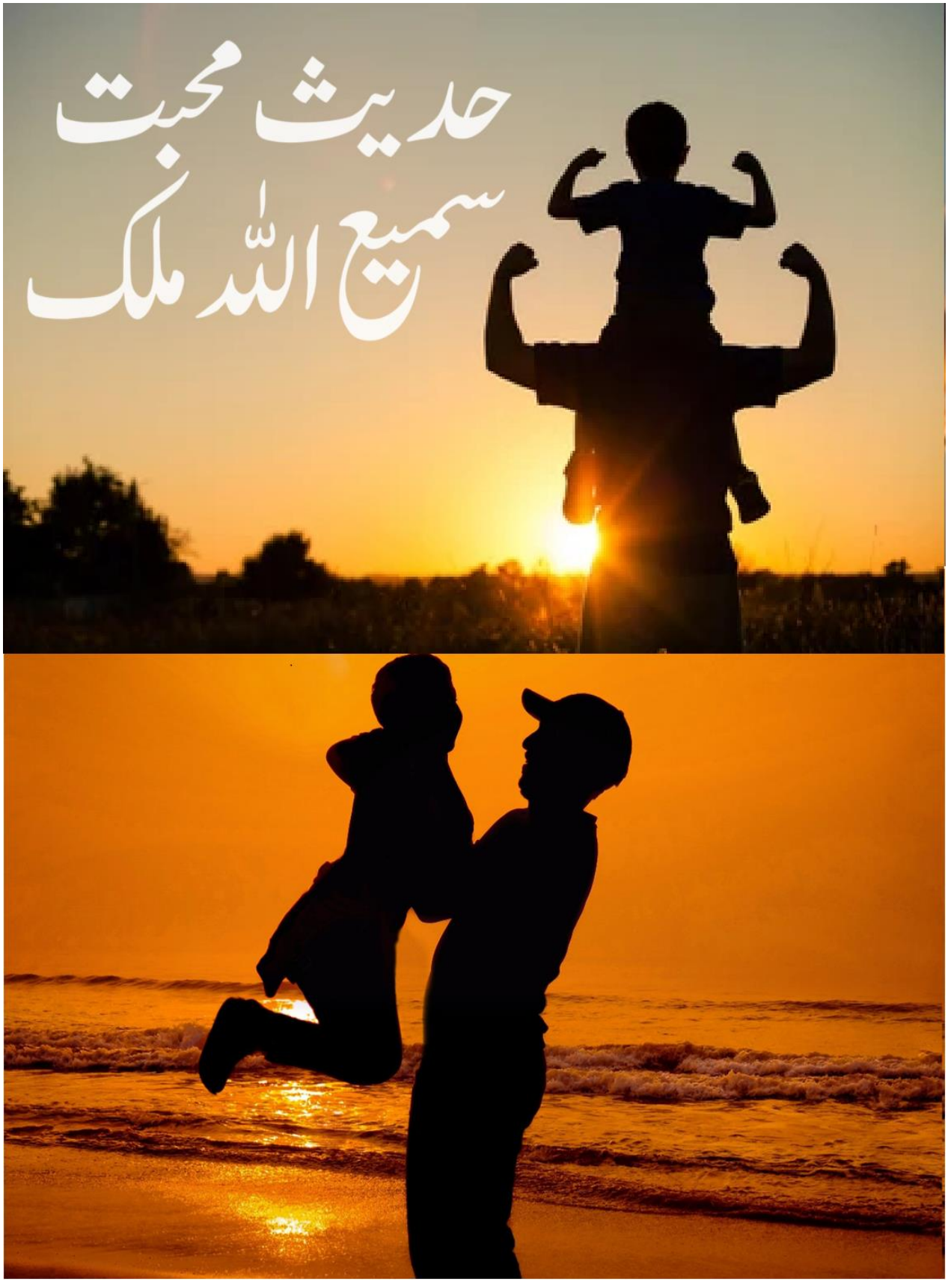
حدیث محبت
سمیع اللہ ملک

حدیثِ محبت

وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًاؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُہُمَآ اَوْ کِلٰہُمَا فَلَا تَقُلْ لَّہُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْہَرْہُمَا وَ قُلْ لَّہُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا ، وَ اخْفِضْ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ **وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْہُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا**(بنی اسرائیل:23-24)

والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بُوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جِھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جُھک کر رہو، اور دُعا کیا کرو کہ

"پروردگار، ان پر رحم فرما جس طرح اِنہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا"۔

انتساب

زمانے میں میری پہچان

ابا جی کے نام

رخصت ہوا تو آنکھ ملا کر نہیں گیا
وہ کیوں گیا ہے یہ بھی بتا کر نہیں گیا
وہ یوں گیا کہ بادِ صبا یاد آ گئی
احساس تک بھی ہم کو دلا کر نہیں گیا
یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی لوٹ آئے گا
جاتے ہوئے چراغ بجھا کر نہیں گیا
بس اک لکیر کھینچ گیا درمیان میں
دیوار راستے میں بنا کر نہیں گیا
شاید وہ مل ہی جائے مگر جستجو ہے شرط
وہ اپنے نقشِ پا تو مٹا کر نہیں گیا
گھر میں ہے آج تک وہی خوشبو بسی ہوئی
لگتا ہے یوں کہ جیسے وہ آ کر نہیں گیا
تب تک تو پھول جیسی ہی تازہ تھی اس کی یاد
جب تک وہ پتیوں کو جدا کر نہیں گیا
رہنے دیا نہ اس نے کسی کام کا مجھے
اور خاک میں بھی مجھ کو ملا کر نہیں گیا
ویسی ہی بے طلب ہے ابھی میری زندگی
وہ خار و خس میں آگ لگا کر نہیں گیا
شہزاد یہ گلہ ہی رہا اس کی ذات سے
جاتے ہوئے وہ کوئی گلہ کر نہیں گیا

-: پیش لفظ:-

آپ نے "ماں، ممتا" پر بہت لکھا لیکن کیا وجہ ہے کہ آپ نے "باپ" جیسی شفیق ہستی پر اتنا نہیں لکھا کہ باپ کی خاموش محبت کیا ہوتی ہے؟ یہ ہے وہ سوال، جس کے جواب میں یقیناً پوری کتاب بھی باپ کی محبت کے ایک پل کا حق بھی نہیں چکا سکتی۔ نجانے باپ کا نام آتے ہی ایک کمزور اور ضعیف نورانی چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے لیکن میرے نزدیک باپ کی اہمیت اور شخصیت اس لئے سب سے الگ اور جدا ہے کہ میں نے اپنے تیرہ سال کی عمر میں "بابِ جنت" کو اس دنیا سے رخصت ہوتے دیکھا ہے۔ باپ کیا، کیسا اور کیوں اتنا اہم ہوتا ہے، شائد مجھ سے زیادہ نہ کوئی جان سکا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے کیونکہ جس اولاد پر ابھی تک باپ کا مبارک سایہ قائم ہے، وہ باپ کی جدائی کے دکھ کو نہیں سمجھ سکتے بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ "والد" کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہوگا کہ ان کی سرپرستی اولاد کیلئے کتنی بڑی رحمت، شفقت اور بے لوث سہارا ہے جس کا اس دنیا میں کوئی نعم البدل نہیں لیکن میرے باپ کو اس کا مکمل ادراک تھا کیونکہ وہ بھی کم سنی (9 سال کی عمر) میں یتیم ہوگئے تھے اور بڑے کرب کے ساتھ ان کی جدائی کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔

باپ اپنے اہل خانہ کی کفالت کیلئے دن رات اپنے آرام اور صحت کی پرواہ کئے بغیر بھرپور محنت میں جتا رہتا ہے اور اس کی ساری تھکان یہ سوچتے ہی غائب ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کا خوش نما مستقبل مضبوط کر رہا ہے۔ اسے اپنی اولاد کی تمام خواہشات کو پورا کرنا اس لئے بھی ضروری سمجھتا ہے کہ وہ خود بچپن میں اپنی خواہشات کا دم گھٹنے اور باپ کی مجبوریوں کا تجربہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دن کے علاوہ رات کو بھی بچوں کے مستقبل اور فکر معاش کیلئے بے چین رہتا ہے اور خوابوں کے محل تعمیر کرنے کے اپنی کھلی آنکھوں سے خوبصورت اور سہانے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ لیکن کمال درجہ کا ضبط کا مالک ہوتا ہے کہ کبھی گھر میں اپنی پریشانی یا الجھن نہیں بتاتا اور اپنی ذات پر ہر مشکل کو برداشت کرکے اپنے اہل خانہ کیلئے ایک سیسہ پلائی دیوار کی مانند کھڑا رہتا ہے۔

چونکہ میں والد صاحب سے زیادہ قریب رہا ہوں اس لئے میرے لئے یہ سوال بہت معنی رکھتا ہے لیکن محبت کا یہ شاہکار عین جوانی میں اللہ کے حضور حاضر ہوگئے اور میں بچپن ہی کی یادوں کے سمندر میں غوطے لگاتا رہتا ہوں اور ہر مشکل گھڑی میں رب کے بعد میرا باپ ہی میری منزل ہے کہ ان کے پند و نصائح اور خوبصورت سبق آموز کہانیاں مجھے آج بھی ازبر یاد ہیں۔

جہاں تک بات ماں کی محبت کی ہے تو اس بابت تو تب سے لکھا جارہا ہے جب سے حضرت انسان نے لکھنا سیکھا تھا لیکن باپ ایک ایسی ذات ہے جس بابت شاید باپ نے بھی کبھی کھل کر نہیں لکھا اور بھلا لکھ بھی کیسے سکتا ہے کہ باپ کی محبت کا ہر رنگ نرالا اور مختلف ہے۔ ماں کی محبت تو بچے کی پیدائش سے اس کی آخری عمر تک ایک سی ہی رہتی ہے یعنی اپنے بچے کی ہر برائی کو پس پردہ ڈال کر اسے چاہتے رہنا۔ بچپن میں بچہ اگر مٹی کھائے تو ماں اس پر پردہ ڈالتی ہے اور باپ سے بچاتی ہے، نوجوانی میں بچے کی پڑھائی کا نتیجہ آئے تو اس رپورٹ کارڈ کو باپ سے چھپاتی ہے اور اپنے بچے کو بچاتی ہے، جوانی میں بچے کا دیر سے گھر آنا باپ سے چھپاتی ہے اور اپنے بچے کو بچاتی ہے ٹھیک اسی طرح جیسے جیسے بچہ بڑا اور اس کے "جرائم" بڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے ماں اپنے پردے کا دامن پھیلاتی چلی جاتی ہے، اس کے برعکس "باپ" ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی اولاد کو بے پناہ چاہنے کے باوجود اس پر صرف اس لئے ہاتھ اٹھاتا ہے کہ کہیں بچہ خود کو بڑے نقصان میں مبتلا نہ کر بیٹھے، اس کی پڑھائی پر سختی برتتا ہے کہ کہیں اس کا بچہ کم علم ہونے کے باعث کسی دوسرے کا محتاج نہ بن کر رہ جائے، بچے کا رات دیر سے گھر آنا اس لئے کھٹکتا ہے کہ کہیں کسی بری لت میں مبتلا ہو کر بچہ اپنی صحت اور مستقبل نہ خراب کر بیٹھے۔

باپ شفقت محبت اور ایثار کا وہ کوہ ہمالیہ ہے جس کی چوٹی تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اس کا غصہ وقتی ہوتا ہے، اگر وہ ہماری کسی بات پر ناراض ہو بھی جائے تو اندر ہی اندر انتظار کرتا ہے کہ اسے منالیا جائے۔ وہ اوپر سے تو سخت ہوتا ہے پر اندر سے بالکل سادہ ہوتا ہے۔ صرف اس کی "انا اور مان" اپنی شفقت کا اظہار نہیں کرنے دیتی جو کہ ہمارے معاشرے کی عطا کردہ ہے۔ لیکن جونہی اولاد اس کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی کی طلبگار ہوتی ہے تو اولاد کے منہ سے ابھی فقرہ مکمل نہیں ہوتا کہ وہ دوڑ کر آپ کو اپنے سینے سے اس زور سے لگاتا ہے کہ محبت کی ساری گرمی جہاں اس کے سارے مصنوعی غصے کا کافور کر دیتی ہے وہاں اولاد کی غلطیوں اور شرمندگی کو والہانہ محبت سے شرابور کر دیتی ہے۔

یعنی بچے کی پیدائش سے لیکر قبر تک باپ کی زندگی کا محور اس کا بچہ اور اس کا مستقبل ہی رہتا ہے، جہاں ماں کی محبت اس کی آنکھوں سے اور عمل سے ہر وقت عیاں ہوتی ہے وہیں باپ کی محبت کا خزانہ سات پردوں میں چھپا رہتا ہے، غصہ، پابندیاں، ڈانٹ، مار، سختی یہ سب وہ پردے ہیں جن میں باپ اپنی محبتوں کو چھپا کر رکھتا ہے کہ بھلے اس کی اولاد اسے غلط سمجھے پر وہ یہ سب پردے قائم رکھتا ہے کہ اس کی اولاد انہی پردوں کی بدولت کامیابی کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کرتی ہے۔

میں بڑے اچھے اسکول میں پڑھتا تھا، اور اسی بات پر ہر روز چڑھتا تھا۔ میرے دوست لمبی لمبی گاڑیوں میں آتے اور میری طرح نہیں کہ تانگے سے اتر کر گھر کے بنے ہوئے پراٹھوں والا ٹفن ہاتھ میں تھامے اسکول داخل ہوتا جبکہ میرے سب دوست کنٹین میں بیٹھ کر رنگ برنگے سموسے اور دیگر کھانوں کا لطف اٹھاتے تھے۔ کچھ تو ایسے بھی تھے جو سال میں کسی غیر ملک میں چھٹیاں منانے جاتے تھے۔ کسی کا باپ ڈاکٹر، کسی کا باپ سیاستدان، کوئی کسی بڑی مل یا فیکٹری کے مالک کا بیٹا یا کوئی کسی بڑے سرکاری عہدے دار کا بیٹا ہوتا تھا۔ جبکہ میرے والد بالکل ان پڑھ اور ایک معمولی ہوٹل چلانے والے۔

ایک دن میں اس معاشرہ کے غیر امتیازی سلوک کو دیکھ کر پھٹ پڑا، اور بڑے درد کے ساتھ اپنے والد سے سوال کر دیا: ابا جی! یہ کیا ہے؟ آپ سب کی طرح پیسے والے، امیر شخص کیوں نہیں ہیں؟ میرا اچانک یہ سوال سن کر تھوڑی دیر مجھے دیکھا اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کی خاموش ہو گئے، مجھے شدت سے اس سوال کا جواب درکار تھا کہ ابھی اس کے جواب میں کچھ الفاظ میری دماغ کی خلش دور کر دیں گے۔ لیکن میں نے ان کی بھرائی آنکھوں میں جو درد دیکھا، وہ میرے دل میں ایک خنجر کی طرح اتر گیا اور دل میں سما گیا۔ آج بھی جب وہ آنکھیں تصور میں نظر آتی ہیں تو اپنے اس سوال پر ندامت بھی ہوتی ہے لیکن بچپن کی معصومیت کے پردے میں اسی طرح چھپا لیتا ہوں جس طرح میرے باپ نے اس دن اپنے آنسوؤں کو اندر ہی اندر جذب کر کے چھپا لیا تھا۔

ایک دن میں نے اپنے پوتے سے کہا: میں نے جو غلطی کی، تم اسے مت دہرانا، موسم کا حال اسے مت سنانا جو تمہارے لئے ہر روز بھاگتا رہا، سردی، گرمی، بارش آندھی، کسی موسم کی پرواہ نہیں کی۔ دھوپ اور سایہ میں تمیز نہیں رہی، کڑاکے دار سردی بھی اس کی راستہ نہ روک سکی۔ وہ تم سب کے اچھے مستقبل کیلئے بھاگتا رہا، اس کیلئے رات اور دن کا فرق مٹ گیا تھا، کیونکہ اس سخت جاں محنت کی کمائی تم ہو۔ اس سے کبھی یہ نہ پوچھنا کہ اس نے کمایا کیا ہے؟

شہر میں بڑی بڑی دوکانیں تھیں، کپڑوں کھلوں اور کتابوں سے بھری ہوئی ہر دیکھنے والے کو دعوت دے رہی تھیں۔ لیکن مجھے نہیں پتہ کہ ان دنون میرے والد کی مالی استطاعت کیا تھی تاہم اندر سے یہ آواز اٹھتی تھی کہ اگر میں اپنے باپ سے کسی چیز کی فرمائش کروں تو یہ ممکن نہیں کہ وہ مجھے نہ لا کر دیں۔ میں برسوں سے ان کو وہی دو کرتے شلوار میں دیکھ رہا تھا۔ نئے سوٹ کی باری تب آتی جب پہلے والا بالکل پہننے کے لائق نہ رہتا لیکن عجب بات یہ

ہے کہ میں جب بھی کپڑے، کھلونے اور کتابوں کی فرمائش کرتا، وہ مجھے فوری مل جاتا۔ کچھ قصے ایسے ہیں جو دل پر درج ہو گئے اور میرے روح تک کو انہوں نے اسیر کر رکھا ہے۔ میں یہ کبھی نہیں بھول پاتا کہ میرے بابا ہماری خوشیاں خریدتے ہوئے خود خرچ ہو گئے۔

میں ڈرتا نہیں، کسی مشکل، کسی آزمائش، کسی آفت یا مصیبت سے نہیں ڈرتا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میرے پاؤں میں کسی معمولی سے دکھ کا بھی کانٹا چبھ جائے، اگر میرا وقت بگڑ جائے اور دنیا میرا ساتھ چھوڑ جائے، مجھے اس کی پرواہ نہیں کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہی ہے میرا باپ جو سجدے سے اس وقت تک سر نہیں اٹھائے گا جب تک اس کا بیٹا فتح یاب ہونے کا نعرہ نہیں لگائے گا۔ جب تک وہ شفقت بھرا محنتی ہاتھ میرے سر پر تھا، میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میں تو اس کے سہارے اور یقین پر دنیا کی تمام قیامتوں سے لڑ جاتا تھا اور اپنی کامیابی کی خبر سنانے کیلئے دروازے میں اس کی راہ دیکھتا رہتا تھا۔

یہ کیا؟ لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ میرے بابا جن کو میں ایک سخت گیر سمجھتا تھا لیکن میری ماں کی ہر بات پر خاموشی سے "ہاں کر دینے والے میرے "بابا"، جب کبھی ایک روپیہ مانگا تو جواب میں سب سے چھپا کر پانچ روپے میری جیب میں یا میری کتاب کھول کر اس کے اندر چھپا کر رکھ دینے والے میرے "بابا" جن کے جوتے سے ان کے پاؤں کی انگلیاں باہر جھانکتے نظر آتی رہیں لیکن مجھے مہنگے جوتے اور سینڈل لا کر دیتے رہے اور میرے چہرے پر آئی ہوئی خوشیوں کو دیکھ کر واری قربان ہوتے رہے۔

خود بیچارے بہت ہی سیدھے سادے مزاج کے مالک لیکن میرے بگاڑنے کا الزام ساری عمر اپنے کندھوں پر ڈھوتے رہے اور ہاں اب تو میں سچ مچ بگڑ چکا ہوں، میرا دل جیتنے کیلئے چاہے کوئی بڑی گاڑی میں آئے، قیمتی فیشن ایبل لباس زیبِ تن کر آجائے، ہاتھ میں بہت ہی مہنگا موبائل فون تھامے ناز نخرے کرتا ہوا آئے، میرے راستے میں پھول بچھانے کی بجائے خود بچھ جائے، میرا پیار کسی ایسے ویسے کو ملے گا نہیں، مجھے اپنے بابا سے کم کوئی چلے گا نہیں۔

"بابا" چار الفاظ پر مشتمل ایک معمولی سا لفظ، اس میں کوئی ڈرامہ نہیں جو "باپ" میں ہے، وہ گہرائی نہیں جو "باباجی" کہنے میں ہے، وہ مٹھاس نہیں جو "اباجی" کہنے میں ہے، وہ حفاظت کا احساس نہیں جو کبھی کبھار "بابا جانی" میں ہے لیکن کچھ تو ہے کہ یہ معمولی سا لفظ سنتے ہی میرے اندر کا موسم بدل جاتا ہے۔ میں کچھ اور ہو جاتا ہوں، جس دن یاد آتا ہے کہ میں اپنے باپ کا فخر تھا تو اس دن میرے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ خوشیوں سے معمور ہو کر اپنے حسن کی گواہی دینے لگ جاتا ہے۔

بہت چھوٹا تھا میں، جب میرے "بابا" میرے لئے کھلونا کار اور اس کے ساتھ ایک موٹے کاغذ کا ایک چمکدار تاج لیکر آئے تھے جس کو پہن کر میں کئی دن شہزادوں کی طرح گھومتا رہا۔ اپنے دوستوں کی تحسین بھری نگاہیں موصول کر کے سینہ چوڑا کر کے چلتا رہا۔ دن، ماہ و سال تیزی سے گزرتے گئے اور میں ان تمام کھلونوں سے آزاد ہو کر اپنی تعلیم اور دوسرے مشاغل میں کھو گیا۔ غالباً میں نویں کلاس میں تھا اور میری عمر بھی بچپن کی حدوں سے نکل کر لڑکپن یعنی تیرہ سال تک جا پہنچی تھی۔ اپنے امتحانات میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے کی خوشی میں حسبِ عادت پھر تحفہ کی فرمائش کی تو نجانے کہاں سے وہ میری وہی پرانی کھلونا کار اور وہ موٹے سنہری کاغذ کا تاج نکال کر لے آئے اور میرے نئے تحفے کے ساتھ ان کو شامل کر کے مجھے اس احساس سے مالا مال کر گئے کہ وہ "بابا" جو اپنے بچوں کے بچپن کا ہر لمحہ اس قدر محفوظ رکھ سکتے ہیں تو ان کی بے لوث دعائیں تو آپ کی ساری زندگی کے تحفظ کی گارنٹی بن سکتی ہیں۔

اگلے دن "بابا" بہت غور سے مجھے دیکھ رہے تھے اور مجھے ان کی نظروں سے یہ محسوس ہوا کہ یہ میرے سر پر کل کے سنہری کاغذ کے تاج کو حقیقت بنتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور نجانے دل میں کیا دعائیں دیں کہ میں آج سچ مچ ان کی دعاؤں کی بدولت دنیا کی ہر آسائش کے لطف اٹھا رہا ہوں اور مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے سر پر تاج سجانے کیلئے کسی بادشاہ کی ضرورت نہیں بلکہ اس کیلئے میرے بابا کی دعاؤں میں بھرپور سنہری کاغذ کا تاج ہی کافی ہے۔ لیکن "بابا جانی" مجھے آج آپ کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ میں تو ان تمام آسائشوں کے باوجود آپ کا مقروض ہوں کہ میں تو اس صدقے کے چند سکے بھی نہ لوٹا سکا جو آپ نے میرے ہاتھ سے ایک فقیر کو دلوائے تھے۔ میں مسجد کا وہ چندہ تک واپس نہیں کر پایا جو آپ ہمیشہ مجھے مسجد کے ڈبے میں ڈالنے کیلئے دیتے رہے۔ میرا یہ قلق ختم ہونے نام نہیں لے رہا کہ میری کمسنی میں ہی آپ ہم سب کو چھوڑ کر اللہ کے ہاں حضور ہو گئے!

میں نے سنا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے محل کا مالک برونائی کا سلطان ہے، مجھے جب برونائی جانے کا موقع ملا تو میرے میزبان نے اچانک مجھ سے کہا کہ اگلے دو منٹ کے بعد ہم برونائی کے "ایمان کی روشنی کا محل" کے سامنے سے گزریں گے جو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں دنیا کے سب سے بڑے محل کے طور پر شامل کیا گیا ہے، جو 2 ملین مربع فٹ پر محیط ہے۔ اس محل کا گنبد 22 قیراط سونے سے مزین ہے۔ اس میں 1788 کمرے، سلطان کے پولو ٹٹو کے لیے ایئر کنڈیشنڈ اصطبل، سونے کے دروازے کے ہینڈل اور 257 باتھ روم ہیں۔ سال میں صرف رمضان کے اختتام پر تین دن عوام کے لیے کھلا رہتا ہے، جب سلطان اپنے استقبال کے لیے ایک "اوپن ہاؤس" کا انعقاد کرتا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ عرب کا ایک امیر حکمران ایک ایسی گاڑی کا مالک ہے جو سونے (گولڈ) سے تیار کی گئی ہے۔ دنیا میں اب درجنوں افراد ایسے ہیں جن کی دولت کے تخمینے کھربوں ڈالر تک پہنچ چکے ہیں، اور ان میں کئی افراد ایسے ہیں کہ ان کی دولت کو محفوظ کرنے کیلئے بینکوں کے پاس بھی جگہ نہیں رہی اور اب وہ دیگر ذرائع سے اپنی دولت کو محفوظ کر کے اک خاص نشے میں مبتلا ہیں لیکن یقین کریں کہ دنیا کے امیر ترین فہرست پر آج بھی میرا باپ سر فہرست ہے۔ میرے بابا جیسا عالی شان اور کون ہو گا جو اپنے کرتے کی پھٹی جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے یقین دلاتا رہا کہ جو مانگے گا، ملے گا۔۔۔ آپ خود بتائیں بھلا اس سے بڑا دولت مند اور کون ہو سکتا ہے۔

میرے ابا جی انتہائی رعب داب شخصیت کے مالک تھے لیکن کبھی بھی انہوں نے مارا نہیں۔ بظاہر انتہائی سخت معلوم ہوتے تھے لیکن یہ اس ڈسپلن کا تقاضہ تھا جو بچوں کی تربیت کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ ہم بھائیوں پر بہت سخت پابندیاں تھیں۔ اور یہی کچھ ہر اولاد کو محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کا باپ دنیا کا سب سے برا اور ظالم باپ ہے کہ جو نا ہی دوستوں کے ساتھ رات گئے تک بیٹھنے دیتا ہے اور نہ ہی جیب خرچ اتنی زیادہ دیتا ہے کہ اولاد فضول عیاشیاں کر سکیں۔ باقی بھائیوں نے تو شائد اتنی سخت پابندیوں کا سامنا نہ کیا ہو لیکن میرے ساتھ بے انتہاء پیار ہونے کے باوجود کبھی میری بے جا ضد کو نہیں مانا گیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ بڑا بیٹا گاڑی کا انجن ہوتا ہے اور باقی بہن بھائی اس کے ساتھ منسلک بوگیوں کی مانند ہوتے ہیں۔ آج جب اپنے بچپن کے دوستوں کو نشے یا دیگر خرافات میں مبتلا دیکھتا ہوں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ ہمارے والد صاحب نے ہم پر سختیاں برتیں جس کی بدولت آج کسی بھی طرح کے نشے سے خود کو بچائے رکھا ہے، اور آج اس مقام پر کھڑے ہیں کہ اپنے والدین کا سر فخر سے بلند رکھ سکیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ باپ سانسیں لیتے ہوئے بھی مر جاتے ہیں، جیسے جیسے اولاد کا اختیار بڑھتا اور والد کا اختیار گھٹتا جاتا ہے ویسے ویسے ہی باپ "مرنا"

شروع ہو جاتا ہے۔ جب بچہ طاقتور جوان ہونے لگتا ہے تو باپ کا ہاتھ بعض اوقات اس خوف سے بھی اٹھنے سے رک جاتا ہے کہ کہیں بیٹے نے بھی پلٹ کر جواب دے دیا تو اس قیامت کو میں کیسے سہوں گا؟ جب بچے اپنے فیصلے خود لینے لگیں اور فیصلے لینے کے بعد باپ کو آگاہ کر کے "حجت" پوری کی جانے لگے تو بوڑھا شخص تو زندہ رہتا ہے پر اس کے اندر کا "باپ" مرنا شروع ہو جاتا ہے۔ باپ اس وقت تک زندہ ہے جب تک اس اولاد پر اس کا حق ہے

جس اولاد سے اس نے اتنی محبت کی کہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر اس کی سرزنش بھی کی ہو، اولاد کے آنسو بھلے کلیجہ چیر رہے ہوں پھر بھی اس لئے ڈانٹا کہ کہیں ناسمجھ اولاد خود کو بڑی تکلیف میں مبتلا نہ کر بیٹھے، ماں کی محبت تو یہ ہے کہ پیاس لگی (پیار آیا) تو پانی پی لیا پر باپ کی محبت یہ ہے کہ پیاس لگی تو خود کو اور اتنا زیادہ تھکایا کہ پیاس لگتے لگتے اپنی موت آپ مر گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ "والد" کا اولاد کی زندگی پر ہمیشہ اختیار رہنا ضروری ہے لہذا اولاد کو عمر کے ہر حصّے میں باپ کو یہ یقین دلانا ضروری ہے کہ اسے کبھی احساس نہ ہو کہ اب ہم "بڑے" ہو گئے ہیں یا ان کی اہمیت گھٹ چکی ہے لہذا پیسے ہونے کے باوجود اپنے ہر کام کے لئے باپ سے پیسے مانگنا اپنی عادت بنالو چاہے وہ تمہاری اپنی ہی کمائی ہوئی دولت کیوں نہ ہو، رات اگر کسی پروگرام سے واپسی پر دیر ہو جانے کا خدشہ ہو تو آدھا گھنٹے پہلے باپ کی منتیں کرنی شروع کر دو کہ پلیز جانیں دیں جلدی واپس آجاؤں گا۔ آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ روڈ کراس کرتے ہوئے بوڑھا باپ آج بھی جوان اور توانا بچے کا ہاتھ پکڑ کر رکھتے ہیں جبکہ آپ کے بچے بھی شادی شدہ ہو گئے ہیں اور یقیناً تمام اولاد دل ہی دل میں ہنستے ہوئے اور آس پاس کھڑے لوگوں کی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے باپ کا ہاتھ پکڑ کر روڈ کراس کرتے ہوئے دیکھتے ہوں گے لیکن اس کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

باپ "کو زندہ رکھا جائے، پھر چاہے وہ چارپائی پر پڑا کوئی بہت ہی بیمار اور کمزور انسان ہی" باپ کی محبت اولاد سے ماسوائے اس کے اور کچھ نہیں مانگتی کہ کیوں نہ ہو، اگر اس کے اندر کا "باپ" زندہ ہے تو یقین جانئے اسے زندگی میں اور کسی شے کی خواہش اور ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کے والد صاحب سلامت ہیں تو خدارا اس کے اندر کا "باپ" زندہ رکھئے یہ اس "بوڑھے شخص" کا آپ پر حق بھی ہے اور آپ کا فرض بھی ہے۔

یقیناً ہم سب جنت کے امیدوار ہیں تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ اپنی ماں جس کے قدموں کے نیچے جنت ہے تو باپ کو جنت کا دروازہ تعبیر کیا گیا ہے اور داخلہ کیلئے دروازہ کی کیا قدر اور اہمیت ہے، ہم سب جانتے ہیں لیکن میرے رب کا یہ فرمان کہ جس کے ساتھ باپ ناراض ہو تو میرا رب بھی اس سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کو راضی رکھنا ہو گا۔ ٹھیک اسی طرح رحم کرنا ہو گا جس طرح انہوں نے ہم پر رحم کیا جب ہم محض گوشت کے اک لوتھڑے کے سوا کچھ نہ تھے۔ وہ بڑے خوش نصیب ہیں جن کے والدین یا ان میں کوئی ایک زندہ ہے۔ اللہ نہ کرے کہ دیر ہو جائے، ان کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی دعاؤں میں اولاد ہی سرفہرست ہوتی ہے، اپنے لئے تو مانگنے کا انہیں یاد بھی نہیں ہوتا۔ والدین بالخصوص والد کی اہمیت ہم جیسے ہی بتا سکتے ہیں کہ جن کے کان ہر عید اور خاص تہوار پر وہ رس بھری آواز کے منتظر رہتے ہیں کہ کاش کوئی آگے بڑھ کر ویسے ہی گلے لگا کر عید مبارک کہے جس طرح بچپن میں منہ چوم کر ہاتھ میں عیدی ملتی تھی۔

بابا! آپ کے جانے کے بعد پتہ چلا کہ میرے رب نے آپ کو جنت کا دروازہ کیوں کہا۔ باپ ایک ایسا بے داغ آئینہ ہوتا ہے جس پر کبھی بھی کسی قسم کی دھول ٹھہر نہیں سکتی اور اس آئینے میں اسے اپنی اولاد سے زیادہ کوئی اور خوبصورت دکھائی ہی نہیں دیتا۔ میرے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ دعا عبادات کا مغز ہے، اس لئے اپنے رب سے کثرت کے ساتھ دعا کرنی چاہئے اور میرے رب کا فرمان ہے کہ میں بندے کے گمان کے مطابق ہوں، اس لئے میری

گزارش ہے کہ اپنے رب سے ہمیشہ خوش گمان ہو کر مانگیں۔

دعا "ایک "امید "ہے"

دعا "ایک "یقین "ہے"

دعا "ایک "بھروسہ "ہے"

دعا "ایک "وسیلہ "ہے"

دعا "ایک "حوصلہ "ہے"

دعا "ایک "محبت "ہے"

میری سب دعاؤں کا مرکز میرا باپ!

میری دعا ہے کہ یا کریم ور حیم رب! جن کے والدین اس دنیا میں نہیں رہے، ان کی بخشش فرما اور جن کے والدین زندہ ہیں، ان کی خدمت کرنے کی توفیق عنائت فرما کہ تو ہی ہماری دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا ہے۔ آپ ہمیشہ خوش، آباد، سلامت رہیں اور میرا کریم رب آپ کو کسی کا محتاج نہ کرے۔

آمین!

تاریک ہو گئی مری کائناتِ حیات جن کے بغیر

فہرست حدیثِ محبت

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	اغیار کے آلہ کار	بروز اتوار 18 ذوالقعد 1445ھ 26 مئی 2024ء	15
2	وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل	بروز سوموار 19 ذوالقعد 1445ھ 27 مئی 2024ء	18
3	واحد سُپر پاور کا گھمنڈ	بروز بدھ 21 ذوالقعد 1445ھ 29 مئی 2024ء	23
4	یومِ تکبیر کا اصل پیغام	بروز ہفتہ 24 ذوالقعد 1445ھ یکم جون 2024ء	30
5	خلیج فارس اور بدمست ہاتھی	بروز سوموار 26 ذوالقعد 1445ھ 3 جون 2024ء	35
6	تو آؤ مر جائیں!	بروز جمعرات 29 ذوالقعد 1445ھ 6 جون 2024ء	42
7	کیا دل ٹوٹنا ضروری ہے؟	بروز جمعتہ المبارک یکم ذوالحج 1445ھ 7 جون 2024ء	45
8	اسرائیل آخری سانسیں لے رہا ہے	بروز ہفتہ 2 ذوالحج 1445ھ 8 جون 2024ء	48
9	بصیرت نہ بصارت	بروز سوموار 4 ذوالحج 1445ھ 10 جون 2024ء	54
10	رات کا آخری پہر	بروز جمعرات 6 ذوالحج 1445ھ 13 جون 2024ء	59
11	جرم عظیم	بروز یومِ عرفہ ہفتہ 9 ذوالحج 1445ھ 15 جون 2024ء	63
12	عید الاضحیٰ اور فادرڈے	بروز عید الاضحیٰ اتوار 10 ذوالحج 1445ھ 16 جون 2024ء	66
13	نیا دجال، نیا جنجال	بروز جمعتہ المبارک 15 ذوالحج 1445ھ 21 جون 2024ء	72
14	مظلومِ مدینہ.....حضرت عثمانؓ غنی	بروز بدھ 20 ذوالحج 1445ھ 26 جون 2024ء	81
15	یہ کھیل بند کرو کشتیاں بدلنے کا	بروز جمعرات 21 ذوالحج 1445ھ 27 جون 2024ء	84
16	اقلیتوں کے حقوق	بروز ہفتہ 23 ذوالحج 1445ھ 29 جون 2024	89
17	دوست دشمن کی تمیز	بروز منگل 26 ذوالحج 1445ھ 2 جولائی 2024ء	95
18	ماتھے کا جھومر.....سیدنا حضرت عمرؓ	بروز ہفتہ 30 ذوالحج 1445ھ 6 جولائی 2024ء	103
19	حکایاتِ خونچکاں	بروز سوموار 2 محرم الحرام 1446ھ 8 جولائی 2024ء	108
20	شدید تشنج میں مبتلا	بروز بدھ 4 محرم الحرام 1446ھ 10 جولائی 2024ء	110
21	حسینؓ ہمارے ہیں.....!	بروز جمعتہ المبارک 6 محرم الحرام 1446ھ 12 جولائی 2024ء	113
22	نہایت اس کی حسینؓ ابتداء ہے اسمٰعیلؑ	بروز ہفتہ 7 محرم الحرام 1446ھ 13 جولائی 2024ء	115
23	حسینیتؓ کے درخشاں پہلو	بروز سوموار 9 محرم الحرام 1446ھ 15 جولائی 2024ء	122
24	فلاحی ریاست کا خواب	بروز منگل 10 محرم 1446ھ 16 جولائی 2024ء	124
25	واپسی کا سفر	بروز بدھ 11 محرم الحرام 1446ھ 17 جولائی 2024ء	127
26	قرآن کا فلسفہ اور سائنس کی ترویج	بروز جمعتہ المبارک 13 محرم الحرام 1446ھ 19 جولائی 2024ء	131
27	شرم کس احساس کا نام ہے	بروز منگل 17 محرم الحرام 1446ھ 23 جولائی 2024ء	141

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
28	سفاک منافق	بروز جمعرات 19 محرم الحرام 1446ھ 25 جولائی 2024ء	144
29	تضحیک وتوہین	بروز جمعتہ المبارک 20 محرم الحرام 1446ھ 26 جولائی 2024ء	147
30	خودکشی یا خودکش بمبار.....فیصلہ کن گھڑی	بروز اتوار 22 محرم الحرام 1446ھ 28 جولائی 2024ء	152
31	حتمی انجام	بروز منگل 24 محرم الحرام 1446ھ 30 جولائی 2024ء	157
32	اقتدار اور جو تم پیزار	بروز جمعتہ المبارک 27 محرم الحرام 1446ھ 2/اگست 2024ء	162
33	ہمارا پیارا پاکستان	بروز اتوار 29 محرم الحرام 1446ھ 4/اگست 2024	167
34	اگر پاکستان نہ بنتا	بروز سوموار یکم صفر المظفر ھ 5/اگست 2024ء	169
35	ایسا کہاں سے لاؤں تجھ سا کہیں جسے	بروز اتوار 7 صفر المظفر 1446ھ 11/اگست 2024	181
36	پاکستان کی فریاد	بروز منگل 9 صفر المظفر 1446ھ 13/اگست 2024ء	185
37	یومِ آزادی..... تجدیدِ عہد	بروز جمعرات 11 صفر المظفر 1446ھ 15/اگست 2024	189
38	ضمیر کی خودکشی	بروز ہفتہ 13 صفر المظفر 1446ھ 17/اگست 2024ء	194
39	قائد: ہم شرمندہ ہیں!	بروز سوموار 15 صفر المظفر 1446ھ 19/اگست 2024ء	199
40	پھندہ منتظر ہے!	بروز جمعرات 18 صفر المظفر 1446ھ 22/اگست 2024ء	204
41	پاکستان: منزل یا نشانِ منزل	بروز ہفتہ 20 صفر المظفر 1446ھ 24/اگست 2024ء	207
42	مصور پاکستان اور ہم!	بروز سوموار 22 صفر المظفر 1446ھ 26/اگست 2024ء	210
43	مدبر اقبال کا تدبر	بروز بدھ 24 صفر المظفر 1446ھ 28/اگست 2024ء	215
44	اگر منظر بدل جائے۔۔۔!	بروز جمعتہ المبارک 26 صفر المظفر 1446ھ 30/اگست 2024ء	220
45	قلب وروح کی جان۔۔۔سید علی گیلانی	بروز منگل 30 صفر المظفر 1446ھ 3 ستمبر 2024ء	225
46	یادوں کی دہلیز	بروز جمعرات 2 ربیع الاول 1446ھ 5 ستمبر 2024ء	231
47	یومِ دفاع کا اصل پیغام	بروز جمعتہ المبارک 4 ربیع الاول 1446ھ 6 ستمبر 2024ء	234
48	عزم وہمت: اقبال کا مسلم نوجوانوں کیلئے پیغام	بروز ہفتہ 5 ربیع الاول 1446ھ 7 ستمبر 2024ء	237
49	"اقبال کا فلسفہ: صدیوں پر محیط بصارت"	بروز اتوار 6 ربیع الاول 1446ھ 8 ستمبر 2024ء	240
50	کھوئی ہوئی منزل	بروز سوموار 7 ربیع الاول 1446ھ 9 ستمبر 2024ء	243
51	یہ بھوک، افلاس تنگدستی آخر تمہارا ہی مقدر کیوں	بروز منگل 8 ربیع الاول 1446ھ 10 ستمبر 2024ء	245
52	پاکستان منزل یا نشانِ منزل	بروز جمعرات 10 ربیع الاول ھ 12 ستمبر 2024ء	249
53	قسمت کا ماتم	بروز جمعتہ المبارک 11 ربیع الاول 1446ھ 13 ستمبر 2024ء	252
54	پاکستان کیوں بنا؟	بروز ہفتہ 12 ربیع الاول 1446ھ 14 ستمبر 2024ء	255
55	حاصلِ حیات وکائنات	بروز اتوار 13 ربیع الاول 1446ھ 15 ستمبر 2024ء	258
56	حضور اکرم ﷺ کی تریسٹھ سالہ حیاتِ طیبہ	بروز اتوار 13 ربیع الاول 1446ھ 15 ستمبر 2024ء	261

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
57	اقبال: تصورِ وطنیت و قومیت	بروز سوموار 14 ربیع الاول 1446ھ 16 ستمبر 2024ء	268
58	توحید کا رقصِ بسمل: نظریات کی خوشبو	بروز بدھ 16 ربیع الاول 1446ھ 18 ستمبر 2024ء	274
59	خادم و مخدوم	بروز ہفتہ 19 ربیع الاول 1446ھ 21 ستمبر 2024ء	279
60	کامیابی کا راز: عاجزی یا تکبر	بروز اتوار 20 ربیع الاول 1446ھ 22 ستمبر 2024ء	282

اغیار کے آلہ کار

امریکی اشرافیہ اور یورپی ممالک کی سول سوسائٹی اس حقیقت کو اچھی طرح جانتی ہیں کہ امریکی حکومت کی مسلط کردہ جنگ "وارآن ٹیرر" دراصل امریکا کا تراشا ہوا وہ مصنوعی غبارہ تھا جسے بے پناہ وسائل اور گوئبلز آف جرمنی کی روح سے کشید کئے ہوئے مسلسل پروپیگنڈے کی غلیظ ہوا نے نجس اور ظالمانہ زندگی عطا کی اور جس سے آج بھی بدستور کام لیا جارہا ہے۔ یورپی حکومتوں کیلئے اپنے مفاد کیلئے یہ اصطلاح استعمال کرنا تو بعید از قیاس نہیں ہے، بدقسمتی سے بہت سے محکوم ذہنیت کے اسلامی ممالک بھی اپنی بے کردار بداعمالیوں کے نتیجے میں اپنے خلاف ابھرنے والی احتجاجی تحاریک کو کچلنے کیلئے بے دریغ مسلح طاقت کے استعمال کو دہشتگردی کے خلاف جنگ یا امریکی پیروی میں "وارآن ٹیرر" قرار دیتے ہوئے کوئی ندامت محسوس نہیں کرتے یہاں تک کہ کشمیر، فلسطین، افغانستان اور عراق میں بھی غیر ملکی تسلط اور قتل وغارت کے خلاف برسرپیکار حریت کی تحاریک اور اپنے وطن کی آزادی کیلئے جاری مسلح جدوجہد کو بھی دہشتگردی اور اسے کچلنے کیلئے ہر اقدام کو بھی "وارآن ٹیرر" کا نام دینے میں لمحہ بھر تاخیر نہیں کی۔

16 جولائی 2008ء کو اسپین کے دارلحکومت میڈرڈ میں منعقدہ بین الاقوامی بین المذاہب کانفرنس میں سعودی عرب کے سابق فرمانروا مرحوم شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے خطاب کرتے ہوئے نہائت درست طور پر نشاندہی فرمائی تھی کہ انتہاپسندی اور دہشتگردی امریکی اور مغربی ممالک کی وضع کردہ تراکیب ہیں جن کا اسلام سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر چند گمراہ لوگ خودکش حملوں سمیت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کیلئے ایسے افعال کے مرتکب ہوئے ہیں تو یہ ان کی انفرادی سوچ اور ذاتی فعل ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور ایسے افراد کو بالفعل مسلمان یا اسلامی فدائین وغیرہ متعین کرلینا انتہائی غلط فیصلہ ہے۔ اس سہ روزہ کانفرنس میں دنیا بھر سے مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے ممتاز دانشوروں اور مذہبی قائدین نے بڑی تعداد میں شرکت کی تھی۔

اس کانفرنس کا انعقاد رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام کیا گیا تھا جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اسلام دشمن قوتوں، امریکا اور مغربی حلقوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی شر انگیز غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا تھا۔ اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب سے تعلق رکھنے والے نمائندہ افراد کے علاوہ 150 کے قریب صحافی بھی مختلف ذرائع ابلاغ کی نمائندگی کرنے کیلئے اس کانفرنس میں موجود تھے۔ اس امر کا واضح تجزیہ کیا گیا کہ بعض طاقتور ممالک کی طرف سے کمزور اور ناقابل مزاحمت ملکوں پر بلا اشتعال وجواز جارحانہ قبضے، بعض ملکوں کے عوام کے آئینی اور قانونی حقوق پر ڈاکہ ڈالنے، انہیں آزادی سے محروم کرنے اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے نتیجے میں مزاحمت کا جو عمل شروع ہوتا ہے، اسے انتہاپسندی اور دہشتگردی میں ہرگز شامل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ان اقوام کی طرف سے اپنے آئینی اور قانونی حقوق کے حصول کی جدوجہد ہے۔

اس حوالے سے دنیا کی سپر طاقتوں اور خاص طور پر مغربی ملکوں کو اپنی سوچ، روش اور پالیسی میں مناسب تبدیلی لانا ہوگی۔ حقائق پر مبنی اس خطاب کے اختتام پر سب مذاہب کے قائدین، دانشوروں، تمام شرکاء اور مبصرین نے اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر داد وتحسین پیش کی تھی جس کا بدیہی مطلب ان حقائق کا اعتراف تھا کہ بیان کردہ وضاحت احوال ان تمام گمراہ کن، اسلام مخالف موادات کی تشہیر محض معاندانہ رویوں کی اشاعت وتبلیغ کے سوا کچھ نہیں۔ غالباً امریکا اور کچھ مغربی ممالک کو کیمونزم کی پسپائی کے بعد اپنی سرمایہ دار پالیسیوں اور استعماری قوتوں کو متحرک رکھنے کیلئے کسی ایک خودساختہ "دشمن" کی موجودگی وقت کی ضرورت لگتی ہے، ان کے مذموم پروگرام "ون ورلڈ ون آرڈر" کا تقاضہ بھی یہی ہے لہٰذا مشترکہ حریف کے طور پر مسلم

ممالک اوراحیائے اسلام کی تحریکوں کو مٹانے کیلئے خوف ودہشت اور حقارت کی فضا پیدا کرنا حصول مقاصد کا نامعقول ذریعہ بن گیا ہے۔

دہشتگردی، انتہاپسندی اور جارحیت اسلام کے ہم معنی قرار دینے کیلئے امریکا اور مغرب شب وروز اپنے اس جھوٹے پروپیگنڈے کو ہوا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے جبکہ تمام عالمی تجزیہ نگار اس جھوٹ کا پول کھولتے ہوئے اعتراف کر رہے ہیں کہ اس جاری پروپیگنڈے کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں جبکہ اس کی سیاسی اور معاشی وجوہات اظہر من الشمس ہیں۔ یہ رائے اور یقین بھی کسی حد تک موجود ہے کہ دہشتگردی، انتہاپسندی اور بنیاد پرستی وغیرہ کا واویلا مچانے والے امیر ممالک غربت اور ناداری، افلاس اور کسمپرسی کے باعث پھیلنے والی بھوک کے ہاتھوں ہونے والی ہلاکتوں کی آہ وبکا اور احتجاج کا گلا گھونٹنے کی سازش کے طور پر کر ارہے ہیں۔ بنیاد پرستی سے دہشتگردی تک کے تمام رجحانات وہی استعماری دنیا بھر کے وسائل پر غاصبانہ قبضے کے ذریعے پوری انسانی آبادی میں غربت اور ناداری پھیلانے کی مجرم ہیں۔ اس قوتیں پھیلا رہی اور استعمال کر رہی ہیں جو کے خلاف کسی قسم کے صدائے احتجاج بلند ہونے سے روکنے کیلئے مغربی طاقتوں کی سوچی سمجھی منصوبہ بندی، مکروہ سیاسی چال اوران کے بہترین مفاد میں ہے کہ اقوام عالم کی توجہ مذہبی بنیاد پرستی اور نام نہاد دہشتگردی پر مرکوز رکھی جائے اور یہی وہ لائحہ عمل اور طریقہ کار ہے جس کے ذریعے مغربی طاقتیں اور استعماری قوتیں دنیا بھر کے معدنی ومالی، اقتصادی اور معاشی وسائل پر اپنا جارحانہ قبضہ جاری رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

ان حقائق کو تسلیم نہ کرنا پرلے درجے کی خود فریبی ہوگی کہ امریکی استعمار کیلئے اپنی عسکری قوت اور برتری کو متحرک رکھنا اور بیرونی دنیا کے موہوم خطرات یعنی خود ساختہ "دشمن" کی موجودگی حصولِ مقاصد کا ایک ذریعہ ہے۔ مسلم ممالک پر براہ راست قبضہ اوران سے ملحق مزید مسلم ممالک کے وسائل کا اپنی جارحیت کی ترویج کیلئے استعمال ان ممالک پر اپنے تسلط کو اپنی عسکری قوت کا خراج مانا جائے گا جو اپنے جرم ضعیفی کی سزا، مرگ مفاجات کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ اسرائیل کا ناجائز وجود عرب اور ملحق افریقی مسلم ممالک کے سینے کا خنجر کے مترادف ہے، جس کو مضبوط کرنے کیلئے عراق پر مکمل تسلط، بحرین اور کویت میں امریکی چھاؤنیوں کی تعمیر تمام عرب وعجم کی پشت میں مزید زہر آلود خنجروں کے مترادف ہی تو ہیں۔

اپنے ان مذموم تسلط کو تقویت دینے کیلئے گیارہ سال تک افغانستان کی اینت سے اینٹ بجادی گئی تاکہ افغانستان میں مستقل امریکی عسکری قوت کی موجودگی میں ایسی کاسہ لیس حکومت قائم کی جائے جہاں سے وسط ایشیائی مسلم ریاستوں، ایران اور پاکستان سمیت ترکی تک پورا بلاک امریکی اور مغربی مفادات کیلئے کوئی خطرہ باقی نہ رہے اوراس کے ساتھ ہی خطے کی دو طاقتوں روس اور چین کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کیا جاسکے جس کیلئے بھارت پہلے ہی امریکی مفادات کیلئے مکمل سپردگی کا عملی اظہار کر رہا ہے۔ یہیں سے شکوک شبہات کی ابتدا اور انتہا کے باعث وطن عزیز کو غیر مستحکم کرنے کیلئے سازشیں جاری ہیں اور بعض اوقات ملک میں جاری سیاسی افراتفری اور بدامنی کے سیاہ اور منحوس بادلوں کے درمیان روشنی کی کرنیں باہمی سیاسی اختلافات اور اقتدار کی ہوس کے اندھیروں میں ہماری امیدوں کے چراغ پھڑ پھڑاتے محسوس ہوتے ہیں۔

حصول اقتدار کیلئے محاذ آرائی پچھلے 77 برسوں سے جاری ہے۔ طالع آزماؤں نے آمرانہ اور نام نہاد جمہوری نظام حکومت کے تحت برسوں اقتدار اور حاکمیت کا بلاجواز اور بلا اختیار جابرانہ استعمال اور ملکی وسائل کا بے دریغ استحصال کیا ہے اور ہر دور کے اختتام پر قوم کو شکست خوردہ صاحبان اقتدار کے ہا

تھوں قومی وسائل اور معیشت کی تباہی کا مژدہ سنایا جاتا رہا ہے۔ نئے ادوار کی ابتدا وہی پرانے چہرے نئے نقابوں کے ساتھ کرتے چلے آرہے ہیں جن کی ترجیحات کا تعین ہمیشہ غیر ملکی سرپرست قوتیں کرتی چلی آئی ہیں اور بلاشبہ آج کی ترجیح اپنے "آقاؤں کی تابعداری" ہے جس کے نتیجے میں پڑھے لکھے افراد جس تیزی کے ساتھ ملک کو چھوڑ کر بے نشان، بے گھر اور تلاشِ معاش کیلئے دربدر ہو رہے ہیں اور اپنے بہتر مستقبل کیلئے ایجنٹوں کا شکار ہو کر آئے دن سمندروں میں مچھلیوں کی غذا بن رہے ہیں، زندگی کی ہر آسائش سے محروم سینوں میں اپنے باپوں، بھائیوں اور بیٹوں کی کربناک موت کے زخم چھپائے خوشحال زندگی کی تلاش پر مجبور کر دیئے گئے ہیں جبکہ خود صاحبِ اقتدار ملکی دولت لوٹ کر بیرون ملک میں اپنی آنے والی سات نسلوں کیلئے پر تعیش محلات اور کاروبار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، ان کے کڑے احتساب کا بھی تو کوئی علاج ہونا چاہئے۔ یہی تو وہ ناسور ہیں جو اپنے ان مفادات کے تحفظ کیلئے اغیار کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔

غیروں سے کیا گلہ ہو کہ اپنوں کے ہاتھ سے
ہے دوسروں کی آگ میرے گھر لگی ہوئی

بروز اتوار 18 ذوالقعد 1445ھ 26 مئی 2024ء

وسعت افلاک میں تکبیرِ مسلسل

جنوری 2018ء میں برسلز کا شاندار بوزار تھیٹر تاریخی لمحات سے متعلق عوامی جمہوریہ چین کی ویڈیو کا بیک ڈراپ تھا۔ یہ موقع تھا چینی نئے سال کے جشن کا۔ ایک گلوکار فن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کی پشت پر چلائی جانے والی ویڈیو میں چین کی کامیابیوں کو نمایاں طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ ویڈیو میں چین کے پہلے جوہری دھماکے، عالمی تجارتی تنظیم میں شمولیت، پہلے طیارہ بردار جہاز کی تیاری اور دیگر معاملات سے دنیا کو آگاہ کیا جا رہا تھا۔ حاضرین میں موجود سفارت کار، فوجی نمائندے اور دیگر حکام دم سادھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ سوال یہ نہیں تھا کہ وہ چین کی کامیابیوں کو دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ متاثر ہو بھی رہے ہوں مگر اِس سے کہیں بڑھ کر وہ حیرت زدہ بھی تھے اور تشویش میں بھی مبتلا تھے۔ چین کی بڑھتی ہوئی عسکری قوت، معیشت کے پنپتے ہوئے حجم اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت نے یورپ کے بہت سے پالیسی سازوں کو خوابِ غفلت سے جگا دیا ہے۔ یورپی یونین ایک زمانے سے غیر اعلانیہ طور پر، مشنری انداز سے چین کے بارے میں سوچتی آئی ہے۔ چین کے مستقبل کے حوالے سے مختلف اندازے لگائے جاتے رہے ہیں مگر اب اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر اندازے خام خیالی یا خوش فہمی پر مشتمل تھے۔

چین کی معاشی و عسکری قوت میں غیر معمولی اضافے کے ساتھ بیجنگ، واشنگٹن اور برسلز کی اسٹریٹجک تکون میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ٹرمپ کی صدارت کے دوران امریکا نے چین کو اسٹریٹجک مدمقابل کے روپ میں زیادہ دیکھا ہے۔ یورپ کے بیشتر قائدین کے مطابق ٹرمپ کسی بھی وقت کچھ بھی کہہ سکتے ہیں اور اُن پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا جس کے نتیجے میں بیشتر یورپی ممالک نے حکمت عملی کے حوالے سے زیادہ خود مختاری کا راستہ اختیار کیا۔ ٹرمپ نے افغانستان اور شام سے فوج نکالنے کا اچانک اعلان کر کے امریکا کی 17 سالہ ملٹری ڈاکٹرائن کے حوالے سے یوٹرن لیکر جیمز میٹس نے کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ کہ اب یورپ کی سلامتی کے حوالے سے معاملات پریشان کن ہو چلے ہیں۔

دسمبر 2018ء میں بیجنگ نے یورپی یونین سے تعلقات کے حوالے سے وائٹ پیپر شائع کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح چین نے یورپی طاقتوں کے ساتھ مختلف شعبوں میں مل کر کام کیا بالخصوص ہائی ٹیکنالوجی کے شعبے میں۔ اب بیجنگ تائیوان اور تبت کے مسئلے پر برسلز سے کیا امید رکھتا ہے اور کس طور چین نے اظہارِ رائے کی آزادی کیلئے خطرہ بننے والی جعلی اور من گھڑت خبروں کے سدباب کیلئے بھی یورپی یونین کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ وائٹ پیپر میں یہ بھی درج ہے کہ امریکا کے یکطرفہ اقدامات کے آگے بند باندھنے کیلئے یورپ کو چین کا ساتھ دینا چاہیے۔ چینی قیادت نے اس وائٹ پیپر میں یہ عندیہ بھی دیا کہ جہاں کہیں بھی امریکا کے انخلا سے خلا پیدا ہوگا، وہاں وہ اپنا کردار ادا کر کے خلا پُر کرنے کو تیار ہے۔ جرمی رفکن کے مطابق چین نے مابعدِ جدیدیت کے لمحاتِ سعید میں دو عشروں تک "یورپی خواب" کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یورپی یونین کے بعض حکام کہتے ہیں کہ یورپی یونین جیو پالیٹکس نہیں کرتی اور جو کچھ بھی یورپی یونین کرتی ہے، اُس کے سیاسی عواقب برآمد نہیں ہوتے۔ یوں یورپی یونین اپنے علاقے کو بڑی طاقتوں کیلئے پلے گراؤنڈ کے طور پر پیش کرتی ہے۔ یورپ نے خاصی مشقت سے جو خُوئے اطاعت پروان چڑھائی ہے، اُس نے چین کو بھی کھل کر کھیلنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے ہیں۔ روس نے یوکرین کے حوالے سے طاقت کا غیر معمولی مظاہرہ کیا اور یوکرین سے جُڑے ہوئے چند اور یورپی ممالک کو بھی کسی حد تک متاثر کیا مگر یورپی یونین کے مجموعی ماحول پر اس کا کچھ خاص منفی اثر مرتب نہیں ہوا۔

یورپی یونین کے حکام بھلے ہی کہتے رہیں کہ یورپی یونین کے اقدامات کے سیاسی نتائج برآمد نہیں ہوتے مگر حقیقت یہ ہے کہ اب بعض یورپی ممالک نے

انفرادی سطح پر اور یورپی یونین نے اجتماعی سطح پر چین کو ایک بڑے حریف کے روپ میں دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ چین کی "میڈ اِن 2025ء" حکمت عملی نے یورپ کی ہائی ٹیک انڈسٹری کیلئے بیداری کا کردار ادا کیا ہے۔ یورپ اور بھارت دونوں ہی چین کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں۔ دونوں کیلئے چین کی بڑھتی ہوئی سیاسی، عسکری اور معاشی قوت نے ویک اپ کال کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ایسے میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا بھارت کا "یواشکتی" آدرش اور یورپین ڈریم متصادم ہوں گے؟ دسمبر 2018ء میں یورپین کونسل نے "ای یو اسٹریٹجی آن انڈیا" کے حوالے سے اخذ کیے جانے والے خیالات کو قبول کیا۔ کیا اِس سے یورپی یونین اور بھارت کے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوا؟ اب تک عام خیال یہ تھا کہ یورپی یونین نے چین کو زیادہ اہمیت دی ہے اور بھارت کو مجموعی طور پر نظر انداز کیا ہے۔ بھارت کے حوالے سے نئی حکمت عملی اپنانے سے یہ تاثر ابھرے گا کہ یورپی یونین بھارت کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسے نئے عالمی نظام کو پروان چڑھانے کے حق میں ہے، جو اصولوں کی بنیاد پر کام کرتا ہو۔ علاوہ ازیں یورپی یونین سلامتی سے متعلق سیٹ اپ کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کر رہی ہے لیکن مودی سرکار کی طرف سے کینیڈا کے علاوہ دیگر ممالک میں خفیہ ایجنسی "را" کے دہشتگردی میں ملوث ہونے کے بعد یورپی یونین کی سلامتی کے اداروں نے انڈیا سے فی الحال اپنے کئی تحفظات کا اظہار کر دیا ہے۔ دوسری طرف ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس وائٹ پیپر کے مندرجات کی بنیاد پر چینی قیادت کس نوعیت کے اقدامات کی راہ ہموار کرتی ہے۔

فروری 2017ء میں فرانس، اٹلی اور جرمنی نے یورپی یونین سے کہا کہ وہ یورپ میں براہِ راست بیرونی سرمایہ کاری کی اسکریننگ سے متعلق سفارشات مرتب کرنے کیلئے کمیشن قائم کرے۔ تینوں یورپی طاقتوں نے اگرچہ کسی ملک کا نام نہیں لیا تاہم یہ بات طے ہے کہ وہ چینی باشندوں کی طرف سے کی جانے والی براہِ راست سرمایہ کاری کے حوالے سے غیر معمولی تشویش میں مبتلا تھے۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ یورپ کے بعض ممالک میں چینیوں کی سرمایہ کاری اِتنی زیادہ ہے کہ فرانس، اٹلی اور جرمنی کی تجویز پر کھل کر بحث نہیں کی جاسکی۔ یورپی کونسل، یورپی کمیشن اور یورپی پارلیمان... تینوں ادارے اس حوالے سے باضابطہ مذاکرات اور بحث کی منزل سے دور رہے۔ ناقدین کہتے ہیں کہ اس حوالے سے پائی جانے والی موجودہ دستاویز میں ذرا بھی دم نہیں کیونکہ اُس کی ساری طاقت ختم کر دی گئی ہے۔

یورپ میں براہِ راست بیرونی سرمایہ کاری کی اسکریننگ کے حوالے سے تجویز ایسے وقت سامنے آئی ہے، جب یورپی یونین کے بہت سے رکن ممالک کے لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ یورپی ممالک میں تو براہِ راست بیرونی سرمایہ کاری کی اجازت ہے تاہم اس کے مقابلے میں چین میں سرمایہ کاری کی گنجائش دی جاتی ہے نہ کھلی منڈی تک رسائی ہی دی جاتی ہے۔ چین کے بیشتر کاروباری ادارے دراصل ریاستی مفادات کے تابع ہوتے ہیں۔ یورپ میں چینیوں کی سرمایہ کاری 2008ء میں 70 کروڑ ڈالر تھی۔ 2017ء میں یہ 30/ارب ڈالر کی منزل تک پہنچ چکی تھی۔ یونان کی بندرگاہ پیرائس میں چینیوں کی سرمایہ کاری اصل بلغراد اور بڈاپیسٹ سے ہوتے ہوئے باقی یورپ تک راہداری کو معرضِ وجود میں لانے کیلئے تھی، مگر اب صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس سرمایہ کاری کے شدید اثرات یونان اور ہنگری محسوس کر رہے ہیں۔ ویسے چینیوں کی بیشتر سرمایہ کاری جرمنی، فرانس اور برطانیہ میں ہے اور زور اس بات پر ہے کہ جو ٹیکنالوجی امریکا سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو وہ یورپ سے حاصل کر لی جائے۔ دو طرفہ سرمایہ کاری کے حوالے سے معاملہ اُس وقت زیادہ اُجاگر ہوا جب جرمنی کے معروف روبوٹکس میکر "کوکا" کو چینی ملکیت کے ادارے "میڈیا" نے خریدا۔ تجزیہ کاروں کو معلوم ہوا کہ جرمن انجینئر اب پیپلز لبریشن آرمی کیلئے روبوٹکس تیار کرتے ہیں۔ یہ کوئی اچھا سودا نہیں تھا۔

اب جرمنی نے بھی براہِ راست بیرونی سرمایہ کاری پر گہری نظر رکھنا شروع کر دی ہے۔ اس بات کو سمجھنا اب کچھ دشوار نہیں کہ چینی قیادت اور پوری قوم

چینی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہ پر گامزن ہے۔ یورپ کے اپنے آنگن کے نزدیک بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم میں روس کے ساتھ جنگی مشقوں کا پروگرام ہے اور ساتھ ہی ساتھ بحیرۂ بالٹک میں بھی مشقوں کا پروگرام، جس کے نتیجے میں متعدد یورپی ریاستیں بھی لرزش محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں گی۔ یورپی یونین کے حکام بھی اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ چین اب روس کے ساتھ مل کر یورپ کو متاثر کرنے والے ماحول میں کام کر رہا ہے۔ فروری 2018ء میں جرمنی کے دو تھنک ٹینکس نے بھی اپنی رپورٹس میں بتایا کہ چین اب یورپ کے معاملات پر غیر معمولی حد تک اثر انداز ہونے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس قدر واضح ہے کہ یورپی یونین کے پالیسی سازاسے کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتے۔

جرمن چانسلر نے بلقان کے خطے میں چین کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کے حوالے سے تشویش کا اظہار کیا ہے۔ میونخ سیکورٹی کانفرنس 2018ء میں جرمن وزیر خارجہ سگمار گیبریل نے چینی صدر شی جن پنگ کے پیش کردہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ چین ایک ایسا نظام تیار کر رہا ہے جو ہمارے نظامِ جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی کے اصولوں کی بنیاد پر استوار نہیں۔ بہر کیف، چین نے اپنی بھرپور معاشی قوت کو بروئے کار لا کر یورپ میں اختلاف رائے پیدا کر دیا ہے۔ اب بہت سے معاملات پر تمام یورپی طاقتیں ہم آہنگ ہو کر بات نہیں کر رہی، مثلاً مارچ 2017ء میں ہنگری نے ایک ایسے مشترکہ خط پر دستخط سے انکار کیا جو زیر حراست وکلا پر تشدد کے حوالے سے تھا۔ جون 2017ء میں یونان نے اقوامِ متحدہ میں ایک ایسے بیان کی راہ مسدود کر دی، جس میں چین کے انسانی حقوق کے ریکارڈ کی مذمت کی گئی تھی۔ جولائی 2016ء میں یورپی یونین کے ایک ایسے بیان کو ہنگری، یونان اور کروشیا نے ویٹو کیا، جس میں بحیرۂ جنوبی چین میں چین کے ملکیتی دعوؤں پر تنقید کی گئی تھی۔ ان تمام مثالوں سے یورپی یونین کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے سے متعلق چین کی صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کئی شعبے ایسے ہیں جن میں یورپ اب بھی واضح طور پر برتری کا حامل ہے۔ نئی ہائی ٹیکنالوجی کے حوالے سے یورپ اپنی برتری برقرار رکھنے پر پوری تندہی سے کام کر رہا ہے اور یورپ سمجھتا ہے کہ ایسا کرنا ترقی اور سلامتی کے حوالے سے مستقبل کو محفوظ بنانے کی خاطر لازم ہے۔ ٹیکنالوجی کی منتقلی کے حوالے سے یورپ بہت زیادہ محتاط ہے۔ 5۔جی ٹیکنالوجی کے حوالے سے یورپ نے واضح حکمتِ عملی تیار کر رکھی ہے اور اس پر مکمل طور پر کنٹرول برقرار رکھے ہوئے ہے۔

یورپی یونین پر گہری نگاہ رکھنے والے سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق ہو سکتا ہے کہ یورپی یونین کے حکام کو اپنے آپشن بہت زیادہ پر کشش محسوس نہ ہوتے ہوں مگر وقت آ گیا ہے کہ وہ محض تماشائی بنے رہنے کی روش ترک کریں اور میدانِ عمل میں نکلیں۔ یورپ کو اب طے کرنا پڑے گا کہ مابعدِ جدیدیت کے دور میں سلامتی اور ترقی دونوں حوالوں سے مل جل کر کام کرنے کا طریقہ درست تھا یا یہ طریقہ ترک کرنا پڑے گا اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ یورپی طاقتوں کا مل جل کر چلنا نئے عالمی نظام کو کسی حد تک بہتر بنا سکے گا یا نہیں۔

تاہم چین نے یہ طے کر رکھا ہے کہ مستقبل میں دنیا میں سپر پاور کہلانے کیلئے جنگ اور جارحیت کی بجائے صلح جوئی سے تجارتی منڈیوں کو اپنے حق میں استعمال کرنا انتہائی ضروری ہے، اس کیلئے چینی صدر نے 2014ء میں یورپی یونین کے صدر دفتر کا دورہ کر کے چین اور یورپی یونین کے مابین چار اہم شراکت داریاں قائم کرنے کی ٹھوس تجاویز پیش کرتے ہوئے اپنے مستقبل وژن کا تعارف کروایا جس پر وہ آج بھی سختی سے قائم ہے۔ گزرتے وقت نے

چینی صدر کی پیش کردہ تجاویز کو درست ثابت کر دیا اور موجودہ حالات میں اس کی عملی اہمیت اور بھی اہم ہو گئی ہے۔

افغانستان سے انخلاء کے فوری بعد چین نے اپنی تجارتی دانشمندی سے اس خلاء کو بڑی تیزی کے ساتھ پُر کیا ہے اور اب اس خطے میں پاکستان، ایران، افغانستان کے ساتھ تمام ملحقہ ریاستوں میں اپنی تجارتی راہداری قائم کر کے ان ملکوں کی منڈیوں میں اپنا مضبوط مقام بنالیا ہے جبکہ امریکا نے ایک بار پھر یوکرین کے ذریعے روس کو نیچا دکھانے کیلئے اپنے کچھ یورپی اتحادیوں کی مدد سے ایک نئی جنگ کا آغاز کر دیا ہے لیکن جن مقاصد کے حصول کیلئے امریکا پر امید تھا، وہ فی الحال خاک میں ملتے دکھائی دے رہے ہیں اور خود بین الاقوامی مالیاتی ادارے روس کی معیشت کو پہلے سے بہتر قرار دیتے ہوئے زمینی حقائق سے متفکر نظر آرہے ہیں جبکہ یوکرین کی جنگ کے آغاز میں سارے یورپ کو روس کی طرف سے گیس کی بندش کی سپلائی کا خدشہ لاحق ہو گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ یورپ کھل کر امریکا کا ساتھ دینے سے گریزاں نظر آتا ہے۔

ادھر دوسری طرف آج دنیا میں غیر یقینی اور عدم استحکام بڑھتا جارہا ہے جس کی وجہ سے چین اور یورپی یونین کے درمیان قریبی رابطے اور اس کے نتیجے میں باہمی تجارتی فوائد اور مستقبل کے عالمی چیلنجوں سے نمٹنے کیلئے زیادہ توجہ دی جارہی ہے اور چینی صدر کی دس سال قبل دی گئی تجاویز اور چینی وژن نے ثابت کر دیا ہے کہ باہمی اتفاق اور تعاون اور ملکی ترقی کیلئے اپنے ممالک کے عوام کیلئے خوشحالی کے نئے باب کھولے جاسکتے ہیں جس کیلئے غیر ضروری خدشات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب چین یورپی یونین کے سب سے اہم تجارتی شراکت داروں میں سے ایک ہے، اور اس کے برعکس عالمی تجارتی مندی کے منفی اثرات کے باوجود چین اور یورپی یونین کے مابین مجموعی تجارتی حجم 2023 میں 783 بلین ڈالر تک جا پہنچا ہے جس میں دوطرفہ سرمایہ کاری کا اسٹاک 250 بلین ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے۔

چین نے ثابت کیا ہے کہ وہ کاروباری تعاون، سائنس اور ٹیکنالوجی میں تعاون اور سپلائی میں یورپ کا قابل اعتماد، کلیدی، ترجیحی اور صنعتی شراکت دار بننے کیلئے تیار ہے کیونکہ دونوں فریقین باہمی کامیابی اور مشترکہ خوشحالی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور دونوں کے مابین تعاون ڈیجیٹل معیشت، سبز ترقی اور ماحولیاتی تحفظ، نئی توانائی اور مصنوعی ذہانت جیسے ابھرتے ہوئے شعبوں میں تیزی سے آگے بڑھنے کی مکمل صلاحیت ہے۔ یورپی یونین چیمبرز آف کامرس ان چائنا (ای یو سی سی) کی جانب سے جاری کردہ بزنس کانفیڈنس سروے 2023 کے مطابق سروے میں شامل 90 فیصد سے زائد یورپی کمپنیاں چین کو اپنی سرمایہ کاری کی منزل بنانے اور سروے میں شامل 80 فیصد سے زیادہ چینی کمپنیاں یورپ میں اپنے کاروبار کو بڑھانے کا ہوم ورک مکمل کر چکی ہیں۔

چین دنیا کا سب سے بڑا ترقی پذیر ملک ہے اور یورپ کسی بھی دوسرے براعظم کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ممالک کا خطہ ہے۔ چین اور یورپی یونین دونوں بکھری ہوئی عالمی معیشت اور تحفظ پسندی کی بڑھتی ہوئی لہر کے سامنے محتاط رہ کر کھلے پن کے ساتھ منصفانہ مسابقت اور آزاد تجارت کو برقرار رکھنے کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ سلامتی کے تصور کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے گریز کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے گلوبلائزیشن کے خلاف مشترکہ مزاحمت کیلئے تیاری کے مراحل میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چین بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو اور گلوبل ڈیولپمنٹ انیشی ایٹو کے حصول کیلئے مشترکہ ہدف کے تعاقب میں یورپی یونین اور دیگر یورپی ممالک کی فعال شرکت کا بھی خیر مقدم کر رہا ہے اور یورپی یونین کی گلوبل گیٹ وے حکمت عملی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کیلئے بھی تیار نظر آتا ہے تاکہ ترقی پذیر ممالک ترقی کے اپنے سفر کو تیز کرنے میں مدد کیلئے متعلقہ طاقتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بدلتی ہوئی اور غیر مستحکم بین الاقوامی صورتحال کے پیش نظر چین اور یورپ کو مزید تعاون کی ضرورت ہے۔ دونوں فریقوں کو کثیر الجہتی پر عمل

کرنے، کھلے پن اور ترقی کی وکالت کرنے اور تہذیبوں کے درمیان مکالمے کو آسان بنانے کیلئے مل کر کام کرنا ہو گا۔ انہیں مشترکہ طور پر ایک مساوی اور منظم کثیر قطبی دنیا کی تعمیر کرنا ہو گی اور عالمی سطح پر فائدہ مند اور جامع اقتصادی عالمگیریت کو فروغ دینا ہو گا۔

قدرت نے پاکستان کو ایک بار پھر ایک سنہری موقع دیا ہے کہ وہ اپنے جغرافیائی وجود کی وجہ سے ان فوائد کو سمیٹ سکے اور اب تک سی پیک پراجیکٹ کی تکمیل میں مجرمانہ تاخیر کا فوری ازالہ کرتے ہوئے ایسے ہنگامی اور انقلابی اقدامات اٹھائے تاکہ برادر عرب ممالک کی طرف سے آنے والی سرمایہ کاری کو بھی ایک ایسا رخ میسر آجائے جس کے بعد یورپی ممالک کی سرمایہ کاری بھی پاکستان کا رخ کرے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ ملک میں سیاسی افراتفری اور بدامنی کو ختم کرنے کا سازگار ماحول پیدا کیا جائے اور تمام سیاسی جماعتیں کم از کم ملکی معیشت پر اتفاق کرتے ہوئے ایک ایسا باہمی لائحہ عمل تیار کریں کہ ملک میں جو بھی حکومت آئے لیکن ان معاشی اہداف کو کبھی بھی سیاست کی بھینٹ نہیں چڑھایا جائے گا۔

بابا اقبال یاد آ گئے:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

بروز سوموار 19 ذوالقعدہ 1445ھ 27 مئی 2024ء

واحد سپر پاور کا گھمنڈ

میں اس خوفناک لمحات سے بھی واقف ہوں جب ایٹمی بریف کیس کا بٹن دبانے کی مکمل طاقت رکھنے والے امریکی صدر ٹرمپ کے بارے میں ایک مشہور زمانہ امریکی ماہر نفسیات بھرپور دلائل کے ساتھ عالمی میڈیا پر ببانگ دہل ٹرمپ کی دماغی صحت پر اپنے شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کر رہی تھی جس سے تمام دفاعی اور سیاسی تجزیہ نگاروں میں ایک خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ماہر نفسیات ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ٹرمپ نے جب سے امریکی صدر کا منصب سنبھالا ہے تب سے وہ ایسا بہت کچھ کر رہے ہیں جو امریکا کو ایک عظیم طاقت بنانے والے عوامل کے خلاف اور دنیا کو مکمل تباہی ۔ان کی طرف دھکیل سکتا ہے۔انہوں نے قدم قدم پر ایسی باتیں اور حرکتیں کی ہیں جو ان کے منصب کے تقاضوں سے کسی بھی طور میل نہیں کھاتیں کی یہ کوشش رہی ہے کہ جو کھلنڈراپن ان کے مزاج میں پایا جاتا ہے وہ امریکی صدر کے منصب میں بھی دکھائی دے۔امریکا کو ایک عظیم طاقت میں کوشش کی ہے اور یہ بات اب بیشتر امریکی زیادہ شدت سے محسوس تبدیل کرنے والے اصولوں، طریقوں اور خواص کو انہوں نے نشانے پر لینے کی بارہا کرتے ہیں۔

ٹرمپ عالمی سیاست کے حوالے سے کوئی بھی پیش گوئی انتہائی دشوار کام ہے۔حالات اتنی تیزی سے بدلتے ہیں کہ ہر پیش گوئی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ کا معاملہ تو اب اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔اس نے اپنے دورِ صدارت کے پہلے ایک سال کے دوران ایسا بہت کچھ کیا جس کی بنیاد پر ان کے بارے میں پورے یقین سے کچھ کہنا انتہائی دشوار تھا۔پیش گوئی کرنے والوں کو بھی اندازہ تھا کہ وہ اگر کچھ کہیں گے تو ٹرمپ اس کے خلاف کچھ نہ کچھ کر کے انہیں ناکامی وذلت سے دوچار کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کرے گا۔تاہم یہ بات البتہ پورے یقین سے کہتے رہے کہ مورخین جب ٹرمپ کے ادوار کے بارے میں لکھیں گے تو اس نکتے پر ضرور زور دیں گے کہ اس نے اپنے کھلنڈرے مزاج سے وہ نظم وضبط تباہ کر دیا جو امریکی صدر کیلئے لازم قرار دیا جاتا تھا۔یقیناً اپنے دورِ صدارت میں اس نے بہت کچھ اپنی خواہش کے اصول کی بنیاد پر کیا، افغانستان میں روائتی بموں کی "ماں" جیسا خطرناک بم گرانے میں شرم محسوس نہ کی اور پھر برملا عالمی میڈیا کے سامنے افغانستان پر ایٹم بم گرنے کی دھمکیاں بھی دیں، کبھی نئے سال کی آمد پر خطے میں اپنے سب سے اہم اتحادی پاکستان کے خلاف ٹوئیٹر میں نازیبا الفاظ پر مشتمل ہرزہ سرائی سے بھی باز نہ آیا جس کے نتیجے میں امریکا کو کئی معاملات میں بہت سبکی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔تاہم دنیا بھر کے سنجیدہ افراد کو یہ تشویش ضرور لاحق ہو گئی ہے کہ ٹرمپ امریکا کا پہلا صدر ہے جس کے پاس اپنا کوئی وژن نہیں۔اسی لئے وہ اپنے پورے دورِ اقتدار میں کوئی ایسی "گرینڈ اسٹریٹجی" تیار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ وہ امریکی معاشرے اور قیادت کے ڈھانچے کو کوئی باضابطہ نئی شکل دیکر اسے عالمی بحرانوں سے نکالنا چاہتا تھا۔اس حوالے سے ٹرمپ کی سنجیدگی کا گراف خاصا نیچا رہا۔

کسی بھی ملک کیلئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کی کوئی واضح اور بڑی حکمت عملی نہ ہو۔اس مرحلے سے گزرے بغیر کوئی بھی ریاست ترقی تو کیا کرے گی، اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ پائے گی۔امریکا کوئی عام ملک نہیں، اسے واحد عالمی طاقت ہونے کا گھمنڈ ہے۔اس کیلئے تو قیادت کے ڈھانچے کا مضبوط ہونا اور بیشتر بین الاقوامی معاملات میں واضح حکمت عملی کا ہونا لازم ہے۔امریکا میں ایک زمانے سے عظیم، ہمہ گیر حکمت عملی اپنانے کا رجحان رہا ہے اور یہ رجحان محض اپنی پسند کا نہیں بلکہ مجبوری اور لازم ہے۔امریکا سپر پاور ہے۔اسے کئی ممالک سے خصوصی تعلقات استوار رکھنا پڑتے ہیں۔ہر خطے پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔کسی بھی صدر کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ملک کی "گرینڈ اسٹریٹجی" سے ہٹ کر کچھ کرے۔وہ اگر نمایاں حد تک بصیرت سے محروم ہو اور مستقبلِ

بعید کے بارے میں سوچنے اور اس حوالے سے کوئی واضح منصوبہ تیار کرنے کا اہل نہ ہو تب بھی اسے حکمت عملی کے حوالے سے بہت سے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لینا ہی پڑتی ہے۔ ٹرمپ بظاہر بصیرت کا حامل نہیں تھا مگر اس کیلئے بھی گرینڈ اسٹریٹیجی کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا یا اس سے مطابقت رکھنے والے اقدامات سے گریز کرتا۔ لیون ٹراٹسکی نے خوب کہا ہے کہ اگر کوئی صدر گرینڈ اسٹریٹیجی میں زیادہ دلچسپی نہ بھی لے، تب بھی گرینڈ اسٹریٹیجی تو اس میں دلچسپی لیتی ہی ہے یعنی پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں، صرف بڑھنے کا آپشن ہے۔

اگر امریکی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ نکتہ کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ٹرمپ نے ایک ایسے اہم موقع پر امریکا کی صدارت سنبھالی جب اس کے انتخاب سے پہلے کے 70 برسوں میں امریکا نے دوسری عالمی جنگ عظیم کے بعد سے ایک ایسی طاقت کا کردار ادا کیا تھا جو پوری دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا بھرپور عزم اور توانائی رکھتی تھی۔ امریکی جبر نے کئی خطوں کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کیا۔ متعدد ممالک کو تعمیر و ترقی کی نئی جہتوں سے آشنا کیا اور دوسری طرف کئی ممالک امریکا کے ہاتھوں بربادی کا شکار ہوئے۔ 1990ء میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا چونکہ واحد سپر پاور تھا، اس لیے اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔ تقریباً تین عشروں پر محیط اس مدت کے دوران امریکا نے اچھا کم اور بُرا بہت زیادہ کیا ہے۔ بعض مواقع پر صاف محسوس کیا گیا کہ امریکا کیلئے معاملات الجھے ہوئے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، اس کی پشت پر یا تو بدحواسی ہے یا پھر کچھ اداروں کا دباؤ اور خوف۔

امریکی دفاعی تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ٹرمپ ایک ایسے وقت امریکا کا صدر منتخب ہوا جب چین اپنی پوری قوت کے ساتھ ابھر کر سامنے آچکا تھا۔ چین ایک ایسا بڑا چیلنج بن گیا جس سے نمٹنے کیلئے امریکا کو اپنی ''گرینڈ اسٹریٹیجی'' تبدیل کرنا پڑ گئی۔ ایک طرف جہاں چین نے امریکا کی عسکری و معاشی بالادستی کیلئے بہت بڑے چیلنج کی حیثیت اختیار کرلی وہاں خطے میں پاکستان جیسا اہم اتحادی جس نے امریکا کو دنیا کی واحد سپر پاور بننے میں اہم کردار ادا کیا تھا، اب چین کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا نظر آیا جس کے جواب میں امریکی آشیر باد پر آئے دن پاکستانی سرحدوں پر بھارتی جارحیت جیسا ماحول، سرحد پار سے پاکستان میں دہشتگردی جیسے واقعات، کشمیر میں جاری ظلم و ستم کی بناء پر بھارت کے ساتھ انتہائی کشیدہ تعلقات اس پر مستزاد ٹرائیکا کا مختلف انداز میں بلاوجہ دباؤ ڈالنے کی غلط پالیسی اختیار کرنے کی بناء پر امریکا کو اس خطے میں سخت دھچکا لگا ہے اور ردِّ عمل میں خطے میں چین، پاکستان، روس اور ایران کا ایک مضبوط بلاک بھی تشکیل پا رہا ہے۔

ایک طرف چین نے امریکا کی عسکری و معاشی بالادستی کیلئے بہت بڑے چیلنج کی حیثیت اختیار کی ہے اور دوسری طرف مشرق وسطیٰ میں بھی صورتِ حال بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے جو امریکا کیلئے مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت کو بہتر طرزِ حکمرانی کی حیثیت سے قبول نہ کرنے کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔ عام آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اگر آمریت اس کے مسائل حل کردے تو جمہوریت کی کیا ضرورت ہے؟

کئی عشروں سے امریکا عالمی سیاست و معیشت پر بلاشرکتِ غیرے متصرّف رہا ہے۔ اس نے یورپ کو ساتھ ملا کر اپنی مرضی کے فیصلے کیے ہیں اور ان فیصلوں کا پھل بھی کھایا ہے مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ کئی ممالک تیزی سے مضبوط ہو کر ابھرے ہیں۔ یورپ نے اپنی راہ بہت حد تک الگ کرلی ہے۔ چین، روس، برازیل، جنوبی افریقا اور دوسرے بہت سے ممالک تیزی سے مستحکم ہوئے ہیں۔ ان کا استحکام امریکی بالادستی کیلئے واضح خطرے کی شکل میں ابھرا ہے۔ یہ سوال امریکا میں بھی جڑ پکڑ چکا ہے کہ عالمی سیاست و معیشت میں اب امریکا کیلئے کیا رہ گیا ہے۔ گزشتہ صدارتی انتخاب میں جہاں دیدہ سیاست دان جو بائیڈن منتخب ہو کر جب وائٹ ہاؤس میں براجمان ہوئے تو ان کیلئے بھی سب سے اہم سوال یہی تھا کہ کہ عالمی سطح پر امریکا کو برتر حیثیت

بر قرار رکھنے کے قابل کس طور بنایا جائے۔ وہ ان چیلنجز کا مقابلہ کرتے ہوئے اب اگلی انتخابی مہم میں داخل ہو چکے ہیں جہاں انہیں یقیناً اپنے سیاسی فیصلوں کے نتائج کا سامنا کرنا ہے۔ حقیقتاً ان کیلئے چیلنجز بڑھ چکے ہیں۔ حکمت عملی میں غیر معمولی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

جو بائیڈن نے اب تک ایسا کچھ نہیں کیا جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ امریکا کو نئی بلندیوں پر لے جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ بھی ٹرمپ کی طرح بظاہر اس سیاسی بصیرت سے محروم دکھائی دیئے جو کسی امریکی صدر کیلئے لازم سمجھی جاتی تھی مگر اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ وہ اپنی شخصیت کا کوئی تاثر چھوڑنے میں مکمل ناکام رہے ہیں۔ چند ایک معاملات میں انہوں نے "ٹرمپ بڑھک" سے ہٹ کر عمل کے میدان میں اعتدال پسندی کا ثبوت دیا ہے مگر مجموعی طور پر وہ اپنے اقوال و اعمال سے امریکی فکر کو متاثر کرنے میں تھوڑے بہت کامیاب ضرور ہوئے ہیں۔ یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ امریکا نے جن اصولوں اور طریق کار کو اپنا کر اب تک عالمی سیاست و معیشت میں اپنی بالادستی کسی نہ کسی طور برقرار رکھی ہے اُنہیں جو بائیڈن نے متاثر کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی حد تک کامیاب رہے ہیں جبکہ ٹرمپ کا دعوٰی تھا کہ جو کچھ وہ سوچتا اور کرتا تھا، اس سے امریکا کی طاقت اور دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور عالمی سیاست و معیشت میں امریکی بالادستی برقرار رہی مگر درحقیقت ٹرمپ کی پالیسیوں سے امریکا کو مجموعی طور پر خاصا نقصان پہنچا۔ پالیسی ساز اب یہ بات شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ دراصل ٹرمپ کے آنے کے بعد سے امریکا کی سب سے بڑی طاقت والی حیثیت متاثر ہوئی ہے اور جو کچھ وہ کہتا رہا، اُس کے وہ اثرات رونما نہیں ہوئے جو ہونے چاہیے تھے۔ امریکیوں کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ٹرمپ کی پالیسیوں سے عالمی سطح پر امریکا کی پوزیشن قابل ذکر حد تک متاثر ہوئی اور اب ایسے شخص کو دوبارہ ایسی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

امریکی پالیسی ساز یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں جس سے بڑی حد تک واضح اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ امریکا نے چار نسلوں تک دنیا کو ایک ایسا نظام دیا ہے جس نے امن، خوش حالی، استحکام اور جمہوریت کی راہ ہموار کی ہے۔ یہ بات دیگر نظام ہائے سیاست سے موازنے کی صورت میں کہی جارہی ہے۔ امریکا نے عالمی سیاست و معیشت پر جو بالادستی پائی وہ اس کی ''سخت قوت'' کا نتیجہ تھی۔ امریکا کے پاس بے مثال قوت تھی اور اس قوت کو بھرپور انداز سے بروئے لانے پر بھی خاطر خواہ توجہ تو دی گئی لیکن اپنی ظالمانہ پالیسیوں کے سبب اپنے اردگرد نفرتوں کے پہاڑ بھی کھڑے کر لئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا نے باضابطہ عالمی طاقت کی حیثیت اختیار کی۔ ایسا نہیں کہ سرد جنگ کے زمانے میں سابق سوویت یونین کے ہوتے ہوئے امریکا کی عالمی حیثیت اتنی مضبوط تھی جسے چیلنج نہ کیا جاسکتا تھا تاہم دنیا دو واضح عالمی قوتوں کے درمیان تقسیم تھی۔ بظاہر امریکا نے غیر معمولی عسکری قوت کے ذریعے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا کی عسکری قوت مزید بڑھ گئی۔ عالمی معیشت میں بھی اس کا حصہ اس قدر بڑھ گیا کہ ایک مرحلے پر امریکی خام قومی پیداوار عالمی خام قومی پیداوار کا پچیس فیصد تھی۔ دنیا نے کسی ایک ملک کو باقی دنیا کے مقابلے میں اس قدر طاقتور کبھی نہیں دیکھا لیکن امریکا کو یہ مقام کبھی نہ ملتا اگر سوویت یونین افغانستان میں جارحیت کی غلطی نہ کرتا اور پاکستان جیسا اتحادی امریکا کی بھرپور مدد نہ کرتا لیکن امریکا نے اپنی سابقہ تاریخ دہراتے ہوئے پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کیا کہ جونہی سابقہ روس شکست و ریخت سے دوچار ہوا، امریکا وعدہ خلافی کرتے ہوئے پاکستان اور افغانستان کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر فوری طور پر پاکستان کے مخالف کیمپ کو گلے لگالیا کیونکہ بھارت نے بھی پانچ دہائیوں سے ایک وفادار ساتھی روس سے آنکھیں پھیر کر امریکا کے قدموں میں پناہ لیکر اپنی برہمنی روایت کو قائم رکھا جس کا حال روسی وزارتِ خارجہ نے بھرپور گلہ کا اظہار بھی کیا ہے۔

لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مکافاتِ عمل نے چند برسوں کے دوران امریکی بالادستی کیلئے بہت سے خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔ اب چین، روس

اور دیگر ممالک ابھر کر سامنے آئے ہیں مگر اس کے باوجود امریکا سمجھتا ہے کہ اس کی عسکری اور معاشی قوت اب بھی اس قدر ہے کہ وہ عالمی سیاست و معیشت پر نمایاں حد تک متصرف ہے اور امریکی قیادت اب بھی دنیا بھر میں معاملات کو الٹنے اور پلٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر امریکا چاہتا تو ایسی حکمت عملی ترتیب دے سکتا تھا جو صرف اس کیلئے کارگر ہوتی اور اسے زیادہ سے زیادہ عسکری و معاشی قوت سے ہمکنار کرتی مگر پالیسی سازوں نے ایک ایسا بین الاقوامی نظام ترتیب دینے پر توجہ دی جس کے ذریعے صرف امریکا بھرپور استحکام سے ہمکنار نہ ہو بلکہ مجموعی طور پر تمام خطے ترقی کریں، خوشحالی پائیں اور خاص طور پر ہم خیال ممالک زیادہ مستفید ہوں۔ اس بین الاقوامی نظام کو چلانے کیلئے ادارے معرض وجود میں لائے گئے، پروگرامز ترتیب دیے گئے۔ یوں اب تک بین الاقوامی نظام کے معاملے میں امریکا عالمی راہنما کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ امریکا نے عسکری اتحاد تشکیل دیے۔ کوشش کی گئی کہ بین الاقوامی تجارتی راستوں کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنایا جائے۔ یہ سب کچھ عالمی سطح پر امن برقرار رکھنے کی خاطر کیا گیا، مگر درحقیقت امریکا یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسی دنیا تشکیل دی جائے جس میں وہ خود زیادہ آسانی سے ترقی و استحکام سے ہمکنار رہ سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر امریکا چاہتا تو ایسی حکمت عملی ترتیب دے سکتا تھا جو صرف اس کیلئے نہیں بلکہ اس کے قریبی اتحادیوں کیلئے بھی کارگر ہوتی اور امریکا زیادہ سے زیادہ عسکری و معاشی قوت سے ہمکنار ہوتا مگر پالیسی سازوں نے ایک ایسا بین الاقوامی نظام ترتیب دینے پر توجہ دی جس کے ذریعے صرف امریکانہ صرف بھرپور استحکام سے ہمکنار ہو اور اس کے اتحادی مجموعی طور پر خطے میں ترقی اور خوشحالی کیلئے اس کی بالادستی قبول کریں اور پر ہم خیال ممالک اس کی ہر پالیسی میں اس کے ہمنوا ہوں جس طرح مشرقِ وسطیٰ میں مسلم ممالک اور افغانستان کی تباہی میں اس کے تمام خاص طور اتحادیوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس بین الاقوامی نظام "ورلڈ آرڈر" کو چلانے کیلئے ادارے معرض وجود میں لائے گئے، پروگرامز ترتیب دیے گئے، یوں اب تک بین الاقوامی نظام کے معاملے میں امریکا عالمی رہنما کی حیثیت اختیار کرنے کے راستے پر گامزن ہے۔ امریکا نے عسکری اتحاد تشکیل دیے اور کوشش کی گئی کہ بین الاقوامی تجارتی راستوں کو اپنے مفادات کیلئے زیادہ سے زیادہ محفوظ بنایا جائے۔ یہ سب کچھ عالمی سطح پر امن برقرار رکھنے کے نام تشکیل دی جائے جس میں وہ خود زیادہ آسانی سے ترقی و استحکام پر کیا گیا لیکن اب اقوام عالم یہ سمجھ چکے ہیں کہ درحقیقت امریکا یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسی دنیا سے ہمکنار رہ سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی امریکی مساعی درحقیقت صرف اس مقصد کے تحت تھیں کہ عالمی سیاست و معیشت میں اس کی بالادستی قائم ہو اور مستقل بغیر کسی چیلنج کے برقرار رہے۔ اسی لئے کویت عراق جنگ کے بعد جارج بش اوّل نے یہودی نژاد ہنری کسینجر کے تشکیل کردہ "نیو ورلڈ آرڈر" پروگرام کو متعارف کرانے کے بعد امریکا نے جو عالمی نظام پر اس قدر زور دیا تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ معیشت، عسکری قوت اور سفارت کاری کے میدان میں اپنی پوزیشن زیادہ سے زیادہ مستحکم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے وہ جو دنیا تشکیل دینے میں مصروف ہے، اس کا واحد مقصد اکیلے ہی اس سے بھرپور استفادہ مقصود ہے تاکہ عالمی معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق چلا کر امریکا اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر کے عالمی بالادستی کو یقینی بنائے۔

یہ نکتہ نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ امریکا نے عالمی سیاست و معیشت میں اب تک جو بھی مرضی کے فیصلے کیے ہیں ان کے حوالے سے اپنے اتحادیوں کیلئے زیادہ طاقت استعمال نہیں کی۔ وہ اگر چاہتا تو اپنی طاقت کے ذریعے غیر معمولی حد تک اپنی مرضی کے فیصلے کر سکتا تھا مگر اس کے بجائے کم استحصالی انداز اختیار کر کے امریکا نے ان تمام ممالک کو مجوزہ مفادات میں کچھ حصہ ضرور دیا جو عالمی نظام کے حوالے سے اس کے تصورات کو قبول کرنے کیلئے تیار تھے۔ دیگر سپر پاورز کے مقابلے میں امریکا نے طاقت کے ذریعے بات منوانے پر کم توجہ دی۔ امریکا کے بہت سے شراکت دار اس امر کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی معاملے میں امریکا کی بالادستی سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں امریکا معاملات سے الگ تھلگ نہ ہو جائے اور پھر ان ممالک کو دیگر قوتوں کے ساتھ بھی سرد جنگ کا سامنا کرنا پڑے!

ہر حال میں سب سے پہلے امریکا کا نعرہ امریکی سیاست و معیشت کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکا نے کبھی اپنے مفادات کو کسی بھی صورتِ حال کے تابع نہیں کیا۔ وہ صورتِ حال کو اپنے مفادات کے تابع کرنے پر یقین رکھتا آیا ہے۔ ایک یورپی سفارت کار کا کہنا ہے کہ یورپ نے ستر سال تک امریکا کی ڈفلی پر رقص کیا ہے۔ ویتنام سے نکارا گوا تک لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ اپنے ملک کے مفادات کو ہر حال میں تقویت بہم پہنچانے کیلئے امریکی حکام نے غیر معمولی تشدد اور ظلم و جبر کی راہ پر چلنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ معیشت اور سیاست سے ہٹ کر بھی کئی معاملات میں امریکی اندازِ قیادت بہت اہم رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکا نے عالمی سطح پر امن اور استحکام کے حوالے سے غیر معمولی کردار ادا کرنے کی یہ وجہ بھی تھی کہ اس وقت دنیا سرمایہ داری اور کیمونزم نظام میں واضح طور پر تقسیم تھی اور امریکا کے اتحادی یہ سمجھتے تھے کہ امریکا عسکری امور میں کمٹ منٹ کے مطابق کام کرنے اور ڈلیور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور یہ کہ ایک انتہائی خطرناک دنیا میں حقیقی استحکام پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کی صلاحیت اگر کسی میں پائی جاتی ہے تو وہ امریکا ہے۔

امریکی صدور اس امر کیلئے کوشاں رہے ہیں کہ دنیا بھر میں ایسی جمہوریت اور بنیادی حقوق کی پاسداری کو یقینی بنایا جائے جو امریکی قیادت کے تابع رہے اور اس کی واضح مثال ہمیں پہلے الجزائر اور بعد ازاں مصر کی مرسی حکومت کا تختہ الٹنے سے ملتی ہے۔ امریکی قیادت یہ سمجھتی ہے کہ عالمی سطح پر بالادستی برقرار رکھنے میں یہ بات بھی کلیدی حیثیت رکھتی ہے کہ اخلاقی سطح پر امریکا کیسی دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ امریکا نے اپنی اخلاقی بالادستی بھی یقینی بنانے کیلئے دنیا بھر میں کھلے معاشرے معرضِ وجود میں لانے اور لبرل ازم کو بھرپور تقویت بہم پہنچانے کی کوششیں جاری رکھی ہیں۔

سابق امریکی وزیر خارجہ جارج شلز نے ایک بار کہا تھا کہ امریکا نے زیادہ مستحکم تعلقات ان ممالک سے استوار رکھے ہیں جہاں ایسی جمہوریت کی جڑیں گہری اور مضبوط ہیں جو امریکی اور اس کے اتحادیوں کی پالیسیوں سے مکمل آہنگی اور یکجہتی کا اظہار کریں۔ یہ محض اتفاق نہیں۔ امریکا جن ممالک میں حقیقی جمہوریت اور سیکولر لبرل روایات دیکھنا چاہتا ہے ان کی طرف زیادہ جھکتا ہے۔ امریکی قیادت انہی ممالک سے بہتر سیاسی اور معاشی روابط کو فروغ دینے پر آمادگی ظاہر کرتی ہے جہاں کی سیاسی روایات امریکی اور اس کے اتحادیوں کی سیاسی روایات سے ہم آہنگ ہوں۔ معاملات محض لین دین کی سطح سے کہیں بلند ہو کر ورلڈ آرڈر کے حقیقی نظریہ اور ثقافتی ہم آہنگی مفادات تک تابع ہوں۔

ایسا نہیں ہے کہ امریکا نے صرف ''سخت قوت'' (معاشی و عسکری) پر مدار رکھا ہے۔ وہ اپنی بات منوانے کیلئے اور اپنی نمبر ون پوزیشن برقرار رکھنے کیلئے دنیا بھر میں سوفٹ امیج بھی پھیلاتا ہے۔ امریکیوں نے ہر دور میں چاہا ہے کہ دنیا ان کے ملک کو دیکھ کر صرف خوفزدہ نہ ہو بلکہ متاثر ہو کر متوجہ بھی ہو۔

آج دنیا بھر میں امریکا کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے مگر اس کے باوجود دنیا کے ہر ملک کے باشندے چاہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طور امریکا میں داخل ہونے کا موقع مل جائے۔ جن ممالک سے امریکا کے تعلقات اچھے نہیں اور جہاں کے لوگ امریکا سے شدید نفرت کرتے ہیں وہاں بھی لوگ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ امریکی ویزا لگ جائے یعنی مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ امریکا کی ''سخت قوت'' کو تقویت بہم پہنچانے میں ''نرم قوت'' نے بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ناپسندیدہ ہوتے ہوئے بھی امریکا میں دنیا بھر کے لوگوں کیلئے غیر معمولی کشش پائی جاتی ہے لیکن صد افسوس کہ پہلی مرتبہ ٹرمپ کی نئی امیگریشن پالیسی نے امریکا کے برسوں سے قائم اس تاثر کو بری طرح نہ صرف مجروح کیا بلکہ خود امریکی اعلیٰ عدالت نے مداخلت کرکے ٹرمپ کی اس پالیسی کو مسترد کردیا تھا۔

ٹرمپ نے اپنے دورِ اقتدار میں جو کچھ کہا وہ اس امر کا غماز تھا کہ وہ بنانے پر کم اور بگاڑنے پر زیادہ توجہ دیتا رہا۔ (ڈین ایچیسن کیلئے یہ بات بہت اہم تھی کہ وہ امریکا کی تخلیق کے وقت تھے)۔ خود امریکی اور مغربی سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق ٹرمپ کی بڑھکیں دیکھتے ہوئے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکے گی کہ انہیں شاید کل کو یہ بات قابل فخر محسوس ہو کہ وہ امریکا کی تباہی کے وقت موجود تھے۔ ٹرمپ نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ایسا بہت کچھ کہا جس سے پتہ چلا کہ اسے بنیادی امریکی اقدار کی پاسداری کا ذرا بھی خیال نہیں تھا۔ اس نے آزاد تجارت کے بجائے اپنے مفادات کو ہر حال میں مقدم رکھنے کی تجارت پر زور دیا۔ ٹرمپ نے جمہوریت کیلئے اب تک ویسی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا جیسی ان کے پیش رَو بیان کرتے آئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے جمہوریت کے مقابل پیوٹن کیلئے پسندیدگی کا اظہار کیا جو مطلق العنانیت کو بنیادی سیاسی قدر قرار دے کر تمام اختیارات اپنی ذات میں سمیٹنا چاہتا ہے۔ امریکا نے پانچ چھ عشروں میں جو کچھ بھی پایا، اُسے ٹرمپ نے ٹھکانے لگانے میں تاخیر نہیں کی۔ اس کا خیال تھا کہ امریکا نے جنگ کے بعد کے زمانے میں جو خارجہ پالیسی اپنائی وہ بہت سے معاملات میں مخالفین کو اس قدر رعایتیں دیتی رہی ہیں کہ اب وہ منہ دینے کا سوچ رہے ہیں۔ امریکا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا میں عالمی معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش ضرور کی ہے مگر اس کوشش میں اس نے اپنی مصنوعات ٹرمپ جیسے لوگ پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ امریکا کو اپنی ٹیکنالوجیز اور جدید ترین مصنوعات اور ٹیکنالوجی دنیا بھر کو دی ہے۔ اس بات کو ساری دنیا میں پھیلانے سے گریز کرنا چاہیے۔

ٹرمپ نے امریکی فوج کو قیدیوں پر تشدد بڑھانے کی اجازت دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ دہشتگردی ختم کرنے کی خاطر اگر جنگی جرائم کا ارتکاب بھی کرنا پڑے تو ایسا کرنے میں کچھ ہرج نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا نے کسی نہ کسی طور اپنی بالادستی کو برقرار رکھا ہے مگر ٹرمپ اسے ٹھکانے لگانے کے لئے بے تاب رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ ٹرمپ نے صدر کی حیثیت سے کہا تھا وہ جذباتیت کی طرح پر ہے۔ وہ ایک زمانے سے کئی امریکی شراکت داروں پر شدید نکتہ چینی کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے 1980ء کے عشرے میں جاپان اور کویت کو شدید نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں ممالک سے امریکا کو ملا کم ہے اور امریکا نے دیا زیادہ ہے۔ اسی طور انہوں نے 2015ء اور 2016ء میں جرمنی اور میکسیکو پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں ممالک نے امریکا کیلئے طفیلی کا کردار ادا کیا ہے۔ اپنی انتخابی مہم کے دوران انہوں نے امریکا کے بعض شراکت داروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ ان کے دو ڈھائی عشروں کے خیالات ہی کا عکاس تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹرمپ نے صدر کی حیثیت سے امریکا کے بعض اتحادیوں اور اتحادیوں کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ محض بڑھک نہیں، جذباتیت کی سطح پر نہیں بلکہ وہ واقعی کچھ کرنا چاہتا تھا یعنی وہ امریکا کے بعض اتحادیوں کو ایک طرف ہٹانے اور نئے تعلقات استوار کرنے کی راہ پر گامزن

ہونے کیلئے بے تاب رہتا تھا چاہے اس کیلئے امریکا کو کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔ لیکن خود امریکا کے خیر خواہ اور ان کے اتحادی ٹرمپ کی ان پالیسیوں کے اجراء کی کبھی بھی کھل کر حمائت نہ کر سکے کیونکہ اس سے امریکا تیزی کے ساتھ تنہائی کا شکار ہو جاتا لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ ٹرمپ ایک مرتبہ پھر اسے سے کہیں زیادہ شدت پسند نعروں کی گونج میں وائٹ ہاؤس پہنچنے کی تیاریوں میں بڑا پر امید ہے اور ایسا ہی حال ہمارے ملک کی سیاست کا بھی ہو چکا ہے کہ ہر روز کسی نہ کسی کا بیان آجاتا ہے کہ عمران کے ساتھ بیک ڈور چینل پر بات چیت جاری ہے اور ناکامی کا منہ دیکھتے ہی اس کی تردید کر دی جاتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں کردار ایسے ہم مزاج ہیں کہ ایک دوسرے کی تعریفوں کے پل باندھنے میں کبھی بخیلی سے کام نہیں لیتے۔

؎ اپنا بھی کچھ خیال کر، اے دل بجز لحاظ
موقع ملے تو جھاڑ کبھی آستین کے سانپ

بروز بدھ 21 ذوالقعد 1445ھ 29 مئی 2024ء

"یومِ تکبیر کا اصل پیغام"

سی پیک پراجیکٹ کو آج دس سال ہوگئے ہیں لیکن ہماری سیاسی کوتاہیوں اوراقتدار کی ہوس نے اسے ابھی تک پروگرام کے مطابق مکمل نہیں کیااوراس موضوع پر کئی مرتبہ دلائل کے ساتھ لکھ بھی چکاہوں کہ اس پراجیکٹ کے فوائداور ثمرات کو کس طرح پاکستانی عوام کی جانب موڑاجاسکتاہے اور پاکستان جوابھی تک اپنی معاشی پریشانیوں کی وجہ سے اپنی خود مختاری کو بچانے کیلئے شب وروز جانی اورمالی قربانیاں دے رہاہے،اس میں ہمارے اپنوں کا کس قدر ہاتھ ہے اوراس منصوبے کو ختم کرنے کیلئے اغیار کی سازشوں کا سلسلہ مسلسل جاری اور ساری ہے جس کی بناء پر ملکی خوشحالی کاراستہ روکنے کیلئے چین نے اکیسویں صدی کے میری ٹائم سلک روڈ کاتصور 2013ء میں پیش کیاتھا،جس کے ذریعے بحرالکاہل، جنوب مشرقی ایشیا،بحرہنداور مشرقی افریقا کو جوڑنے کیلئے انفرااسٹرکچر کی تعمیر کااعلان کیاگیا۔

میری ٹائم سلک روڈسمندری راستہ ہے،جس سے اقتصادی راہداری کی تکمیل ہوگی،اس منصوبے کے تحت پورے وسط ایشیامیں انفرااسٹرکچر کی تعمیر پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ون بیلٹ ون روڈ منصوبے کاایک مقصد پورے ایشیامیں چین کے تجارتی اوراس کی حفاظت کیلئے عسکری اثرورسوخ کوبڑھانا بھی ہے۔ایشیاکے ترقی پذیر ممالک میں انفرااسٹرکچرپر سرمایہ کاری کی شدید کمی ہے۔اس لیے خطے کے زیادہ تر ممالک نے جہاں چین کی سرمایہ کاری کا خیر مقدم کیاہے وہاں اسے امریکاکے دباؤکا بھی سامناہے۔

چین کی پیشکش کے حوالے سے معاشی استحکام اور سیاسی وجغرافیائی ارادوں پر سوالات بڑھتے جارہے ہیں،اس منصوبے کامقصد بنیادی طور پر بحرہند کے ممالک کوباہم جوڑناہے۔اس منصوبے میں خاص طور پر بندگاہوں کی تعمیر کواہمیت دی گئی ہے،جس کی وجہ سے سوال اٹھ رہاہے کہ یہ منصوبہ صرف معاشی اور سرمایہ کاری کیلئے ہے یاپھراس کے عسکری مقاصد بھی ہیں۔اس حوالے سے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری وصول کرنے والے ممالک کی قومی اور خارجہ پالیسی پر چین کے ممکنہ اثرات کے خدشات بھی پائے جاتے ہیں۔اس ساری صورتحال کی روشنی میں سی ایس آئی ایس نے 7ماہرین پر مشتمل کمیشن قائم کیا،جومیری ٹائم سلک روڈ منصوبے کے تحت بحرہند میں چین کے ترقیاتی منصوبوں کے معاشی اور جیواسٹریٹجک اثرات کاجائزہ لے گا۔ان ماہرین کی تحقیق اس رپورٹ میں پیش کی گئی ہے۔اس مضمون میں انفرااسٹریکچر کے 4 منصوبوں کا تجزیہ کیاگیاہے جس میں 3 میری ٹائم سلک روڈ کے چینی منصوبے ہیں اورایک اس کے جواب میں بھارتی منصوبہ ہے۔

چینی منصوبوں میں میانمار کاانڈیاکو گھیرنے کی چین کی مسلسل کوششوں کے ایک حصے کے طور پر،اس نے میانمار کے مغربی ساحل پر "کیوکفو" بندرگاہ کی تعمیر کو تیز کردیاہے۔بحری مرکز کو ممکنہ طور پر جب بھی ضرورت ہو فوجی معاملات کیلئے دوبارہ استعمال کیاجاسکتاہے۔سری لنکا"ہامبانتوتا" پاکستان کا "گوادر" شامل ہیں جبکہ بھارت نے ایرانی "چاہ بہار" بندرگاہ کی تعمیر کے منصوبے پر جو کام شروع کیاتھا،فی الحال انتہائی سست روی کا شکار ہوچکاہے۔

جب سے سی پیک اور "ون بیلٹ ون روڈ" کے پراجیکٹس عملی شکل اختیار کرتے چلے جارہے ہیں،ان کے خلاف مخصوص پروپیگنڈہ بھی تیز ہوتاجارہاہے تاکہ یہاں کی آبادی کوان منصوبوں کے خلاف مزاحمت کیلئے کھڑاکیاجائے۔اس کام کے حوالے سے گریگ پولنگ نے راخائن میں خلیج بنگال کے کنارے موجود "کیوکفو" بندرگاہ پر چینی سرمایہ کاری کے معاشی اور تزویراتی مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔چین نے اپنے منصوبے کی تکمیل کیلئے گہرے

پانی کی بندر گاہ "کیوکفو" اوراس سے ملحقہ انڈسٹریل ایریا اور اقتصادی زون کی تعمیر کا ٹھیکہ حاصل کرتے ہی اسے تیزی کے ساتھ مکمل کرنے پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ جنوب مغربی چین کے صوبے "یو آن" کے دارالحکومت کو قدرتی گیس اور تیل کی فراہمی کی لائنیں بھی "کیوکفو" سے گزرتی ہیں۔ یہ منصوبہ تیل اور گیس کی درآمدات کیلئے آبنائے مالاکہ پر چین کا انحصار کم کرنے کیلئے اس کی تزویراتی کوششوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح "کیوکفو" میں گہرے پانی کی بندر گاہ کی تعمیر سے چین کو اپنے اندرونی صوبوں کی تعمیر وترقی میں مدد ملے گی۔ گریگ پولنگ نے خطے میں موجودان خدشات کا بھی حوالہ دیاہے کہ مستقبل میں چین اس گہرے پانی کی بندر گاہ کو معاشی استعمال کے ساتھ ساتھ اس کا فوجی استعمال بھی کر سکتاہے جبکہ سب بڑا خطرہ یہ ہے کہ چین نے میانمار کو قرض دے کر اس کی معیشت کو مکمل طور پر قابو کر لیاہے۔

جوناتھن ہیل مین نے سری لنکا کی بندر گاہ ہامبانتوتا پر چین کے ترقیاتی منصوبے کا جائزہ لیاہے۔ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ کولمبو کی بندر گاہ کی موجودہ صلاحیت اور توسیع منصوبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہامبانتوتا کی بندر گاہ پر چینی بحریہ ممکنہ بحری اڈہ تعمیر کر سکتی ہے۔ جوناتھن کا کہناہے کہ جس طرح سری لنکا نے 99 سالہ لیز پر یہ بندر گاہ چین کے حوالے کی ہے اس سے خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ چین سری لنکا کو بھی قرض کے جال میں پھنسا رہاہے۔ جوناتھن کا کہناہے کہ ہامبانتوتا کا کیس یہ سبق دیتاہے کہ جن ممالک میں اس طرح کے منصوبوں پر کام ہو رہاہے انہیں اپنے انفراسٹرکچر کی تعمیر کیلئے طویل المیعاد معاہدوں پر دستخط کرنے چاہیے تاکہ وہ قرضوں کے جال میں نہ پھنس جائیں اوراس کے ساتھ ہی بین الاقوامی برادری کو بنیادی منصوبوں کیلئے چین کی مالی امداد کا متبادل فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

بھارتی تجزیہ نگار گرمیت کنول نے بھی اس منفی پروپیگنڈہ میں حصہ لیتاہوئے یہ ہرزہ سرائی کی ہے کہ گوادر بندر گاہ کی تعمیر چین پاکستان اقتصادی راہداری منصوبے کا اہم ترین حصہ ہے سی پیک پاکستان اور چین کے درمیان مضبوط تعلقات کی علامت بن چکاہے۔ گرمیت کے مطابق دونوں ممالک ہی سی پیک کے حوالے سے خدشات کا شکار ہیں۔ چین کو اپنے مزدوروں کی سلامتی کے حوالے سے خدشات ہیں تو پاکستان کو پریشانی ہے کہ سی پیک کے نتیجے میں قرضوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا، جس سے کشیدگی میں اضافہ ہو سکتاہے۔ گرمیت نے بحرہند کے گیٹ وے گوادر تک چینی بحریہ کی ممکنہ رسائی کے سیکیورٹی اثرات کا بھی جائزہ لیاہے۔ امریکا اور بھارت کی منافقت اور خوف کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے خطے میں چین کے بڑھتے ہوئے اسٹریٹیجک اثرات سے نمٹنے کیلئے بھارت، جاپان، آسٹریلیا اور امریکا کے درمیان ایک معاہدہ بھی طے پاچکاہے جو اس بات کی نشاندہی ہے کہ امریکا اپنے ان تمام اتحادیوں کی مدد سے چین کو گھیرنے کا منصوبہ بناچکاہے جبکہ چین بھی اس کے مقابلے میں خاموش نہیں ہے۔

ادھر ہرش پینٹ کے مطابق چین انفراسٹرکچر سرمایہ کاری کے ذریعے "گریٹ گیم" کھیلنے والا تنہاملک نہیں، بلکہ بھارت بھی اس دوڑ میں شامل ہے۔ بھارت کا ایران کی چاہ بہار بندر گاہ کی تعمیر میں مدد کرنا دہلی کے عزائم کی عکاسی کرتاہے کہ بھارت خطے کو جوڑنے کیلئے خاص کر افغانستان تک رسائی کیلئے انفراسٹرکچر کو بہتر کرنے کیلئے اب بھی ہاتھ پاؤں مار رہاہے۔ چاہ بہار بندر گاہ چین کے تعاون سے تعمیر ہونے والی گوادر بندر گاہ کے قریب واقع ہے۔ چاہ بہار بندر گاہ کی بھی خطے میں اہم اسٹریٹیجک حیثیت ہے، جس کے ذریعے چین کے خطے میں بڑھتے ہوئے اثرات کو کنٹرول کرنے کی منصوبہ بندی شامل ہے لیکن ہرش نے بھارتی حکمت عملی میں پیچیدگی کی چند برس قبل نشاندہی بھی کی تھی، جس کی وجہ ایران کی جانب سے چاہ بہار بند گاہ کی تعمیر میں پاکستان اور چین کا کردار قبول کرنا عین ممکن ہے اور وہی ہوا کہ چین نے بروقت اپنی بہتر خارجہ اور کامیاب معاشی پالیسیوں کی بناء پر امریکا اوراس کے اتحادیوں کے منصوبوں کا تدارک کر لیاہے۔

ان چار منصوبوں کے تجزیہ کے علاوہ دو مضامین اور بھی ہیں، جن میں چین کے میری ٹائم سلک روڈ کے معاشی اور دفاعی اثرات پر تبصرہ کیا ہے۔ میتھیو اور جوناتھن نے بحر ہند کی تجارتی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، مثال کے طور پر دنیا کی 10 مصروف ترین تجارتی بندر گاہیں بحر ہند میں واقع ہیں۔ دنیا بھر میں تیل کی آدھی تجارت بحر ہند کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ چین کی سرمایہ کاری معاشی مقاصد رکھتی ہے یا اسٹر ٹیجک؟ چینی منصوبے کے نتیجے میں معاشی استحکام کا اندازہ لگانے کیلئے میتھیو اور جوناتھن نے تین مختلف معیار اور اصول متعارف کرائے ہیں، شپنگ لائنز کو قریب لانا، موجودہ بندر گاہوں میں فاصلے کم کرنا اور ملک کے اندرونی علاقوں کو بندر گاہ سے جوڑنے کیلئے سڑکوں کی تعمیر۔ میتھیو اور جوناتھن کے مطابق چینی منصوبے کو ان تین معیار پر رکھ کر جانچنے سے پتا لگا کہ اس منصوبے کو معاشی مقاصد سے جوڑنا غلط ہے۔ زیک کوپر کے مطابق بحر ہند میں چینی فوجیوں کی موجودگی میں اضافہ حیرت انگیز نہیں ہے، چین بھی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے روایتی راستے پر گامزن ہے۔ چین بیرون ملک اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے اپنے فوجی آپریشنز میں توسیع کر رہا ہے۔ بحر ہند کے راستوں پر چینی تجارت کا انحصار بہت زیادہ ہے، یہ تجارتی راستے چین کیلئے بہت اہم ہیں، خاص کر توانائی کی فراہمی کیلئے، اس لیے چینی حکومت کی جانب سے بحر ہند میں اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ایک قدرتی امر ہے۔

زیک کے خیال میں بحر ہند میں چینی فوج کی موجودگی کے سیکیورٹی اثرات ملے جلے ہوں گے۔ ان کوششوں سے خطے میں چین کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہو جائے گا۔ زمانہ امن میں قزاقوں کے خلاف آپریشنز اور خطے کی دیگر افواج سے تعاون پر چین کے بحری جہازوں کو بحر ہند کی بندر گاہوں تک رسائی مل سکتی ہے، جہاں سے وہ تیل اور دیگر سپلائی کا سامان حاصل کر سکتے ہیں۔ زمانہ جنگ میں بحر ہند میں موجود چین کے بحری جہاز اور اڈے دشمن کیلئے آسان ہدف ثابت ہوں گے۔ اس سب کے باوجود مستقبل میں بحر ہند میں چین کے سیاسی، معاشی اور عسکری اثر ورسوخ میں اضافہ ہو گا، جس کی وجہ سے بحر ہند کے حوالے سے حکمت عملی بنانے والوں میں تشویش رہے گی۔ بحر الکاہل سے مشرق وسطیٰ جانے والے اہم راستے، خلیج ہرمز اور آبنائے مالاکہ کے چیک پوائنٹس کے حوالے سے امریکا اور آسٹریلیا میں تشویش پائی جاتی ہے۔ خطے میں چین کے بڑھتے اثرات سے جاپان بھی تشویش میں مبتلا ہے۔ بھارت بھی بحر ہند میں چین کی جانب سے بنائی جانے والی "موتیوں کی مالا" (کی مانند بندر گاہیں) سے پریشان ہے۔ ہمالیہ میں جاری چین اور بھارت کی طویل مسابقت کے پس منظر میں ان بندر گاہوں کی وجہ سے خطے میں چین کو نئے اختیارات حاصل ہو جائیں گے۔ گریگ کے مطابق میری ٹائم سلک روڈ کی وجہ سے پیدا ہونے والی غیر یقینی صورتحال کا امریکا، جاپان، بھارت اور آسٹریلیا اپنے قائم ہونے والے اتحاد کے ذریعے جواب دے سکتے ہیں۔

جسکی برکر اور اینڈریو نے چار ملکی سیکورٹی ڈائیلاگ (کواڈ) کے تاریخی کردار کا جائزہ لیا ہے۔ یہ چار ملکی گروپ آسٹریلیا، جاپان، بھارت اور امریکا نے 2004ء میں بحر ہند میں سونامی کے بعد انسانی مدد کیلئے قائم کیا تھا۔ چین کے ممکنہ رد عمل کے خدشے کی وجہ سے چاروں ممالک باقاعدہ طور پر گروپ کو فعال نہیں کر سکے تھے، مگر اب چاروں ممالک نے کواڈ کو 2018ء سے دوبارہ فعال کر دیا ہے جو تجزیہ نگاروں کے مطابق خطے میں چین کی بڑھتی معاشی اور عسکری سرگرمیوں کا جواب ہے۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ بظاہر چاروں جمہوری ممالک کے درمیان بحر ہند کو سب کیلئے کھلا رکھنے کیلئے تعاون کرنے کی حکمت عملی پر اتفاق پایا جاتا ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ چین کی بڑھتی ہوئی معاشی اور عسکری طاقت کو روکنے کا پلان ہے۔ "کواڈ" میں جہاں چین کی حکمت

عملی میں مثبت تبدیلی کروانے کی پوری صلاحیت ہے لیکن بہت محتاط انداز میں اقدامات کرنے کے باوجود چین کو اس کا پورا ادراک ہے اور چین کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ وہ بیانات میں الجھنے کی بجائے ٹھوس اقدامات پر بھرپور توجہ اور بعد ازاں جواب دینے کی عملی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے میں سستی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

یہ رپورٹ سی ایس آئی ایس کے ماہرین نے بحرِ ہند کی جیوپولیٹیکل صورتحال کے حوالے سے تیار کی ہے۔ماہرین کے مطابق میری ٹائم سلک روڈ منصوبہ نہ تو مکمل طور پر معاشی منصوبہ ہے اور نہ مکمل طور پر عسکری منصوبہ ہے۔چین کی حکمت عملی تیاری کے مراحل سے گزر کر تکمیل کی طرف رواں دواں ہے۔اس رپورٹ سے امریکا و دیگر ممالک کو یقیناً میری ٹائم سلک روڈ کے حوالے سے اپنی حکمت عملی تیار کرنے میں مدد ملی ہے۔بظاہر تو اس رپورٹ کے بعد توقع کی جارہی تھی کہ بیجنگ کو اپنی معاشی حکمت عملی کو مزید واضح کرنے کیلئے زور ڈالا جاسکے لیکن سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ چین ان تمام خطرات کے سدباب کیلئے اپنے دفاعی کارڈ اپنے سینے سے لگائے بیٹھا ہے اور یہ طے ہے کہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کی موجودہ پالیسیاں ہی ان کو ڈبونے کیلئے کافی ہیں جس کی وجہ سے ان کے مغربی اتحادیوں نے اب تک ایران کو تنہا کرنے کی امریکی پالیسی سے خود کو الگ رکھا ہوا ہے اور اب تو براہِ راست یورپ اور چین کے مابین بڑھتے تعلقات نے گیم کا رخ تبدیل کر دیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خود پاکستان نے اس منصوبے کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ایک اہم رپورٹ سامنے آئی ہے جس میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ منصوبوں کی تکمیل میں طویل تاخیر اور بقایاجات کی تعمیر کے درمیان، چین کے صوبہ سنکیانگ سے بلوچستان کے گوادر تک چلنے والا بہت مشہور چائنا پاکستان اکنامک کوریڈور کو تیزی سے غیر فعال کرنے کیلئے پہلے کام میں سستی اور بعد ازاں "کورونا" کے غلاف میں لپیٹ کر اسے روک دیا گیا، جس کی وجہ سے دونوں ممالک میں بڑھتی مایوسی نے کئی شکوک وشبہات پیدا کر دیئے ہیں۔شنید یہ ہے کہ اب بیجنگ بنیادی ڈھانچے کے منصوبوں کیلئے گروی رکھے ہوئے فنڈز جاری کرنے سے گریزاں ہے۔دریں اثناء چینی کمپنیوں نے بقایاجات کی ادائیگی کا مطالبہ کرتے ہوئے سی پیک منصوبوں میں بجلی کی پیداوار بھی روک دی ہے۔سی پی ای سی کے قرضوں پر سود کی بلند شرح، پراجیکٹ کی بڑھتی ہوئی لاگت، کمزور پراجیکٹس، اور سی پی ای سی کے انفراسٹرکچر پر حملے بڑے مسائل ہیں جو ایک سفید ہاتھی کا خواب بن گیا ہے۔اس سے پاکستان میں مایوسی بڑھ رہی ہے اور وفاقی وزیر برائے منصوبہ بندی وترقی احسن اقبال نے حال ہی میں اہم منصوبوں کی سست رفتاری پر عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے۔

یہ منصوبہ، چین اور پاکستان کے درمیان اقتصادی تعلقات کو بڑھانے کیلئے آج پہلے سے زیادہ اہم ہے لیکن دشمنوں کی طرف سے دہشتگردی کے خطرات سے متاثرہ علاقوں میں چیلنجز کا سامنا ہے۔بلوچستان کے علاوہ سی پیک کی تعمیراتی جگہوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے جیسا کہ حال ہی میں بشام میں چینی باشندوں کو لیجانے والی بس پر خودکش حملہ ایک مرتبہ پھر سیکورٹی کے خطرات کی عکاسی کرتا ہے۔افغانستان کی سرحد سے ملحقہ قبائلی علاقے، جو تاریخی عسکریت پسندی کیلئے مشہور ہیں، سیکورٹی کے منظرنامے میں پیچیدگی پیدا کررہے ہیں۔مزید برآں، جغرافیائی سیاسی کشیدگی اور کوریڈور کی حساس سرحدی علاقوں سے قربت مزید مضبوط حفاظتی اقدامات میں اضافہ کرکے اور اضافی سیکورٹی فورسز کی تعیناتی اور نگرانی کے نظام کو نافذ کرنے کیلئے دونوں حکومتوں نے مشترکہ پلان بھی تیار کیا ہے جس پر عملدرآمد شروع ہوچکا ہے۔چین کو باقاعدہ بشام حملے میں ملوث سرحد پار ٹی ٹی پی کی طرف سے اس حملے میں پلان کرنے والوں، ان حملوں میں ملوث ان تمام افراد کے باقاعدہ ثبوت مہیا کئے گئے ہیں، جن کو چین نے باقاعدہ تسلیم کرتے ہوئے مشترکہ لائحہ عمل کے طور پر اب افغانستان کی موجودہ حکومت سے اس کو کنٹرول کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔

لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس پراجیکٹ پر مجرمانہ تاخیر کی فوری تحقیقات کر کے ان قومی مجرموں کی نشاندہی کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ان کو سخت ترین سزا سنا کر دشمنوں کو واضح پیغام دیا جائے کہ ملکی سلامتی کیلئے ساری قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح تیار ہے۔ دراصل یہ ہے "یومِ تکبیر کا اصل پیغام" جس کو ہم ابھی تک فراموش کئے بیٹھے ہیں۔

بروز ہفتہ 24 ذوالقعد 1445ھ یکم جون 2024ء

خلیج فارس اور بد مست ہاتھی

کنٹرول سنبھالنے کیلئے کسی امریکا کے صدر جمی کارٹر نے 1980 میں اسٹیٹ آف یونین خطاب کے دوران کہا تھا کہا گر کسی بیرونی طاقت نے خلیج فارس کا قسم کی مداخلت کی تو امریکا مشرق وسطیٰ میں تیل کی آزادانہ نقل وحمل کی حفاظت کیلئے اس کے خلاف جوابی کاروائی کرے گا۔ کارٹر اور ان کے جانشینوں نے اس وعدہ کو ہمیشہ نبھایا ہے۔ قصر سفید کا دعویٰ ہے کہ امریکا نے نہ صرف خطے میں موجود امریکی فوج کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا بلکہ عراق کے صدام حسین کو تیل کی سپلائی لائن پر قبضے سے روکنے کا بہانہ بنا کر جنگ خلیج میں بھی حصہ لیتے ہوئے عراق کو تاراج اور صدام کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ اگرچہ خلیج فارس میں امریکا کے دیگر بھی کئی مفادات تھے جن میں جوہری پھیلاؤ کی روک تھام، انسداد دہشتگردی اور جمہوریت کا فروغ جیسے بہانے بھی شامل تھے لیکن امریکا کا سب سے اہم مفاد تیل کی ترسیل کو بغیر رکاوٹ جاری رکھنا تھا جبکہ وقت نے امریکی بیانیے نے یہ ثابت کر دیا کہ اس خطے میں امریکا کی موجودگی اپنے مخصوص مفادات ورلڈ آرڈر کے تابع ہیں۔

خلیج فارس سے امریکا کی اس وابستگی پر اسے کبھی کسی بڑی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ حتی کہ وہ لوگ بھی جو امریکا کے یورپ اور ایشیا میں مختلف اتحادوں کو خلیج فارس کی کے مخالف رہے ہیں اور ان اتحادوں کو ملکی معیشت پر بوجھ قرار دیتے رہے ہیں، انہوں نے بھی ہمیشہ اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ امریکا حفاظت کا ذمہ اپنے سر رکھنا چاہیے، کیونکہ دنیا کے ایک تہائی تیل کی پیداوار اس خطے سے ہوتی ہے۔ لیکن اب دنیا میں ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ سرد جنگ کے دوران خطے میں امریکی مفادات کیلئے سب سے بڑا خطرہ سوویت یونین تھا۔ امریکی پالیسی ساز پریشان تھے کہ اگر سوویت یونین تیل کی ترسیل کو منقطع کرنے میں کامیاب ہو گیا، تو تیل و گیس پر انحصار کرنے والی امریکی فوج یورپ میں کوئی بڑی جنگ نہ جیت سکے گی۔ لیکن سوویت یونین کے خاتمے نے تیل کی سپلائی کے حوالے سے امریکی مفاد کی نوعیت کو تبدیل کر دیا۔ جہاں قومی سلامتی اور خوشحالی دونوں کا انحصار خلیج فارس کی حفاظت پر ہوا کرتا تھا، اب اس کا تعلق صرف خوشحالی سے رہ گیا۔ جس نے امریکا کی پالیسی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ قومی سلامتی کے عنصر کی عدم موجودگی نے خلیج فارس میں فوج کی مداخلت بڑھا دی، کیونکہ زیادہ تر امریکی معاشی مفادات کے دفاع کیلئے فوج کو مشکلات میں ڈالنے کو برا نہیں سمجھتے۔ تو یہاں سوال اٹھتا ہے کہ کیا خلیج فارس کا تیل اتنا قیمتی ہے کہ اس کا دفاع امریکی فوجی قوت کے ذریعے کیا جائے؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کیلئے مزید چار سوالوں کے جواب حاصل کرنے ہوں گے۔ اول یہ کہ اگر امریکا خلیج فارس سے اپنی وابستگی ختم کر دیتا ہے تو اس بات کا کتنا امکان ہے کہ خلیج فارس سے تیل کے بہاؤ میں کوئی بڑی رکاوٹ پیدا ہو گی؟ دوم، اس رکاوٹ کا امریکی معیشت پر کتنا اثر پڑے گا؟ سوم، امریکا خلیج فارس سے تیل کے بہاؤ کی حفاظت پر کتنے فوجی اخراجات اٹھاتا ہے؟ آخری یہ کہ خلیج فارس کی حفاظت کیلئے غیر فوجی متبادل ذرائع کیا ہو سکتے ہیں اور اس پر کتنے اخراجات ہوں گے؟ ان سوالات کے جوابات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ خلیج فارس میں تیل کی ترسیل کے نظام کی حفاظت پر آنے والی لاگت، اس سے حاصل ہونے والے فوائد کے برابر پہنچ گئی ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ لاگت اس پالیسی سے حاصل ہونے والے فوائد سے بھی بڑھ جائے گی۔ سو یہ وہ وقت ہے جب امریکا کو خلیج فارس سے فوجی وابستگی ختم کر کے ایسے متبادل ذرائع میں سرمایہ کاری کرنی چاہیے جو تیل کی ترسیل میں رکاوٹ کی صورت میں امریکی معیشت کو سہارا دے سکیں۔ ایک دہائی یا اس سے کچھ زیادہ وقت میں جب یہ خطہ آج سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہو چکا ہو گا تو امریکا کو اس مقام پر ہونا چاہیے کہ وہ خلیج فارس سے فوجی وابستگی مکمل طور پر ختم کر دے۔

موجودہ پالیسی کا صحیح جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک غلط فہمی دور کرلی جائے۔ سیاستدان اور تجزیہ نگار اکثر یہ بات کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ تیل کے ترسیلی نظام میں آنے والی کسی رکاوٹ کے خطرے سے بچنے کیلئے امریکا کو تیل کی پیداوار بڑھانی ہوگی تاکہ درآمدی تیل پر انحصار کم سے کم ہو یعنی توانائی کے شعبے میں خود مختار ہو۔ یہ دلیل بنیادی طور پر تیل کی عالمی منڈی کے نظام کی ناسمجھی کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ قابل مبادلہ اجناس کی تجارت میں خود مختاری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دراصل تیل کی خرید و فروخت عالمی منڈی میں ہوتی ہے، اس لیے امریکا میں اس کی قیمت دنیا بھر میں تیل کی قیمتوں سے جڑی ہوئی ہے۔ تیل کی عالمی منڈی کی مثال ایک پانی کے ٹب کی سی ہے، جس میں پانی ڈالنے کیلئے بہت سے نل لگے ہوئے ہیں اور اس کی نکاسی کیلئے بھی بہت سی نالیاں ہیں۔ اس لیے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ کسی ایک نل سے کتنا پانی آتا ہے اور کسی خاص نالی سے کتنا پانی بہتا ہے۔ رسد اور طلب کی بنیاد پر انحصار کرنے والی تیل کی منڈی میں زیادہ اہمیت تیل کی رسد کی ہے کیونکہ اگر تیل کی رسد تیزی سے کم ہوتی ہے تو ٹب سے پانی حاصل کرنے والے تمام صارفین ہی متاثر ہوں گے۔ اس لیے اگر امریکا کی خلیج فارس سے تیل کی درآمد صفر بھی ہو جاتی ہے، تو بھی خلیج فارس سے نکلنے والے تیل کی سپلائی متاثر ہونے کی صورت میں تیل کی قیمتوں میں آنے والی تبدیلیوں سے امریکا بھی متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پائے گا۔

یہ تو سوچا جاسکتا ہے کہ امریکا کے خطے سے نکل جانے کی صورت میں تیل کی سپلائی کس طرح متاثر ہو سکتی ہے، لیکن ان سوچ جانے والے آپشنز میں سے قابل عمل کوئی بھی نہیں لگتا۔ ایک امکان جس پر غور کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی خلیجی ملک اپنے پڑوسی ممالک پر قبضہ کرکے خطے میں موجود تیل کے بیشتر ذخائر پر قبضہ کرلیتا ہے تو پھر تیل کی عالمی منڈی میں قیمتیں کنٹرول کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور ایسا کوئی بھی اقدام تیل کے بڑے صارفین جیسے برطانیہ اور امریکا کی طاقت کو چیلنج کرنے کے برابر ہوگا لیکن یہ آپشن کسی طور پر ممکنات میں سے نہیں، کیونکہ خطے میں اتنی طاقت رکھنے والا کوئی ملک نہیں ہے۔ عراق امریکی حملے کے بعد سے تباہ ہو چکا ہے اور ابھی بھی انارکی کی لپیٹ میں ہے۔ ایران کو مغربی پابندیوں نے کمزور کرکے رکھ دیا ہے اور اس کے رہنما اندرونی مسائل سے نمٹنے میں مصروف ہیں۔ سعودی عرب، یمن جنگ سے جان چھڑانے کے بعد اب خطے کو فتح کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

دوسری فرضی صورتحال جس پر غور کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ خطے پر کنٹرول حاصل کرنے کی بالواسطہ جنگ سے خلیجی ممالک افراتفری اور انارکی کی لپیٹ میں آسکتے ہیں اور بنیادی انفراسٹرکچر تباہ ہو سکتا ہے۔ جس سے تیل کی سپلائی بذریعہ بحری جہاز متاثر ہو سکتی ہے لیکن بہت سے عوامل ایسے ہیں جو اس فرضی صورتحال کو حقیقت کا روپ دینے میں رکاوٹ ہیں۔ خطے میں کوئی بھی ایسی ریاست نہیں ہے جو اپنی اجارہ داری قائم کرنے کیلئے اتنی بڑی جنگ کا خطرہ مول لے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ بھی آسان کام نہیں۔ ایران اور سعودی عرب ایک دوسرے کو نشانہ بنا سکتے تھے لیکن ان دونوں کو جہاں خلیج فارس نے ایک دوسرے سے الگ رکھا ہوا ہے وہاں چین نے ایک بہت بڑا مثبت کردار کرکے اس خطے میں امن قائم کروادیا ہے۔

عراق اندرونی تقسیم اور ایران کے ساتھ سرحد لگنے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ غیر محفوظ ہے، لیکن ایران کو خود بے شمار چیلنجوں کا سامنا ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ امریکا کے عراق پر حملے کی صورت میں پیش آنے والی مشکلات سے بہت کچھ سیکھ چکا ہے۔ اس کے علاوہ تیل کے ذخائر کا بنیادی انفراسٹرکچر اس قابل ہے کہ شدید جنگ کے دوران بھی کام دیتا رہے، جس کی واضح مثال 1980 کی ایران، عراق جنگ ہے، جب شدید جنگ کے دوران بھی تیل کی سپلائی کم ضرور ہوئی لیکن جاری رہی اور جنگ بندی کے کچھ ہی عرصے میں تیل کی قیمتیں دوبارہ مستحکم ہو گئیں۔

تیسری ممکنہ صورتحال یہ ہو سکتی ہے کہ ایران امریکا اور اس کے اتحادیوں کو مشکلات میں ڈالنے کیلئے آبنائے ہرمز سے ہونے والی تیل کی سپلائی میں رکاوٹ پیدا کرے۔ آبنائے ہرمز کا 21 میل کا بہت ہی تنگ سا راستہ ہے جہاں سے روزانہ 20 ملین بیرل تیل گزرتا ہے جو کہ عالمی پیداوار کا تقریباً 20 فیصد ہے باوجود اس کے کہ ایرانی فوج اس راستے کو مکمل بند کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ بارودی سرنگیں بچھا کر اور میزائل بوٹ کی مدد سے سپلائی متاثر ضرور کر سکتی ہے۔ لیکن اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا ایران آبنائے ہرمز کو بند کرنے کا ارادہ رکھتا بھی ہے یا نہیں بہرحال سپلائی لائن بند کرنے سے اس کی اپنی پیداوار اور آمدنی بھی متاثر ہو گی اور پڑوسی ممالک بھی اس پر سخت ردعمل کا اظہار کریں گے۔ درحقیقت ایران نے کبھی ایسا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی، حتیٰ کہ عراق جنگ کے دوران بھی نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر امریکا خطے سے اپنی کمٹمنٹ ختم کر دیتا ہے تو شاید ایران کبھی اس آپشن پر بھی غور کرنا شروع کر دے بہرحال یہ بات قابل فہم لگتی تھی کہ امریکا کے خطے سے نکل جانے کے بعد ایران جب ایٹمی معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو اس پر مغرب کی لگائی جانے والی پابندیوں کے ردعمل میں وہ آبنائے ہرمز کے راستے کو بند کرنے کی کوشش کرے جو ایسا سب کچھ ہونا آسان تو نہیں ہے لیکن اگر امریکا خلیج فارس کی حفاظت کا بیڑا اٹھانے سے انکار کر دے گا تو اس صورتحال کے حقیقت کا روپ دھارنے کے امکان میں اضافہ ہو گا لیکن یہ صورتحال اس وقت یکسر تبدیل ہو گئی جب خود ٹرمپ نے ایران کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور ایران پر شکنجہ کسنے کیلئے مزید عالمی پابندیوں پر عملدرآمد شروع کر دیا جس کے بعد ایران نے ہنگامی بنیادوں پر معاہدے کے باقی ارکان سے بات چیت کر کے کئی یقین دہانیاں کروائی ہیں ۔ادھر دوسری طرف ایران کی جوہری توانائی کے ادارے کے سربراہ علی اکبر صالحی نے صحافیوں کو بتایا آیت اللہ خامنہ ای نے متعلقہ حکام کو حکم دیا ہے کہ وہ افزودگی کیلئے اپنی تیاریاں تیز کر دیں۔ اسی لئے یورینیم کی افزودگی کی صلاحیت بڑھانے کے بارے میں اقوام متحدہ کے جوہری ادارے آئی اے ای اے کو مطلع کر دیا گیا۔ ایران کے جوہری ادارے نے اعلان کیا ہے کہ وہ افزودگی کا سب سے اہم جز "یورینیم ہیگزافلورائڈ" زیادہ بنائے گا۔ اگر ہم معمول کے مطابق کام کرتے تو شاید چھ سے سات سال لگ جاتے لیکن اب یہ آئندہ ہفتوں یا مہینوں میں تیار ہو جائے گا۔ اگر ایران کی اس بات کا یقین کر لیا جائے تو اب تک ایران اپنے اس مقصد کو حاصل کر چکا ہے۔

امریکا کی بد دیانتی کے بعد تیل کی سپلائی لائن میں رکاوٹ پیدا کرنے والا آخری ممکنہ خطرہ یہ ہو سکتا ہے کہ تیل پیدا کرنے والے کسی بڑے ملک کے اندرونی حالات اس حد تک خراب ہو جائیں کہ تیل کی پیداوار متاثر ہو۔ اس ممکنہ صورتحال کا نشانہ سعودی عرب بن سکتا ہے۔ سعودی عرب نہ صرف عالمی پیداوار کا 10 فیصد سے زیادہ تیل پیدا کرتا ہے، بلکہ اس کے پاس تیل کے اتنے بڑے ذخائر ہیں کہ وہ دنیا بھر میں تیل کی سپلائی لائن متاثر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ فی الوقت تو اس کی برآمدات بظاہر محفوظ دکھائی دیتی ہیں ۔ سعودی فوج تیل کے ذخائر کی حفاظت پر مامور ہے اور وہ اس کام کو بہتر طریقے سے سرانجام دے رہی ہے۔ اس لیے کسی قسم کی دہشتگردی کی کارروائی ممکنہ طور پر ناکام ہی ہو گی حالانکہ ان دنوں سعودی بادشاہت یمن کی جنگ سے الگ ہو کر اپنی مشکلات پر کافی حد تک قابو پا چکی ہے جس میں چین نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

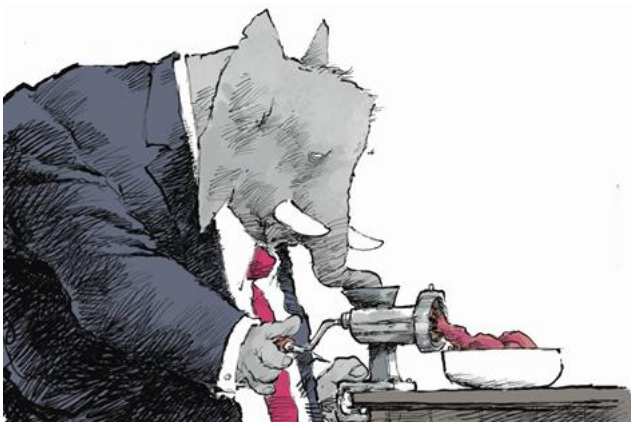

سعودی شاہی خاندان کو عمومی طور پر بادشاہت کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ ملک کے بیشتر عوام تیل کی دولت سے فوائد حاصل کر رہے ہیں اور جنرل راحیل اوران کے دیگر ساتھیوں کی انتھک محنت اور عسکری مہارت کی بناپر سعودی فوج بھی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ اعلی مہارت کی حامل بن چکی ہے۔ یہی وہ سب وجوہات ہیں جنہوں نے بروقت سعودی عرب کو عرب بہار کے اثرات سے بچائے رکھا ہے۔ مزید یہ کہ خانہ جنگی کی صورت میں اگر کوئی نئی طاقت اقتدار سنبھالتی ہے تو اسے بھی تیل کی پیداوار کو جاری رکھنا ہو گا کیونکہ ملک کی معیشت مکمل طور پر تیل کی پیداوار پر انحصار کرتی ہے۔ اگر امریکا خلیج سے اپنی کمٹمنٹ ختم کرتا ہے تو بھی وہ سعودی عرب کی داخلی سلامتی کیلئے اس کی فوج کو تربیت دینے کا عمل جاری رکھ سکتا ہے اوراس کے ساتھ ساتھ خفیہ معلومات کا تبادلہ اور ہتھیار کی فراہمی بھی جاری رکھی جاسکتی ہے۔ مختصر یہ کہ اگر امریکا خطے سے اپنی فوجی کمٹمنٹ ختم کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، تو تیل کی سپلائی متاثر ہونے کے امکان میں اضافہ تو ہو گا، خاص طور پر آبنائے ہرمز سے، لیکن یہ اضافہ نہایت معمولی ہو گا لیکن سوال یہ ہے کہ تیل کی سپلائی میں ایسی کوئی رکاوٹ کتنی مہنگی پڑ سکتی ہے؟ اور یہ خطے میں کسی ممکنہ بڑی جنگ کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔

تیل کی سپلائی میں کسی قسم کی رکاوٹ کے باعث ہونے والے نقصانات کے بارے میں ماہرین کی پیش گوئیاں کافی خطرناک ہیں۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق تیل کی عالمی پیداوار میں ایک فیصد کمی سے تیل کی عالمی قیمتوں میں 8 فیصد تک اضافہ ہو گا۔ ان اعداد و شمار کو سامنے رکھا جائے تو ایک لاکھ بیرل یومیہ تیل اگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے کم سپلائی ہوتا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ سعودیہ کی برآمدات صفر ہو جاتی ہے یا آبنائے ہرمز سے تیل کی سپلائی 60 فیصد کم ہو جاتی ہے، تو تیل کی عالمی قیمتیں دگنی ہو جائیں گی۔ دنیا نے ابھی تک ایسی کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کیا، لیکن ایسا ہونے کی صورت میں نقصان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اور قیمت میں اس بھی زیادہ اضافہ ممکن ہے۔ تیل کی قیمتوں کا امریکا کی معیشت پر بھی گہرا اثر پڑے گا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تیل کی قیمت دگنی ہونے کی صورت میں امریکا کی مجموعی ملکی پیداوار میں تین فیصد کمی آئے گی، جو کہ تقریباً 550 / ارب ڈالر بنتی ہے اور کسی بڑی رکاوٹ کی صورت میں جیسے کہ آبنائے ہرمز سے تیل کی سپلائی مکمل طور پر بند ہونا، تو اس کے نقصانات بھی اتنے ہی خطرناک ہوں گے۔

لیکن اس کے حقیقی اثرات امریکا پر نہایت کم ہوں گے۔ کیونکہ ایسی صورت میں امریکا اپنے پیٹرول کے ہنگامی محفوظ ذخیرے کا استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قیمتوں کو کنٹرول کرنے کیلئے زیر زمین ذخائر کا استعمال بھی کر سکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 700 ملین بیرل تیلا سٹریٹجک پیٹرولیم ریزرو میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ چار ارب بیرل سے زائد تیل عالمی توانائی ایجنسی کے ارکان ممالک کے پاس بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ تنظیم 1974 میں قائم کی گئی، جس کا مقصد دنیا بھر میں تیل کے بحران کی صورت میں مل کر اس کا مقابلہ کرنا تھا۔ آبنائے ہرمز سے اگر تیل کی سپلائی آٹھ ماہ کے طویل عرصے کیلئے بھی بند ہو جائے تو یہ چار ارب بیرل تیل آٹھ ماہ تک اس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ ایسے کسی بحران کی صورت میں پہلے ایک ماہ تو امریکا اپنے محفوظ ذخائر سے یومیہ 44 ملین بیرل تیل نکالے گا اور اسی طرح عالمی توانائی ایجنسی کے ارکان ممالک بھی 85 ملین بیرل یومیہ اضافی تیل اپنے ذخائر سے نکال سکتے ہیں ۔ چین جو کہ عالمی توانائی ایجنسی کا رکن نہیں ہے، لیکن وہ بھی اپنے ذخائر کا استعمال کر سکتا ہے، چین اپنی درآمد کے حساب سے 90 دن کے ذخائر رکھتا ہے۔ یہ تمام اعداد و شمار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ خلیج فارس سے تیل کی سپلائی میں کسی بڑی رکاوٹ کی صورت میں دنیا اگر باہمی طور پر کوئی لائحہ عمل اپنائے گی تو وہ یومیہ ہونے والے نقصانات کا ازالہ کر سکتی ہے۔

امریکی فوج کی خلیج فارس میں موجودگی کے معاشی فوائد اور نقصانات کا جائزہ لینے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے وہاں رہنے پر آنے والے اخراجات کا جائزہ بھی لیا جائے۔ وہاں بھاری اخراجات تو امریکی جنگی جہازوں کو فعال رکھنے پر آتے ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے پینٹاگون نے ایک وقت میں دو

دشمنوں سے مقابلے کی جو حکمت عملی بنا رکھی ہے، اس میں سے ایک دشمن کو ہمیشہ خلیج فارس میں سمجھ کر منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ دو محاذوں پر لڑنے کی حکمت عملی اس لیے اپنائی گئی کہ کبھی ایسا موقع نہ آئے کہ امریکا کسی ایک محاذ پر اتنا پھنس جائے کہ موقع پرست دوسرے محاذ سے حملہ کر کے فائدہ اٹھا لیں۔ اگر امریکا خلیج فارس میں جنگ کی تیاری کی حکمت عملی کو ترک کرتا ہے تو اس کے پاس دو آپشن بچتے ہیں، ایک یہ کہ وہ دو دشمنوں سے ایک وقت میں لڑنے والی حکمت عملی جاری رکھے لیکن وہ دوسرا دشمن کسی اور خطے میں ہو، دوسرا یہ کہ وہ ایک وقت میں ایک جنگ کی حکمت عملی اختیار کر لے لیکن اس حکمت عملی میں خلیج فارس سے زیادہ خطرناک کوئی خطہ نہیں جہاں اس حکمت عملی کے تحت موجودگی برقرار رکھی جا سکے۔

خلیج فارس میں امریکی فوج پر آنے والے اخراجات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے، کیونکہ وہاں موجود فوج اور بھی کئی جگہوں پر استعمال ہو رہی ہوتی ہے۔ ماہرین کے مطابق اگر امریکا ایک جنگ کی حکمت عملی اپناتا ہے تو ایک اندازے کے مطابق سالانہ 75 ارب ڈالر کی بچت ہو گی جو کہ دفاعی بجٹ کا 15 فیصد بنتا ہے۔ فوجیوں کی تعداد میں کمی، جنگی جہازوں کی تعداد میں کمی اور اسلحہ کی مقدار میں کمی لا کر یہ رقم بچائی جا سکتی ہے لیکن امریکا کی خلیج سے وابستگی صرف فوجیوں کی تعداد میں کمی تک محدود نہیں۔ اس خطے میں امریکا تیل کے حوالے سے اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے بالواسطہ یا بلاواسطہ کئی جنگیں لڑ چکا ہے، جن کی بھاری قیمت چکائی ہے۔ امریکا نے خلیج کی جنگ میں حصہ لیا تو بنیادی مقصد تیل کی سپلائی جاری رکھنا تھا۔ اگرچہ امریکی بیانئے کے مطابق عراق جنگ تیل کیلئے نہیں لڑی گئی لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ صرف دنیا کو دھوکہ دینے کیلئے تھا اور پالیسی سازوں کے ہاں عراق میں استحکام اور جمہوریت کی جو تڑپ نظر آتی تھی اس کی بنیادی وجہ وہاں موجود تیل کے ذخائر ہی تھے۔ اس لیے اب خلیج سے وابستگی ختم کرنے کے نتیجے میں نہ صرف ڈالر بچیں گے بلکہ قیمتی جانوں کا ضیاع بھی رک جائے گا کیونکہ اب خطے کے ممالک امریکی دھوکے کو سمجھ چکے ہیں۔

اس ساری بحث کے اختتام پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ خلیج فارس سے نکلنے والے تیل کی حفاظت کیلئے فوج کے استعمال کا متبادل کیا ہو سکتا ہے؟ اگر تیل کی رسد میں آنے والی رکاوٹ سے نمٹنے کیلئے فوج کا استعمال ہی بہتر آپشن ہوتا تو آج اس پالیسی کا دفاع کرنے والے بہتر پوزیشن میں ہوتے۔ درحقیقت امریکا بہت سے غیر فوجی ذرائع استعمال کر کے اس سپلائی کی حفاظت کو یقینی بنا سکتا ہے۔ ایک طرف تو امریکا تیل کے اپنے تزویراتی ذخائر میں اضافہ سٹریٹجک پٹرولیم ریزرو میں پچاس فیصد کا اضافہ کرتا ہے تو وہ تیل سپلائی میں آنے والے کسی بڑے SPR کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر امریکا اپنے تعطل کی صورت میں عالمی طلب کو مزید چند ماہ پورا کر سکتا ہے۔ اور اس کام کیلئے اسے دس سے چالیس ارب ڈالر خرچ کرنے پڑیں گے جو وہ متاثرہ ممالک سے وصول کر سکتا ہے۔

اگر ہم امریکی اور یورپی ممالک کی پٹرول کی طلب کی طرف دیکھیں تو ان میں بیشتر ممالک اس دن سے پٹرول کا نعم البدل ڈھونڈنے میں مصروف ہیں جب شاہ فیصل مرحوم نے امریکا اور اس کے اتحادیوں کیلئے پٹرول کی فروخت بند کرنے کا اعلان کر دیا تھا جس کے بعد دنیا میں ایک بھونچال آ گیا تھا۔ اس دن کے بعد ایک خاص حکمت عملی کے تحت امریکی معیشت میں تیل کا حصہ کم کرنے کے اقدامات شروع کر دیئے گئے لیکن ابھی تک مکمل طور پر پٹرول کا نعم البدل ڈھونڈ نہیں پائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ امریکا اور یورپ نے ایسے پالیسیوں کا اجرا ضرور کیا ہے کہ معیشت پر تیل کی تبدیل ہوتی قیمتوں کا اثر نہ پڑے۔ امریکا میں نقل و حمل کا شعبہ 70 فیصد تیل استعمال کرتا ہے، اس لیے اس شعبہ پر خصوصی توجہ دینے کے عمل کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ جارج بش سے لیکر اوباما تک تمام صدور نے اس معاملے پر خصوصی توجہ دی لیکن ٹرمپ کے اقدامات نے نہ صرف اس خطے کو بلکہ دنیا کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کر دیا بلکہ دفاعی اور معاشی ماہرین نے ان خطرات سے بچنے کیلئے جارحانہ پالیسیوں سے گریز کا مشورہ دیتے ہوئے ٹرمپ کو متنبہ بھی کیا کہ ممکنہ

خطرات سے بچنے کیلئے امریکا اور اس کے اتحادیوں کو ہنگامی بنیادوں پر تیل کی کھپت کو کم کرنے کے اقدامات پر ابھی سے اقدامات کرنا ہوں گے۔ اس کیلئے پٹرول پر ٹیکس کی شرح بڑھانی ہو گی تا کہ عوام متبادل ذرائع کا استعمال بڑھائیں لیکن ٹرمپ نے اس پر دھیان نہ دیا جو اب تک ان کی مشکلات کا سبب بھی ہے۔

امریکی ماہرین کے مطابق کچھ ترقیاتی اخراجات ایسے ہوتے ہیں جو طویل عرصے بعد نتائج دیتے ہیں، جیسے کہ ریسرچ کا شعبہ، اگر حکومت ریسرچ کے شعبے کیلئے مختص رقم میں اضافہ کر دے تو اس کے نتیجے کی صورت میں 2035 تک ملک میں تیل کی کھپت میں پچاس فیصد تک کمی ممکن ہو سکے گی۔ اس لیے حکومت اگر آئندہ 15 سالوں میں 100 سے 200 ارب ڈالر ریسرچ جیسے شعبہ جات پر خرچ کرتی ہے جو کہ تقریباً دس ارب ڈالر سالانہ بنتے ہیں، تو خلیج فارس کے دفاع پر آنے والے 75 ارب ڈالر سالانہ اخراجات سے بچا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ امریکا تیل کی سپلائی میں کسی رکاوٹ کے معیشت پر اثرات کم کرنے کیلئے مختلف اقدامات کر سکتا ہے۔ پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ بھی اپنے ذخائر میں کسی بحران کے موقع پر امریکا کو اکیلے بوجھ برداشت IEA میں اضافہ کے علاوہ SPR میں خاطر خواہ اضافہ کرے۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت کرنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ واشنگٹن کو خلیجی ممالک پر بھی دباؤ بڑھانا ہو گا کہ وہ آبنائے ہرمز پر اپنا انحصار کم کریں اور تیل کی پائپ لائن، جو کہ آبنائے ہرمز سے گزرتی ہیں ان کی استعداد بڑھائیں اور یہ کام وہ آسانی سے کر بھی سکتے ہیں۔

امریکی فوج کی خلیج فارس میں موجودگی کے فوائد و نقصانات کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حالیہ حکمت عملی کلی طور پر غلط نہیں ہے۔ اکثر ہمیں کم خطرات سے نمٹنے کیلئے بھاری اخراجات کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن اب دانش کا تقاضہ ہے کہ اس وابستگی کا خاتمہ ہو۔ قومی سلامتی کے تناظر میں دیکھا جائے تو اب خلیج فارس سے آنے والے تعطل پر کسی بڑے نقصان کا خدشہ نہیں ہے۔ معاشی طور پر بھی ملک اب تیل کی سپلائی میں آنے والی کسی بھی رکاوٹ کو برداشت کر سکتا ہے اور آئندہ اس تیل پر انحصار مزید کم ہی ہو گا۔ موجودہ حالات میں امریکا کو خلیج فارس میں اپنی موجودگی کی بجائے بتدریج خود کو ایسی پوزیشن پر لانا ہو گا کہ کسی بھی وقت وہ اس وابستگی کو ختم کر سکے۔ آنے والے دو عشروں میں تیل کے حوالے سے خود انحصاری حاصل کرنے کیلئے مزید سرمایہ کاری کرنی ہو گی، جیسا کہ ملکی ذخائر میں اضافہ، توانائی کا بہتر استعمال اور آبنائے ہرمز سے گزرنے والی تیل کی پائپ لائنوں کی استعداد میں اضافہ، ان اقدامات سے ملک جلد خود انحصاری حاصل کر لے گا۔

ادھر پینٹاگون نے ٹرمپ کو اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ تیل کے معاملے میں خود انحصاری کے بعد امریکا کو خلیج میں اپنی وابستگی وہاں موجود خطرات کو سامنے رکھ کر برقرار رکھنی ہو گی۔ ان خطرات میں سب سے نمایاں ایران ہے جس کیلئے ایران پر ایٹمی معاہدے میں مزید سخت شرائط عائد کرنے کے بعد وابستہ خطرات بھی کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تیل کی درآمد سے پابندی ہٹنے کے بعد ایران شاید ہی کبھی خلیج فارس میں کسی گڑبڑ کا سوچے کیونکہ ایسا کرنے سے اس کو بہت بڑی آمدنی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اس طرح جب ایران سے خطرات بھی نہ ہونے کے برابر رہ جائیں اور امریکا تیل پر خود انحصاری حاصل کر لے تو اس کو تیل کی سپلائی لائن کی حفاظت کی ذمہ داری سے جان چھڑا لینی چاہیے۔ لیکن اگر ایران جارحیت پر اترتا ہے تو پھر امریکا کو مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

ان دنوں خود امریکی عوام کے اندر یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے امریکا کو خلیج سے اپنی فوجی وابستگی کا خاتمہ جلد از جلد کرنا چاہئے، جس سے اس کے اخراجات

میں نمایاں کمی ہو گی اور ترجیحات بدل جائیں گی اور اگر امریکا اپنی فوجی وابستگی برقرار رکھتا ہے، تو اسے اپنے دفاعی بجٹ کا بڑا حصہ اس مد میں خرچ کرنا پڑے گا۔ بہر حال یہ فیصلہ اب غزہ کے موجودہ حالات سے جڑ گیا ہے کہ امریکا کی خلیج فارس میں فوجی ترجیحات کیا ہوں گی، جن میں جوہری پھیلا سب سے اہم ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فیصلہ سازوں نے دہائیوں سے خلیج میں فوج کی موجودگی پر کبھی سوال ہی نہیں اٹھایا باوجود اس کے کہ خلیج میں فوج کی ضرورت پہلے جیسی نہیں رہی۔ اس معاملے پر نظر ثانی نہ کرنا اور اس کے متبادل پر سرمایہ کاری نہ کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ اس غلطی کے نتیجے میں جہاں امریکا کو اربوں ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے وہیں اپنی فوج کو غیر ضروری جنگ میں بھی الجھایا ہوا ہے اگر اسرائیل جیسے بد مست ہاتھی سے جلد جان نہ چھڑائی گئی تو یہ سفید ہاتھی خود امریکا کو اپنے قدموں تلے کچلنا شروع کر دے گا۔

بروز سوموار 26 ذوالقعدہ 1445ھ 3 جون 2024ء

تو آؤ مر جائیں!

آئے روز مسلمانوں کے خون کی بڑھتی ہوئی ارزانی سے دل ڈوب جاتا ہے، ایسے لگتا ہے جیسے میں مر گیا ہوں، بس میرا جسم لوگوں کے ہجوم میں ایک تنکے لہو کیا یہ کچھ بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے یہ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے لگتا ہے کہ یہ جو سارا لہو بہہ رہا ہے، یہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ یہ لہو ہی نہیں، خواب ہے، یہ دنیا بھی کچھ نہیں۔ اگر اس دنیا پہ کسی کو جینے کا حق ہے تو بس ظالم کو ہے۔ مولوی اور زاہدانِ دین بھی مجھے مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ یہ سب تیری وجہ سے ہے لیکن افسوس وہ یہ کیوں نہیں جانتے کہ میں تو مرا ہوا ہوں، میں تو ایک لاش کی مانند اس دھرتی پہ پڑا ہوں، کوئی مجھے اس دھرتی میں دفن کر دے تو میں احسان مند رہوں گا۔ میری روح بس ہوا میں اڑتی رہتی ہے اور اسی کی وجہ سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے۔

میں ایک لکھاری ہوں، بکا ہوا یا مرا ہوا یا جو مرضی سمجھیں، آپ کو حق حاصل ہے۔ لوگو! میں بھی خوش رہنا چاہتا ہوں، میں اپنے حکمرانوں اور سیاست دانوں کی طرح بے حس رہنا چاہتا ہوں۔ کتنی سکون والی زندگی ہو گی حکمرانی والی زندگی، جس میں اپنے سوا، اپنے خاندان کے سوا کچھ دکھائی اور سنائی نہیں دیتا مگر میں تنگ ہوں، آپ کی وجہ سے نہیں، مجھے اپنی روح سے پریشانی ہے. کاش کہ میری روح کو کوئی قتل کر دے۔

آپ کو معلوم ہو گا کہ انسان کبھی کبھی مرنے سے پہلے مر جاتا ہے، اسی طرح جب ایک فرد مرتا ہے تو اسی کی وجہ سے پورا سماج مرنے لگتا ہے اور یوں ایک بے حس معاشرہ بن جاتا ہے اور کبھی کبھی میں خود کو مضبوط کر لیتا ہوں اور ایک سنگدل سا انسان بن جاتا ہوں۔ تب مجھے لگتا ہے، میں زندہ ہوں لیکن پھر میرے زندہ ہونے سے مجھے لگتا ہے، معاشرہ مرا ہوا ہے، یعنی میرا دل نرم ہو جائے یا پتھر بن جائے دونوں صورتوں میں معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے۔ آپ ہی دیکھ لیں، ہم بطور مسلمان کیا مسلمان ہیں؟ کتنی حقیر سوچ ہے میری کہ میں آج کے مسلمان کے ایمان کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں، اس وجہ سے بھی معاشرے کو یعنی مسلم معاشرہ کو تکلیف ہو گی۔

ہم نے ٹوپی، تسبیح کے منکوں، مسجد کے میناروں، عید کی مٹھائی، قربانی کے گوشت، لمبے لمبے جبوں میں اسلام کو چھپانے کی کوشش کی ہے اور مزید دفنانے کی کوشش میں ہم سب عالم، استاد، ڈاکٹرز، مفتی، امام، سکالرز سب غیروں کی مدد کر رہے ہیں، اتنا کچھ ہو رہا ہے مسلمان کی عزت کی ہر روز طرح طرح سے تذلیل جاری ہے اور مسلمان کی غیرت کو سلایا اور سہلایا جا رہا ہے، آج ہے ہمت کسی کے پاس کہ جہاد کا نام لے کر دکھائے؟ نہیں بلکہ اپنے ہی مسلمان افواج کے ہاتھوں مرنے کا شرف عطا ہو گا اسے دہشتگرد اور انتہا پسند کہا جائے گا یعنی ہمارا دشمن کامیاب ہو گیا، وہ جہاد کو دہشتگردی کہلوانے میں کامیاب ہو چکا۔ مسلمان کو امن کا سبق دے کر محبت کے جال میں پھنسا کر ان گنت نعشیں گرائی جا رہی ہیں۔

کون ہے دہشتگرد؟ کیا یہ جو ڈراموں اور چینلز پہ داڑھی والوں کو دہشتگرد کہا جاتا ہے، وہ ہیں دہشتگرد؟ اوئے مت ماری گئی اے تیری! رب کی قسم! تیری سوچ ہی یہی بنائی جا رہی ہے کہ یہ داڑھیوں والے ہی دہشتگرد ہیں۔ ذرا اپنے کلین شیو، کالا کو لا لگائے ہوئے حکمرانوں میں بھی دیکھ اگر وقت ملے تو اپنے لکھاریوں میں بھی دیکھ، اگر وقت ملے تو صحافیوں اور ڈاکٹرز میں بھی دیکھ۔

دہشتگردی۔۔۔ غزہ فلسطین میں، بغداد عراق میں روہنگیا برما میں کی جائے تو وہ کیا ہے؟ غوطہ شام میں یا مقبوضہ کشمیر میں مسلمان حوا کی بیٹی لوٹی جائے، بوسنیا مسلمان کے بچوں کو مشینوں میں کاٹ کر چارہ بنا دیا جائے تو کیا ہے؟ اور اگر یورپ میں ایک پٹاخہ بھی پھٹ جائے تو مورد الزام مجھے ٹھہرایا جاتا ہے

کیوں؟ ہمارے خون کی کوئی قدر و منزلت نہیں؟ ان کی شاہراہوں، کتوں بلیوں کی ہمارے جسموں سے بھی زیادہ قدر ہے، مسلمان کہاں ہیں؟ کیا مسلمان ایسے ہوتے ہیں، جیسے میں اور ہم ہیں؟ مسئلہ کہاں ہے، مسئلہ ختم کیوں نہیں کیا جاتا؟؟ ہمارے تمام اسلامی ممالک کی افواج اسلام کی کارکردگی اور ایمان پر رب العزت کی قسم ایک سوالیہ نشان ہے؟؟؟؟ مجھے تو لگتا ہے، میں لاش ہوں، کھاتی پیتی، چلتی پھرتی لاش کیونکہ زندگی تو وہ ہے جس میں زندہ رہا جائے اور زندہ ہونے کا ثبوت دیا جائے ۔شائد مجھے اس لیے لگتا ہے کہ میں ایک بے حس لاش ہوں جس کے ساتھ جو مرضی چاہے رویہ رکھے۔

سوال ایک آپ سے بھی ہے کہ کیا میں تنہا لاش ہوں یا آپ پر بھی یہی گزر رہی ہے مجھے تو خوف آتا ہے ایسی زندگی سے۔ اگر آپ پر یہی گزر رہی ہے تو آؤ مر جائیں۔ روہنگیا، غزہ، غوطہ، یمن، مقبوضہ کشمیر کے مظلوم و مقہور اور معصوم بچوں، بہنوں اور بھائیوں کو بچانے کیلئے وگرنہ ان کی چیخوں، فریادوں کی دہلا دینے والی آواز آسمانوں تک پہنچ چکی ہے، جس کے جواب میں ہی یہ ان دیکھا جرثومہ کرونا کی شکل میں ہمارے تعاقب میں آیا تھا۔ وقتی طور پر سب ہی دبک کر بیٹھ گئے، خوف کی ایسی لہر چلی کہ نیویارک،، پیرس، لندن کی مصروف ترین سڑکیں ویران ہو گئیں، مساجد اور دیگر تمام عبادت گاہیں اپنے ہاتھوں بند کرنی پڑ گئیں، حرمین شریفین میں داخلہ ممنوع ہو گیا، سالانہ حج پر پابندی لگ گئی کیونکہ سامنے موت نظر آ رہی تھی۔ خوب گڑگڑا کر دعائیں کیں لیکن جونہی اس وبا پر قابو پایا تو ہمارے لچھن پہلے سے زیادہ نافرمانی کی طرف مائل ہو گئے۔ غزہ میں جاری قیامت خیز مناظر ابھی تک بند نہیں ہوئے لیکن ہمارے مقتدر اشرافیہ نے سارے ملک میں چھٹی کر کے آگاہ کیا کہ ہم آج ہی کے دن ایٹمی قوت کے حامل بن گئے تھے لیکن کیا کروں جب قرآن کے اس پیغام کی طرف نگاہ دوڑاتا ہوں تو بدن میں جھرجھری پیدا ہو جاتی ہے کہ مرے رب کا تو فرمان ہے:

وَ مَالَكُمۡ لَاتُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ الَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ الظَّالِمِ اَهۡلُهَا ۚ وَاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ نَصِيۡرًا:

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچّوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔

لیکن ہم تو زمینی حقائق سے نظریں چرانے میں عافیت سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ غیبی امداد نہ اسپین پہنچی، نہ خلافت عثمانیہ کو بچانے کیلئے آئی، نہ اسرائیل کا قیام روکنے کیلئے آئی اور نہ ہی اب ہماری آنکھوں کے سامنے غزہ کے پرخچے اڑتے ہوئی آئی، نہ بابری مسجد کے وقت آئی، نہ عراق اور شام کے وقت آئی، نہ روہنگیا میں اللہ کے نام لینے والے بے بس مسلمانوں کے ذبح ہوتے ووتے وقت آئی، نہ گجرات کے وقت آئی، نہ مقبوضہ کشمیر کیلئے آئی لیکن عجب وقت ہے کہ پھر بھی گھروں اور مسجدوں میں بیٹھ کر غیبی مدد کی صدائیں دی جا رہی ہیں؟ کوئی انہیں سمجھائے کہ غیبی مدد جنگ بدر میں آئی جب ہزار کے مقابلے میں 313 میدانِ جنگ میں اُترے۔ غیبی مدد جنگ خندق میں آئی جب اللہ کے محبوب ﷺ نے پیٹ پر 2 پتھر باندھے اور خود خندق کھودی اور میدانِ جنگ میں اُترے۔ غیبی مدد افغانستان میں آئی جب بھوکے پیاسے مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں میدانِ جنگ میں اُترے۔

دنیا کا قیمتی لباس پہن کر، مال و زر جمع کر کے، لگژری ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں بیٹھ کر (انہی کافروں کی بنائی ہوئی مصنوعات زیر استعمال لا کر)، جُھک جُھک کر لوگوں کے ہاتھ چومنے کی خواہش لے کر، لوگوں کی واہ واہ کی ہنکار کی خواہشات لئے مسجدوں کے منبروں پر بیٹھ کر بددعائیں کر کے غیبی مدد کے منتظر

ہیں؟ طاغوت کے نظام پر راضی اور پھر غیبی مدد کے منتظر؟؟؟؟؟ اللہ کی زمین پر اللہ اور اُس کے محبوب ﷺ کے نظام کے نفاذ کی جدوجہد کی بجائے صرف نعت خوانی، محفلِ میلاد یا تسبیح کے دانوں کو دس لاکھ بیس لاکھ گھما کر غیبی مدد کے منتظر ہیں؟ آفاقی دین کو چند جزئیاتِ عبادت میں محصور و مقید کر کے غیبی مدد کے منتظر ہیں؟

خود کو اور دوسرے مسلمانوں کو مجاہد بنانے کی بجائے مجاور بنا کر، خوب پیٹ بھر کر فربہ جسم لئے غیبی مدد کے منتظر ہیں؟ جہاد فی سبیل اللہ اور جذبہ شہادت سے دُور رہ کر اور دُور رکھ کر مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و جبر اور مصائب و مشکلات دیکھ کر اللہ دشمن کو غرق کر دے۔ اللہ دشمن کو تباہ و برباد کر دے۔ یا اللہ مظلوموں کی مدد فرما۔ یا اللہ دشمنوں کو ہدایت عطا فرما دے اور اگر اُن کے نصیب میں ہدایت نہیں تو انہیں غرق کر دے جیسی بد دعاؤں پر اکتفاء کر کے سکوت اختیار کر لینے اور سکون سے نوالہ تر حلق سے نیچے اُتار کر پھر دوبارہ پیٹ بھر کر گہری نیند سونے والے غیبی مدد کے منتظر ہیں؟ یعنی سب کچھ اللہ کے ذمہ لگا کر اور خود کنارہ کشی اختیار کر کے غیبی مدد کے منتظر ہیں؟ میدان جہاد میں اُترنے سے ڈرتے اور کتراتے ہوئے آسمانوں سے فرشتوں کے نازل ہو کر مسلمانوں کی غیبی مدد کے منتظر ہیں؟

ایسی صورت میں غیبی مدد نہیں صرف عذاب ہی آئے گا جو ہم ناعاقبت اندیش حکمران، بد اندیش افسران، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، جھوٹ، کم تولنا، ملاوٹ، خود غرضی و دیگر معاشی و معاشرتی برائیوں کی شکل میں بھگت بھی رہے ہیں! خواب غفلت سے بیدار ہوں، علم، کردار و جہد مسلسل سے اپنے مہربان رب سے رجوع اور مدد طلب کریں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میری یہ فریاد بغور پڑھیں تاکہ آپ بھی میری اس فریاد میں شامل ہو سکیں۔ میرے مضطرب دل کیلئے دعا بھی فرمائیں کہ میرا رب روز قیامت مجھے رسول اکرم ﷺ کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالے آمین

بروز جمعرات 29 ذوالقعد 1445ھ 6 جون 2024ء

کیا دل ٹوٹنا ضروری ہے؟

اس وقت قوم بالخصوص نوجوان نسل اور حساس افراد بڑے مایوس اور دل شکستہ نظر آتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دل کا ٹوٹنا بھلا کوئی آسان بات تھوڑی ہے؟ کیا یونہی اس کی قیمت چکائی جاسکتی ہے؟ دل دنیا کی واحد شے ہے جس کی قیمت ٹوٹنے کے بعد کئی گنا بڑھ جاتی ہے، قیمت بڑھ جائے اور ایسی بڑھے کہ آواز آئے "اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ" کہ ہم ٹوٹے ہوئے دلوں میں رہتے ہیں۔ کیا اس مقام کو حاصل کرنے والا کوئی للو پنجو ہو سکتا ہے؟

دل ٹوٹے، کئی حصوں میں تقسیم ہو اور تقسیم شدہ یہ پارچے تخت الٰہی بن جائیں، کیا یہ یونہی ہو جائے گا؟؟ درد نہ دکھ؟ تکلیف نہ کوفت؟ پیڑ نہ پنچائت؟ غم نہ گھٹن؟ آلام نہ مصائب؟ واہ واہ واہ۔ مقام اور عہدے بھلا یونہی مل جاتے ہیں؟ اور پھر یوں ملے عہدوں کی وقعت ہی کیا؟ خواہ مخواہ ملے مرتبے کی حیثیت ہی کیا؟ مل بھی جائے تو ایسے مقام کی اہمیت ہی کیا؟ مقام کی وقعت، حیثیت، اہمیت حتٰی کہ افادیت کا اندازہ ہوتا ہی نہیں، ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ درد کی نیلی نیلی آگ میں تپ کر محبت کا مجسمہ عشق کے راستے سے ہوتے ہوئے دل کے ٹوٹنے تک کی منزل پر نہ پہنچ جائے۔ دل ٹوٹنا ضروری ہے، لازمی ہے، ناگزیر ہے، کہ ٹوٹے دل ہی میں تو "اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ" کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، تخت لگتا ہے، بادشاہ بیٹھتا ہے، فیصلے ہوتے ہیں، کتنوں کی قسمتوں کے فیصلے، مقدر کے فیصلے۔ لہٰذا دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹنے دیجیے، ہنستے مسکراتے ٹوٹنے دیجیے۔ ٹوٹا ہوا دل جوڑنا سکھا دے گا اور جس دن آپ کو جوڑنا آگیا نہ تو کچھ ایسا نہیں رہے گا جو آپ نہ کر سکیں، ٹوٹنے دیجیے دل، ٹوٹنے دیجیے۔

تاہم اس قیامت کا ذکر کرنا بھی از حد ضروری ہے کہ ہم نے ایسی حکومت کو بھی بھگتا ہے جو کھلے عام عوام کے سامنے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ حکومت کے پہلے 100 دنوں میں آئی ایم ایف کے منہ پر 200 / ارب ڈالر مار کر ان سے نجات حاصل کر لیں گے لیکن جب حکومت سنبھالی تو اپنی کابینہ سے نیا ترمیمی ایکٹ 2021 برائے سٹیٹ بینک پاس کر کے سارا اسٹیٹ بینک ہے آئی ایم ایف کے منہ پر مار دیا گیا جو ابھی تک غلامی کی چادر تلے کام کرنے پر مجبور ہے۔ اُس حکومت نے ملک میں سائنسی، علمی، زرعی اور دیگر علوم کی ترویج کیلئے کام کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن کیا اپنے دورِ حکومت کے پہلے یوم پاکستان 23 مارچ کو تقسیم ہونے والے ایوارڈ میں ان ترجیحات کو مد نظر رکھا گیا۔ کیا کوئی ایک ایوارڈ بھی علمی، سائنسی، زرعی یا دیگر کسی ادارے کیلئے کام کرنے والے کسی ریسرچ اسکالر کو ملا؟

ہماری قوم نے تو صدرِ پاکستان عارف علوی کو ریشم اور مہوش کو اچھا ناچنے گانے پر اپنے دستِ مبارک سے صدارتی ایوارڈ سے نوازتے دیکھا۔ اسی طرح درجن سے زائد ڈوم میراثی افراد میں ایوارڈ تقسیم کر کے قومی ایوارڈوں کی بے توقیری کر دی گئی۔ یاد رہے کپتان نے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ریاست مدینہ بناؤں گا۔ انہوں نے مولانا طارق جمیل کو یہ ایوارڈ دیکر مدینہ کا دامن نہیں چھوڑا۔ مولانا طارق جمیل کا کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ ایوان اقتدار میں لاہوری قادیانی شوکت عزیز ہو، فاسق کمانڈو پرویز مشرف یا عمران خان، یہ سب کو تبلیغ کے نام پر سلام کرنے ضرور تشریف لیجاتے ہیں اور جب ملاقات کے بعد ایوان اقتدار سے باہر تشریف لاتے ہیں تو انہیں اسلام اور پاکستان کے سچے خادم کا سرٹیفکیٹ دینا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

ہماری قوم کی یہ بدقسمتی بھی ملاحظہ ہو کہ جن سیاسی رہنماؤں کی گاڑیوں کے آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتے تھے حالانکہ وہ عدالتوں میں اپنی بدعنوانی اور قومی دولت کو بے رحمی سے لوٹنے کے جرم میں پیش ہونے جا رہے ہوتے تھے، وہ جب اقتدار میں پہنچے تو انہوں نے بھی

"مارے کو ماریں شاہ مدار" کے ہتھیار سے قوم کو ذبح کر کے رکھ دیا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں مہنگائی کے ہاتھوں بلبلانے والی کروڑوں افراد کیلئے قومی خزانے سے رمضان الکریم کے ایک پیکج کا اعلان ہوا تو فوری طور پر آٹے کے تھیلے پر میاں نواز شریف کی تصویر پرنٹ کر کے اسے آج کے دور کا "حاتم طائی" پینٹ کرنے کی کوشش کی گئی تو مجبور و مقہور عوام کو اس تذلیل سے بچانے کیلئے عدالت کو اس میں مداخلت کرنا پڑ گئی لیکن اس کے باوجود اپنے مہربان کو محض کروڑوں روپے اس پراجیکٹ کی تشہیر کیلئے عطا کر دیئے گئے۔ جب متعلقہ محکمہ کی ایماندار خاتون افسر نے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا تو اس خاتون سمیت مزید دس افسارن کو "او ایس ڈی" کا پروانہ تھما دیا گیا اور آنے والے متعلقہ افسر نے کروڑوں روپے کی واگزاری میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔

ایک دوزخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے نکلے

حاجیوں کی تعداد کے لحاظ سے پاکستان دنیا میں دوسرے نمبر پر اور عمرہ کرنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ہے جبکہ دنیا بھر میں ایمانداری کے انڈکس کے مطابق پاکستان کا 160 نمبر ہے، ورلڈ جسٹس پراجیکٹ کی سالانہ رپورٹ میں پاکستانی عدالتی نظام کو قانون کی حکمرانی کی پابندی کرنے والے ممالک میں سب سے نچلے نمبر 139 ممالک میں سے 130 واسے 130 ویں نمبر پر رکھا گیا ہے۔ 1500 یونٹ کو 500 یونٹ لکھنے والا رشوت خور میٹر ریڈر، خالص گوشت کے پیسے وصول کر کے ہڈیاں بھی ساتھ تول دینے والا قصائی، خالص دودھ کا نعرہ لگا کر ملاوٹ کرنے والا دودھ فروش، بے گناہ کی ایف آئی آر میں دو مزید ہیروئین کی پڑیاں لکھنے والا انصاف پسند ایس ایچ او، گھر بیٹھ کر حاضری لگوا کر حکومت سے تنخواہ لینے والا مستقبل کی نسل کا معمار استاد، کم ناپ تول کر پورے دام لینے والا دوکاندار، 100 روپے کی رشوت لینے والا عام معمولی سا سپاہی، معمولی سی رقم کیلئے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے والا وکیل، سو روپے کے سودے میں دس روپے غائب کر دینے والا بچہ، آفیسر کیلئے رشوت میں سے اپنا حصہ لے جانے والا معمولی سا چپڑاسی، کھیل کے بین الاقوامی مقابلوں میچ فکسنگ کر کے ملک کا نام بدنام کرنے والا کھلاڑی، ساری رات فلمیں دیکھ کر سوشل میڈیا پر واہیات اور جھوٹ پر مبنی پروپیگنڈے کو آگے بڑھانے والا اور فجر کو اللہ اکبر سنتے ہی سونے والا نوجوان، کروڑوں کے بجٹ میں غبن کر کے دس لاکھ کی سڑک بنانے والا ایم پی اے اور ایم این اے، لاکھوں غبن کر کے دس ہزار کے ہینڈ پمپ لگانے والا جابر ٹھیکدار، ہزاروں کا غبن کر کے چند سو میں ایک نالی پکی کرنے والا ضمیر فروش کونسلر، غلہ اگانے کیلئے بھاری بھر کم سود پہ قرض دینے والا ظالم چودھری، زمین کے حساب کتاب و پیمائش میں کمی بیشی کر کے اپنے بیٹے کو حرام مال کا مالک بنانے والا پٹواری اور ریونیو آفیسر، ادویات اور لیبارٹری ٹیسٹ پر کمیشن کے طور پر عمرہ کرنے والے ڈاکٹر، اپنے قلم کو بیچ کر پیسہ کمانے والا صحافی، منبر رسول پر بیٹھ کر دین کے نام پر چندے اور نذرانے والے مولوی اور پیر صاحبان، جب ہر کوئی کشتی میں اپنے حصے کا سوراخ کر رہا ہو تو پھر یہ نہیں کہنا چاہئے کہ فلاں کا سوراخ میرے سے بڑا تھا، اس لئے کشتی دوب گئی! ہم سب قصوروار ہیں اور ہر کوئی سوشل میڈیا کو بغیر تحقیق کے بے تحاشہ استعمال کر کے خود کو بری الذمہ سمجھتا ہے اس دور میں اگر ہم پر نئے اور پرانے پاکستان کی گردان کرنے والے سیاستدان مسلط ہیں، تو یہ ہمارے اعمال کی سزا نہیں تو اور کیا ہے؟

لاس اینجلس کے ڈاکٹر ابراہام نے انسانی روح کا وزن معلوم کرنے کیلئے نزع کے شکار لوگوں پر پانچ سال میں بارہ سو تجربے کیے۔ اس سلسلے میں اس نے شیشے کے باکس کا ایک انتہائی حساس ترازو بنایا، وہ مریض کو اس ترازو پر لٹاتا، مریض کی پھیپھڑوں کی آکسیجن کا وزن کرتا، ان کے جسم کا وزن کرتا اور

اس کے مرنے کا انتظار کرتا تھا- مرنے کے فوراًبعد اس کا وزن نوٹ کرتا۔ڈاکٹر ابراہام نے سینکڑوں تجربات کے بعد اعلان کیا کہ انسانی روح کا وزن 21 گرام ہے۔ گویا انسانی روح اس 21 گرام آکسیجن کا نام ہے جو پھیپھڑوں کے کونوں، کھدروں، درزوں اور لکیروں میں چھپی رہتی ہے، موت ہچکی کی صورت میں انسانی جسم پر وار کرتی ہے اور پھیپھڑوں کی تہوں میں چھپی اس 21 گرام آکسیجن کو باہر دھکیل دیتی ہے، اس کے بعد انسانی جسم کے سارے سیل مر جاتے ہیں اور انسان فوت ہو جاتا ہے۔ ہم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ 21 گرام کتنے ہوتے ہیں؟؟21 گرام مکئی کے 14 چھوٹے سے دانے ہوتے ہیں ،ایک ٹماٹر، پیاز کی ایک پرت، ریت کی 6 چٹکیاں اور پانچ ٹشو پیپر ہوتے ہیں لیکن ہم بھی کیا لوگ ہیں کہ 21 گرام کا انسان خود کو کھربوں ٹن وزنی کائنات کا خدا سمجھتا ہے۔ یہ ہے مجھ سمیت سب انسانوں کی اوقات۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر روح کا وزن 21 گرام ہے تو ان 21 گراموں میں ہماری خواہشوں کا وزن کتنا ہے؟ اس میں ہماری نفرتیں، لالچ، ہیرا پھیری، چالاکی، سازشیں، ہماری گردن کی اکڑ، ہمارے لہجے کے غرور کا وزن کتنا ہے؟ یہ 21 گرام کا انسان جو خود کو 21 گرام کے کروڑوں انسانوں کا حاکم سمجھتا ہے، وقت کو اپنا غلام اور زمانے کو اپنا ملازم سمجھتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ بس ذرا سی تپش، بس ذرا سی ایک ہچکی ہمارے اختیار ہمارے اقتدار ہماری اکڑ، غرور اور چالاکی کی موم کو پگھلا دے گی اور جب یہ 21 گرام ہوا ہمارے جسم سے باہر نکل جائے گی تو ہم تاریخ کی سلوں تلے دفن ہو جائیں گے اور 21 گرام کا کوئی دوسرا انسان ہماری جگہ لے لے گا۔

ہائے یہ انسان! جو مڑ کر اپنی ہی کمر کا تل تو دیکھ نہیں سکتا اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں زمین پر چلنے والے ہر کیڑے کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ یہ ہے ہماری اوقات.....!

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۚ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴿286﴾

﴿ایمان لانے والو! تم یوں دُعا کرو﴾ اے ہمارے ربّ! ہم سے بھول چُوک میں جو قصور ہو جائیں، ان پر گرفت نہ کرنا۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تُو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ آمین یارب العالمین

بروز جمعتہ المبارک 29 ذوالقعد 1445ھ 6 جون 2024ء

اسرائیل آخری سانسیں لے رہا ہے

میری انتہائی سادہ دیہاتی، سفید ان پڑھ ماں، عجیب سی باتیں کرتی تھی "دل کی آنکھ سے دیکھ، دل کے کان سے سن" میں نے انہی سے سنا تھا۔ بہت جری اور بہادر، اب تو نئی نسل کی بچیاں چھپکلی اور معمولی سے کیڑوں کو سامنے دیکھ کر اپنے اوسان خطا کر دیتی ہیں اور اپنی چیخوں سے سے آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں، لیکن کیا مجال کہ رات کا گھپ اندھیرا یا کبھی بادلوں کی کڑکتی گرج چمک سے انہیں کبھی خوف آیا ہو۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خوف جیسی کوئی شئے بھی ان سے خوفزدہ ہے۔ سفید موتئے کی کلیوں یا گلاب کے پھولوں کو ایک بڑی تھالی میں رکھ کر ان سے باتیں کرنا ان کا ایک معمول تھا۔ میں ان سے کبھی پوچھتا کہ "ماں جی! کیا یہ آپ کی باتیں سنتے ہیں" تو فوراً مسکرا کر فرماتیں کہ "یہ نہ صرف سنتے ہیں بلکہ سمجھتے بھی ہیں، تجھے جس دن ان سے کلام کرنا آ گیا پھر دیکھنا تجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ خفا بھی ہو جاتے ہیں یہ تو..... یہ پودے، درخت اور پھل پھول بہت لاڈلے ہوتے ہیں، بہت پیار چاہتے ہیں، اسی لئے اکثر ماں باپ اپنی اولاد کو پھول کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ "میں خاموش رہتا، کچھ سمجھ میں نہ آتا لیکن اب کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں اور شائد یہ انہی کی دعاؤں کا ثمر ہے۔

شوہر کا انتقال ہو گیا تو سب بچوں کی باپ بھی بن گئیں۔ بڑی سی چادر میں لپٹا ہوا رعب دار چہرہ، جس نے گھر کے تمام امور کو خود اعتمادی کے ساتھ سنبھالا دیا حالانکہ شوہر کی موجودگی میں کبھی بھی گھر سے باہر قدم تک نہیں نکالا کہ رسول اکرم ﷺ کے اس مبارک قول کو دہرایا کرتی تھیں کہ "بازار شیطان کی آماجگاہ ہے"، اس کے شر سے بچنے کیلئے گھر میں ہی رہنا عافیت ہے۔ کبھی نہیں جھکیں، سماج کو کئی مرتبہ جھکتے دیکھا۔ اپنے شوہر کی طرح مجبوروں کیلئے انکار تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ جہاں سے گزرتیں، لوگ سر جھکا کر سلام کرتے، لمحہ بھر رک کر ان کی خیریت دریافت کرتیں، "بالکل شرم نہ کرنا، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا" ان کی گفتگو کا یہ آخری جملہ ہوتا اور وہاں سے آگے بڑھ جاتیں۔

سب بچوں کی پڑھائی اور دوسرے معمولات پر مکمل اور گہری نظر، مجال ہے کوئی عمل ان سے پوشیدہ رہ سکے۔ وہ اکثر میرے کپڑے اس انداز اور نزاکت سے دھوتیں کہ ان کو بھی کہیں چوٹ نہ آ جائے جبکہ اس زمانے میں مشینی واشنگ مشین کا تصور تک نہیں تھا۔ میں اکثر ان کے پاس بیٹھ جاتا اور کسی کتاب یا اخبار سے کوئی کہانی قصہ پڑھ کر ان کو سناتا رہتا لیکن اس کہانی یا قصہ پر ان کا تبصرہ سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ میری ماں بالکل ان پڑھ ہے اور جس طرح وہ ہماری تعلیم میں دلچسپی کا اظہار فرماتی تھیں تو محسوس یہی ہوتا تھا کہ میری ماں بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک دفعہ میں سامنے بیٹھا کچھ سنا رہا تھا کہ اچانک ایک پتھر میری پشت کی طرف دیوار پر دے مارا۔ میں اس اچانک عمل پر خوفزدہ ہو گیا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک زہریلا کیڑا تھا جو اس پتھر کی ضرب سے کچلا گیا۔ وہ غضب ناک شیرنی لگ رہی تھیں۔ "ماں جی! اس نے آپ کا کیا نقصان کیا تھا کہ آپ نے اس کا یہ حشر کر دیا"۔ "کچھ نہیں، خاموش رہو" میرے اس سوال پر مجھے سینے سے چمٹا کر بولیں "یہ اگر میرے پھول کو کاٹ لیتا تب کیا کرتی؟" کچھ لوگ بھی بہت معصوم لگتے ہیں لیکن ان میں زہر بھرا ہوتا ہے، ڈس لیتے ہیں پھر بھی نا آسودہ رہتے ہیں" ہاں! یہ میں نے انہی سے پہلی دفعہ سنا اور سیکھا تھا اور عملی زندگی میں ان کا یہ ناصحانہ مشاہدہ بالکل درست پایا۔ زندگی بھر یہی ان کا عمل رہا، بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھیں، ہر دم نبرد آزما..... سماج سے، وقت سے، حالات کے جبر سے۔

ہم سب کو رات جلد سونے کا حکم تھا لیکن خود کب سونے کیلئے جاتی تھیں، کسی کو علم نہیں تھا۔ یہ پتہ ہے کہ صبح چار بجے اٹھ کر عبادات سے فارغ ہو کر گھر

کے کام کاج میں مصروف ہو جاتیں تھیں اور سب کو فجر کی نماز پڑھنے اور قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام سختی سے کرواتی تھیں۔ صبح سویرے اٹھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی سارے گھر کی باقاعدگی کے ساتھ نگرانی کر رہا ہے۔ اپنے پالتو کتے کو ہر روز شاباش دیتی کہ ساری رات تم نے کس قدر ذمہ داری سے اپنی ڈیوٹی نبھائی۔ ہم سے پہلے اس کو باقاعدہ ناشتہ اور کھانا دیتی تھیں۔ اس کی صفائی ستھرائی کا بھی ایسا خیال رکھتی تھیں کہ جیسے یہ بھی گھر کا بہت ہی اہم فرد ہے۔ اس سے یوں باتیں کرتیں جیسے وہ اسی ستائش کا منتظر ہے۔ ایک فاصلے پر سر جھکائے کھڑا، کیا مجال کہ اپنی حدود سے تجاوز کرے۔ ایک مرتبہ اس کو سمجھا دیا کہ دہلیز کے اس پار رہنا ہے۔ بس ساری عمر گرمی ہو یا سردی، کوئی بہانہ بنائے بغیر، خاموشی کے ساتھ اپنے فرائض بجالاتا رہا اور اپنی مالکہ کے احکام کی تعمیل کی! اس کتے نے تو وفاداری کی ایک ایسی مثال قائم کر دی کہ ماں جی کے انتقال کے اگلے دن ہی وہ بھی اس دنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا بلکہ ماں جی اپنی علالت کے آخری دنوں میں ہسپتال میں بھی اس کے کھانے پینے کا خیال رکھنے کا حکم دیا کرتی تھیں، اس لئے وہ بھی ماں جی کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر ان کا فراق برداشت نہ کر پایا۔ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ سب کچھ میری ماں نے کہاں سے سیکھا جس نے آج تک کسی کتاب کو چھوا تک نہیں، کسی مکتب کو دیکھا تک نہیں کہ ایک پالتو جانور نے بھی وفا کا حق ادا کر دیا جبکہ ہمارے دن کا آغاز ہی عہد شکنی سے شروع ہوتا ہے اور رات بستر تک جانے تک ہمارا یہ فعل جاری رہتا ہے... یہ کیا اسرار تھا؟

اب اس کی جتنی گہرائی میں جاتا ہوں، عقل و دانش کے نئے نئے پرت کھلتے جاتے ہیں۔ ان کے جملوں کی سادگی میں چھپی حکمت اور حلاوت آج پھر شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ وہی محبت میں گندھی ہوئی ماں، جب بھی لکھنے کیلئے الفاظ کم پڑتے ہیں، فوراً اپنی کسی یاد کے آنچل سے نمودار ہو کر اسی طرح میرا ہاتھ پکڑ کر لکھنا شروع کر دیتی ہے جس طرح بچپن میں تختی پر لکھوانے کی مشق کرواتی تھیں۔

ان کی اپنی ایک کابینہ تھی۔ اڑوس پڑوس کی کئی عورتیں اپنے دکھوں کا غم ہلکا کرنے کیلئے موجود رہتی تھیں۔ ایک دن میں نے ان کو یہ کہتے سنا "چھوڑو بہن، دفع کرو اسے، بے غیرت پچاس بھی ہوں تو کیا کرنا، غیرت مند تو ایک بھی بہت ہے، جو اپنے گلے کی حفاظت نہ کر سکے وہ چرواہا کیسا"۔ ہم سب پچھلی سات دہائیوں سے غزہ پر خوفناک بمباری کے دلدوز مناظر دیکھ ہی رہے تھے لیکن گزشتہ برس 7/ اکتوبر سے دل دہلا دینے والے قیامت خیز مناظر ایک لمحے کیلئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو رہے لیکن عالم اسلام کے کسی حکمران کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ صابرہ اور شتیلہ بھی مجھے یاد ہیں، مجھے بوسنیا بھی نہیں بھولا، بھارتی گجرات کا احمد آباد اور کشمیر بھی دل کی دھڑکنوں کو بند کرنے کیلئے کافی ہے، عراق اور افغانستان کا حشر تو ساری دنیا کے سامنے ہے۔ کیسی کیسی لہو رنگ تصویریں ہیں اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کی زینت.....!

پھول اور کلیاں خوں میں نہائی ہوئی، معصومیت بیدردی سے قتل ہو رہی ہے، کڑیل نوجوانوں کو درگور کرنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، نسل کشی کرنے والے ہنس رہے ہیں، کھیل رہے ہیں انسانیت کے ساتھ۔ مہلک ترین ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں، ٹنوں وزنی بارود برساتے ہوئے انہوں نے کچھ نہیں دیکھا، آگ و خون کی ہولی کھیلنے میں مصروف رہے۔ نیتن یاہو کتنے جوش اور تکبر سے کہہ رہا تھا کہ ابھی تو شروعات ہیں، آگے آگے دیکھتا جا، ہم انہیں زمین سے اس طرح مٹا دیں گے کہ تاریخ میں بھی ان کا ذکر باقی نہیں رہے گا" لیکن 8 ماہ گزر جانے کے باوجود اپنے یرغمالیوں تک نہیں پہنچ سکا اور اب امریکا اپنی ناجائز اولاد کے تحفظ کیلئے اک نئے سفارتی جال کے ساتھ میدان میں اترا ہے۔

جو بائیڈن نے اسرائیل، حماس جنگ بندی کا نیا منصوبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ تنازع کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ اور موقع ہے اور حماس کو اسے فوری قبول کر لینا چاہئے۔ یہ مجوزہ منصوبہ تین مراحل پر مشتمل ہے جس میں پہلے چھ ہفتے مکمل جنگ بندی ہو گی اور اسی دوران اسرائیلی فوجوں کا انخلاء

ہو گا اور یرغمالیوں اور سینکڑوں فلسطینی قیدیوں کا تبادلہ ہو گا۔ اس منصوبے کے تحت فلسطینی شہری غزہ واپس جائیں گے اور غزہ میں روزانہ 600 / امدادی ٹرک روزمرہ استعمال کی اشیاء لیکر آئیں گے۔ دوسرے مرحلے میں حماس اور اسرائیل جنگ کے مستقل خاتمے کی شرائط طے کریں گے اور جب تک مذاکرات جاری رہیں گے، مکمل جنگ بندی رہے گی۔ اور تیسرے مرحلے میں غزہ کی تعمیرِ نو ہو گی۔ حماس نے فی الحال ان تجاویز کو مثبت قرار دیا ہے۔

ادھر اردن نے ہنگامی بنیادوں پر اعلان کیا ہے کہ 11 جون کو وہ غزہ جنگ کی صورت حال کے بارے میں انسانی ہمدردی کی ایک ہنگامی سربراہی بین الاقوامی کانفرنس کی میزبانی کرے گا۔ عرب میڈیا کے مطابق مسئلہ فلسطین حالیہ غزہ جنگ میں ایک اہم فریق کے ناطے اردن کافی متحرک ہے، شاہ اردن نے دوبار امریکا کا دورہ بھی کیا ہے، جبکہ امریکی وزیر خارجہ بلنکن و دیگر حکام کئی بار اردن آ چکے ہیں تاہم اب اردن نے مصر اور اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر ہنگامی سربراہی کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس مجوزہ کانفرنس میں ڈونر ملکوں اور اداروں کو بطور خاص شرکت کیلئے مدعو کیا جائے گا۔
اس سے قبل بھی غزہ میں امداد لانے کے بہانے فلسطینی مزاحمت پر فوری جنگ بندی قبول کرنے کیلئے دباؤ ڈالنے کیلئے امریکی محکمہ خارجہ کی جانب سے بعض عرب ممالک بالخصوص مصر اور قطر کے ساتھ گہرے اور فوری رابطے کیے گئے تھے!! سچ تو یہ ہے کہ اس جنگ بندی کی فوری طور پر اسرائیل کی طرف سے امریکا سے درخواست کی گئی تھی تاکہ وہ اپنے فوجیوں اور گاڑیوں کو اس دلدل سے نکال سکے جو آج غزہ کی گلیوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ سینکڑوں گاڑیوں اور جانوں کے بھاری نقصان کی بناء پر سیکڑوں صیہونی فوجی غزہ کی گلیوں میں محصور ہو گئے ہیں اور واپسی کے سارے راستے بھی مسدود ہو گئے ہیں۔ عبرانی چینلز نے کئی اسرائیلی افسران اور فوجیوں کی بڑی تعداد کے مارے جانے کی خبریں نشر کرنا شروع کر دی ہیں جبکہ آج بھی غزہ کی گلیوں سے آخری سانس تک "فتح یا شہادت" کے نعرے سنائی دے رہے ہیں۔

مشہور صہیونی مصنف "اری شاوٹ" کا قومی سطح پر سب سے بڑا اور اہم عبرانی اخبار "ہاریٹیز" میں "اسرائیل اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا ہے جس نے ایک تہلکہ مچا دیا ہے لیکن نجانے مسلم ممالک کے اخبارات میں موت جیسی خاموشی چھائی ہوئی ہے کہ کسی نے ابھی تک اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

"اری شاوٹ" اپنے مضمون میں لکھتا ہے: ایسا لگتا ہے کہ ہم ان مشکل ترین لوگوں کا سامنا کر رہے ہیں جن کے بارے میں یہودی تاریخ کو معلوم نہیں ہے۔ ان کے پاس اپنے حقوق کو تسلیم کرنے اور قبضہ ختم کرنے کے سوا کوئی حل نہیں ہے اور اس کیلئے وہ اپنی جانوں، اولاد اور ہر قسم کی قربانی کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم واپسی کے نقطہ سے گزر چکے ہیں، اور "اسرائیل" کیلئے قبضہ ختم کرنا، آبادکاری کو روکنا اور امن کا حصول ممکن نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صیہونیت کی اصلاح، جمہوریت اور اس ملک میں لوگوں کی تقسیم کو بچانا اب ممکن نہیں رہا۔ اگر حالات ایسے ہی رہے تو اس ملک میں رہنے کا کوئی ذائقہ اور "ہاریٹیز" میں لکھنے اور پڑھنے کا قطعاً کوئی ذوق نہیں بچا ہے، اور ہمیں وہی کرنا چاہیے جو روجیل الفر نے دو سال قبل تجویز کیا تھا کہ جس خواب کی تعبیر کیلئے اسرائیل میں قیام کیلئے آئے تھے، اسی عجلت میں واپسی کا سفر کرنا ہو گا۔

اگر "اسرائیلیت" اور یہودیت شناخت کا ایک اہم عنصر نہیں ہیں، اور اگر ہر "اسرائیلی" شہری کے پاس غیر ملکی پاسپورٹ ہے، نہ صرف تکنیکی لحاظ سے، بلکہ نفسیاتی لحاظ سے بھی، تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ آپ کو دوستوں کو الوداع کہنا ہو گا اور سان فرانسسکو، برلن یا پیرس جانا ہو گا۔ وہاں سے، نئی جرمن انتہا پسند قوم پرستی کی سرزمین، یا نئی امریکی انتہا پسند قوم پرستی کی سرزمین سے، کسی کو سکون سے دیکھنا چاہیے اور "ریاست اسرائیل" کو اپنی

آخری سانسیں لیتے دیکھنا چاہیے۔ ہمیں تین قدم پیچھے ہٹ کر یہودی جمہوری ریاست کو ڈوبتے دیکھنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ ابھی تک حل نہ ہوا ہو۔ عین ممکن ہے کہ ہم ابھی تک پوائنٹ آف نوریٹرن سے نہیں گزرے ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ قبضے کا خاتمہ، آبادکاری روکنا، صیہونیت کی اصلاح، جمہوریت کو بچانا اور ملک کو تقسیم کرنا اب بھی ممکن ہے۔

"اری شاوٹ" مزید تحریر کرتے ہیں: میں نے نیتن یاہو، لائبرمین اور نو نازیوں کی آنکھ میں انگلی ڈالی تاکہ انہیں صہیونی فریب سے بیدار کیا جاسکے۔ ٹرمپ، کشنر، بائیڈن، براک اوباما اور ہلیری کلنٹن وہ نہیں جو قبضے کو ختم کریں گے۔ یہ اقوام متحدہ اور یورپی یونین نہیں ہے جو بستیوں کو روکے گی۔ دنیا کی وہ واحد طاقت جو اسرائیل کو خود سے بچانے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ خود اسرائیلی ہیں، جو ایک نئی سیاسی حقیقت کو تسلیم کرے اور یہ کہ فلسطینیوں کی جڑیں ہزاروں سال سے اس سرزمین میں ہیں۔ میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ زندہ رہنے کیلئے تیسرا راستہ تلاش کریں اور نہ مریں۔

"اری شاوٹ" نے تصدیق کی ہے: جب سے وہ فلسطین آئے ہیں، "اسرائیلیوں" نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ صہیونی تحریک کی طرف سے پیدا کردہ جھوٹ کا نتیجہ ہیں، جس کے دوران اس نے پوری تاریخ میں یہودیوں کے کردار میں تمام دھوکے کا استعمال کیا۔ ہٹلر نے جس چیز کو ہولوکاسٹ کہا تھا اس کا استحصال اور مبالغہ آرائی کرتے ہوئے، تحریک دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہی کہ فلسطین "وعدہ شدہ سرزمین" ہے اور یہ کہ مبینہ ہیکل سلیمانی مسجد اقصیٰ کے نیچے واقع ہے۔ اس طرح، بھیڑیا ایک بھیڑ کے بچے میں تبدیل ہو گیا جسے امریکی اور یورپی ٹیکس دہندگان کے پیسے سے دودھ پلایا گیا، یہاں تک کہ وہ ایٹمی عفریت بن گیا۔

مصنف نے مغربی اور یہودی ماہرینِ آثار قدیمہ سے مدد طلب کی، جن میں سے سب سے مشہور تل ابیب یونیورسٹی کے "اسرائیل فلنٹسٹائن" ہیں، جنہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ "ہیکل بھی ایک جھوٹ اور پریوں کی کہانی ہے جس کا کوئی وجود نہیں، اور تمام کھدائیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ یہ ہزاروں سال پہلے مکمل طور پر غائب ہو گیا تھا، اور یہ واضح طور پر یہودی حوالوں کی ایک بڑی تعداد میں بیان کیا گیا تھا، اور بہت سے مغربی ماہرین آثار قدیمہ نے اس کی تصدیق کی ہے۔ ان میں سے آخری 1968 میں برطانوی ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر کیتلن کابینوس تھیں، جب وہ یروشلم کے برٹش سکول آف آرکیالوجی میں کھدائی کی ڈائریکٹر تھیں۔ اس نے یروشلم میں کھدائی کی، اور اس نے مسجد اقصیٰ کے نیچے ہیکل سلیمانی کے آثار" کی موجودگی کو "اسرائیلی" خرافات" کا نام دیا جس کی وجہ سے اسے فلسطین سے نکال دیا گیا۔

جہاں میں نے فیصلہ کیا کہ ہیکل سلیمانی کا کوئی نشان نہیں ہے، اور میں نے دریافت کیا کہ جسے اسرائیلی "سلیمان کے اصطبل کی عمارت" کہتے ہیں، اس کا سلیمان یا اصطبل سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ ایک محل کا آرکیٹیکچرل ماڈل ہے جو عام طور پر فلسطین کے کئی خطوں میں تعمیر کیا گیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ "کیتھلین کینیون" فلسطین ایکسپلوریشن فنڈ ایسوسی ایشن کی طرف سے آئی تھی، کیونکہ اس نے "قریب مشرق" کی تاریخ کے بائبل کے بیانات کے حوالے سے برطانیہ میں 19 ویں صدی کے وسط میں زبردست سرگرمی دکھائی تھی۔

یہودی مصنف نے یہ کہتے ہوئے زور دیا: جھوٹ کی لعنت وہ ہے جو "اسرائیلیوں" کو پریشان کرتی ہے اور یہ دن بہ دن ایک یروشلم، خلیلی اور نابلسی کے ہاتھ میں چھری کی شکل میں ان کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے۔ "اسرائیلیوں" کو احساس ہے کہ فلسطین میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے، یہ ایسی سرزمین نہیں ہے جہاں لوگوں کو جھوٹ بول کر بلایا گیا تھا۔ یہاں ایک اور بائیں بازو کے صہیونی مصنف "جیڈون لیوی" جو فلسطینی عوام کے وجود کو نہیں بلکہ "اسرائیلیوں" پر ان کی برتری کو تسلیم کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ فلسطینیوں کی باقی دنیا سے فطرت مختلف ہے... ہم نے ان کی زمینوں پر قبضہ کیا اور ان کے نوجوانوں کو قاتل، دہشتگرد اور ان کی عورتوں کو طوائف کہا۔ اور منشیات کا مکروہ دھندہ بھی کیا گیا، اور ہم نے کہا کہ چند سال گزر جائیں گے، اور وہ اپنے وطن اور اپنی سرزمین کو بھول جائیں گے، اور پھر ان کی نوجوان نسل 1987 کی بغاوت کی شکل میں ہمارے مقابلے کیلئے آن موجود تھی۔

ہم نے انہیں جیلوں میں ڈالا اور ان پر بے پناہ تشدد کیا، ہم نے کہا کہ ہم انہیں جیلوں میں ہی مار دیں گے... برسوں بعد، جب ہم نے سوچا کہ انہوں نے سبق سیکھ لیا ہو گا لیکن وہ 2000ء میں مسلح بغاوت کے ساتھ واپس ہمارے مقابلے کیلئے آ گئے۔ اور ہم نے کہا: ہم ان کے گھروں کو گرا دیں گے اور کئی سالوں تک ان کا محاصرہ کریں گے، اور دیکھو، وہ محاصرے اور تباہی کے باوجود ہم پر حملہ کرنے کیلئے ناممکن سے میزائل نکال لائے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ان کیلئے علیحدگی کی دیوار اور خاردار تاروں سے منصوبہ بندی شروع کی..... اور دیکھو، وہ زمین کے اندر سے اور سرنگوں کے ذریعے ہم پر حملہ آور ہو کر بڑی قتل وغارت کر کے ہمیں بے بس بنا کر چلے گئے، یہاں تک کہ آخری جنگ کے طور پر ہم نے اپنے دماغ سے ان کا مقابلہ کیا، اور پھر انہوں نے "اسرائیلی "سیٹلائٹ (آموس) پر قبضہ کر لیا اور "اسرائیل" کے ہر گھر میں دھمکیاں نشر کر کے دہشت پھیلا دی، جیسا کہ اس وقت ہوا جب ان کے نوجوان "اسرائیلی" چینل 2 پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مصنف کے مطابق بین السطور یہ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ ہم تاریخ کے مشکل ترین لوگوں کا سامنا کر رہے ہیں جن کیلئے کچھ بھی ناممکن نہیں، اور ان کیلئے اپنے حقوق کو پہچاننے اور قبضے کو ختم کرنے کے سوا کوئی دوسرا حل نہیں ہے۔

ادھر دوسری طرف فلسطین کے حق میں مظاہرہ کرنے والوں نے نیویارک کے بروکلین میوزیم پر قبضہ کر کے اس پر فلسطین کا پرچم لہرا دیا۔ مظاہرین کو میوزیم سے نکالنے کی کوشش کے دوران پولیس اور مظاہرین میں جھڑپیں ہوئیں۔ متعدد افراد زخمی ہوئے جبکہ پولیس نے چند مظاہرین کو گرفتار بھی کر لیا۔ غیر ملکی خبر رساں ادارے کے مطابق بروکلین میوزیم کے باہر لگے ہوئے ایک مجسمے پر مظاہرین نے اسپرے بھی کر دیا۔ ہاں! وائٹ ہاؤس اور مغربی آقاؤں کی لونڈی اقوام متحدہ نے تو ہلکی سی مذمت بھی کرنا چھوڑ دی ہے۔ دنیا بھر میں ہونے والے مظاہروں کی بھی کسی کو پرواہ نہیں۔ وہ کوئی اصول اور کوئی ضابطہ نہیں مانتے۔ دنیا بھر کے اصول وضابطے صرف امت مسلمہ کیلئے ہیں لیکن قدرت کا انتقام دیکھیں کہ خود مشہور اور نامور اسرائیلی یہودی جو صہیونیت کے بڑے علمبردار ہیں، انہوں نے اپنی تحریروں میں اسرائیل کے آخری سانسوں کا تذکرہ کر کے حقیقت واضح کر دی ہے۔

ناروے، آئرلینڈ اور اسپین نے رسمی طور پر فلسطین کو بطور ریاست تسلیم کر لیا ہے جس کے جواب میں اسرائیل نے بطور احتجاج تینوں ملکوں سے اپنے سفیروں کو واپس بلا لیا ہے۔ شنید یہ بھی ہے کہ یورپی یونین کی دیگر ریاستیں بھی عنقریب اپنے تین یورپی ممالک کی تائید میں فلسطین کو تسلیم کرنے کا اعلان کرنے والی ہیں جس کیلئے فی الحال مشاورت جاری ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ ابھی تک او آئی سی کے ممالک نے فلسطین کو باقاعدہ بطور ریاست تسلیم نہیں کیا۔ دنیا بھر میں ایک دو نہیں پورے ستاون ممالک ہیں لیکن..... لیکن کتنے پرسکون ہیں، سو رہے ہیں ان کے حکمران، ان کی افواج، ان کے گولہ بارود کے خزانوں کو زنگ لگ رہا ہے، سب دادِ عیش دیتے ہوئے اور دنیا بھر کی عیاشی کا ساماں لئے ہوئے..... بے حسی کا شکار اور سفاکی کی تصویر ہمارے مسلم حکمران۔

مجھے آج پھر اپنی ماں یاد آ رہی ہے، چٹی ان پڑھ، جو کہتی تھی کہ "بے غیرت پچاس بھی ہوں تو کیا کرنا، ہاں غیرت مند ایک بھی بہت ہے" مجھے آج پچاس میں سات کا اضافہ کرنا ہے لیکن وہ غیرت مند ہے کہاں.... کیا ایک بھی غیرت مند نہیں رہا..... سب کے سب.....! مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا۔

قارئین! مجھے تو آپ نے پہلے ہی اپنی محبت کی سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ میں ان سے کیا کہوں! وہ بھی نہیں رہیں گے اور ہم بھی، کوئی بھی تو نہیں رہے گا، بس یہی سوچ کر ندامت سے خاموش ہو جاتا ہوں کہ شائد یہی حق کے علم بردار ہوں جو اپنے ہاتھوں میں اپنے معصوم بچوں کے لاشے بطور علم اٹھائے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں، کوئی بھی تو علم سرنگوں کرنے کو تیار نہیں۔ اب تو لاکھوں علم راہ گزاروں میں عزادار اٹھائے نکل آئے ہیں، یہ منیر نیازی کیوں تڑپ اٹھے!

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
ان امتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں
کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں
صرصر کی زد میں آئے ہوئے بام و در کو دیکھ
کیسی ہوائیں کیسا نگر سرد کر گئیں
کیا باب تھے یہاں جو صدا سے نہیں کُھلے
کیسی دعائیں تھیں جو یہاں بے اثر گئیں
تنہا اجاڑ برجوں میں پھرتا ہے تو منیر
وہ زر فشانیاں ترے رخ کی کدھر گئیں

بروز جمعتہ المبارک یکم ذوالحج 1445ھ 7 جون 2024ء

بصیرت نا بصیرت

وادی گماں میں بسنے والو! اس گماں میں، اس دھوکے میں، فریب میں مت رہنا کہ تم ہر وقت باوضو رہتے ہو، اچھے کپڑے پہنتے ہو، نمازیں ادا کرتے ہو، اور اگر تم نفلی روزوں کا بھی اہتمام کرتے ہو تو رب کو اس سے کچھ ملتا ہو گا، اسے بندگی کرانے کی کوئی خواہش ہے، رب کی عزت میں کوئی اضافہ ہوتا ہو گا وادی گماں میں بسنے والو! ایسا نہیں ہے، بغاوت کرتے ہوئے، فرائض نہیں ادا کرتے تو اسے کوئی نقصان ہوتا ہو گا وہ رنجیدہ ہوتا ہو گا، قطعی نہیں، ساری کائنات اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے تو اس کی بڑائی بیان نہیں ہو سکتی اور ساری کائنات باغی ہو جائے تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی نگاہ میں ساری دنیا کی قیمت ایک لنگڑے مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ بس حکم کی تعمیل کرتے چلے جاؤ، شکر کے ساتھ عاجزی کے ساتھ، اپنی تمام تر بے بسی کے ساتھ، تو بس تمہارا ہی فائدہ ہے۔ فلاح پاؤ گے، مانتے چلے جاؤ گے تو امن پاؤ گے، سکون وراحت پاؤ گے۔ بغاوت کرو گے تو زندگی جہنم بن جائے گی، سکون و قرار کھو بیٹھو گے، اعتبار جاتا رہے گا، نفسا نفسی مچے گی، کوئی کسی کی نہیں سنے گا، بس پھنس کے رہ جاؤ گے اس تارِ نفس میں اور دھوکے میں فریب میں۔ بس ایک ہی راہ ہے:

تسلیم کرو اس کی حاکمیت، رضا پر راضی رہو، اس کے گن گاؤ۔ اسی کی مدحت ہے، وہی ہے سزاوارِ حمد وثنا، نام اس کا ہی بلند رہے گا۔ سب چلے جانے کیلئے ہیں، چلے جائیں گے۔ کوئی نہیں رہا یہاں پر، کوئی نہیں رہے گا، رہ ہی نہیں سکتا۔ بس رہے گا تو نام میرے اللہ کا، بس اسی کا۔ بہت ہی اتھلا ہے بندہ بشر، بہت ہی تھڑ دلا بہت مکار و عیار بہت ہی شکوہ کرنے والا شکایت کرنے والا..... تھوڑی سی راحت پر پھول کر کپا ہو جاتا ہے اور رب کو بھول جاتا ہے اور اگر تھوڑی سی تکلیف پہنچے تو بس ڈھنڈورچی بن جاتا ہے۔ سب کو بتانے لگتا ہے دیکھو میرے سر میں درد ہے دیکھو مجھے بخار ہو گیا دیکھو میں تکلیف میں ہوں، یہ ہو گیا وہ ہو گیا غضب ہو گیا۔ بس میں ہی نظر آتا ہوں رب کو۔

حضرت رابعہ بصری یاد آ گئیں کہیں سے گزر رہی تھیں کہ ایک شخص کو دیکھا جس نے سر پر رومال باندھا ہوا تھا۔ پوچھا: یہ تم نے سر پر رومال کیوں باندھا ہوا ہے؟ وہ بہت عاجزی سے بولا: میرے سر میں درد ہے اس لیے۔ تب رابعہ بصری بولیں: کیا تم نے کبھی شکر کا رومال باندھا ہے؟ حیران شخص نے وضاحت چاہی تو رابعہ بصری نے فرمایا: اتنی راحتیں رب نے دیں تب تو تم نے رومال نہیں باندھا کہ جس پر لکھا ہوتا: مجھے رب نے راحت دی ہے اس لیے یہ رومال باندھا ہوا ہے یہ شکر کا رومال ہے اور سر میں تھوڑا سا درد کیا ہو گیا کہ شکایت کا رومال باندھے گھومتے ہو۔ کبھی غور کیا ہے ہم نے اِس پر؟ ہم سب شکر کے رومال سے محروم ہیں اور شکایت کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ بہت ناشکرے ہیں ہم بہت تھڑ دلے بہت بے عقل..... بصیرت نہ بصارت۔ بہت بغاوت کر لی ہم نے، نتائج بھی دیکھ رہے ہیں۔ پلٹ کیوں نہیں آتے اپنے رب کی طرف۔

ہاں یہ مجھے میرے ایک بابا نے بتایا تھا بہت پیار سے کہ اللہ جی اس بندے سے بہت خوش ہوتا ہے جو پلٹ آئے، سہما سہما سا شرمسار، اس بات کا ملال ہو کہ اتنے عرصے رب کا باغی رہا۔ جب وہ شرمندہ شرمندہ سا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تب رب کی رحمت جوش میں آتی ہے اور وہ اسے اپنی رحمت میں لپیٹ لیتا ہے۔ پلٹ آیئے۔ یہ سب کچھ رب نے دیا ہے۔ شکر ادا کیجیے اور شکر یہ نہیں ہے کہ صرف نمازیں پڑھیں، تلاوت کریں، روزے رکھیں۔ یہ تو رب کا حکم ہے اسے تو ادا کرنا ہی ہے، یہ آپ کا اور رب کا معاملہ ہے۔ شکر یہ بھی ہے کہ آپ بے کسوں کی خبر گیری کریں۔ وہ جو آپ کے محلے میں سفید پوش ہیں ان سے سر جھکا کر ملیں، ان کے مسائل معلوم کریں اور پھر اس طرح کہ ان کی عزتِ نفس ذرا سی بھی متاثر نہ ہو ان کی اس خفیہ طریقے سے مدد

کریں کہ ان کو بھی پتہ نہ چلے۔ ہر محلے میں کئی دوکانداروں کے ہاں ان سفید پوشوں کے ادھار کا کھاتہ چل رہا ہوتا ہے، خاموشی سے ان کا ادھار چکا دیں اور دوکاندار کو بھی خوف خدا کا واسطہ دیکر اپنا نام چھپانے کی درخواست کریں۔ کبھی اگر راشن بھی دینا ہے تو محلے کے دوکاندار کی ڈیوٹی لگا دیں یا پھر خود شام کے اندھیرے میں خاموشی سے گھر کی دہلیز پر اس طرح رکھ کر چلے آئیں کہ ہمسایہ کو بھی اس کی خبر نہ ہو۔ کیا ہمارے رب نے ہمیں عطا کرتے ہوئے کسی کو رازداں بنایا ہے؟

محلے میں اگر کوئی مریض ہے تو رازداری سے اس کی ادویات کا بندوبست کر دیں۔ اپنے عزیز و اقارب میں ایسے حاجت مند آپ کو مل جائیں گے۔ جہاں ان کی خوشدلی سے عیادت کرنا آپ کا فرض ہے وہاں ان کی مشکلات کا ادراک کرتے ہوئے ان کی عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے خود سے ہدیہ کی صورت میں ان کی کفالت کر دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان شاءاللہ آپ ہر قسم کی ادویات استعمال کرنے سے محفوظ رہیں گے۔ وہ بیٹی جو جہیز نہ ہونے کی وجہ سے اپنے بالوں میں چاندی لیے بیٹھی ہے اس کا درد معلوم کریں۔ وہ جو بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے اسے راحت و آرام کی چند گھڑیاں دیں ،وہ طالب علم جو چند روپوں کیلئے اپنی تعلیم چھوڑنے کا سوچ رہا ہے، اس کا ہاتھ تھامیں اور ان کی خبر گیری کریں جن کے گھروں کے چولہے ٹھنڈے ہیں، یہ جو مال و دولت آپ کو رب نے دیا ہے اسے اس کی مخلوق کیلئے خرچ کرنا سیکھئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اس خرچ کرنے کی راحت کو کبھی نہیں بھول پائیں گے۔ وہ لمحے جو آپ نے کسی کے کام میں خرچ کیے وہ سرمایہ ہیں زندگی کا.....وہ آنسو جو آپ کی آنکھوں سے کسی اور کیلئے برسا، وہ انمول ہے اور وہی رب کو مطلوب ہے۔ دیکھئے پھر کہہ رہا ہوں عبادت سے جنت اور خدمت سے خدا ملتا ہے، انتخاب تو آپ کا ہے ناں۔

ہم سب بلا سوچے سمجھے بولتے رہتے ہیں۔ ہمارے شر سے انسان محفوظ نہیں ہیں.....وہ انسان جو بولتے ہیں چیختے ہیں احتجاج کرتے ہیں لڑنے مرنے پر اتر آتے ہیں۔ ہم کسی کو بھی کسی وقت کچھ بھی کہہ دیتے ہیں.....وہ ایسا ہے فلاں ویسا ہے اور جس پر آپ نے الزام دھر دیا ہے بہتان لگا دیا ہے.....زور آور ہے تو مقابلے پر اترتا ہے اور آپ پھر کھسیانی بلی بن جاتے ہیں اور کھمبا نوچتے ہوئے پتلی گلی کی راہ لیتے ہیں اور اگر کوئی کمزور ہے تو یہ سماج اس کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ بے آسرا کے ساتھ آپ جو چاہیں سلوک کریں کوئی آپ کو روکنے والا نہیں ہے؟ خیر یہ تو ہم روز دیکھتے ہیں اور کبھی خود بھی یہی کرتے ہیں۔ ہمارے شر سے انسان محفوظ نہیں ہیں تو جانور کیا محفوظ ہوں گے۔ وہ جانور جو بول نہیں سکتے احتجاج نہیں کر سکتے مظاہرہ نہیں کر سکتے، اخباری بیان جاری نہیں کر سکتے، عدالتوں کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے۔

ہم ہیں کہ جنگلوں کے باسیوں پر الزام پر الزام دھرتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی سنا ہے شیر نے کرپشن کی ہو، کسی گدھے کے سوئس اکاؤنٹ ہوں یا کسی جانور نے کسی دوسرے کو بیچ کھایا ہو، ذخیرہ اندوزی کی یا منافع خوری کی ہو! کیا کسی شیر نے اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے اپنے بچوں کو بیچ کھایا ہو اور بعد میں بڑے فخر سے کہے کہ اس نے اپنے ہی جنگل کے اتنے جانوروں کو فلاں شکاری کے ہاتھوں فروخت کر کے اتنا مال بنایا۔ بے بس اور کمزور مرغی بھی اپنے چوزوں کو بچانے کیلئے مقابلے پر اتر آتی ہے، کہیں کچھ کھانے کو نظر آجائے تو کوا ہانک لگا کر سب ساتھیوں کو بلا لیتا ہے۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ چپکے سے سارا مال خود ہضم کر لے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دے۔ انسان.....جی ہم جو اشرف المخلوقات ہیں، جو کچھ کرتے آئے ہیں، کر رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے، کبھی آپ نے سنا ہے کہ جانوروں نے یہ کرتوت کئے ہیں؟ وہ بے زبان جانور ہیں تو ہم ان پر بہتان طرازی کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اب ان کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو گیا ہے، کسی دن وہ ہمیں گھیر لیں گے اور جواب طلب کریں گے کہ بتا ہم بے زبان تھے ہمیں یہ سب کچھ کیوں کہا گیا؟

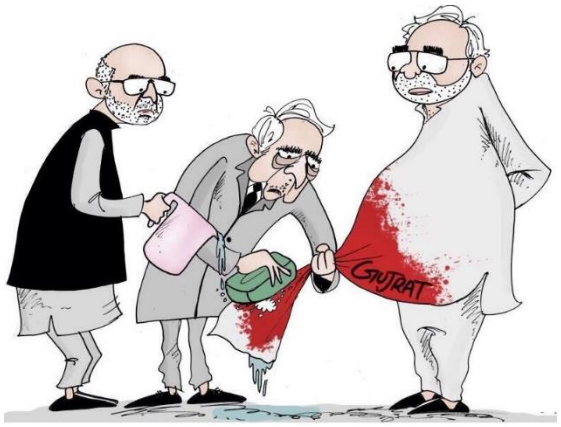

جب دیکھو یار لوگ کہتے رہتے ہیں: شہروں میں جنگل کا قانون رائج ہے۔ امریکا نے ساری دنیا میں جنگل کا قانون رائج کر رکھا ہے۔ لاکھوں انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا، صدیوں کی تاریخ کے امین ممالک کھنڈر بنا دیئے گئے، کوئی کہنے والا نہیں کہ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ اب ان دیکھے جرثومے کرونا نے کیا تباہی مچائی کہ نیویارک کی ان شاہراہوں پر جہاں لاکھوں ڈالر کی گاڑیوں میں لوگ گھومتے تھے، دنیا بھر کے سیاح ان سامان سے عالیشان ہوٹلوں، پلازوں اور کروڑوں ڈالر کے نادر اشیاء اور ساز و لدی ہوئی دوکانوں پر خریداری کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے، وہاں موت کا سناٹا چھا گیا، خود وہاں کا ایک نوجوان دنیا بھر میں امریکی ظلم و ستم پر چیخ چیخ کر ان کی خاموشی کو جرم عظیم قرار دیتے ہوئے رب کے ہاں جھکنے اور توبہ کرنے کیلئے پکار رہا تھا کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یہ غیر مرئی سر کے بال سے بھی ہزاروں گنا چھوٹا جرثومہ ہر ذی روح کو خاک کر دے گا۔

دنیا میں سب سے پہلے لاک ڈاؤن تو سفاک و جابر درندہ صفت ہندو مودی جنتا نے متعارف کروایا۔ مقبوضہ کشمیر کے لاکھوں جیتے جاگتے افراد کو ایک لمبے عرصے تک نہ صرف گھروں میں بند کر دیا بلکہ مکمل لاک ڈاؤن کرتے ہوئے تمام تعلیمی درسگاہوں، روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والی ضروریات فروخت کرنے والے تمام اداروں، حتیٰ کہ زندگی کے سانسوں کو جاری رکھنے کیلئے ادویات کے سٹوروں کے علاوہ ہسپتالوں تک کو بند کر دیا گیا تھا۔
اقوام عالم نے دیکھا کہ بدنصیب کشمیریوں کو اپنے پیاروں کے جنازوں کو کندھا دینا تو درکنار قبرستان میں تدفین کی اجازت بھی چھین لی گئی اور ان کو گھروں کے دالانوں میں اپنے عزیزوں کو دفن کرنا پڑ گیا۔ تمام نوجوان بچوں کو زبردستی گھروں سے اغواء کر کے یا تو غائب کر دیا گیا یا پھر بھارت کی دور دراز جیلوں کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا اور آج تک نہ تو کسی کا کوئی سراغ مل سکا اور نہ ہی کسی عدالت میں اس کا ریکارڈ پیش کیا جا سکا ہے۔ امریکا و مغرب جو دنیا میں انسانی حقوق کے بڑے چیمپین بنتے تھے، اپنی معاشی مفادات کیلئے مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

ہمیں بارہا بھارت کی ترقی، اس کی آزاد خارجہ پالیسی اور جمہوری انتخابی عمل کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ چلیں آج آپ کو بھارت کی سیر کروا دیتا ہوں جس کی گواہی خود ان کے معاشی ماہرین کی زبانی بتا دیتا ہوں: ان کے اپنے اسی بھارت کے 53 کروڑ 68 لاکھ شہری خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں جو دنیا میں کسی بھی ملک سے زیادہ ہیں۔ دنیا بھر میں 96 کروڑ 30 لاکھ انسان بھوک کا شکار ہیں جن میں 21 کروڑ سے زیادہ بھارتی ہیں جو کسی بھی ملک سے زیادہ ہیں، اس کے 9 کروڑ 23 لاکھ بچے غذائی قلت کا شکار ہیں جو دنیا میں سب سے بڑی تعداد ہے اور اسی طرح دنیا میں 58 لاکھ 40 ہزار بچے ہر سال مر جاتے ہیں جن میں 25 لاکھ سے زائد تعداد بھارتی بچوں کی ہے جو کسی بھی ملک سے بہت زیادہ ہے۔ دنیا میں ایک ارب 21 کروڑ 16 لاکھ 52 ہزار انسانوں کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے جن میں سے 41 کروڑ سے زائد بھارتی ہیں جو کسی بھی ملک سے کہیں زیادہ ہیں۔ دنیا کے 2/ارب 60 کروڑ 10 لاکھ انسانوں کو صحت و صفائی کی سہولتیں میسر نہیں ہیں جن میں بھارتیوں کا حصہ 62 کروڑ 65 لاکھ سے زائد ہے (بعض اداروں کے مطابق ایک ارب دس کروڑ ہے) جو کسی بھی ملک سے زیادہ ہے۔

دنیا بھر میں 4 کروڑ 20 لاکھ لوگ ایڈز کا شکار ہیں جن میں سے 61 لاکھ 90 ہزار بھارتی ہیں جو کہ دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ ہیں۔ بھارتی سرکار کے

مطابق ان میں سے ہر سال 5 لاکھ سے زائد ہر سال مر جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے 20 کروڑ ٹی بی کے مریضوں میں سے 47 لاکھ بھارتی ہیں جو کسی بھی ملک سے زیادہ ہیں، ان میں سے 5 لاکھ کے قریب ہر سال مر جاتے ہیں جو کسی بھی ملک سے زیادہ ہیں۔ دنیا میں ہر سال 5 لاکھ 25 ہزار 6 سو خواتین زچگی کی حالت میں لقمہ اجل بن جاتی ہیں جن میں سے 98 ہزار بھارتی خواتین ہیں جو کسی بھی ملک سے زیادہ ہیں۔ بھارت کے 43 کروڑ افراد اب بھی ناخواندہ ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ ہیں۔ اس کے 5 کروڑ بچے تعلیم سے اب بھی محروم ہیں اور 3 کروڑ فٹ پاتھوں پر رہتے ہیں جو کسی بھی ملک سے زیادہ ہیں۔ ہر سال اس کے سوا لاکھ انسان خودکشی کرتے ہیں اور ایک لاکھ 50 ہزار خواتین جہیز نہ لانے پر قتل کر دی جاتی ہیں۔ جہاں 43 کروڑ افراد ناخواندہ ہیں، جہاں 5 کروڑ سے زائد بچے تعلیم سے محروم اور 3 کروڑ سے زائد بچے فٹ پاتھوں پر رہتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف عالمی اعداد و شمار کے مطابق مودی سرکار غربت دور کرنے کی بجائے اس نے ہتھیاروں کی خریداری پر اب تک کا سب سے زیادہ خرچ کیا ہے۔ ہندوستان 2023 میں فوجی اخراجات میں عالمی سطح پر چوتھے نمبر پر تھا، کل $83.6 بلین تھا، جو 2022 کے مقابلے میں 4.2 فیصد اور 2014 کے مقابلے میں 44 فیصد اضافہ کے ساتھ نمایاں ہے۔ 2023 میں دفاعی اخراجات بجٹ کا 15 فیصد تھے اور 2024ء کے اخراجات میں اضافہ کا امکان بتایا جا رہا ہے۔ 14 لاکھ فوج، 11 لاکھ 55 ہزار ریزرو فوج اور 12 لاکھ 93 ہزار پیرا ملٹری فوج کا خرچہ برداشت کیا جاتا ہے۔ ان کو مؤثر بنانے کیلئے 4300 ٹینک، 8700 آرمڈ وہیکل، 1260 لڑاکا فوجی طیارے، ایک ایئر کرافٹ کیریئر اور 60 ایٹم بم بھی ہیں۔ ان سے بھی دل نہیں بھرا تو اسرائیل سے تین جدید ترین اواکس جنگی طیارے اور فرانس سے رافیل طیارے حاصل کر کے جنگی جنون کو تسکین پہنچانے کی کوششیں جاری ہیں۔

اس انتہائی پسماندگی کے علاوہ اقلیتوں کے ساتھ جو کچھ بھارت میں ہوتا ہے، مہذب دنیا میں اس کا تصور بھی نہیں ہے۔ 20 کروڑ اچھوت جانوروں سے بھی زیادہ بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں جن کو بنیادی انسانی حقوق دینا تو دور کی بات انسان تک نہیں سمجھا جاتا ہے۔ 23 کروڑ مسلمانوں کا حال تو اچھوتوں سے بھی بدتر ہے۔ انتہا پسند ہندو جماعتوں کے 23 لاکھ سے زیادہ جنونی کارکنہیں جنہوں نے پورے بھارت میں اقلیتوں کا جینا دوبھر کیا ہوا ہے۔ ہندو مسلم فسادات روز کا معمول ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے سکھوں سے مل کر تقسیم کے وقت فسادات اور ہجرت کے دوران 10 لاکھ مسلمانوں کا قتلِ عام کیا، بعد میں تاریخی بابری مسجد اور ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر دیا، گجرات میں درندہ صفت وزیرِ اعلیٰ نریندر مودی کی حکومتی سرپرستی میں 5 ہزار مسلمانوں کو دن دیہاڑے شہید کر دیا گیا جس میں ڈھائی ہزار کو زندہ جلا دیا گیا، ان کی املاک کو لوٹا اور جلایا گیا اور ان کاروائیوں پر فخر کرتے ہوئے اور مزید کرنے کا عہد کیا گیا۔ اس قتلِ عام میں مودی نے سرکاری مشینری کا کھلے عام استعمال کیا اور جس انسان دشمن نریندر مودی کی سرپرستی میں یہ ظلم و ستم کا مجرمانہ کھیل کھیلا گیا، اسے کوئی عبرتناک سزا دینے کی بجائے دیوتا کا مقام دے دیا گیا۔

جہاں ان فسادات اور ظلم و ستم میں ملوث سرکاری اداروں کے سپاہیوں کو فرض شناسی اور بہادری کے انعامات اور ترقیوں سے نوازا گیا وہاں اب اس درندہ صفت مودی کو ملک کا ملک کا تیسری بار وزیرِ اعظم بنا دیا گیا۔ اس کے باوجود ہم کس قدر آسانی سے انسان کے ہاتھوں ظلم و ستم کو جنگل کے قانون سے تشبیہ دے دیتے ہیں۔ کبھی جنگل دیکھا ہے؟ وہاں کے باسی دیکھے ہیں؟ کیا آپ کسی جنگل میں رہے ہیں؟ پھر آپ یہ کس طرح کہہ دیتے ہیں، جنگل کا قانون۔ جناب آپ کچھ نہیں جانتے۔ جنگل میں قانونِ فطرت رائج ہوتا ہے۔ وہ بے زبان ہم جیسے شاطر و چالاک عیار و مکار نہیں ہوتے۔ جو ہوتے ہیں وہ نظر آتے ہیں۔ وہ ہماری طرح منافق نہیں ہوتے، دوغلے نہیں ہوتے، ہم جیسے کرتوت نہیں ہوتے ان کے۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر التماس کرتا ہوں خدا

کیلئے یہ کہنا چھوڑ دیجیے، اپنے کرتوتوں کو بے زبانوں کے سر مت ڈالیے۔ وہ معصوم ہیں انہیں کیوں گالی دے رہے ہیں آپ! انہیں تو بخش دیجئے۔ مجھے آج زہرہ آپا کیوں اس قدر یاد آرہی ہیں؟

سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو وہ حملہ نہیں کرتا
سنا ہے جب کسی ندی کے پانی میں
پئے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے
تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اس کو پڑوسی مان لیتی ہیں
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر
کوے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہے
سنا ہے گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے
تو سارا جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باڑ آجائے
کوئی پل ٹوٹ جائے تو کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری سانپ چیتا اور بکری ساتھ ہوتے ہیں
سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خداوندِ جلیل و معتبر دانا و بینا منصف و اکبر
ہمارے شہر میں اب جنگلوں کا ہی کوئی دستور نافذ کر

بروز سوموار 3 ذوالحج 1445ھ 9 جون 2024ء

رات کا آخری پہر

رات کے آخری پہر گھنٹی کی آواز نے دل کی دھڑکن کو بے ترتیب کر دیا۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو چند لمحے جان ہی نہ پایا کہ میں جاگ رہا ہوں یا خواب کی کوئی کیفیت ہے۔ اس کی آواز میری اکلوتی پوتی سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اس کا ہر لفظ گہرے کرب میں ڈوبا ہوا تھا وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی، مجھے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کیا رات کا آخری پہر تھا کہ نیند میری آنکھوں سے یکایک ایسے روٹھ گئی جیسے اس سے میری کوئی آشنائی نہیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ جانے مجھے کیا جان کر روتی رہی، اپنی کہانی سناتی رہی اور میں اسے جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔

میں یہ پوچھنا بھی بھول گیا کہ اس نے میرا ٹیلیفون کہاں سے حاصل کیا ہے؟ اس کا نام زینب ہے اور مقبوضہ کشمیر.....سے اس کا تعلق ہے۔ کئی ماہ پہلے اس کی شادی ہوئی، کچھ ہی دنوں بعد جلاد صفت وردی میں ملبوس کچھ لوگ آئے، تلاشی کے نام پر سارے گھر کو اکھاڑ پچھاڑ دیا۔ جاتے ہوئے اس کے خاوند کو اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر والوں نے جب احتجاج کیا تو گولیوں کی تڑتڑ سے اس کا گھرانہ اس طرح کانپ رہا تھا جس طرح خوفِ خدا سے کسی گناہ گار کا دل تنہائی میں کانپتا ہے۔

تین دنوں کے بعد وہ گھر واپس آ گیا لیکن اسے پہنچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ اس سے تفتیش کی جاتی رہی کہ وہ کبھی سرحد پار گیا تھا یا نہیں؟ مزید چند دنوں بعد آدھی رات کو وہی وردی میں ملبوس افراد نے اچانک چھاپہ مارا، دیوار پھلانگ کر اندر آنے والے، زینب کے شوہر اور جیٹھ کو، کچھ کمپیوٹر اور دوسری اشیاء سمیت اٹھالے گئے۔ دونوں برسوں دہلی میں رہے اور وہاں تعلیمی اداروں میں پڑھاتے رہے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ کشمیر میں ہونے والے مظالم کو مکمل ثبوتوں کے ساتھ عالمی انسانی حقوق کے اداروں کو مہیا کرتے تھے۔ ابھی زینب کے ہاتھوں کی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی تھی کہ وہ اس افتاد کا شکار ہو گئی۔ اس نے عالمی انسانی ہمدردی کے تمام اداروں سے رابطہ کر کے اس ناگہانی مصیبت کے بارے میں مطلع کیا تو سب نے اپنی اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتے ہوئے جان چھڑالی۔ اس نے عدالت سے رجوع کیا تو حسبِ معمول بھارت کی تمام ایجنسیوں نے تحریری طور پر ان دونوں کے بارے میں اپنی لاعلمی کا جھوٹا بیان دیدیا۔

22 سالہ دلہن اب بستی بستی بھٹک رہی ہے، دکھائی دینے والا ہر دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ گلیوں گلیوں دہائی دے رہی ہے لیکن ظلم کے لق ودق صحرا میں اس کی آواز چیخ بن کر خود اسی کے کانوں میں پلٹ آتی ہے۔ لگ بھگ بھارت کی ایک ارب انسانوں کی بھری پڑی آبادی میں کوئی دروازہ وا نہیں ہوتا، کوئی دریچہ اپنی آغوش نہیں کھولتا اور کوئی کھڑکی اسے آواز نہیں دیتی۔ میں ابھی تک نرم و گداز بستر میں نیم دراز بیٹھا تھا اور لندن کی خنک رات ہولے ہولے سرک رہی تھی اور کشمیر کی ایک عفت مآب بیٹی کی آواز قطرہ قطرہ میرے دل پر ٹپک رہی تھی۔ وہ آبدیدہ آواز میں فریاد کناں تھی:

"مجھے بتائیں میں کہاں جاؤں؟ سرینگر سے ٹھوکریں کھاتی کھاتی نئی دہلی اس لئے آ گئی ہوں کہ دنیا میں سب سے بڑی جمہوریت کا نعرہ لگانے والے کشمیر میں کسی انسانی حقوق کے ادارے کو جانے کی اجازت نہیں دیتے، کوئی غیر ملکی صحافی یا کیمرہ اس جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جس کو ان درندوں نے جہنم میں تبدیل کر دیا ہے۔ میرا کوئی ٹھکانہ ہے نہ جائے پناہ، میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ میں اپنے کھو جانے والے شوہر اور اس کے بھائی کی تلاش کروں یا اپنا آپ بچاؤں؟ میں اپنی فریاد اخباروں کو سنا چکی، مسلمان ہونے کے ناطے مجھے بہت سے اخبار کے مالکان کی کڑوی اور کسیلی باتیں بھی سننے کو ملیں، کسی کا دل نہیں پسیجا، کسی نے میرا حال نہیں پوچھا۔ آپ کے ایک واقف کار نے اپنے ٹیلیفون سے نمبر ملا کر میرے ہاتھ میں یہ کہہ کر تھما دیا کہ ان کو بھی

تو اطلاع ہونی چاہئے جن کو ہر کشمیری بہن بیٹی اپنا بھائی اور باپ سمجھ کر ہر لمحہ ان کی سلامتی اور عافیت کی دعاؤں میں مگن رہتی ہیں۔ اتنی رات گئے آپ سے بات کرنے پر بہت شرمندہ ہوں لیکن میں کیا کروں؟ میں کدھر جاؤں؟ بہنیں اور بیٹیاں آخر اپنے دکھ اور غم اپنوں سے ہی کر سکتی ہیں؟ اب میں کس کو.....!

فون بند ہو جانے کے بعد بھی میرا کمرہ دیر تک سسکیوں سے بھرا رہا۔ دیر تک میرے کانوں میں صحرائی ریت کے بگولے سائیں سائیں کرتے رہے اور دیر تک میری آنکھیں دہکتے کوئلوں پر کسمساتی راکھ سے بھری رہیں اور دیر تک ایک آواز جو میری پوتی کی آواز سے بہت ملتی جلتی تھی، میری بند کھڑکی کے شیشوں پر دستک دیتی رہیں۔ زینب اپنے شوہر اور اس کے بڑے بھائی کی تلاش میں ہے۔ ہزاروں دیگر افراد اپنے پیاروں کے انتظار میں کسی اچھی خبر کے منتظر ہیں۔ کئی بوڑھے والدین کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں کہ ان کے بڑھاپے کے سہارے ان سے چھین لئے گئے ہیں اور اس وقت بے سہارا مارے مارے پھر رہے ہیں۔ امریکا کی ایک ہندو پروفیسر نے اپنے ساتھی پروفیسر کی مدد سے کشمیر میں اجتماعی قبروں کی نشاندہی میں مدد دی جہاں چار ہزار سے زائد افراد کو گڑھے کھود کر دفن کر دیا گیا۔ اس جنتِ ارضی میں جنگل کا قانون جاری و ساری ہے۔

اس جنتِ ارضی میں جنگل کا قانون جاری و ساری ہے اور ہم جو سینہ ٹھونک کر ان کے وکیل بننے کا دعویٰ کر رہے تھے، ہم سے ہفتہ وار ایک گھنٹے کا احتجاج بھی تو نہیں ہو سکا۔ ضعیف مردِ مجاہد علی گیلانی اور آسیہ اندرابی کے سچے اور مضبوط عزم کے سامنے ایک مرتبہ پھر ہم سب کے سر شرم سے جھک گئے تھے جب اسمبلی سے سینکڑوں پاکستانیوں کے قاتل کلبھوشن کو اپیل کا حق دینے کی قرارداد کو تو پاس کروالیا گیا تھا لیکن ہم نے ایک لمحہ کیلئے بھی نہ سوچا کہ اس مردِ مجاہد گیلانی کے دل پر کیا گزری ہو گی جس نے ہندو بنئے فوج کے حصار میں لاکھوں کشمیری نوجوانوں کے دلوں میں یہ سرفروشانہ نعرہ کندہ کر دیا کہ "ہم ہیں پاکستانی، پاکستان ہمارا ہے" اور آسیہ اندرابی جس کے شوہر ڈاکٹر قاسم کو ناکردہ جرم میں پچھلی دو دہائیوں سے بھی زائد جیل میں بند کر رکھا ہے اور آسیہ اندرابی کو تہاڑ جیل میں انسانیت سوز مظالم کے حوالے کر دیا گیا اور اب بھی نجانے کس حال میں ہے، جہاں شبیر احمد شاہ کی چھوٹی بیٹی سحر شبیر شاہ کا کہنا ہے کہ "میں روز سپنے میں بابا کو دیکھتی ہوں، جیسے وہ مجھے بلا رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں کہ میں جیل سے چھوٹ گیا، پھر ماں جگاتی ہے لیکن مجھے کچھ وقت کے بعد ہوش آتا ہے"۔ وہ اپنے والد کی گرفتاری کے باعث افسردہ اور ذہنی تناؤ کا شکار رہتی ہے۔

فریاد کناں زینب کے یہ جملے میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند کیوں دوڑ رہے ہیں کہ "بالآخر بیٹیاں اپنے دکھوں کا تذکرہ اپنے باپ سے نہ کریں تو کہاں جائیں؟" میں اسے کیسے بتاؤں کہ ابھی تک عصمت صدیقی کی روح اپنی عفت مآب بیٹی عافیہ صدیقی کی تلاش میں بھٹک رہی ہے، آمنہ مسعود جنجوعہ جو پچھلے کئی برسوں سے حکومتی اداروں کے مردہ ضمیروں کو جگانے کی کوششوں میں آخر کار ناکام اور تھک ہار کر بیٹھ گئی، کیونکہ کوئی ان کی انگلی تھامنے والا، کوئی انہیں راستہ سجھانے والا نہیں ملا، اس مجبور و مقہور نے بھی اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ کیسا سحر ہے کہ انسان بیٹھے بٹھائے تحلیل ہو جاتے ہیں اور کسی کو کچھ پتہ بھی نہیں چلتا۔

کسی پر شک ہو تو قانون موجود ہے، اسے حرکت میں لایا جا سکتا ہے، اس کے خلاف شواہد جمع کر کے اسے عدالتی عمل سے گزارا جا سکتا ہے، اسے صفائی کا موقع دینے کے بعد جرم ثابت ہونے پر کڑی سزا دی جا سکتی ہے لیکن یہ عجیب دستور چل نکلا ہے کہ کسی کو غائب کر دیا جائے اور پھر مہینوں بلکہ سالوں تک اس کے عزیزوں کو انتظار کی سولی پر لٹکا دیا جائے کہ ان کے

پیارے عزیز کہاں اور کس حال میں ہیں اوران پر کیا گزر رہی ہے ؟ایسا کرنے سے ایک مہذب ملک کی ساکھ پر انتہائی منفی اثر پڑتا ہے جو دنیا بھر کی سب سے بڑی جمہوریت کا جعلی ڈھنڈورا ابھی پیٹ رہا ہو۔ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح ان کی "روشن خیال جمہوریت" محض ایک سراب دکھائی دینے لگی ہے ؟ہم نے تو یہ جرم عظیم سب کچھ امریکی کروسیڈ سے عہدِ وفا نبھانے کیلئے کیا لیکن بھارت تو امریکا اور مغرب کی دوستی کا دم بھر رہا ہے۔ وہ اپنے انہی دوستوں کے کندھے استعمال کر کے ایک مرتبہ پھر اقوام متحدہ کی مستقل نشست (ویٹو پاور) کے خواب دیکھ رہا ہے تا کہ اس طاقت کے نشے میں وہ مہابھارت کی تکمیل کر سکے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انسانی حقوق کی ایسی پامالی پر ایک امریکی ہندو پروفیسر کو بھی اجتماعی قبروں جیسے ہولناک مظالم پر احتجاج کی آواز اٹھانا ناگزیر ہو گیا اور انسانی حقوق کے چیمپئن ممالک کو کشمیر میں اس ہولناک مظالم سے آگاہ کرنا پڑا۔

ہم نصیبوں جلے تو ایسے ہیں کہ آج تک کشمیر میں ان اجتماعی قبروں کے انکشاف کے بعد قصرِ سفید کے فرعون سے کوئی اعلامیہ جاری نہ کروا سکے بلکہ مغربی ممالک تو بھارت کی بلائیں لے رہے ہیں اور ایٹمی توانائی کی مدد کیلئے دل و جاں فرشِ راہ کر دیئے لیکن ماورائے عدالت ہلاکتوں سے لیکر اغوا تشدد، ریاستی جبر اور قانون وعدل کی رسوائی تک ہر وہ الزام ہمارے دامن کا داغ بنا دیا گیا جس کا تصور کیا جا سکتا ہے، اس کے باوجود امریکا کی دلداری ہماری سب سے بڑی ترجیح ہے جس کیلئے ہم نے اچھے بھلے ملک کو جنگل بنا دیا اور ڈھٹائی کی حد تو یہ ہے کہ اب بھی اسی عطار کے لونڈے سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں اور سیکورٹی مشیر امریکا سے گلہ کر رہے ہیں کہ پاکستان کو کیوں فراموش کر دیا گیا۔

زینب کے شوہر کا جرم صرف یہی ہے کہ وہ دنیا کے انسانی حقوق کے اداروں کو کشمیر میں ہونے والے مظالم کی اصلی تصویر سے آگاہ کرتا تھا۔ کشمیر میں "غیر اعلانیہ کرفیو جیسے ماورائے قانون" کی آڑ میں ہونے والے مظالم کی نشاندہی کرتا تھا۔ "غیر اعلانیہ کرفیو" جیسی منحوس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے 2008ء میں امرناتھ اراضی ایجی ٹیشن کے دوران گورنر این این وہرا نے شروع کیا تھا لیکن اس سے بھی پہلے شیخ محمد عبداللہ نے 1975ء میں پبلک سیفٹی ایکٹ یہ کہہ کر متعارف کروایا تھا کہ یہ صرف اسمگلروں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ اس ایکٹ کے تحت بغیر کسی عدالتی کاروائی کے کسی بھی شخص کو دو سال کیلئے زنداں کی تاریکی میں پھینکا جا سکتا ہے لیکن آج تک اسی غیر انسانی اور ظالمانہ قانون کو بے دریغ بے گناہ کشمیریوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے اور بیشتر کشمیری اسی تعذیبی قانون کے تحت چودہ چودہ سال سے بھی زیادہ بھارت کی جیلوں میں گل سڑ رہے ہیں۔

اگر آپ کو یاد ہو تو 29 اور 30 مئی 2009ء کی درمیانی رات کو کشمیر کی دو مجبور بیٹیوں نیلوفر اور آسیہ کو اجتماعی عصمت دری کے بعد قتل کر دیا گیا تھا جس سے اہل شوپیاں کے علاوہ سارے کشمیریوں کے دل دہل گئے تھے۔ پوری وادی میں اس پر بھرپور احتجاج ہوا لیکن شوپیاں کے غیور عوام نے 47 دن کی مسلسل ہڑتال سے اس سانحے کو امر کر دیا کہ وہ اپنی ان بیٹیوں کے صدمے کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ مجھے یاد ہے کہ تین سالہ سوزین جو ایک سال بعد اپنی ماں اور پھوپھی کی اجتماعی عصمت دری کے خلاف احتجاج کر رہا تھا اس کو غمزدہ لواحقین کے ساتھ انصاف مانگنے کی پاداش میں مجرم ٹھہرا کر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ تین سالہ بچہ جو اپنے پاؤں پر اچھی طرح چل بھی نہیں سکتا وہ بھارت کے وزیر اعظم کیلئے کوئی خطرہ بن سکتا تھا؟ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے محافظ اس بلکتے تڑپتے شیر خوار سوزین جس کے آنسو کئی دلوں کو گھائل کر رہے تھے، مردہ خور گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔

مجبور و مقہور کشمیریوں کے سر قلم کرنے کیلئے "غیر اعلانیہ کرفیو" کے دوران "پبلک سیفٹی ایکٹ" کی بے لگام تلوار ہی کافی تھی کہ اب کشمیر میں تعینات 8 لاکھ افواج کو "آرمڈ فورسز سپیشل پاور ایکٹ" اور "ڈسٹرب ایریا ایکٹ" جیسے ظالمانہ قوانین کے تحت بے پناہ اختیارات حاصل کرنے کے بعد کسی کو جوابدہ نہیں، جس کی وجہ سے اب یہ قانون عوام کے محافظین کہلانے والوں کیلئے ایک نفع بخش تجارت کی شکل اختیار کر گیا ہے جس میں لین دین انسانی سروں

اور سستے انسانی خون سے ہوتا ہے۔ میں تو ابھی تک زاہد، وامق، عنائت اللہ اور طفیل متو کی ہلاکتوں سے لیکر مژھل فرضی جھڑپوں میں کشمیریوں کے سرِعام قتل کو نہیں بھول سکا، اے میری مظلوم و مجبور بیٹی زینب! کیا تجھے معلوم نہیں کہ اسلام کا ایک درخشندہ ستارے کا نام بھی زینب تھا جن کی کنیت "ام المصائب" تھی جن کے خطبات آج بھی مسلم امہ کیلئے مشعلِ راہ ہیں۔

میرا وجدان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ظلم و ستم کا یہ دور ایسے عوامی انقلابی ریلے کو دعوت دے رہا ہے جس کے سامنے توپ و تفنگ ناکارہ اور بے بہرہ ہو جاتی ہیں۔ انقلابِ فرانس بھی ایک پتھر مارنے سے شروع ہوا تھا پھر اس کے بعد بادشاہ کے محافظین اپنے تمام اسلحے کے ساتھ نہ تو بادشاہ کی حفاظت کر سکے اور نہ خود کو بچا سکے۔ اس طوفانی ریلے کے سامنے تمام ظالمانہ قوتیں اپنے اتحاد کے باوجود تنکوں کی طرح خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ جو نرم ہاتھ یاسفید کالر والی گردن نظر آئی اس کا شانوں سے تعلق ختم کر دیا گیا۔ کشمیر کے موجودہ حالات میں امرناتھ جیسی ایجی ٹیشن سے بھی کہیں شدید مزاحمتی تحریک کا میدان تیار ہے جہاں سات دہائیوں سے کشمیریوں کا بہنے والا مقدس خون اب ضرور رنگ لائے گا اور اب کوئی نیا میر جعفر یا میر صادق ظالموں کو میسر نہ آسکے گا انشاء اللہ۔

لیکن ٹھہریئے مجھے کچھ ان افراد کے ضمیر کو بھی جگانا ہے جن کی یہ مجبور و مقہور بیٹیاں ان کے نام کی دہائی ان شہدا کے قبرستانوں میں دیتی نظر آرہی ہیں جو ہمارے ہاں کے مفاد پرستوں کی چیرہ دستوں کا شکار ہو گئے جن کو ہر قیمت پر اپنا اقتدار عزیز ہے اور اپنے دورِ حکومت میں سفاک مودی سے ملاقات کیلئے بے چین تھے اور سلامتی کونسل میں اپنا ووٹ دیکر اس کو ممبر بنانے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں کی تھی۔ اب مودی کی کامیابی پر انہیں مبارکباد کا جو پیغام بھیجا، اس کا تکبر آمیز جواب پڑھ کر ہمیں کس سطح پر لا کھڑا کیا ہے؟ دنیا کی بڑی جمہوریت کا دعویٰ کرنے والے کو مبارکباد دینے کی بجائے اسے اپنے گریبان کی طرف نگاہ دوڑانے کا پیغام دیا جاتا اور اس طرف اقوام عالم کی توجہ مبذول کروائی جاتی کہ آخر یہ روتی بلکتی مائیں، دربدر بھٹکتے بوڑھے باپ، بال بکھرائے دہائی دیتی بیویاں کہاں جائیں؟ کون سی زنجیر عدل ہلائیں، کس دیوار سے سر پھوڑیں؟ میں سوچتے سوچتے تھک گیا ہوں لیکن کوئی جواب سجھائی نہیں دیتا۔ آج بھی تین سالہ سوزین کے آنسو اور بائیس سالہ نوبیاہتا زینب کی آوازیں مسلسل میرا تعاقب کر رہیں ہیں اور میرے لئے کرب کا ایک اضافی پہلو یہ ہے کہ دل چیر دینے والی آواز میری پوتی کی آواز سے ہو بہو ملتی ہے!

بروز جمعرات 6 ذوالحج 1445ھ 13 جون 2024ء

جرمِ عظیم

خدا سے تجارت کون کرے؟ حالانکہ اسلامی تہوار بالخصوص عیدین کے ایام خدا سے کاروبار کرنے کا بہترین موقع فراہم کرتے ہیں اور ایسا کاروبار جس میں غلطیوں اور گناہوں کی میلی گٹھڑی کے عوض ثواب واستغفار کا بلاسود پیکیج نہایت آسان اور معمولی شرائط پر دستیاب ہے لیکن لالچ، خود غرضی، ریا کاری، فریب اور ہوس کی چیک پوسٹیں اور چُنگیاں بندے کو آسمانی یوٹیلیٹی سٹور تک پہنچنے سے پہلے ہی کنگال و کھوکھلا کر چکی ہوتی ہیں۔ ان اسلامی تہواروں میں خدا کے ساتھ اہل زمین عموماً وہی کرتے ہیں جو ناخلف اولاد ماں کے ساتھ کرتی ہے۔ ماں سے کوئی مشورہ نہیں کرتا لیکن سب کچھ اسی کے نام پر ہوتا ہے۔ ماں کا عملی مصرف بس یہ ہے کہ کونے میں عزت سے بیٹھی رہے اور ہر آتا جاتا اس سے دعائیں اور آشیر باد لیتا، سر پر ہاتھ پھروا کے آگے بڑھ جائے

خدا کی مخلوق، خدا کے ہاتھوں فروخت ہونے کی بجائے خدا کے نام کو فروخت کرنے میں زیادہ سہولت محسوس کرتی ہے۔ اس کے نام پر اربوں روپے کی اشتہار بازی ہوتی ہے، اسی کے نام پر اسی کے نام لیواؤں کو ایر کنڈیشنڈ اور سادہ عمرہ وحج پیکیجز بیچتے ہیں۔ پیسہ اپنی جیب میں، ثواب آپ کی جیب میں..... ہر آڑا ٹیڑھا تر چھا مال جو سال بھر بیچنا مشکل ہوتا ہے، دورانِ حج اور عیدین کو آسانی سے سرشار عبادت گزاروں کو منہ مانگے دام منڈھا جا سکتا ہے۔ حج کے نام پر ایسی لوٹ اور دھوکہ دہی، الامان والحفیظ! حرمین شریفین میں ہر سال دورانِ رمضان اور حج کے ایام میں سب سے زیادہ بھکاریوں کی پاکستانیوں کی پائی جاتی ہے اور اب تو خود سعودی عرب کی حکومت نے باقاعدہ طور پر پاکستان کو اس سنگین اور شرمناک معاملے کی روک تھام کا مطالبہ کیا ہے۔ وہاں کے مقامی میڈیا نے تو پھر بھی کچھ لحاظ رکھا لیکن پڑوسی ملک نے اس خبر کو جس قدر مرچ مصالحے کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کو دیکھ کر شرم سے سر جھک گئے ہیں۔

ادھر پاکستان میں ایک مرتبہ پھر کئی ایجنٹس حج کے نام پر غریب افراد کی عمر بھر کی کمائی لوٹ کر رفو چکر ہو گئے ہیں جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ان دنوں حج کے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے اخراجات جمع کرتے ہوئے ساری عمر خرچ ہو جاتی ہے۔ ادھر تمام خوردنی وغیر خوردنی مصنوعاتی برانڈز سبز پگڑی باندھے خصوصی آفرز کی پرکشش تسبیح گھماتے ہوئے سادہ مسلمان کی جیب سے آخری سکہ تک نکالنے کیلئے عیدین کی چراگاہ میں کود پڑتے ہیں۔ 50 روپے درجن کیلے خدا رسول کی قسم کھا کر ایک سو بیس روپے درجن بیچنے والا دوکاندار بھی مسلمان اور اپنے بچوں کیلئے جیب سے کچھ میلے کچیلے نوٹ اور ریزگاری نکال کر چھ کیلے بھی دس بار سوچ کر خریدنے والا گاہک بھی مسلمان ہے۔

چاند رات سے عید اور یوم عرفہ اور عید الاضحیٰ کی شب تک اپنے پیاروں سے بات کیجئے، صرف ایک روپیہ ننانوے پیسے میں۔ ثوابِ عیدین کال پیکیج کیلئے ابھی کال کیجیے چار دو صفر پر..... اور ڈاؤن لوڈ کیجئے اپنی پسندیدہ نعت، حمد، حج کی تلبیہ اور اذان کی رنگ ٹونز اور لوٹ لیجیے دونوں ہاتھوں سے ثواب کے مزے، کیا کہا؟ رات دیر تک ٹی وی بیہودہ پروگرامز اور اخلاق باختہ فلمیں دیکھنے کے بعد نیند نہیں آتی اور نماز فجر کیلئے بیدار ہونے میں دقت ہوتی ہے؟ تو یہ ہے نیا طاقتور سحر اب اسپرے.... رمضان اور ذوالحج بھر کی ساری راتیں "مچھر اور پسو" ابلیس کی طرح آپ سے دور رہنے پر مجبور..... رمضان المبارک کے مہینے حج کے خصوصی ایام میں روزہ دار اور حاجی کے منہ سے خوشبو کیوں نہ آئے؟ ہم لائے تو ہیں آپ کیلئے خصوصی مسواکی ٹوتھ پیسٹ، جو سحر تا افطار اور لاکھوں افراد کے اژدہام حج کے ایام میں آپ کے منہ کو دس طرح کے خطرناک جراثیم سے پاک و معطر رکھتا ہے، اور اب آپ کا دوران بلڈ پریشر کم زیادہ نہیں ہو گا؟ دورانِ حج میں تھکن سے بچنے کیلئے حکیم بڈھن کا تیر بہدف خمیرہ زنجبار استعمال کرنا مت بھولیں..... تین بوتلوں کی

خریداری پر شربتِ روح فرسا کی ایک بوتل مفت اور عید الاضحی پر قربانی کا وافر گوشت و دیگر مرغن کھانے جی بھر کر کھایئے مگر بد ہضمی، کھٹے ڈکار سے بچنے کیلئے "باباچورن" یا "قصوری پھکی" حاضر ہے، ہاں! اگر دونوں ہاتھوں سے لوٹی ہوئی قومی دولت کو چھپانا مقصود ہے تو اس کیلئے دبئی، لندن، سوئٹزرلینڈ و دیگر یورپی بینکوں کی ایک ایک لمبی فہرست تو آپ کے پاس پہلے ہی موجود ہے اور اس کام میں تعاون کرنے والے بھی ہاتھ باندھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

شیروانیاں اور ٹوپیاں پہن کر میک اپ زدہ مسخرے خدا کے نام پر کروڑوں روپے ابھی تو ہمیں رمضان المبارک کے وہ مناظر نہیں بھولے جب ڈیزائنرز کے سیزنل کنٹریکٹ سائن کر کے ٹی وی کے منبر پر بیٹھ کر عجز و انکساری، تقویٰ اور پرہیز گاری کے گیت گا رہے تھے، گلوگیریت چہرے پر سجائے ناداروں سے محبت، یتیموں سے شفقت اور مسکینوں سے قربت کی تلقین فرما رہے تھے، جب تازہ پھلوں کے خالص جوس کے ساتھ افطار و سحر ٹرانسمیشن کے محل نما سیٹ پر لگے روحانی دربار میں آنسو بیچتے ہوئے خدا کے نبی ﷺ کی تنگی و عُسرت بھری حیات مبارکہ کا اس انداز میں تذکرہ ہوتا تھا تو دیکھنے سننے والے روزہ دار کے ہاتھ سے نوالہ گر ہی تو پڑتا تھا۔ اور ان دنوں اب سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائشوں سے بھرپور زندگی اور بیٹے کی قربانی کا ذکر اس انداز میں کیا جا رہا ہے کہ ٹی وی دیکھنے والے اسی پروگرام کے وقفے میں قربانی کا اہتمام کرنے والے اداروں کے اشتہارات پر ان کو فون کر کے اپنا حصہ ڈال کر قربانی کا فریضہ ادا کرتے ہوئے یہ سنے گئے ہیں کہ اب کون جا کر منڈیوں میں دھکے کھا کر پھر اس کو ذبح کروانے کیلئے قصائیوں کی منت سماجت کرے، خود گھر پر گوشت کا تھیلا پہنچ جائے گا، بس اس کیلئے فریج اور فریزر کو مکمل خالی کر کے صفائی کر لیں۔ میرا کریم رب یہ مناظر ماہِ رمضان میں تیس روز اور ذوالحج کے پہلے عشرے کو دلچسپی سے دیکھتا رہا، انتظار کرتا اور مسکراتا رہا لیکن رحیم و رحمٰن رب نے عید کے روز مہربانیوں کا سارا اسٹاک اپنے ناشکروں میں اس امید پر بانٹ دیا شاید اگلی عید پر ہی کوئی بھولا بھٹکا مجھ تک پہنچ جائے۔

لیکن یہ کیا؟ ہم تو اللہ کو منانے کیلئے لاکھوں روپے کی گائے، بیل یا بچھڑا گلے میں ہار ڈالے میڈیا کی یلغار میں قربان گاہ تک لے آئے اور کیمروں کو گواہ بنا کر سنت ابراہیمی کی ان اداؤں کو تصاویر کی شکل میں ڈھال کر معاشرے میں پارسائی کا دعویٰ کرنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ باقی رہی سہی کسر میڈیا اپنے عید کے پروگرامز میں دکھا کر اپنی ریٹنگ بڑھانے کیلئے مصروف رہا۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق غزہ میں چھ لاکھ بچے بھوک کی وجہ سے موت کے دہانے پر اپنے رب سے ملاقات کیلئے تیار بیٹھے ہیں جہاں وہ یقیناً اپنے معصوم چہروں سے رب کو ہماری منافقت کی شکائت کریں گے۔ یہ چھ لاکھ بھوکے ڈھانچے تڑپ رہے ہیں اور بیشتر بچوں کے لواحقین کا بھی کوئی علم نہیں کہ شائد وہ پہلے ہی اپنے رب کے ہاں پہنچ چکے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں اس خوفناک بمباری سے بچ جانے والے یہ بچے اپنے ماں باپ کی گود میں تڑپ کر جان دے رہے ہیں۔ ہمارا سارا زور سوشل میڈیا پر ان مجبوروں کی تصاویر اور ویڈیو کی تشہیر میں تو گزر رہا ہے لیکن کتنے ہیں جو ان کا درد اپنے بچوں کے چہروں میں ڈھونڈتے ہیں۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ چیخ چیخ کر بتا رہی ہے کہ اسرائیلی بمباری سے 15 ہزار سے زائد بچے قتل کئے جا چکے ہیں، 17 ہزار لاوارث ہیں، لیکن خود کو ترقی یافتہ اور انسانی حقوق کے چیمپئن ممالک بھی اس کا نوٹس نہیں لے رہے۔ ہم ان بچوں کو کیسے بھول جائیں، کبھی نہیں، اس بہیمانہ قتل کے وہ سب مسلمان کہلوانے والے ذمہ دار ہیں جو بند آنکھوں اور مردہ ضمیروں کے ساتھ اپنے تعیشات میں غرق ٹس سے مس نہیں ہو رہے لیکن یاد رکھیں! ہم اس ظلم کو کبھی فراموش نہیں کریں گے، ہم ان کے اس بہیمانہ قتل کو نہیں بھولیں گے، ان کے ساتھ ہونے والی ان تمام زیادتیوں کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ اس

ظلم میں جہاں اسرائیل کے ساتھ امریکا، برطانیہ، اوراس ظلم میں شریک سینکڑوں بھارتی افراد کا اسرائیلی فوج کے ساتھ مل کر ان معصوم بچوں کو مارنے کے عمل کے علاوہ مودی کا اسرائیل کو اسلحہ سپلائی کرنا کبھی نہیں بھولیں گے۔ ان بچوں کے اس بہیمانہ قتل وغارت کو نہ روکنے کی وجہ سے "او آئی سی" بھی برابر کی ذمہ دار ہے، تمام مسلم حکمرانوں، اختیارات رکھنے والے جرنیلوں کے جرمِ عظیم کو بھی کبھی نہیں بھولیں گے!

ماں اور خدا..... آج دونوں کے پاس اپنے دنیادار بچوں کے انتظار کے سوا اور ہے ہی کیا؟؟

افلاس ہے رقص کناں جن کی ٹوٹی پھوٹی کٹیاوں میں
تم اپنی عید منا کر ان کو بھول نہ جانا دعاؤں میں
وہ افغانی کہساروں میں جن کے ماں باپ شہید ہوئے
ان معصوموں کی چیخیں ہر سو، پھیل رہی ہیں فضائوں میں
بھارت کے ظلم کی دھوپ میں وہ کشمیری قافلے پاپیادہ
ہے جن کی طلب کہ آکر بیٹھیں، پاکستان کی چھائوں میں
وہ بنگلہ دیشی کیمپوں میں جو روز دعائیں کرتے ہیں
اس پاکستان سے الفت کی زنجیر ہے جن کے پاؤں میں
اس مسجد اقصی کی چھت پر اور صحن میں جن کا بسیرا ہے
وہ سارے کبوتر جو محصور ہیں، غزہ میں خوں آشام بلاؤں میں
تم اپنی عید منا کر ان کو بھول نہ جانا دعاؤں میں

بروز یوم عرفہ ہفتہ 8 ذوالحج 1445ھ 15 جون 2024ء

عید الاضحیٰ اور فادر ڈے

برسوں بعد ساری دنیا میں عید الاضحیٰ اور فادر ڈے ایک ہی دن منائے جا رہے ہیں اور پچھلے کئی دنوں سے قارئین کا یہ سوال بھی مجھ پر قرض تھا کہ آپ نے "ماں، ممتا" پر بہت لکھا لیکن کیا وجہ ہے کہ آپ نے "باپ" جیسی شفیق ہستی پر اتنا نہیں لکھا کہ باپ کی خاموش محبت کیا ہوتی ہے؟ یہ ہے وہ سوال، جس کے جواب میں یقیناً پوری کتاب بھی باپ کی محبت کے ایک پل کا حق بھی نہیں چکا سکتی۔ نجانے باپ کا نام آتے ہی ایک کمزور اور ضعیف نورانی چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے لیکن میرے نزدیک باپ کی اہمیت اور شخصیت اس لئے سب سے الگ اور جدا ہے کہ میں نے تیرہ سال کی عمر میں اپنے "بابِ جنت" کو اس دنیا سے رخصت ہوتے دیکھا ہے۔

باپ کیا، کیسا اور کیوں اتنا اہم ہوتا ہے، شائد مجھ سے زیادہ نہ کوئی جان سکا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے کیونکہ جس اولاد پر ابھی تک باپ کا مبارک سایہ قائم ہے، وہ باپ کی جدائی کے دکھ کو نہیں سمجھ سکتے بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ "والد" کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہو گا کہ ان کی سرپرستی اولاد کیلئے کتنی بڑی رحمت، شفقت اور بے لوث سہارا ہے جس کا اس دنیا میں کوئی نعم البدل نہیں لیکن میرے باپ کو اس کا مکمل ادراک تھا کیونکہ وہ بھی کم سنی (9 سال کی عمر) میں یتیم ہو گئے تھے اور بڑے کرب کے ساتھ ان کی جدائی کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔

باپ اپنے اہل خانہ کی کفالت کیلئے دن رات اپنے آرام اور صحت کی پرواہ کئے بغیر بھرپور محنت میں جتا رہتا ہے اور اس کی ساری تھکان یہ سوچتے ہی غائب ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کا خوش نما مستقبل مضبوط کر رہا ہے۔ اسے اپنی اولاد کی تمام خواہشات کو پورا کرنا اس لئے بھی ضروری سمجھتا ہے کہ وہ خود بچپن میں اپنی خواہشات کا دم گھٹنے اور باپ کی مجبوریوں کا تجربہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دن کے علاوہ رات کو بھی بچوں کے مستقبل اور فکر معاش کیلئے بے چین رہتا ہے اور خوابوں کے محل تعمیر کرنے کے اپنی کھلی آنکھوں سے خوبصورت اور سہانے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ لیکن کمال درجہ کا ضبط کا مالک ہوتا ہے کہ کبھی گھر میں اپنی پریشانی یا الجھن نہیں بتاتا اور اپنی ذات پر ہر مشکل کو برداشت کر کے اپنے اہل خانہ کیلئے ایک سیسہ پلائی دیوار کی مانند کھڑا رہتا ہے۔

چونکہ میں والد صاحب سے زیادہ قریب رہا ہوں اس لئے میرے لئے یہ سوال بہت معنی رکھتا ہے لیکن محبت کا یہ شاہکار عین جوانی میں اللہ کے حضور حاضر ہو گئے اور میں بچپن ہی کی یادوں کے سمندر میں غوطے لگاتا رہتا ہوں اور ہر مشکل گھڑی میں رب کے بعد میرا باپ ہی میری منزل ہے کہ ان کے پند و نصائح اور خوبصورت سبق آموز کہانیاں مجھے آج بھی ازبر یاد ہیں۔

جہاں تک بات ماں کی محبت کی ہے تو اس بابت تو تب سے لکھا جا رہا ہے جب سے حضرت انسان نے لکھنا سیکھا تھا لیکن باپ ایک ایسی ذات ہے جس بابت شاید باپ نے بھی کبھی کھل کر نہیں لکھا اور بھلا لکھ بھی کیسے سکتا ہے کہ باپ کی محبت کا ہر رنگ نرالا اور مختلف ہے۔ ماں کی محبت تو بچے کی پیدائش سے اس کی آخری عمر تک ایک سی ہی رہتی ہے یعنی اپنے بچے کی ہر برائی کو پس پردہ ڈال کر اسے چاہتے رہنا۔ بچپن میں بچہ اگر مٹی کھائے تو ماں اس پر پردہ ڈالتی ہے اور باپ سے بچاتی ہے، نوجوانی میں بچے کی پڑھائی کا نتیجہ آئے تو اس رپورٹ کارڈ کو باپ سے چھپاتی ہے اور اپنے بچے کو بچاتی ہے، جوانی میں بچے کا دیر سے گھر آنا باپ سے چھپاتی ہے اور اپنے بچے کو بچاتی ہے ٹھیک اسی طرح جیسے جیسے بچہ بڑا اور اس کے "جرائم" بڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے ماں اپنے پردے کا دامن پھیلاتی چلی جاتی ہے، اس کے برعکس "باپ" ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی اولاد کو بے پناہ چاہنے کے باوجود اس پر صرف اس لئے ہاتھ اٹھاتا

ہے کہ کہیں بچہ خود کو بڑے نقصان میں مبتلا نہ کر بیٹھے، اس کی پڑھائی پر سختی برتتا ہے کہ کہیں اس کا بچہ کم علم ہونے کے باعث کسی دوسرے کا محتاج نہ بن کر رہ جائے، بچے کا رات دیر سے گھر آنا اس لئے کھٹکتا ہے کہ کہیں کسی بری لت میں مبتلا ہو کر بچہ اپنی صحت اور مستقبل نہ خراب کر بیٹھے۔

باپ شفقت محبت اور ایثار کا وہ کوہ ہمالیہ ہے جس کی چوٹی تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اس کا غصہ وقتی ہوتا ہے، اگر وہ ہماری کسی بات پر ناراض ہو بھی جائے تو اندر ہی اندر انتظار کرتا ہے کہ اسے منالیا جائے۔ وہ اوپر سے تو سخت ہوتا ہے پر اندر سے بالکل سادہ ہوتا ہے۔ صرف اس کی "انا اور مان" اپنی شفقت کا اظہار نہیں کرنے دیتی جو کہ ہمارے معاشرے کی عطا کردہ ہے۔ لیکن جونہی اولاد اس کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی کی طلبگار ہوتی ہے تو اولاد کے منہ سے ابھی فقرہ مکمل نہیں ہوتا کہ وہ دوڑ کر آپ کو اپنے سینے سے اس زور سے لگاتا ہے کہ محبت کی ساری گرمی جہاں اس کے سارے مصنوعی غصے کا کافور کر دیتی ہے وہاں اولاد کی غلطیوں اور شرمندگی کو والہانہ محبت سے شرابور کر دیتی ہے۔

یعنی بچے کی پیدائش سے لیکر قبر تک باپ کی زندگی کا محور اس کا بچہ اور اس کا مستقبل ہی رہتا ہے، جہاں ماں کی محبت اس کی آنکھوں سے اور عمل سے ہر وقت عیاں ہوتی ہے وہیں باپ کی محبت کا خزانہ سات پردوں میں چھپا رہتا ہے، غصہ، پابندیاں، ڈانٹ، مار، سختی یہ سب وہ پردے ہیں جن میں باپ اپنی محبتوں کو چھپا کر رکھتا ہے کہ بھلے اس کی اولاد اسے غلط سمجھے پر وہ یہ سب پردے قائم رکھتا ہے کہ اس کی اولاد انہی پردوں کی بدولت کامیابی کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کرتی ہے۔

میں بڑے اچھے اسکول میں پڑھتا تھا، اور اسی بات پر ہر روز چڑھتا تھا۔ میرے دوست لمبی لمبی گاڑیوں میں آتے اور میری طرح نہیں کہ تانگے سے اتر کر گھر کے بنے ہوئے پراٹھوں والا ٹفن ہاتھ میں تھامے اسکول داخل ہوتا جبکہ میرے سب دوست کنٹین میں بیٹھ کر رنگ برنگے سموسے اور دیگر کھانوں کا لطف اٹھاتے تھے۔ کچھ تو ایسے بھی تھے جو سال میں کسی غیر ملک میں چھٹیاں منانے جاتے تھے۔ کسی کا باپ ڈاکٹر، کسی کا باپ سیاستدان، کوئی کسی بڑی مل یا فیکٹری کے مالک کا بیٹا یا کوئی کسی بڑے سرکاری عہدے دار کا بیٹا ہوتا تھا۔ جبکہ میرے والد بالکل ان پڑھ اور ایک معمولی ہوٹل چلانے والے۔

ایک دن میں اس معاشرہ کے غیر امتیازی سلوک کو دیکھ کر پھٹ پڑا، اور بڑے درد کے ساتھ اپنے والد سے سوال کر دیا: ابا جی! یہ کیا ہے؟ آپ سب کی طرح پیسے والے، امیر شخص کیوں نہیں ہیں؟ میرا اچانک یہ سوال سن کر تھوڑی دیر مجھے دیکھا اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کی خاموش ہو گئے، مجھے شدت سے اس سوال کا جواب درکار تھا کہ ابھی اس کے جواب میں کچھ الفاظ میری دماغ کی خلش دور کر دیں گے۔ لیکن میں نے ان کی بھرائی آنکھوں میں جو درد دیکھا، وہ میرے دل میں ایک خنجر کی طرح اتر گیا اور دل میں سما گیا۔ آج بھی جب وہ آنکھیں تصور میں نظر آتی ہیں تو اپنے اس سوال پر ندامت بھی ہوتی ہے لیکن بچپن کی معصومیت کے پردے میں اسی طرح چھپا لیتا ہوں جس طرح میرے باپ نے اس دن اپنے آنسوؤں کو اندر ہی اندر جذب کر کے چھپا لیا تھا۔

ایک دن میں نے اپنے پوتے سے کہا: میں نے جو غلطی کی، تم اسے مت دہرانا، موسم کا حال اسے مت سنانا جو تمہارے لئے ہر روز بھاگتا رہا، سردی، گرمی، بارش آندھی، کسی موسم کی پرواہ نہیں کی۔ دھوپ اور سایہ میں تمیز نہیں رہی، کڑاکے دار سردی بھی اس کی راستہ نہ روک سکی۔ وہ تم سب کے اچھے مستقبل کیلئے بھاگتا رہا، اس کیلئے رات اور دن کا فرق مٹ گیا تھا، کیونکہ اس سخت جاں محنت کی کمائی تم ہو۔ اس سے کبھی یہ نہ پوچھنا کہ اس نے کمایا کیا ہے؟

شہر میں بڑی بڑی دوکانیں تھیں، کپڑوں کھلوں اور کتابوں سے بھری ہوئی ہر دیکھنے والے کو دعوت دے رہی تھیں۔ لیکن مجھے نہیں پتہ کہ ان دنوں میرے والد کی مالی استطاعت کیا تھی تاہم اندر سے یہ آواز اٹھتی تھی کہ اگر میں اپنے باپ سے کسی چیز کی فرمائش کروں تو یہ ممکن نہیں کہ وہ مجھے نہ لا کر دیں۔ میں برسوں سے ان کو وہی دو کرتے شلوار میں دیکھ رہا تھا۔ نئے سوٹ کی باری تب آتی جب پہلے والا بالکل پہننے کے لائق نہ رہتا لیکن عجب بات یہ ہے کہ میں جب بھی کپڑے، کھلونے اور کتابوں کی فرمائش کرتا، وہ مجھے فوری مل جاتا۔ کچھ قصے ایسے ہیں جو دل پر درج ہو گئے اور میرے روح تک کو انہوں نے اسیر کر رکھا ہے۔ میں یہ کبھی نہیں بھول پاتا کہ میرے بابا ہماری خوشیاں خریدتے ہوئے خود خرچ ہو گئے۔

میں ڈرتا نہیں، کسی مشکل، کسی آزمائش، کسی آفت یا مصیبت سے نہیں ڈرتا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میرے پاؤں میں کسی معمولی سے دکھ کا بھی کانٹا چبھ جائے، اگر میرا وقت بگڑ جائے اور دنیا میرا ساتھ چھوڑ جائے، مجھے اس کی پرواہ نہیں کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہی ہے میرا باپ جو سجدے سے اس وقت تک سر نہیں اٹھائے گا جب تک اس کا بیٹا فتح یاب ہونے کا نعرہ نہیں لگائے گا۔ جب تک وہ شفقت بھرا محنتی ہاتھ میرے سر پر تھا، میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میں تو اس کے سہارے اور یقین پر دنیا کی تمام قیامتوں سے لڑ جاتا تھا اور اپنی کامیابی کی خبر سنانے کیلئے دروازے میں اس کی راہ دیکھتا رہتا تھا۔

یہ کیا؟ لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ میرے بابا جن کو میں ایک سخت گیر سمجھتا تھا لیکن میری ماں کی ہر بات پر خاموشی سے "ہاں کر دینے والے میرے "بابا"، جب کبھی ایک روپیہ مانگا تو جواب میں سب سے چھپا کر پانچ روپے میری جیب میں یا میری کتاب کھول کر اس کے اندر چھپا کر رکھ دینے والے میرے "بابا" جن کے جوتے سے ان کے پاؤں کی انگلیاں باہر جھانکتے نظر آتی رہیں لیکن مجھے مہنگے جوتے اور سینڈل لا کر دیتے رہے اور میرے چہرے پر آئی ہوئی خوشیوں کو دیکھ کر واری قربان ہوتے رہے۔

خود بیچارے بہت ہی سیدھے سادے مزاج کے مالک لیکن میرے بگاڑنے کا الزام ساری عمر اپنے کندھوں پر ڈھوتے رہے اور ہاں اب تو میں سچ مچ بگڑ چکا ہوں، میرا دل جیتنے کیلئے چاہے کوئی بڑی گاڑی میں آئے، قیمتی فیشن ایبل لباس زیبِ تن کر آجائے، ہاتھ میں بہت ہی مہنگا موبائل فون تھامے ناز نخرے کرتا ہوا آئے، میرے راستے میں پھول بچھانے کی بجائے خود بچھ جائے، میرا پیار کسی ایسے ویسے کو ملے گا نہیں، مجھے اپنے بابا سے کم کوئی چلے گا نہیں۔

"بابا" چار الفاظ پر مشتمل ایک معمولی سا لفظ، اس میں کوئی ڈرامہ نہیں جو "باپ" میں ہے، وہ گہرائی نہیں جو "باباجی" کہنے میں ہے، وہ مٹھاس نہیں جو "اباجی" کہنے میں ہے، وہ حفاظت کا احساس نہیں جو کبھی کبھار "باباجانی" میں ہے لیکن کچھ تو ہے کہ یہ معمولی سا لفظ سنتے ہی میرے اندر کا موسم بدل جاتا ہے۔ میں کچھ اور ہو جاتا ہوں، جس دن یاد آتا ہے کہ میں اپنے باپ کا فخر تھا تو اس دن میرے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ خوشیوں سے معمور ہو کر اپنے حسن کی گواہی دینے لگ جاتا ہے۔

بہت چھوٹا تھا میں، جب میرے "بابا" میرے لئے کھلونا کار اور اس کے ساتھ ایک موٹے کاغذ کا ایک چمکدار تاج لیکر آئے تھے جس کو پہن کر میں کئی دن شہزادوں کی طرح گھومتا رہا۔ اپنے دوستوں کی تحسین بھری نگاہیں موصول کر کے سینہ چوڑا کر کے چلتا رہا۔ دن، ماہ و سال تیزی سے گزرتے گئے اور میں ان تمام کھلونوں سے آزاد ہو کر اپنی تعلیم اور دوسرے مشاغل میں کھو گیا۔ غالباً میں نویں کلاس میں تھا اور میری عمر بھی بچپن کی حدوں سے نکل کر لڑکپن یعنی تیرہ سال تک جا پہنچی تھی۔ اپنے امتحانات میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے کی خوشی میں حسبِ عادت پھر تحفہ کی فرمائش کی تو نجانے کہاں سے وہ میری وہی پرانی کھلونا کار اور وہ موٹے سنہری کاغذ کا تاج نکال کر لے آئے اور میرے نئے تحفے کے ساتھ ان کو شامل کر کے مجھے اس احساس سے مالا مال کر

گئے کہ وہ "بابا" جو اپنے بچوں کے بچپن کا ہر لمحہ اس قدر محفوظ رکھ سکتے ہیں تو ان کی بے لوث دعائیں تو آپ کی ساری زندگی کے تحفظ کی گارنٹی بن سکتی ہیں

اگلے دن "بابا" بہت غور سے مجھے دیکھ رہے تھے اور مجھے ان کی نظروں سے یہ محسوس ہوا کہ یہ میرے سر پر کل کے سنہری کاغذ کے تاج کو حقیقت بنتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور نجانے دل میں کیا دعائیں دیں کہ میں آج سچ مچ ان کی دعاؤں کی بدولت دنیا کی ہر آسائش کے لطف اٹھا رہا ہوں اور مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے سر پر تاج سجانے کیلئے کسی بادشاہ کی ضرورت نہیں بلکہ اس کیلئے میرے بابا کی دعاؤں میں بھرپور سنہری کاغذ کا تاج ہی کافی ہے۔ لیکن "بابا جانی" مجھے آج آپ کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ میں تو ان تمام آسائشوں کے باوجود آپ کا مقروض ہوں کہ میں تو اس صدقے کے چند سکے بھی نہ لوٹا سکا جو آپ نے میرے ہاتھ سے ایک فقیر کو دلوائے تھے۔ میں مسجد کا وہ چندہ تک واپس نہیں کر پایا جو آپ ہمیشہ مجھے مسجد کے ڈبے میں ڈالنے کیلئے دیتے رہے۔ میرا یہ قلق ختم ہونے نام نہیں لے رہا کہ میری کمسنی میں ہی آپ ہم سب کو چھوڑ کر اللہ کے ہاں حضور ہو گئے!

میں نے سنا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے محل کا مالک برونائی کا سلطان ہے، مجھے جب برونائی جانے کا موقع ملا تو میرے میزبان نے اچانک مجھ سے کہا کہ اگلے دو منٹ کے بعد ہم برونائی کے "ایمان کی روشنی کا محل" کے سامنے سے گزریں گے جو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں دنیا کے سب سے بڑے محل کے طور پر شامل کیا گیا ہے، جو 2 ملین مربع فٹ پر محیط ہے۔ اس محل کا گنبد 22 قیراط سونے سے مزین ہے۔ اس میں 1788 کمرے، سلطان کے پولو ٹٹو کے لیے ایئر کنڈیشنڈ اصطبل، سونے کے دروازے کے ہینڈل اور 257 باتھ روم ہیں۔ سال میں صرف رمضان کے اختتام پر تین دن عوام کے لیے کھلا رہتا ہے، جب سلطان اپنے استقبال کے لیے ایک "اوپن ہاؤس" کا انعقاد کرتا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ عرب کا ایک امیر حکمران ایک ایسی گاڑی کا مالک ہے جو سونے (گولڈ) سے تیار کی گئی ہے۔ دنیا میں اب درجنوں افراد ایسے ہیں جن کی دولت کے تخمینے کھربوں ڈالر تک پہنچ چکے ہیں، اور ان میں کئی افراد ایسے ہیں کہ ان کی دولت کر محفوظ کرنے کیلئے بینکوں کے پاس بھی جگہ نہیں رہی اور اب وہ دیگر ذرائع سے اپنی دولت کو محفوظ کر کے اک خاص نشے میں مبتلا ہیں لیکن یقین کریں کہ دنیا کے امیر ترین فہرست پر آج بھی میرا باپ سر فہرست ہے۔ میرے بابا جیسا عالی شان اور کون ہو گا جو اپنے کرتے کی چھٹی جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے یقین دلاتا رہا کہ جو مانگے گا، ملے گا۔۔۔ آپ خود بتائیں بھلا اس سے بڑا دولت مند اور کون ہو سکتا ہے۔

میرے ابا جی انتہائی رعب داب شخصیت کے مالک تھے لیکن کبھی بھی انہوں نے مارا نہیں۔ بظاہر انتہائی سخت معلوم ہوتے تھے لیکن یہ اس ڈسپلن کا تقاضہ تھا جو بچوں کی تربیت کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ ہم بھائیوں پر بہت سخت پابندیاں تھیں۔ اور یہی کچھ ہر اولاد کو محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کا باپ دنیا کا سب سے برا اور ظالم باپ ہے کہ جو نا ہی دوستوں کے ساتھ رات گئے تک بیٹھنے دیتا ہے اور نہ ہی جیب خرچ اتنی زیادہ دیتا ہے کہ اولاد فضول عیاشیاں کر سکیں۔ باقی بھائیوں نے تو شائد اتنی سخت پابندیوں کا سامنا نہ کیا ہو لیکن میرے ساتھ بے انتہاء پیار ہونے کے باوجود کبھی میری بے جا ضد کو نہیں مانا گیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ بڑا بیٹا گاڑی کا انجن ہوتا ہے اور باقی بہن بھائی اس کے ساتھ منسلک بوگیوں کی مانند ہوتے ہیں۔ آج جب اپنے بچپن کے دوستوں کو نشے یا دیگر خرافات میں مبتلا دیکھتا ہوں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ ہمارے والد صاحب نے ہم پر سختیاں برتیں جس کی بدولت آج کسی بھی طرح کے نشے

سے خود کو بچائے رکھا ہے، اور آج اس مقام پر کھڑے ہیں کہ اپنے والدین کا سر فخر سے بلند رکھ سکیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ باپ سانسیں لیتے ہوئے بھی مر جاتے ہیں، جیسے جیسے اولاد کا اختیار بڑھتا اور والد کا اختیار گھٹتا جاتا ہے ویسے ویسے ہی باپ "مرنا" شروع ہو جاتا ہے۔ جب بچہ طاقتور جوان ہونے لگتا ہے تو باپ کا ہاتھ بعض اوقات اس خوف سے بھی اٹھنے سے رک جاتا ہے کہ کہیں بیٹے نے بھی پلٹ کر جواب دے دیا تو اس قیامت کو میں کیسے سہوں گا؟ جب بچے اپنے فیصلے خود لینے لگیں اور فیصلے لینے کے بعد باپ کو آگاہ کر کے "حجت" پوری کی جانے لگے تو بوڑھا شخص تو زندہ رہتا ہے پر اس کے اندر کا "باپ" مرنا شروع ہو جاتا ہے۔ باپ اس وقت تک زندہ ہے جب تک اس اولاد پر اس کا حق ہے۔ جس اولاد سے اس نے اتنی محبت کی کہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر اس کی سرزنش بھی کی ہو، اولاد کے آنسو بھلے کلیجہ چیر رہے ہوں پھر بھی اس لئے ڈانٹا کہ کہیں نا سمجھ اولاد خود کو بڑی تکلیف میں مبتلا نہ کر بیٹھے، ماں کی محبت تو یہ ہے کہ پیاس لگی (پیار آیا) تو پانی پی لیا پر باپ کی محبت یہ ہے کہ پیاس لگی تو خود کو اور اتنا زیادہ تھکایا کہ پیاس لگتے لگتے اپنی موت آپ مر گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ "والد" کا اولاد کی زندگی پر ہمیشہ اختیار رہنا ضروری ہے لہذا اولاد کو عمر کے ہر حصّے میں باپ کو یہ یقین دلانا ضروری ہے کہ اسے کبھی احساس نہ ہو کہ اب ہم "بڑے" ہو گئے ہیں یا ان کی اہمیت گھٹ چکی ہے لہذا پیسے ہونے کے باوجود اپنے ہر کام کے لئے باپ سے پیسے مانگنا اپنی عادت بنا لو چاہے وہ تمہاری اپنی ہی کمائی ہوئی دولت کیوں نہ ہو، رات اگر کسی پروگرام سے واپسی پر دیر ہو جانے کا خدشہ ہو تو آدھا گھنٹہ پہلے باپ کی منتیں کرنی شروع کر دو کہ پلیز جانیں دیں جلدی واپس آجاؤں گا۔ آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ روڈ کراس کرتے ہوئے بوڑھا اپ آج بھی جوان اور توانا بچے کا ہاتھ پکڑ کر رکھتے ہیں جبکہ آپ کے بچے بھی شادی شدہ ہو گئے ہیں اور یقیناً تمام اولاد دل ہی دل میں ہنستے ہوئے اور آس پاس کھڑے لوگوں کی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے باپ کا ہاتھ پکڑ کر روڈ کراس کرتے ہوئے دیکھتے ہوں گے لیکن اس کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

باپ "کو زندہ رکھا جائے، پھر چاہے وہ چارپائی پر پڑا کوئی بہت ہی بیمار اور کمزور انسان ہی "باپ کی محبت اولاد سے ماسوائے اس کے اور کچھ نہیں مانگتی کہ کیوں نہ ہو، اگر اس کے اندر کا "باپ" زندہ ہے تو یقین جانئے اسے زندگی میں اور کسی شے کی خواہش اور ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کے والد صاحب سلامت ہیں تو خدارا اس کے اندر کا "باپ" زندہ رکھئے یہ اس "بوڑھے شخص" کا آپ پر حق بھی ہے اور آپ کا فرض بھی ہے۔

یقیناً ہم سب جنت کے امیدوار ہیں تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ اپنی ماں جس کے قدموں کے نیچے جنت ہے تو باپ کو جنت کا دروازہ تعبیر کیا گیا ہے اور داخلہ کیلئے دروازہ کی کیا قدر اور اہمیت ہے، ہم سب جانتے ہیں لیکن میرے رب کا یہ فرمان کہ جس کے ساتھ باپ ناراض ہو تو میرا رب بھی اس سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کو راضی رکھنا ہو گا۔ ٹھیک اسی طرح رحم کرنا ہو گا جس طرح انہوں نے ہم پر رحم کیا جب ہم محض گوشت کے اک لوتھڑے کے سوا کچھ نہ تھے۔ وہ بڑے خوش نصیب ہیں جن کے والدین یا ان میں کوئی ایک زندہ ہے۔ اللہ نہ کرے کہ دیر ہو جائے، ان کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی دعاؤں میں اولاد ہی سرفہرست ہوتی ہے، اپنے لئے تو مانگنے کا انہیں یاد بھی نہیں ہوتا۔ والدین بالخصوص والد کی اہمیت ہم جیسے ہی بتا سکتے ہیں کہ جن کے کان ہر عید اور خاص تہوار پر وہ رس بھری آواز کے منتظر رہتے ہیں کہ کاش کوئی آگے بڑھ کر ویسے ہی گلے لگا کر عید مبارک کہے جس طرح بچپن میں منہ چوم کر ہاتھ میں عیدی ملتی تھی۔

بابا! آپ کے جانے کے بعد پتہ چلا کہ میرے رب نے آپ کو جنت کا دروازہ کیوں کہا۔ باپ ایک ایسا بے داغ آئینہ ہوتا ہے جس پر کبھی بھی کسی قسم کی

دھول ٹھہر نہیں سکتی اور اس آئینے میں اسے اپنی اولاد سے زیادہ کوئی اور خوبصورت دکھائی ہی نہیں دیتا۔ میرے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ دعا عبادات کا مغز ہے، اس لئے اپنے رب سے کثرت کے ساتھ دعا کرنی چاہئے اور میرے رب کا فرمان ہے کہ میں بندے کے گمان کے مطابق ہوں، اس لئے میری گزارش ہے کہ اپنے رب سے ہمیشہ خوش گمان ہو کر مانگیں۔

دعا "ایک "امید" ہے"

دعا "ایک "یقین" ہے"

دعا "ایک "بھروسہ" ہے"

دعا "ایک "وسیلہ" ہے"

دعا "ایک "حوصلہ" ہے"

دعا "ایک "محبت" ہے"

میری سب دعاؤں کا مرکز میرا باپ!

میری دعا ہے کہ یا کریم ورحیم رب! جن کے والدین اس دنیا میں نہیں رہے، ان کی بخشش فرما اور جن کے والدین زندہ ہیں، ان کی خدمت کرنے کی توفیق عنائت فرما کہ تو ہی ہماری دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا ہے۔ آپ ہمیشہ خوش، آباد، سلامت رہیں اور میرا کریم رب آپ کو کسی کا محتاج نہ کرے۔

آمین!

تاریک ہو گئی مری کائناتِ حیات جن کے بغیر

بروز عید الاضحیٰ اتوار 10 ذوالحج 1445ھ 16 جون 2024ء

نیا دجال، نیا جنجال

گیارہ ستمبر 2001ء کو قصر سفید کے فرعون کی نخوت و تکبر بھری آواز نے ساری دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جس میں اس نے اپنی فرعونی طاقت کے بل بوتے پر ساری انسانیت کو للکار کر خوفزدہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "آج ہماری تہذیب اور طرزِ زندگی پر حملہ ہوا ہے، یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے مخالف"۔ ایک وہ جو یہودی منصوبہ بندی "ورلڈ آرڈر" کی امریکی حکمت عملی کا حصہ بنیں گے اور جدید تہذیب کا دفاع اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیکر تن من دھن سے اس مشن میں حصہ لیں گے، انہیں اپنے مفادات کی حد تک محبوب رکھا جائے گا چاہے وہ تاریخ کی سب سے بدترین وحشت ناک بربریت کے مرتکب کیوں نہ ہوں، دوسرے وہ جو یا تو جدید تہذیب کا مقابلہ کریں گے یا فرعونی امریکی حکمت عملی کے بارے میں سکوت اختیار کریں گے ،مؤخر الذکر دونوں کو بالتدریج عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا لیکن کس کو اس بات کا علم تھا کہ غرور و تکبر کے نشے میں مدہوش عالمی طاقت کہلانے والا ایسی دلدل میں پھنسنے جا رہا ہے جس میں اس سے قبل زمین پر خدائی کا دعویٰ کرنے والوں کے آثار موجود ہیں لیکن اب بھی یہ عبرت حاصل کرنے کو تیار نہیں

کاش تاریخ کو گیارہ ستمبر 2001ء کا دن نہ دیکھنا پڑتا جس کے نتیجے میں ملکوں کے ملک اجڑ گئے، شہر ویران کر دیئے گئے، بستیاں برباد ہو گئیں، لاتعداد گھروں کا ملیامیٹ کر دیا گیا، لاکھوں انسانوں کو تہہ تیغ، معاشی و سیاسی بالادستی کی خاطر بارود سے نہ صرف بھسم کر دیا گیا بلکہ ان کے چیتھڑے تک اڑا دیئے گئے، جوان لڑکیوں کو اجتماعی تشدد و ہوس کا نشانہ بنا دیا گیا، اولاد کے سروں سے والدین کا سایہ چھین لیا گیا۔ نوجوان نسل کو ان کے ماں باپ کے سامنے چیتھڑوں میں تبدیل کر دیا گیا، انسانیت کو عبرت کا نشان بنا دیا گیا، انسان تو کیا حیوانات، نباتات اور جنگلات تک کو بھی جنگی جنون کی خاطر جلا کر راکھ کر دیا گیا۔

کاش! گیارہ ستمبر 2001ء کو وہ 81 مسافر سفر معطل یا مؤخر کر دیتے یا بوسٹن کے لوگ انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی بجائے کسی دوسرے ہوائی اڈے کا انتخاب کر لیتے یا اس کی ایئرپورٹ سے موت کی طرف فلائٹ لینے کی بجائے کسی دوسری پرواز کو منتخب کر لیتے تو شائد 8 بجکر 48 منٹ پر 81 مسافروں سے بھرا جہاز جو "لاس اینجلز" کی طرف جا رہا تھا، ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے جا کر نہ ٹکراتا اور آج اس فرعون صفت ریاست امریکا کا رعب و دبدبہ، وقار اور بین الاقوامی بالادستی بدستور قائم رہتی، اسے مسلسل دو دہائیوں تک ذلت و رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور آخر کار افغانستان کی خاک پر ناک رگڑتا واپس لوٹنے کا فیصلہ نہ کرنا پڑتا۔

لیکن یہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ آسمانی رزق من و سلویٰ کھانے والی قوم کی منصوبہ بندی نے امریکا کو آرام سے کب بیٹھنے دیا اور اس بین الاقوامی تذلیل کے فوری بعد یوکرین میں نیا محاذ گرم کر دیا جبکہ قصر سفید کے فرعون اور ان کے حواریوں کو بخوبی علم ہے کہ بعض ادارے وقتاً فوقتاً امریکا کو اپنی جھوٹی شان اور بالادستی کی خاطر بیک وقت مختلف ممالک جنگوں میں دھکیل دینے کے بعد اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے کٹھ پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر نچا رہے ہیں، اور انہی اداروں کے بدترین فیصلوں کی تعمیل میں ٹرمپ کو فوجی، سیاسی اور معاشی طور پر کمزور امریکا کو مزید تباہی سے بچانے کیلئے افغانستان سے اپنی افواج کو واپس لوٹنے کا حکم دینا پڑا، اور اس کے ساتھ ہی پاکستان سے اپنے افواج کی سلامتی کیلئے براستہ پاکستان واپسی کیلئے درخواست دینی پڑی، جس پر عملدرآمد کیے بغیر امریکا کے پاس کوئی دوسرا آپشن موجود نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں 16 دسمبر کو امریکا اور افغان طالبان کے مابین براہ راست مذاکرات ہوئے اور پھر افغانستان میں موجود امریکی سفارتخانے کی طرف سے امریکی افواج کی واپسی کا اعلامیہ جاری کر دیا گیا۔ یہ ایک طرف تو افغان مجاہدین کی فتح کا اعلان

تھاتو دوسری طرف امریکا کی خود مختاری پر ایسا شرمناک سوالیہ نشان بن گیا جو امریکا کی آئندہ نسلوں کو شرمندہ کرنے کیلئے کافی رہے گا۔

اس تمام صورتحال کا تجزیہ کرنے کیلئے یہ جاننا اس لئے ضروری ہے کہ آئندہ ایسی المناک غلطیوں سے جہاں عبرت حاصل کی جائے وہاں ایسے جرم عظیم کا اعادہ نہ کیا جاسکے۔ کن مفادات اور مقاصد کے پیش نظر امریکا نے افغانستان میں قدم رکھا؟ کیا امریکا افغانستان میں اپنے مفادات کے حصول میں کامیاب ہوا؟ اگر ہاں تو افغان طالبان سے براہِ راست مذاکرات کی بھیک مانگنے اور رسوا کن فرار کے مناظر کو آپ کیا نام دیں گے؟ یہاں تک کہ اپنے ہی جگری یاروں یعنی بھارت، اسرائیل اور کابل کی کٹھ پتلی حکومت کی حاضری کو بھی ضروری نہ سمجھا اور اگر امریکا اپنے مفادات کے حصول میں اب تک ناکام رہا تو کس کے ایماء پر اپنی قومی غیرت کا جنازہ نکالنے اور سب سے پہلے امریکا کے نعرے کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوا، اور افغانستان سے اس قدر عجلت میں کوچ میں اپنی عافیت کا راستہ کیوں اپنایا؟ اس کا ایک انتہائی سیدھا اور سادہ جواب ہے کہ امریکی معیشت خود تو بیساکھیوں پر کھڑی ہے اور امریکا مزید جنگوں میں جانی ومالی نقصان کے بوجھ تلے دیوالیہ کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ امریکی مالیاتی اداروں کے مطابق اس کے پاس جنگوں پر مزید خرچ کرنے کیلئے اخراجات کا فقدان امریکا کو جلد از جلد اس مالیاتی طوفان سے بچنے کا مطالبہ کر رہا تھا اور امریکی معیشت کی پشت پر کارفرما یہودی لابی بھی افغانستان میں مزید سرمایہ اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ دنیا پر خدائی نظام کی مانند ایک عالمی نظام نافذ کرنے کا خواب دیکھنے والے نظریاتی یہودیوں کو امریکا کے اکتالیسویں صدر سنیئر بش (جارج ہربرٹ واکر بش) کا 1992ء میں بنایا گیا اٹھارہ سال کے بانی ومالی نقصانات کے باوجود بھی ناکام دکھائی دے رہا تھا، لہٰذا ٹرمپ جو بالواسطہ اور بلاواسطہ یہودی لابی کیلئے ایک مہرے کے طور پر امریکا کی صدارت پر براجمان تھا، نے صدارت سنبھالتے ہی فوج کو واپس بلانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، جس پر عملدرآمد کیلئے افغانستان میں موجود امریکی سفارت خانے کی طرف سے اعلامیہ جاری کروانے کے بعد آئندہ ماہ وسال میں اسے عملی جامہ پہنانے کے امکانات پر واضح یقین دلایا گیا۔

میرے اس مؤقف سے یقیناً بعض حضرات کو اختلاف ہو سکتا ہے کہ فلسطین میں غیر قانونی سکونت اختیار کرنے والے صرف 65 لاکھ یہودی عالمی طاقت امریکا کو کیسے مجبور کر سکتے ہیں کیونکہ امریکا تو جمہوریت کا علمبردار ہے اور ٹرمپ اپنے تمامتر اختیارات کو استعمال کرنے کے باوجود بھی جمہوری اقدار کو پامال نہیں کر سکتا تھا اور اگر وہ چاہے بھی تو کابینہ میں ایسے افراد ضرور پائے جاتے ہیں جو ٹرمپ کے ایسے اقدامات کو ہرگز قبول کرنے کی اجازت نہیں دیں گے جس کیلئے وہ امریکی بالادستی اور مفادات پر زد پڑنے کا جواز پیش کریں گے۔ امریکی خود مختاری کس طرح یہودی لابی کے پنجے میں ہے اور کابینہ، سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں پھیلے یہودی اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے امریکی فیصلوں پر کیسے اور کس حد تک اثرانداز ہوتے ہیں، یہ حیرت انگیز انکشافات پر مبنی ایک دلچسپ تاریخ ہے جس کا اندازہ آپ تاریخ کے چند واقعات سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

جارج ایچ ڈبلیو بش (1989 تا 1993ء) جو امریکا کا اکتالیسواں صدر تھا، اس کا خاندانی پیشہ تیل کا کاروبار تھا۔ یہ لوگ امریکا کی سب سے بڑی ریاست ٹیکساس کے رہنے والے ہیں جسے امریکی تیل کا دارلحکومت بھی کہا جاتا ہے، چونکہ اس زمانے میں امریکا تیل کا سب سے بڑا درآمد کنندہ تھا اور اس کی اپنی پیداوار استعمال کے بیس فیصد کے برابر تھی، باقی سعودی عرب، میکسیکو اور وینزویلا سے درآمد کیا جاتا تھا، اس لئے ریاست ٹیکساس میں تیل کے کاروبار سے وابستگی کے باوجود جارج ڈبلیو بش نے دنیا بھر کے تیل پر قبضہ جمانے کیلئے ایک منصوبہ بنایا اور 1992ء میں تیل کی تین بڑی کمپنیوں کے سربراہان کو واشنگٹن میں جمع کیا۔ خلائی اسٹیشنوں سے لی گئی تصاویر اسکرین پر چلائی گئیں اور اپنی چھڑی سے آذربائیجان، قازقستان، ترکمانستان اور ازبکستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان چار ملکوں کے نیچے پانچ کھرب ڈالر کا تیل اور گیس پوشیدہ ہے جس پر میں قبضہ کرنا چاہتا ہوں، کون میرا پارٹنر بننا پسند کرے

گا؟

تمام کمپنیوں کے سربراہان نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ مذاکرات ابھی حتمی شکل اختیار نہیں کر پائے تھے کہ سنیئر بش کی حکومت ختم ہو گئی تاہم مذاکرات پھر بھی جاری رہے۔ اسی دوران اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کو ان تمام سرگرمیوں کی اطلاعات موصول ہوئیں اور وہ بھی متحرک ہو گئی۔ اب موساد کو یہاں دو چیلنجز کا سامنا تھا، ایک نئے منتخب امریکا کے 42ویں صدر کو حصار میں لینا، کابینہ اور ارد گرد تمام سرکاری اور حساس اداروں تک رسائی حاصل کرنا اور دوسرا دنیا بھر کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا۔ آپ یہ جان کر چونک اٹھیں گے کہ تقریباً ایک سال سے بھی کم عرصے کے دوران یہودیوں نے بل کلنٹن کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کر دیا مثلاً کلنٹن کی یہودی نژاد وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ، نائب وزیر خارجہ سٹینلے ارتھ، وزیر دفاع ولیم کوہن، وزیر خزانہ لارسن سمرز، نائب وزیر خزانہ اسٹورن آنزن ٹیسٹ، اقوام متحدہ میں امریکی سفیر رچرڈ ہال بروک، نیشنل سیکورٹی کا سربراہ سینڈل برگر، چیف آف سوشل سیکورٹی کینتھ ایفل، ٹریڈ کا نمائندہ چارلس برشینکی، ڈائریکٹر سی آئی اے ڈیوڈ کوہل، آئی بی ڈائریکٹر ہال آئزنز، کمیونیکشن ڈائریکٹر رابی امونیل راہم، نیشنل ہیلتھ کیئر ایڈوائزر تھامس ریپٹن، ڈائریکٹر مینجمنٹ آف بجٹ ایلیس ریولن، اکنامک پالیسی ایڈوائزر صتیلے پوسکن، یہاں تک خود کلنٹن اور ہیلری کا ذاتی سٹاف تک یہودی تھا لہند اصدر اور خاتون اوّل کی ذاتی اور کاروباری مصروفیات کا تمام تر شیڈول یہی لوگ بناتے تھے۔ یہ دور یہودیوں کیلئے انتہائی سنہری دور تھا جس میں خوب کھل کر امریکی انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے ذریعے اپنی پالیسیوں کو عملی جامہ پہناتے رہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تین فیصد امریکی یہودی 97 فیصد امریکیوں اور سو فیصد دنیا کے مالک بنے بیٹھے ہیں اور یہ تمام یہودی انتہائی درجہ کے متعصب، بنیاد پرست اور نظریاتی تھے۔

دوسری طرف دنیا بھر کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کیلئے موساد نے یوسف اے میمن کو ترکمانستان میں تعینات کیا۔ یوسف اے میمن موساد سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اسرائیل کی ایک کمپنی مہیر و گروپ کا صدر بن گیا۔ اس وقت ترکمانستان کے صدر نیازوف نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے یوسف اے میمن کو نہ صرف ترکمانستان کی شہریت دی بلکہ اسے آئل و گیس کا مشیر اور خصوصی سفیر بنا دیا اور یوں ترکمانستان کے تیل پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تیل کے دیگر تجارتی معاہدوں کے ذریعے یوسف اے میمن نے آذربائیجان کے تیل کے ذخائر تک بھی رسائی حاصل کر لی۔ ادھر سنیئر بش کے تیل کی بڑی کمپنیوں کے ساتھ مذاکرات کے نتیجے میں امریکا کی دیگر آئل کمپنیوں نے بھی ترکمانستان اور قازقستان میں مجموی طور پر 33 / ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی تھی اور پاکستان سے افغانستان اور افغانستان سے ترکمانستان گیس پائپ لائنز بچھانے کی سرمایہ کاری اس کے علاوہ تھی۔ اس صورتحال نے اسرائیل اور بش خاندان کو ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑا کر دیا کیونکہ تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا دونوں کا مقصد تھا۔

بش خاندان نے جب سینٹرل ایشیا کے تیل کو یورپ اور امریکا پہنچانے کے بارے میں سوچا تو اس کے صرف تین راستے تھے۔ پہلا راستہ ترکمانستان، قازقستان، ازبکستان اور آذربائیجان سے روس اور روس سے یورپ، دوسرا چار ممالک سے براستہ ایران سے بحیرۂ عرب اور وہاں سے یورپ اور امریکا، اور تیسرا ان چار ممالک سے افغانستان براستہ پاکستان، بھارت اور وہاں سے بحر ہند سے یورپ اور امریکا۔ روس کے صاف انکار کر دینے پر صرف دو آخری آپشن تھے لیکن چونکہ امریکا ایران پر اعتماد کرنے کیلئے تیار نہیں تھا، اس لئے ان کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچا۔ اسی راستے میں جو سب سے بڑا خطرہ تھا وہ افغان طالبان کا انقلاب تھا چنانچہ سنیئر بش نے دو جون 2000ء کو امریکا میں تیل کمپنیوں کے بڑے بڑے مالکان کو کھانے پر بلایا اور ان کے سامنے

تجویز رکھی کہ اگر میرے بیٹے (جارج ڈبلیو بش) کو امریکا صدر منتخب کرادیا جائے تو ہم 5 کھرب ڈالر کے تیل کے ذخائر آپ کی جھولی میں ڈالنے کیلئے تیار ہیں۔ کمپنیوں کے مالکان نے جب گارنٹی مانگی تو بش نے انہیں پیشکش کی کہ حکومت تشکیل پاتے ہی آپ تمام کو کابینہ کے ارکان کے طور پر لے لیا جائے گا۔ بس پھر کیا تھا تیل کمپنیوں کے مالکان نے ڈالروں کی بارش کردی اور ہر طرف بش خاندان کا ڈنکا بجنے لگا۔ ٹی وی، ریڈیو اخبارات، رسائل و جرائد میں اشتہارات کی بھرمار ہوگئی یہاں تک کہ پاناما اور ایتھوپیا جیسے بدحال ممالک کے اخبارات میں بھی بش کی حمائت میں مضامین چھپنے لگے اور اس مہم کے نتیجے میں بش خاندان ایک بار پھر وائٹ ہاؤس میں داخل ہوگیا۔ وعدے کے مطابق تیل کمپنیوں کے مالکان کو وزیر داخلہ، وزیر خارجہ، وزیر توانائی اور دیگر حساس نوعیت کے سرکاری عہدے سونپ دیئے گئے۔ الیکشن مہم میں سب سے زیادہ چندہ دینے والی آئل کمپنی ایزون کے وائس چیئرمین تھامس وائٹ کو امریکا کی سب سے مضبوط وزارتِ فوج کا سربراہ مقرر کردیا گیا۔

بش خاندان چونکہ مذہباً عیسائی تھا اور یہ لوگ ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ چرچ بھی جایا کرتے تھے بلکہ سنئیر بش کے بارے میں تو یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ یہ یہودیوں کا سخت مخالف اور فلسطین کے معاملے پر عربوں کا حامی تھا۔ اس لئے عربوں کا خیال تھا کہ جونیئر بش صدر منتخب ہونے کے بعد فلسطین کے مسئلے میں ہماری حمائت کرے گا اور مشرقِ وسطیٰ میں امن قائم ہوجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جارج ڈبلیو بش کی الیکشن مہم کیلئے عربوں نے ڈیڑھ بلین ڈالر چندہ دیا تھا جو الیکشن مہم کے اخراجات کا تقریباً نصف بنتا تھا۔ کامیاب مہم کے نتیجے میں جب جارج ڈبلیو بش امریکا کا 43واں صدر منتخب ہوا اور اس نے اپنی کابینہ کا اعلان کیا تو اس میں یہودیوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی اور یہ یہودیوں کیلئے شدید جھٹکا تھا۔ اس سے قبل چونکہ امریکی معیشت و حکومت پر یہودی مکمل طور پر قابض ہوچکے تھے لہٰذا بش حکومت کیلئے مشکلات پیدا کرنا ان کیلئے کوئی مشکل کام نہ تھا چنانچہ تمام یہودیوں نے شٹر ڈاؤن کرکے بش حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا اور اسٹاک ایکسچینج اپنی آخری حد تک گر گیا۔ کارخانوں کیلئے آتش بازی کا سامان تک چین سے منگوانا پڑ گیا جس کی وجہ سے بش حکومت کو 125 ملین ڈالر کا یومیہ خسارہ برداشت کرنا پڑ گیا۔

یہودیوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ موساد نے اپنے 120 / اعلیٰ تربیت یافتہ افراد کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کی منصوبہ بندی میں لگادیا جو بعد میں امریکی تحقیقات کے خفیہ ادارے سی آئی اے کی تفتیشی کاروائیوں کے نتیجے میں گرفتار بھی ہوئے لیکن تاریخ مزید اس حوالے سے خاموش ہے۔ دوسری جانب امریکا کی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی تمام بڑی کمپنیاں جن کے مالکان کٹر متعصب یہودی تھے، نے اپنی توپوں کا رخ بش کی طرف پھیر دیا۔ میڈیا پر اسامہ بن لادن کو بنیاد بنا کر افغان طالبان اور اسلامی سزاؤں کے خلاف پرزور پروپیگنڈہ کا آغاز کردیا جس کے نتیجے میں امریکی عوام کے دلوں میں طالبان کو انسانیت اور امریکی تہذیب کا بدترین دشمن بنا کر پیش کیا گیا اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت امریکی عوام کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ طالبان کو جلد از جلد سبق سکھانا چاہئے۔

طالبان حکومت کے بعض لوگ اس منصوبے کے پیچھے خفیہ عزائم کو بھانپ گئے تھے لہٰذا انہوں نے تعلقات عامہ کی ماہر خاتون اور سی آئی اے کے سابق سربراہ رچرڈ ہیلمز کی بھتیجی لیلیٰ ہیلمز نامی خاتون کو باقاعدہ معاوضہ دیکر خدمات حاصل کیں۔ لیلیٰ ہیلمز کی کوششوں سے امریکا انتظامیہ طالبان کے نمائندوں سے گفتگو کیلئے تیار ہوگئی اور مارچ 2001ء کو طالبان حکومت کے مشیر سید رحمت اللہ ہاشمی پانچ روزہ دورے پر واشنگٹن پہنچ گئے جہاں ان کے

سامنے صلح کی صرف ایک ہی شرط رکھی گئی کہ افغانستان میں لبرل اور ماڈریٹ حکومت تشکیل دی جانی چاہئے بصورت دیگر امریکا طالبان پر حملہ کر دے گا۔6/ اگست کو اسلام آباد میں موجود افغان سفیر کے ذریعے طالبان کو آخری وارننگ دی گئی لیکن طالبان نے امریکی دھمکیوں کو نظر انداز کر دیا۔ جونیئر بش افغانستان پر حملے کا اس لئے بھی خواہشمند تھا کہ ایک طرف تو اس کے والد سنیئر بش کے منصوبے کے تحت تیل کے ذخائر پر قبضہ کر لیا جائے گا تو دوسری طرف بش جونیئر کی حکومت کی پذیرائی ہو گی اور امریکی صنعت و حرفت کا پہیہ چلنا شروع ہو جائے گا۔

بش حکومت نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا یہ تو موساد کے 120 / اعلیٰ تربیت یافتہ جاسوسوں کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کی منصوبہ بندی کا جو ٹاسک دیا گیا تھا، وہ پورا ہوا، اور پھر دنیا نے 11 ستمبر 2001ء کا دن بھی دیکھا کہ دنیا کا بلند ترین تجارتی مرکز جس کی تکمیل چند ماہ قبل ہی 22 اپریل 2001ء کو ہوئی تھی، جس میں روزانہ ساڑھے آٹھ ارب ڈالر کا بزنس ہوتا تھا اور جس کو 99 سال کیلئے تین ارب بیس ملین ڈالرز کی لیز پر سلورا سٹیشن پراپرٹیز اور ویسٹ فیلڈ امریکا نے حاصل کیا تھا، زمین بوس ہو گیا۔ اس حملے سے بش خاندان حواس باختہ ہو کر اپنی تمامتر انتظامی صلاحیتیں گنوا بیٹھا اور افغانستان پر چڑھ دوڑا اور اس طرح یہودی لابی نے امریکا کو نہ ختم ہونے والی طویل جنگ میں جھونک دیا۔ ایک طرف بش حکومت پہلے ہی سے غیر مستحکم حالات اور ہچکولے کھاتی معیشت کا شکار تھی تو دوسری طرف افغان جنگ سے یہودی لابی نے نہ صرف امریکی معیشت کو دیوالیہ کر دیا بلکہ ریکارڈ حد تک ورلڈ بینک اور آئی ایم ایس جیسے اداروں کا مقروض بھی بنا دیا، اور یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ دونوں ادارے عالمی سودی مالیاتی نظام کی تشکیل کا سرچشمہ ہیں جس کے تحت ممالک کو مقروض بنا کر جکڑ لیا جاتا ہے اور آج امریکی محکمہ خزانہ کے اعداد و شمار کے مطابق امریکی تاریخ میں پہلی بار امریکا کا قومی قرض 33 ٹریلین ڈالر سے تجاوز کر گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر امریکی شہری ایک لاکھ ڈالر سے زائد کا مقروض ہے۔

اس کے علاوہ عراق امریکا جنگ میں بھی ان 32 یہودیوں کے مرکزی کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد بش انتظامیہ اور تمام اہم کلیدی عہدوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ یہی وہ یہودی تھے جو اس وقت تمام امریکا کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے تھے اور تمام پالیسیوں کو تشکیل دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک رچرڈ پرل تھا جو پینٹا گون کے ڈیفنس پالیسی بورڈ کا چیئرمین اور خارجہ پالیسی کے سلسلے میں بش کا مشیر تھا۔ اس سے قبل رچرڈ اسرائیل کی اسلحہ ساز فیکٹری سولٹم میں ملازم تھا دوسرا شخص پال ولف اوٹس جو امریکا کا نائب وزیر دفاع اور رچرڈ کے ڈیفنس پالیسی بورڈ کا ممبر تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کے اسرائیل سے خفیہ تعلقات کی خبریں متعدد بار امریکی اخبارات میں شائع ہوئیں۔ تیسرا شخص ڈگلس فیتھ تھا جو دفاع کا انڈر سیکرٹری اور پینٹا گون میں پالیسی ایڈوائزر تھا۔ یہ شخص ایک متعصب یہودی تھا جو عرب مخالف پالیسیوں کی بناء پر امریکا میں خاصا مقبول تھا اور یہودیوں کی بدنام زمانہ تنظیم زاہانسٹ آرگنائزیشن آف امریکا میں بھی شامل رہا۔

چوتھا شخص ایڈورڈ لٹوا جو پینٹا گون میں قائم سیکورٹی اسٹڈی گروپ کا ممبر تھا۔ یہ ایک نظریاتی اور انتہاء پسند یہودی تھا جس کی تعلیم و تربیت تل ابیب میں ہوئی اور اخبارات میں مسلسل اسرائیل کی حمائت میں مضامین بھی لکھتا رہا۔ اگلا شخص ڈوزاخم جو دفاع کا انڈر سیکرٹری اور محکمہ دفاع کا چیف فنانشل آفیسر تھا ۔ یہ شخص بھی نسلاً یہودی تھا اور اور امریکا کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی شہریت بھی رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب تک مسلمانوں کی طاقت ختم نہیں ہو جاتی یہودیوں کا عروج شروع نہیں ہو سکتا۔ کینتھ ایڈولمین پینٹا گون میں مشیر تھا اور رچرڈ کے ڈیفنس پالیسی بورڈ کا ممبر بھی تھا۔ یہ بھی ایک انتہائی متعصب اور انتہاء پسند یہودی ہے، جس کا کا کہنا ہے کہ اگر دنیا امن چاہتی ہے تو مسلمانوں کی بیخ کنی کرنا ہو گی اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو اس جگہ پر رکھنا چاہئے جہاں لوگ پرانے غلاموں کو رکھا کرتے تھے۔ اس شخص کو آپ ہمیشہ کی طرح بین الاقوامی ٹی وی چینل فاکس نیوز پر عربوں اور مسلمانوں کے

خلاف گفتگو کرتا ہوا پائیں گے۔لیویز لیبی امریکا کے نائب صدر ڈک چینی کا چیف آف سٹاف تھا،اس کا کہنا ہے کہ اگر دنیا سے دہشتگردی کو ختم کرنا ہے توجہاد کے جذبے کو مٹانا ہو گا،اس کیلئے مسلمانوں کے اندر ایک گروہ "احمدی" (قادیانی) کے نام سے جو کام کر رہا ہے،ان کی ہر موقع پر حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔

رابرٹ سٹالوف امریکی قومی سلامتی کا مشیر تھا جو اس سے قبل اسرائیل کے تھنک ٹینک،واشنگٹن انسٹی ٹیوٹ فار نیئر ایسٹ کا ڈائریکٹر تھا۔اس کا کہنا ہے کہ عربوں کا تیل بنیادی طور پر یہودیوں کی جاگیر ہے لیکن مسلمان اسے استعمال کر رہے ہیں،یہ سراسر بے ایمانی ہے اور ایک دن یہودی اپنا حق لیکر ہی رہیں گے۔ایسٹ ابرامز کا شمار بھی انتہاء پسند یہودیوں میں ہوتا ہے اور یہ شخص اس دور میں نیشنل سیکورٹی کونسل کا مشیر تھا۔اس کا کہنا تھا کہ اس وقت تک دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک وہ تمام ذرائع مسدود نہ کر دیئے جائیں جن سے اسامہ بن لادن جیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔پس منظر کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ بش کو عراق پر حملے کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیونکہ عرب حکمرانوں کی تمام دولت امریکا میں ہے اور امریکا کو تیل کی ترسیل روک کر وہ اپنے اربوں کھربوں ڈالرز کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتے لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وزارتِ خارجہ اور ڈیفنس جیسے حساس اداروں پر انتہاء پسند اور متعصب یہودی تعینات ہوں جو برسوں سے مسلمانوں کے زوال اور بیخ کنی کے منتظر تھے اور جونیئر بش (جارج ڈبلیو بش) کو عراق پر حملہ کرنے کی تجویز نہ دیں بلکہ مجبور نہ کریں۔اس بات کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ ان حضرت کے ہوتے ہوئے جونیئر بش عراق پر حملہ کرنے سے کیسے انکار کر سکتا تھا جبکہ بش کو اپنے آگے اور پیچھے دونوں طرف موت منڈلاتی دکھائی دے رہی تھی اور اسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ امریکا کے 16 ویں صدر ابراہام لنکن اور 20 ویں صدر جیمز گارفیلڈ عالمی مالیاتی نظام جسے براہِ راست یہودی کنٹرول کرتے ہیں میں رخنہ ڈالنے کے سبب قتل کئے جا چکے ہیں،اس لئے وہ کسی بھی صورت میں اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔

یہودی اگر امریکا کو عراق اور شام کے خلاف جنگ کرنے پر ابھارتے ہیں اور حملہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسا کرنے سے یہودیوں کے گریٹر اسرائیل (جو مصر کے نیل سے لیکر فرات تک پھیلا ہوا ہے اور جس میں اردن سمیت سعودی عرب کا شمالی علاقہ نصف عراق اور پورا شام شامل ہے) کا خواب تکمیل تک پہنچتا ہے،لیکن سوال یہ ہے کہ یہودی لابی نے امریکا کو افغانستان کی دلدل میں کیوں دھکیلا؟ تو اس بات کو رسول اکرم ﷺ کی حدیث مبارکہ سے باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔سنن ابن ماجہ میں حضور اکرم ﷺ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ جب تم دیکھو کہ خراسان کی جانب سے سیاہ جھنڈے نکل آئے ہیں تو اس لشکر میں شامل ہو جاؤ تمہیں اس کیلئے برف پر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے کہ اس لشکر میں اللہ کے آخری خلیفہ مہدی ہوں گے۔

اس وقت تو پوری دنیا میں خراسان نام کے کسی ملک کا وجود نہیں ملتا لیکن صدیوں پہلے یہ افغانستان،ایران،پاکستان کے وسط ایشیائی ریاستوں تک پھیلا ہوا تھا۔یہ تمام وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ امام مہدی علیہ السلام کی مدد کیلئے یہاں سے کالے جھنڈے لیکر مسلمان فوجیں چلیں گی اور ان کو راستہ کوئی نہ روک سکے گا یہاں تک کہ وہ کالے جھنڈے ایلیائی (بیت المقدس) میں نصب کئے جائیں گے اور چونکہ یہی علاقے یہودی لابی کے عالمی غلبے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں،اس لئے یہودی امریکا کو افغانستان کی جنگ میں دھکیل کر خراسان کے علاقوں کو کمزور کرنا چاہتے تھے اور ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ افغانستان سے متصل پاکستان کی حدود شروع ہوتی ہیں اور کرۂ ارض پر دو ہی نظریاتی ریاستیں وجود رکھتی ہیں،ایک پاکستان اور دوسرا اسرائیل،چونکہ پاکستان قومی نظریہ اور **لاالٰہ الااللہ** کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے جو یہودیوں کے عالمی

نظام کے بالکل متصادم ہے لہٰذا اسرائیل کیسے اپنے نظریاتی حلیف کو بھول سکتا ہے؟ اس کا برملا اظہار ان کے سرکردہ رہنماؤں نے کئی بار اپنے نظریاتی کارکنان کے سامنے کیا ہے تاکہ وہ اپنے ٹارگٹ کو کسی بھی حالت میں بھولنے نہ پائیں۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں جب اسرائیل کو فتح حاصل ہوئی تو کامیابی کا جشن منانے کیلئے بن گوریان نے پیرس (فرانس) کا انتخاب کیا اور سار بون یونیورسٹی میں ممتاز یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: بین الاقوامی صہیونی تحریک کو کسی بھی طرح اپنے لئے پاکستان جیسے عظیم خطرے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے اور پاکستان اب بھی ان کا اوّلین ہدف ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ نظریاتی ریاست ہمارے وجود کیلئے خطرہ ہے۔ (پاکستان کا ذہنی وفکری سرمایہ اور جنگی وعسکری قوت وکیفیت آگے چل کر کسی بھی وقت ہمارے لئے باعثِ مصیبت بن سکتی ہے)۔ پاکستان یہودیوں سے نفرت اور عربوں سے محبت کرتا ہے، عربوں سے محبت کرنے والا یہ ملک ہمارے لے خود عربوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہے چنانچہ عالمی صہیونیت کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف فوری طور پر اقدامات کرے اور پاکستان سے ہمیشہ خبردار رہے اور جہاں تک ہو سکے اس کو تباہ کرنے کیلئے اپنی تدابیر کو بروئے کار لانے میں کبھی بھی سستی نہ کرے جبکہ جزیرہ نمائے ہند کے رہنے والے ہندو ہیں جن کے دل مسلمانوں کے خلاف نفرت سے بھرے ہوئے ہیں چنانچہ پاکستان کے خلاف کام کرنے کیلئے بھارت ہمارے لئے بہترین اڈہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارے لئے یہ نہائت اہم اور ضروری ہے کہ ہم اس اڈے کو اپنے تصرف میں لا کر خوب فائدہ اٹھائیں اور پنے تمام خفیہ اور پوشیدہ منصوبوں کے ذریعے پاکستانیوں کو نشانہ بنا کر انہیں نیست ونابود کر دیں جو یہودیت وصہیونیت کے دشمن ہیں۔ بھارت کے ساتھ ہماری دوستی نہ صرف ضروری ہے بلکہ مفید بھی ہے اور ہمیں اس تاریخی عناد سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے جو ہندو پاکستان اور اس میں رہنے والے مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے۔ یہ تاریخی دشمنی ہمارے لئے زبردست سرمایہ ہے لیکن ہماری حکمت عملی ایسی ہونی چاہئے کہ ہم بین الاقوامی دائروں کے ذریعے ہی بھارت کے ساتھ اپنا ربط وضبط رکھیں"۔ (یروشلم پوسٹ 19 / اگست 1967)

تقریر کے مندرجہ بالا اقتباس میں ڈیوڈ بن گوریان نے اپنے ممتاز یہودیوں کو پاکستان کے مسلمانوں اور بھارت کے ہندوؤں کے درمیان نفرت کو بہترین وکارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی اور کون نہیں جانتا کہ آج افغانستان میں بھارت کے ایک سو سے زائد مراکز میں جہاں افغانی اور دیگر قومیت کے افراد کو پاکستان میں تخریبی ودہشتگرد کاروائی کیلئے ہر قسم کی ٹریننگ دی جاتی ہے، آرمی پبلک اسکول جیسے وحشیانہ واقعات اسی کا شاخسانہ ہیں۔ لہٰذا افغانستان کے راستے پاکستان کے امن کو سبوتاژ کرنا ہمیشہ سے یہود وہنود کا ایجنڈہ رہا ہے اور اب تک ارضِ پاکستان کو شدید نقصان پہنچانے کی کوششیں جاری ہیں لیکن اللہ کی تائید ونصرت کی وجہ سے ہماری بہادر افواج اپنی لازوال جانوں کی قربانیوں سے ان کی مکروہ کوششوں کو ناکام بناتی چلی آرہی ہیں۔ مثلاً 27 مئی 1998ء کو پاکستان کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے کیلئے بھارت کے ائیر پورٹ پر اسرائیلی جہازوں کا پایا جانا لیکن پاکستان کے انٹیلی جنس اداروں اور پاک فضائیہ کی بروقت کاروائی نے اس خطرناک منصوبے کا ناکام بنا دیا۔ دونوں ممالک کو اس کے بلا تاخیر خوفناک نتائج سے آگاہ کر دیا گیا۔

بہر حال افغانستان سے غاصب امریکا کا انخلاء یقیناً افغان مجاہدین کی استعمار سے جاری 18 سالہ جنگ میں ایک عظیم الشان فتح ہے جس پر افغان مجاہدین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے دنیا کی دو بڑی سپر طاقتوں کا بڑی جوانمردی سے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ ذلت آمیز شکست دیکر افغانستان کو ان دونوں فرعونی طاقتوں کا قبرستان بھی بنایا۔ افغان مجاہدین کے صبر، ہمت وحوصلے کی دل کھول کر داد دینا چاہئے جو تقریباً 18 سال تک مشترکہ مسلح امریکی اور اس کے اتحادی افواج کے ساتھ برسرپیکار رہے اور اسلامی نظام پر کسی بھی قسم کا سمجھوتہ کرنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی اور یقیناً خود افغان جہادی

قوتوں کا اس فتح کی پشت پر پاکستان کے کلیدی کردار کا اعتراف بھی موجود ہے لیکن کیا اسے محض اتفاق کا نام دیا جاسکتا ہے کہ امریکا جو برسوں سے شام کی سرزمین پر دولت اسلامیہ (داعش) کو کچلنے کے بہانے، ایران کا راستہ روکنے اور شام میں ایرانی فوج کے اثر ورسوخ کو محدود کرنے کیلئے کود پڑا تھا، اسے اب اچانک انخلاء کا فیصلہ کیوں کرنا پڑا جس پر عملدرآمد بھی افغانستان سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا جبکہ شام میں تاحال داعش کا وجود کثیر تعداد میں باقی ہے اور ایران کے ساتھ مل کر حزب اللہ کو اتار دیا ہے اور اس وقت شام میں ایرانی فوج اور پاسداران کے پانچ کمانڈر، تیرہ فوجی اڈے اور قریباً ایک لاکھ نفری موجود ہے۔ یہ پانچ کمانڈر دمشق کے بیس میں واقع ایرانی ہیڈ کوارٹر سے براہِ راست منسلک ہیں بلکہ التنف میں جو شام، اردن و عراق کا انتہائی اہم سرحدی علاقہ ہے، امریکی اڈے کے گرد حزب اللہ کی پیش قدمی عروج پر پہنچ گئی تھی۔

اس کے نتیجے میں شام سے امریکی انخلاء کا بیان سامنے آتے ہی اسرائیل پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ رپورٹ کے مطابق اسرائیلی اخبار "یدی ہوتھ اخرونوتھ" کے مطابق ایک اسرائیلی عہدیدار کے مطابق "امریکا کی طرف سے اس قسم کا بیان ہمارے لئے تعجب سے کم نہیں بلکہ افسوسناک ہے۔ ہمیں اس بیان سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور ہم شام میں ایرانی فوج کی موجودگی کے خلاف سخت اقدامات جاری رکھیں گے۔" کیا امریکا کو بیچ میں سے نکال کر اسرائیل براہِ راست گریٹر اسرائیل کے منصوبے کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا ہے؟ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ٹرمپ نے جس وقت امریکی سفارت خانے کو یروشلم منتقل کرنے کا اعلان کیا تھا، امت مسلمہ کے دانشوران اس بات کو سمجھ گئے تھے کہ اب طاقت کا توازن امریکا سے اسرائیل کی طرف منتقل ہونے والا ہے اور اسرائیل اقتدار میں آنے سے قبل امریکی افواج کو دنیا بھر سے واپس بلانے اور اخراجات کم کرنے کے عزائم کی طے شدہ منصوبے کی تکمیل کر رہا ہے جہاں پر امن، محفوظ اور لاتعلق نیا امریکا دنیا کی سربراہی سے دستبردار ہو جائے گا اور دنیا پر گریٹر اسرائیل کی عملاً حکمرانی ہو گی۔

حالیہ پاک بھارت کشیدگی کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اسرائیل اپنے گریٹر اسرائیل کی تکمیل کیلئے کس طرح بھارت کی مودی سرکار کو استعمال کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہے اور باقاعدہ پاکستان پر مشترکہ حملے میں اسرائیل کے ذہن سازوں نے تین برس تک اس منصوبے کی نہ صرف نوک پلک سنواری بلکہ بالاکوٹ حملے میں بھارتی مگ جنگی جہاز اسرائیلی بموں سے لیس ہو کر حملہ آور ہوئے اور باقاعدہ ایک منظم سازش کے تحت اگلے دن درجن بھر بھارتی جدید جنگی جہازوں کی مدد سے بالاکوٹ کے قریب حملے میں اسرائیلی ساختہ اسپائس 2000 بم استعمال کئے گئے جبکہ یہ بم صرف میراج طیاروں پر ہی نصب کیے جاسکتے ہیں تاہم اسرائیل ان بموں کو روسی ساختہ سخوئی 30 طیاروں پر نصب کرنے میں بھارت کی بھرپور معاونت کی ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان قریبی فوجی تعاون کئی برسوں سے چل رہا ہے۔

پاکستان نے بھارت کے جو طیارے تباہ کیے ان میں سے ایک مگ 21 تھا جس کا ملبہ پاکستانی حدود میں گرا جب کہ دوسرا سخوئی 30 بتایا جاتا ہے جس کا ملبہ مقبوضہ کشمیر میں گرا تاہم بھارت اپنے دوسرے طیارے کی تباہی سے انکار کرتا رہا لیکن بعد ازاں میڈیا نے بھارت کے اس جھوٹ کا پردہ چاک کر دیا۔ ذرائع کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ دوسرا پائلٹ اسرائیلی ہے اس لیے بھارت کیلئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس کا ایک اور پائلٹ پاکستان کی تحویل میں ہے۔ دوسری جانب اسرائیل بھی سرعام یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کا پائلٹ پاکستان پر حملہ کرنے گیا تھا۔ بھارتی میڈیا یہ بھی کہہ چکا ہے کہ پاکستانی طیاروں کا مقابلہ کرنے کیلئے جو بھارتی جہاز اڑے تھے ان میں میراج بھی شامل تھے۔ اسرائیلی فضائیہ کے پاس میراج طیارے ہیں اور اس کے پائلٹ ان طیاروں کو اڑانے کا تجربہ رکھتے ہیں۔

اس حملے میں پاکستان کے پانچ اہم مقامات کو نشانہ بنانے کا پروگرام بھی منکشف ہوا تھا جس میں راجستھان سے بہاولپور پر حملہ کر کے پاکستان کو سندھ کی طرف سے الگ کرنا مقصود تھا لیکن اس سے قبل ہی پاکستان کی فضائیہ اور جنگی ماہرین نے بھارت کے آٹھ اہم علاقوں کو عملی طور پر لاک کر کے پیغام بھیج دیا گیا کہ پاکستان کا جواب اس منصوبے سے تین گنا زیادہ ہو گا اور بھارت اپنے دو درجن حصوں کو جمع نہیں کر پائے گا جس پر بھارت و اسرائیل کو ویسی ہی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جیسا 27 مئی 1998ء کو بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ افغانستان سے امریکا کے انخلاء کے بعد بھارت و اسرائیل کو جس عظیم ناکامی کا سامنا ہے، امریکی انخلاء کو ناکام بنانے کیلئے بھارت و اسرائیل ہلکے پیٹ برداشت نہیں کر پائے اور اب بھی خطے میں پانچ کھرب ڈالرز کے تیل سے دستبرداری دنیا کو مزید تباہی کی طرف لیجا سکتی ہے لیکن جس طرح حالات نے افغان مجاہدین کو فتح سے ہمکنار کیا ہے، بدقسمتی سے اس کے فوائد سے خطے کو محروم کرنے کیلئے دونوں ممالک میں غلط فہمیوں کے پہاڑ حائل کرنے کی کوششیں عروج پر ہیں اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ افغان حکومت جو کئی مرتبہ امریکا اور اس کے اتحادیوں سے افغانستان کو آزاد کروانے میں پاکستان کے کلیدی کردار کے معترف ہیں، ایک مرتبہ پھر دشمنوں کی سازشوں کا جائزہ لیتے ہوئے دوست اور دشمن کا واضح فرق کو سمجھیں کہ اسی میں پورے خطے کی بقاء مضمر ہے۔ ہمارے مقتدر حلقوں کو بھی عقل کے ناخن لینے کی اشد ضرورت ہے کہ دن دیہاڑے جماعت اسلامی کے سابقہ سینیٹر مشتاق صاحب کی قیادت میں اسرائیل کے خلاف دھرنے کے دوران ایک انٹیلی جنس کے افسر کا دو افراد کو کچل کر شہید کر دینا اور کئی دیگر افراد کو زخمی کر کے فرار ہو جانا، کیا اس بات کی دلیل ہے کہ درپردہ یہود و ہنود کے احکام کی پیروی ہو رہی ہے۔

یاد رکھیں کہ خطے میں جس طرح میرے رب کے نظام کے قیام کی باتیں ہو رہی ہیں، امید واثق ہے کہ میرا رب کے فیصلوں کی بہاریں دنیا کو مستفیذ کرنے جا رہی ہیں اور دنیا کا نیا دجّال اک نئے جنجال میں غرق ہو جائے گا ان شاء اللہ۔

بروز جمعۃ المبارک 15 ذوالحج 1445ھ 21 جون 2024ء

مظلومِ مدینہ... حضرت عثمانؓ غنی

تاریخ کہے، حضرت حسینؓ میں تاریخ سے لڑنا نہیں چاہتا، اگر تاریخ کہے کہ حضرت حسینؓ اوران کے خاندان کا پانی 10 دن بند رہا، تب بھی ٹھیک اگر تب بھی نواسہ رسولؐ مظلوم ہے لیکن تاریخ کو چھیڑنے کی کا پانی 7 دن بند رہا، تب بھی ٹھیک۔ میرا نظریہ ہے کہ حضرت حسینؓ کا پانی بند نہ بھی کیا گیا ہو بجائے تاریخ کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں صرف حضرت حسینؓ کی ہی شہادت مظلومانہ یا دردناک نہیں بلکہ اگر ہم 10 محرم کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں 18 ذی الحج کی تاریخ پڑھیں تو ایک ایسی شہادت بھی دکھائی دیتی ہے جس میں شہید والے کا نام حضرت عثمانؓ ہے، جی ہاں! وہی حضرت عثمانؓ جنہیں ہم ذالنورین کہتے ہیں، وہی عثمانؓ جسے ہم داماد مصطفیٰؐ کہتے ہیں، وہی عثمانؓ جسے ہم ناشر قرآن کہتے ہیں، وہی عثمانؓ جسے ہم خلیفہ سوئم کہتے ہیں، وہی عثمانؓ جو حضرت علیؓ کی شادی کا سارا خرچہ اٹھاتے ہیں، وہی عثمانؓ جس کی حفاظت کیلئے حضرت علیؓ اپنے بیٹے حضرت حسینؓ کو بھیجتے ہیں، وہی عثمانؓ جسے جناب محمد الرسول اللہؐ کا دوہرا داماد اور لقب "ذوالنورین" ہونے کا شرف حاصل ہے۔

یہی نہیں بلکہ خلیفۂ سوم سیدنا عثمانؓ غنی کا تعلق قریش کے معزز قبیلے سے تھا۔ سلسلہ نسب عبد المناف پر رسول اللہ ﷺ سے جاملتا ہے۔ سیدنا عثمانؓ ذوالنورین کی نانی نبی ﷺ کی پھوپھی تھیں۔ اسلام قبول کرنے والوں میں آپ "السابقون الاولون" کی فہرست میں شامل تھے۔ خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیق کی دعوت پر حضور ﷺ پر ایمان لانے اور کلمہ حق پڑھنے کے جرم میں سیدنا عثمانؓ غنی کو ان کے چچا حکم بن ابی العاص نے لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر مکہ کی سخت ترین جھلسا دینے والی دھوپ میں ڈال کر کئی روز تک علیحدہ مکان میں بند کر کے نئے مذہب (اسلام) کو چھوڑنے پر آزاد کرنے کی شرط رکھی تو آپ نے جواب میں انتہائی شجاعت واستقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا: چچا! اللہ کی قسم میں مذہب اسلام کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا اور نہ ہی ایمان کی دولت سے کبھی دستبردار ہوں گا۔

سیدنا عثمانؓ غنی اعلیٰ سیرت وکردار کے ساتھ ثروت وسخاوت میں بھی مشہور تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں ہر نبی کا ساتھی ورفیق ہوتا ہے، میرا ساتھی عثمانؓ ہوگا۔ سیدنا عثمانؓ کے دائرہ اسلام میں آنے کے بعد نبی اکرم ﷺ نے اپنی بیٹی سیدہ رقیہؓ کا نکاح آپؓ سے کر دیا۔ جب کفار مکہ کی اذیتوں سے تنگ آکر مسلمانوں نے حکم الٰہی اور نبی کریم ﷺ کی اجازت سے ہجرت حبشہ کی تو سیدنا عثمانؓ بھی اپنی اہلیہ حضرت رقیہؓ کے ساتھ حبشہ ہجرت فرما گئے، جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا تو نبی ﷺ نے دوسری بیٹی حضرت ام کلثومؓ کو آپ کی زوجیت میں دیکر "ذوالنورین" کا لقب بھی عطا فرمادیا۔ مدینہ منورہ میں پانی کی قلت پر سیدنا عثمانؓ نے اپنے آقا ﷺ کی اجازت سے پانی کا کنواں خرید کر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا اور اسی طرح غزوۂ تبوک میں جب رسول اللہ ﷺ نے مالی اعانت کی اپیل فرمائی تو سیدنا عثمانؓ غنی نے تیس ہزار فوج کے ایک تہائی اخراجات کی ذمہ داری لے لی۔ جب رسول اکرم ﷺ نے زیارت خانہ کعبہ کا ارادہ فرمایا تو حدیبیہ کے مقام پر یہ علم ہوا کہ قریش مکہ آمادہ جنگ ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے سیدنا عثمانؓ غنی کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا۔ قریش مکہ نے آپ کو روکے رکھا تو افواہ پھیل گئی کہ سیدنا عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس موقع پر چودہ سو صحابہ سے نبی ﷺ نے بیعت لی کہ سیدنا عثمانؓ غنی کا قصاص لیا جائے گا۔ یہ بیعت تاریخ اسلام میں "بیعت رضوان" کے نام سے معروف ہے۔ قریش مکہ کو جب صحیح صورت حال کا علم ہوا تو آمادۂ صلح ہوگئے اور سیدنا عثمانؓ غنی واپس آگئے۔

لیکن آج ہمارے ہاں حضرت حضرت عثمانؓ کی شان اور سیرت تو بیان کی جاتی ہے، حضرت عثمانؓ کی شرم وحیا کے تذکرے کئے جاتے ہیں ان کے

قبل از اسلام اور بعد از اسلام کے واقعات سنائے جاتے ہیں لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ ان کی دردناک شہادت اور المناک مظلومیت کے قصہ کو عوام کے سامنے نہیں لایا جاتا۔ یہی وہ سب سے بڑا ظلم ہے جو جان بوجھ کر چھپایا جاتا ہے۔ میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ تاریخ کی بھی چیخیں نکل جاتی ہیں اور سیدنا حضرت عثمانؓ کی مظلومیت کا ذکر سنتے ہی "ہائے عثمانؓ" پکار اٹھتی ہے۔ میں خود کو اس وقت دل تھام کر بیٹھ جاتا ہوں جب مجھے پتہ چلتا ہے کہ عثمان وہ مظلوم تھا جس کا 40 دن پانی بند رکھا گیا، میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو جاتی ہے جب چشمِ تصور میں دیکھتا ہوں کہ وہ عثمانؓ پانی کو ترس رہا ہے جو کبھی امت کیلئے پانی کے کنویں خرید اکرتا تھا۔ سانس بند ہوتی محسوس ہوتی ہے جب یہ پڑھتا ہوں کہ جب حضرت عثمانؓ قید میں تھے تو پیاس کی شدت سے جب نڈھال ہوئے تو آواز لگائی "ہے کوئی جو مجھے پانی پلائے؟ حضرت علیؓ کو پتہ چلا تو مشکیزہ لیکر علیؓ عثمانؓ کا ساقی بن کر پانی پلانے آرہے ہیں!

ہائے..... آج کربلا میں علی اصغر پر برسنے والے تیروں کا ذکر تو ہوتا ہے لیکن حضرت علیؓ کے مشکیزہ پر برسنے والے تیروں کا ذکر کیوں نہیں ہوتا۔ باغیوں نے حضرت علیؓ کے مشکیزہ پر تیر برسانے شروع کئے تو حضرت علیؓ نے اپنا عمامہ ہوا میں اچھالا تا کہ عثمانؓ کی نظر پڑے اور کل قیامت کے روز عثمانؓ اللہ کو شکایت نہ لگا سکیں کہ اللہ میرے ہونٹ جب پیاسے تھے تو تیری مخلوق سے مجھے کوئی پانی پلانے نہ آیا۔ کربلا میں حسینؓ کا ساقی اگر عباس تھا تو مدینہ میں عثمانؓ کا ساقی علیؓ تھے۔

ہائے..... آج یہ؛ کہتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے کہ اس عثمانؓ کے گھر کے محاصرے کو 40 دن گزر گئے جو عثمانؓ مسجد نبوی کیلئے جگہ خرید اکرتا تھا۔ آج وہ کسی سے ملاقات نہیں کر سکتا جس کی محفل میں بیٹھنے کیلئے صحابہ کرام جوق در جوق تشریف لایا کرتے تھے۔ 40 دن گزر گئے، آج وہ عثمانؓ ذوالنورین کسی سے ملاقات نہیں کر سکتا۔ آج نبی ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک حضرت عثمانؓ کو 40 دنوں سے کھانا نہیں ملا جو اناج سے بھرے اونٹ نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا کرتا تھا۔ چشمِ فلک نے یہ ظلم ہوتے ہوئے بھی دیکھا کہ آج اس عثمانؓ کی ریش مبارک کھینچی جا رہی ہے جس عثمانؓ سے آسمان کے فرشتے بھی حیا کرتے تھے۔ آج اس عثمانؓ پر جو کبھی غزوہ احد میں حضور نبی کریم ﷺ کا محافظ تھا اور نبی اکرم ﷺ پر برسنے والوں تیروں کے سامنے سینہ سپر تھا، اس پر ظلم کی انتہا کر دی گئی جب آج اس عثمانؓ کا ہاتھ کاٹ دیا گیا جس ہاتھ سے آپؐ ﷺ کی بیعت کی تھی۔
ہائے عثمانؓ! میں نقطہ دان نہیں، میں عالم نہیں جو تیری شہادت کو بیان کروں، ایسا فصیح الکلام نہیں کہ آپؓ کی شہادت کا نقشہ کھینچ سکوں کہ سننے اور پڑھنے والوں کے دل پھٹ جائیں اور آنکھیں نم ہو جائیں۔ اس حقیقت کو کیسے بیان کروں کہ آج اس عثمانؓ کے جسم پر جس بے رحمی سے شقی القلب جہنمی نے برچھی مار کر لہولہان کر دیا گیا، جس عثمانؓ نے بیماری کی حالت میں بھی بغیر کپڑوں کے کبھی غسل نہ کیا تھا۔ آج آپؐ ﷺ کی 2 بیٹیوں کے شوہر کو بیدردی سے ٹھوکریں ماری جا رہی ہیں۔

آیئے چشمِ تصور میں اس سارے معاملے کو محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ 18 ذی الحج 35 ھجری ہے، جمعہ کا دن ہے، حضرت عثمانؓ روزہ کی حالت میں قرآن کی تلاوت میں مصروف ہیں، باغی دیوار پھلانگ کر آتے ہیں، ان کو برا بھلا کہتے ہوئے ریش مبارک کھینچنا شروع کر دیتے ہیں کہ اچانک ایک نانجار باغی پیٹھ پر برچھی مارتا ہے اور دوسرا باغی لوہے کا آہنی ہتھیار سر پر مارتا ہے تو تیسرا ایک تلوار سے حضرت عثمانؓ کا ہاتھ کاٹ دیتا ہے۔ وہی ہاتھ جس

ہاتھ سے آپؐ کی بیعت کی تھی، سامنے قرآن پر اس ہاتھ کا خون گرتا ہے تو قران بھی عثمانؓ کی شہادت کا گواہ بن گیا۔ عثمانؓ زمین پر گر پڑے تو عثمانؓ کو ٹھوکریں مارنے لگے جس سے آپؐ کی پسلیاں تک ٹوٹ گئیں۔ حضرت عثمانؓ باغیوں کے اس بہیمانہ ظلم سے شہید ہو کر حضرت علیؓ اور نواسہ رسولؐ سے پہلے اپنے آقا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

یہ محسوس کر کے میرے دماغ کی نسیں پھول کر پھٹنے کے قریب ہو جاتی ہیں کہ میرے آقا ﷺ کا اپنے ذوالنورین حضرت عثمانؓ کا یہ خون ٹپکتا ہوا لاشہ دیکھ کر اپنے رب سے کیا فریاد کی ہو گی، حضرت عثمانؓ کو اپنے دونوں بازوؤں میں لیتے ہوئے دل پر کیا گزری ہو گی؟ اگر روزِ جزا کے دن سخت پیاس کے موقع پر حوضِ کوثر پر شہادتِ عثمانؓ کا پوچھ لیا گیا کہ تم تو پرسہ دینے والوں میں بھی شامل نہیں تھے تو بھلا شہادتِ عثمانؓ کا ذکر چھپانے والے کیا جواب دیں گے؟

اسلام وہ شجر نہیں جس نے پانی سے غذا پائی
دیا خونِ جگر صحابہؓ نے تو گلشن میں بہار آئی

بروز بدھ 20 ذوالحج 1445ھ 26 جون 2024ء

یہ کھیل ختم کرو کشتیاں بدلنے کا

خاموشی کی زبان آپ سمجھتے ہیں؟ نہیں.... تو اس میں میرا کیا قصور! خاموشی میں ایک چیخ پوشیدہ ہوتی ہے، ایک احتجاج، ایک طوفان، اور جب خاموشی بول پڑے تو گھمسان کا رن پڑتا ہے، پھر کوئی نہیں بچتا.....جی، کوئی بھی نہیں۔ وہ جو محلات میں آسودہ ہیں اور وہ جو کھولیوں اور جھونپڑیوں میں تڑپ رہے ہیں، سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بس دیکھو ایک انتظار کے بعد کیا ہوتا ہے، حادثہ یک دم تو نہیں ہوتا ناں! برسوں وقت اس کی پرورش کرتا ہے، پالتا پوستا ہے، پھر ایک دن لاوا پھٹ پڑتا ہے، پھر وہ دہکتی آگ کچھ نہیں دیکھتی....مال و منال، عزت و آبرو، ذلت و رسوائی، زردار اور بے زر کچھ بھی نہیں۔ ہمارے حکمران قوم کے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کر کے خود کو مسیحا ثابت کرنے کا سہرا اپنے سر سجانے کی کوششوں میں مگن ہیں۔ قوم کو بھیڑ بکریاں سمجھ کر، ان کے مصائب کا بڑی دلسوزی سے ذکر کر کے ہیرو بننے کی اداکاری کمال کی حدوں کو چھو رہی ہے جبکہ آپ کے اعمال کے آئینے تو بکھرے پڑے ہیں اور وہ ہمیں شکل دکھانے سے باز نہیں آتے۔ آئینے کی لاکھ کرچیاں کر دیں، وہ کبھی اپنا کام نہیں چھوڑتے۔ وزیر اعظم نے اپنے خطاب کو ایک شعر پر ختم کر کے دکھوں اور غموں سے نڈھال قوم کا خوب مذاق اڑایا ہے:

سیاہ رات نہیں لیتی نام ڈھلنے کا
یہی تو وقت ہے سورج ترے نکلنے کا

وزیر اعظم کے اس خطاب نے مجھے چونکا دیا کہ ان کو یہ علم ہی نہیں کہ اب وہ ملک کے سب سے بڑے انتظامی عہدے پر ہیں جہاں ان کے اشارے کی تعمیل اور تکمیل کیلئے غلام قطار در قطار میں کھڑے منتظر ہیں کہ ظل سبحانی کے منہ سے جھڑنے والے ہر پھول کو مقتدر حسینہ کے جوڑے میں سجانے کیلئے بے تاب ہیں لیکن ان کے خطاب میں اب بھی دھاڑتا ہوا اپوزیشن لیڈر سامنے آ گیا۔ ان کے خطاب میں جذبات، الزامات، خواہشات اور ماضی کو کوسنے کے بھاری بھر کم الفاظ کے سوا کچھ تھا ہی نہیں! میں تو یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ ملک کو درپیش مسائل میں سر فہرست بیرونی قرضوں سے نجات کا کوئی فارمولہ سامنے آئے گا، مہنگائی کے ہاتھوں پس جانے والی قوم کے مسائل کو جس دلسوزی سے ذکر کیا ہے، ان کے علاج کیلئے کسی پلان کا اعلان ہو گا، کسی ٹھوس لائحہ عمل اور اس کے حصول کیلئے کوئی روڈ میپ سامنے لایا جائے گا لیکن وہ تو اپنے دکھ درد کے اظہار کے ساتھ ساتھ قوم کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر تعزیت کرتے دکھائی دیئے۔ کاش انہیں کوئی جا کر یہ بتائے کہ وہ اب اپوزیشن لیڈر نہیں بلکہ وزیر اعظم ہیں اور قوم کے جتنے مسائل اور دکھ درد کا جو تذکرہ فرمایا ہے، اب ان کے علاج کی ذمہ داری ان کی ہے۔

وزیر اعظم نے بڑے دبنگ لہجے میں فرمایا کہ اشرافیہ کو اپنے اخراجات کم کرنے ہوں گے؟ تو آپ کیا اشرافیہ نہیں، اگر نہیں تو کس کی طرف آپ کا اشارہ ہے، کھل کر اس کا نام کیوں نہیں لیتے اور اس اشرافیہ پر ہاتھ کون ڈالے گا؟ اشرافیہ کے بجٹ میں اضافہ آخر کس کے حکم سے کیا جاتا ہے؟ آپ ہی تو ان کے اخراجات کو بجٹ میں بڑھاتے ہیں تو شکائت کس سے کر رہے ہیں؟ کیا یہ وہی اشرافیہ نہیں جن کی بیرون ملک جائیدادیں اور پلازے بنے ہوئے ہیں؟ سوئس بینکوں میں اربوں ڈالر پڑے ہوئے ہیں۔ آپ کے نائب وزیر اعظم اسحاق ڈار جب آپ کے بھائی کے دور حکومت میں وزیر خزانہ تھے، تو انہوں نے قوم کو سوئس بینکوں سے دو سو ارب ڈالر واپس لانے کی خبر سنائی تھی کہ بس معاہدہ ہونے ہی والا ہے؟ کہاں ہیں وہ دو سو ارب ڈالر؟ قوم کو یہ بتایا جائے کہ اتنے بڑے منصب پر بیٹھ کر قوم کو جھوٹے دلاسے دینے اور لالی پاپ دینے والے اب پھر سے اتنے بڑے منصب پر کیوں فائز ہیں؟ پی

ڈی ایم کی تشکیل کے بعد ان کو پاکستان کی ڈوبتی معیشت کا مسیحا بنا کر واپس وطن لایا گیا اور انہوں نے وزیر خزانہ کا منصب سنبھالتے ہی سب سے پہلے پاکستان میں عدالتی احکام پر ضبط شدہ اپنی ساری جائیداد کو بحال کروایا، کئی برس لندن میں گزارے ہوئے جعلی جلاوطنی کے ایام کی بطور سینیٹر پوری تنخواہ وصول کی اور ملکی معیشت کو بحال کرنے کی بجائے عالمی مالیاتی اداروں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ ملک کو دیوالیہ ہونے سے بچنے کیلئے خود آپ نے میڈیا کے سامنے آکر اعتراف کیا کہ ہماری ناک سے لکیریں نکلوائی گئی ہیں اور ان کے پاؤں چھونے پڑ گئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسے نااہل فرد کو کس کارکردگی اور تجربے کی بناء پر ملک کا وزیر خارجہ جیسا اہم منصب عطا کیا گیا، کیا پاکستان کے آئین میں درج ہے کہ اس عہدے کیلئے اپنے بڑے بھائی کے سمدھی ہونا ہی کافی ہے۔ پاکستان کے آئین میں کہیں نائب وزیر اعظم کے عہدے کا ذکر تک نہیں لیکن آپ ریاض سعودی عرب میں ورلڈ اکنامک فورم میں اسحاق ڈار صاحب کے ساتھ شریک تھے لیکن آپ کی غیر موجودگی میں چھٹی کے دن اتوار کو اسحاق ڈار کے نائب وزیر اعظم کی تقرری کا نوٹیفکیشن جاری ہو گیا، کیا قوم کے دکھوں کا اس قدر دلسوزی کے ساتھ ذکر کرنے والے وزیر اعظم اس کی کوئی توجیہ بیان کر سکتے ہیں کہ 25 کروڑ پاکستانیوں کے ساتھ یہ کھلواڑ کیوں کیا گیا؟

ایک طرف آپ ملکی معیشت کی بربادی کا رونا رو رہے ہیں جس میں یقیناً آپ سمیت دوسرے مقتدر سیاستدان اور افراد شامل ہیں لیکن دوسری طرف اسمبلی اور سینیٹ میں بیٹھے غرباء اور مساکین کے کھانے تک میں جو خصوصی مراعات دی جا رہی ہے، انہیں پٹرول کی مد میں الاؤنس دیئے جا رہے ہیں، بجلی، گیس کے بل میں سبسڈی دی جا رہی ہے، جہازوں کے کرایوں میں خصوصی مراعات، رہنے کیلئے شاہانہ ہوسٹل مہیا کئے گئے ہیں، پھر بھی ان کے بجٹ میں اضافہ کیوں کیا گیا ہے؟ کیا بجٹ میں یہ تمام مراعات آپ کے حکم سے نہیں کی گئیں؟ یا پھر یہ بجٹ بنانے والے کوئی اور ہیں، لیکن اپنے خطاب میں اپوزیشن لیڈر کے فرائض انجام دے رہے ہیں! پارلیمنٹ کے بجٹ میں بے تحاشہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ووٹ لینے سے پہلے یہاں کے مکیں تو عوام کی خدمت کا نعرہ لگا رہے تھے اور خدمت تو اپنی جیب سے کرنے کی بجائے اس کا سارا بل عوام کا خون نچوڑ کر کیوں وصول کیا جا رہا ہے؟

اپنے خطاب میں بجلی کی چوری کی شکائت کر رہے ہیں۔۔۔ آخر آپ کس سے شکائت کر رہے ہیں، اگر بجلی چوری ہو رہی ہے تو بجلی چوروں کو کون پکڑے گا؟ فری بجلی کون استعمال کر رہا ہے؟ کون اس کو روکے گا؟ مجھے کسی ایسے ملک کی مثال دیں جہاں بجلی، گیس اور دیگر یوٹیلیٹیز میں کوئی مراعات لے رہا ہو۔ کیا آپ کو علم ہے کہ دنیا بھر میں اسرائیل کا وزیر اعظم نیتن یاہو لعنت ملامت کی زد میں ہے لیکن وزیر اعظم کے دفتر کا بروقت بل ادا نہ کرنے کی پاداش میں سال میں تین دفعہ بجلی منقطع کر دی گئی لیکن آپ اپنے خطاب میں قوم کے غریب افراد کے ساتھ جہاں ہمدردی کا اظہار فرما رہے تھے، وہاں ان کو یہ بھی بتا دیا جاتا کہ آپ ہی کے پیش کردہ بجٹ کے مطابق رواں مالی سال 99 کروڑ 30 لاکھ روپے مختص کیے گئے تھے۔ وزیر اعظم ہاؤس کیلئے گزشتہ بجٹ کی نسبت 26 کروڑ 73 لاکھ روپے زیادہ مختص کیے گئے ہیں۔ **آئندہ مالی سال کیلئے ایک ارب 26 کروڑ روپے سے زائد کا بجٹ مختص کیا گیا ہے جبکہ** وزیر اعظم ہاؤس نے مختص بجٹ سے ایک کروڑ 80 لاکھ 48 ہزار روپے زیادہ خرچ کیے ہیں۔ اسی طرح گذشتہ سال کے بجٹ میں ایوان صدر کیلئے 80 کروڑ روپے مختص کیے گئے تھے لیکن ایوان صدر نے اپنے بجٹ سے گیارہ کروڑ روپے زیادہ خرچ کیے۔

وزیر اعظم صاحب! آپ تو اپنے خطاب میں اشرافیہ کے شاہانہ اخراجات کو کم کرنے کا کہہ رہے تھے، کیا یہ شاہانہ اخراجات کی مد میں نہیں آتا؟ کیا یہ اخراجات آپ اپنی جیب سے ادا کریں گے یا پھر قوم کے ٹیکس سے ادا ہو گا؟ تو پھر شکائت کس سے کر رہے ہیں؟ آپ کے دل میں ملک کے غریب آدمی

پر ٹیکس کے بڑھ جانے کا بہت بڑا بوجھ ہے۔ یہ بتائیں کہ بجٹ میں یہ ٹیکس کس کے حکم سے لگایا گیا ہے؟ بجٹ آپ کی حکومت نے پیش کیا ہے یا پھر جیل سے عمران خان نے یہ بجٹ آکر بنایا ہے؟

گھر میں جو آگ لگی ہوئی ہے اور خلقِ خدا کو دن دیہاڑے کند چھری سے جو ذبح کیا جارہا ہے، آپ کے پیش کردہ بجٹ میں آپ نے کون سی رعائت دی ہے۔ ایک عام شہری اپنے درد اور کرب کو کس کے سامنے جاکر بیان کرے کہ آپ کے شاہانہ پروٹوکول کو دیکھ کر آپ سب مقتدر اشرافیہ تو کسی اور سیارے کی مخلوق لگتے ہیں جو یہاں صرف ہم پر حکومت کرنے کیلئے آتے ہیں، اپنی باری ابھی لیکر اپنی راہ لیتے ہیں اور آپ کا دوسرا ساتھی ایک خاص ایجنڈے پر کام کرنے کیلئے آجاتا ہے۔

کل ہی ایک عالمی شہرت یافتہ میرے ایک انگریز پروفیسر نے مجھے ایک ویڈیو ارسال کی جس میں ہمارے صدر آصف زرداری اپنے علاقے میں 42 گاڑیوں کیلئے تشریف لے جارہے تھے۔ میرا سر شرم سے اس لئے جھک گیا کہ ایک طرف تو ہم بھکاریوں کی طرح عالمی مالیاتی کے حفاظتی حصار میں عید کی نماز اداروں کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں اور دوسری طرف تعیشات کا یہ عالم ہے۔ جس جمہوریت کا نعرہ آپ الاپ رہے ہیں آپ تو سال میں برطانیہ کے کئی چکر لگاتے ہیں، یہاں کے وزیر اعظم کا کوئی پروٹوکول دیکھا ہے، اس کی کار پر تو جھنڈہ بھی نہیں ہوتا اور 10 / ڈاؤننگ سٹریٹ میں وزیر اعظم کا فلیٹ تین بیڈروم پر مشتمل ہے اور گھر کے کام کیلئے کوئی ملازم نہیں اور یہاں کے وزراء اور دیگر عہدیدار عام شہریوں کی طرح پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کرتے گیا اور جرمانے سے قبل ہیں۔ معاملہ صرف یہاں تک نہیں بلکہ برطانوی وزیر اعظم رشی سونک کو چلتی کار میں سیٹ بیلٹ نہ باندھنے پر جرمانہ عائد کر دیا انہوں نے اپنی اس غلطی پر ساری قوم سے معافی مانگی اور پولیس نے باقاعدہ اس سارے واقعہ کی تصدیق بھی کی۔ کیا آپ نے اپنے بجٹ میں اس طرف کوئی توجہ فرمائی ہے کہ سالانہ کروڑوں روپے پروٹوکول پر اٹھنے والے اخراجات سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ آخر جب آپ حکومت میں نہیں ہوتے تو تب آپ کے ساتھ ایسا شاہانہ پروٹوکول نہیں ہوتا۔

لیکن مجھ جیسا ایک عام انسان اپنے درد اور کرب کو وہ لفظ بھی عطا نہیں کر سکتا جو آپ کے شاہانہ انداز کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور آپ کی طرح میڈیا پر قوم کی ہمدردیاں سمیٹنے کیلئے ایسا لاجواب خطاب بھی کر سکے حالانکہ برسہا برس سے صحافت کی صحرانوردی میں عمر گزری ہے۔ بیان کا سلیقہ بھی موجود اور میڈیا سے بھی پرانا رشتہ ہے لیکن کیا کروں..... درد تو درد ہے ناں، جو ہر انسان کے دل اور سینے میں ہوتا ہے، پھر وہ یہ درد لیکر کہاں جائے، کس سے بیان کرے، کس کو دکھائے یہ زخم؟ وزیر اعظم صاحب! میں آپ سے جو بات کروں گا، آپ کہیں گے، نیا کیا ہے اس میں؟ لیکن ظل الٰہی! ہر درد دوسرے سے جدا ہے، ہر ایک اپنے غم میں تنہا ہے۔ سنا ہے کہ درد بانٹنے سے کم ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں تو یہ معاملہ بالکل الٹ ہے۔

پچھلی کئی دہائیاں میں نے بہت کرب میں گزاری ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اب میرے قلم میں بھی اتنی طاقت نہیں رہی اس کا سہارا لے کر یہ بوجھ ہلکا کر لوں۔ اب تو ہر روز ٹی وی پر ایسے دل دہلا دینے والے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ سوچتا ہوں کہ اگر رب کے محبوب پیغمبر ﷺ کی دعاؤں کا سہارا نہ ہوتا تو یقیناً ہماری قوم کا یہ مخصوص گروہ ہر روز طوفانِ نوح اور پتھروں کی بارش کا شکار رہتا مگر مجھ جیسے ہزاروں یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ یہ سلسلہ کب تک یونہی چلے گا؟ رزقِ حلال کمانے والوں کی دن بدن سانس کی ڈوری ساتھ چھوڑتی نظر آرہی ہے۔

دوسری طرف تپتی جھلسادینے والی دھوپ میں ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنے لاپتہ پیاروں کی بڑی بڑی تصاویر اٹھائے درجن سے زائد عورتیں، معصوم بچے اوران کے لواحقین مارچ کرنے بعد اب اقوام متحدہ کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں کہ انہیں اب یہاں سے انصاف کی کوئی توقع نہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان سینکڑوں تارکین وطن جن کی جائیدادوں پر قبضہ مافیا اپنے خونی پنجے گاڑ چکا ہے، اب وہ بھی اپنی درخواستیں لیکر اقوام متحدہ کے دروازہ پر نوحہ سنانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

میں سوچا کرتا تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کا صدمہ کیسے برداشت کیا ہو گا اہل وطن نے۔ اتنا بڑا صدمہ سہہ کر بھی وہ زندہ بچ گئے، کیسے مر مر کے جئے ہوں گے وہ، میں تو ان کے حوصلوں کو ہمیشہ رشک کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ مشرقی پاکستان کے بنگالی بھی تو ہم کو قبضہ مافیا کا نام دیتے تھے۔ اب تک رہ رہ کر سینے میں جو درد اٹھتا ہے تو سوچتا ہوں کہ 1971ء میں یہی درد محسوس کیا ہو گا اہل وطن نے۔ یہ کسک، یہ چبھن یہ ڈپریشن، مر مر کر جینا کہیں گے اسے آپ یا جی جی کے مرنا۔ آپ اسے جو بھی کہہ لیں۔ ہم تو زندہ ہیں، ہمیں تو اپنے حصے کا قرض چکانا ہے۔ اس پاکستان کو بچانے کیلئے پہلے بھی قربانیاں دیتے آئے ہیں لیکن اس مرتبہ بڑی قربانی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں اور وہ قربانی اس تمام اشرافیہ کی ہو گی جس کیلئے قوم کی قوت برداشت کبھی بھی ختم ہو سکتی ہے! یاد رکھیں کہ فرانس کے خونی انقلاب نے بھی بے بس نڈھال عوام کی ختم ہوتی ہوئی قوت برداشت کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور پھر ہر اس فرد کا سر دھڑ سے الگ کر دیا گیا تھا جس کے نرم ہاتھ اور کالر سفید تھے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اہل قلم بھی قوموں کی تقدیر کا رخ بدل دیتے ہیں، اوران اہل قلم کو غنیمت جانیں جو آج بھی ایسے خطرناک سیلابوں کے آگے بند ھ باندھنے کی کوشش کر رہے ہیں وگرنہ ہم جیسے تارکین وطن نے احتجاج کے طور پر صرف زرمبادلہ بھیجنے سے ہاتھ روک لیا تو پھر کیا ہو گا؟ آگ کے شعلے بہت تیزی سے بلند ہو رہے ہیں۔ خطرے سے آگاہ کرنا تو خطرے سے بچنے کی تیاری کرنا ہے ناں۔ آپ کو ان خطرات سے آگاہ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ یہ اشرافیہ، قبضہ مافیا جو مختلف عہدوں پر براجمان مقتدر لوگوں کی ملی بھگت سے قوم کو لوٹ رہا ہے، یہ پاکستانی طالبان، بلوچستان میں دہشتگردی کی کاروائیوں میں ملوث وطن دشمن افراد، اجرتی قاتلوں اور بھتہ خوروں سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں جنہوں نے ملک کے ہر ادارے کو اپنے گھر کی لونڈی بنا رکھا ہے۔ وزیر اعظم صاحب! اٹھئے خدارا، اپنے پاکستان کو مزید تباہی سے بچالیں، بس آپ کی ذمہ داری اور صرف آپ کی ذمہ داری ہے۔ کسی مبلغ یا اسکول ہیڈ ماسٹر کی طرح قوم کو نصیحتیں کرنے کا وقت نہیں بلکہ عملی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے اور یہ سلسلہ خود آپ کو اپنے گھر سے شروع کرنا ہو گا۔

کیا محترم وزیر اعظم صاحب کو اس بات کا علم ہے جب وہ امریکا کے ایک ہسپتال میں انتہائی نازک حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے رب سے یہ عہد کر رہے تھے کہ "اگر مجھے اللہ نے زندگی دی تو میں پاکستان میں حق داروں کی دادرسی کیلئے اپنی جان تک قربان کر دوں گا"۔ میں یہاں اللہ سے کئے گئے اس عہد کی یاد دہانی کروا رہا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جناب آپ اب وزیر اعظم ہیں، آپ کے حکم سے ملک کا کاروبار چل رہا ہے، آپ خود کہتے ہیں کہ ہمیں عوام نے اس منصب کیلئے منتخب کیا ہے تو کیا یہ بھی ہم بتائیں گے کہ آپ کو کس نے اور کیوں منتخب کیا ہے۔ یقین مانیں کہ قوم آپ کے خطاب پر مزید بیوقوف بننے کیلئے تیار نہیں! وزیر اعظم صاحب! آپ نے اپنی تقریر کو جس شعر پر ختم کیا تھا، اس سے اگلے دو اشعار میں آپ کو سنا دیتا ہوں!

کہیں نہ سب کو سمندر بہا کے لے جائے

یہ کھیل ختم کرو کشتیاں بدلنے کا
بگڑ گیا جو یہ نقشہ ہوس کے ہاتھوں سے
تو پھر کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلنے کا

بروز جمعرات 21 ذوالحج 1445ھ 27 جون 2024ء

اقلیتوں کے حقوق اور ریاست کی ذمہ داری

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام دین رحمت ہے اور اس کی شفقت ورافعت کا دائرہ کار کسی خاص قوم، کسی مخصوص ملت یا گروہ کیلئے وقف نہیں ہے بلکہ اسلام میں تمام بنی نوع انسانوں کیلئے خیر وعافیت کے بے پناہ خزائن موجود ہیں۔ اسلام میں تمام بنی نوع انسان کو اللہ کا کنبہ قرار دیا گیا ہے اور اللہ نے اپنے کنبے کے ساتھ بلا تفریق نیکی و بھلائی کا درس دیا ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے بہترین انسان وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ بہترین سلوک روا رکھے بلکہ یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ رب کریم تمہارے ساتھ پیار کریں تو تم اس کے کنبے کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آؤ۔ قرآن کریم میں تمام معاملات کو عدل وانصاف اور احسان و مروّت سے طے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور مسلم و غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور یہ بھی فرمایا گیا کہ دوسروں کے ساتھ اس طرح بھلائی کرو جس طرح اللہ تمہارے ساتھ بھلائی کا سلوک فرماتے ہیں۔

اسلام میں جتنے بھی اخلاقی احکام ہیں وہ مذہب وملت کی تخصیص کے بغیر ساری انسانیت کیلئے عام ہیں اور اس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں۔ کسی ہندو سکھ عیسائی یا کسی بھی مذہب کیلئے کوئی تفریق نہیں۔ اسلام میں غریبوں کی دستگیری اور مظلوموں کی دادرسی، اخوت ورواداری اور دیگر تمام نیک کاموں کا جو حکم دیا گیا ہے وہ کسی ایک کیلئے مخصوص نہیں بلکہ اس میں اقلیتوں کا برابر کا حق ہے۔ ان احکامات میں اسلام قبول کرنے والوں کی غیر مذاہب کے ماننے والوں کیلئے ایک بنیادی اصلاح کی ہے جس میں مسلم معاشرے میں اقلیتوں کے تحفظ کی تمام تر ذمہ داری نہ صرف ریاست پر بلکہ ہر مسلمان کو اس پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلام کے پیغام سے پہلے تمام اہل مذاہب ایک دوسرے کو باطل اور کاذب قرار دیتے تھے حتیٰ کہ یہودی اور عیسائی جو ایک ہی درخت دین ابراہیمی کی دو شاخیں ہیں ایک دوسرے کو جھوٹا سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے جنگ وجدل میں مصروف تھے۔ ہندو اپنے مذہب کے علاوہ دنیا کے کسی اور مذہب کو مذہب ہی نہیں سمجھتے تھے اور یہی حال ایرانیوں کے احساسِ برتری کا تھا لیکن سب سے پہلے صرف اسلام نے آکر بنی نوع انسانیت کے اس نفرت اور فرق کو ختم کیا کہ دنیا کی کوئی قوم اللہ کی رحمت سے محروم نہیں اور اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس نے ہر قوم کی ہدائت ورہنمائی کیلئے ایک ہادی وپیغمبر مبعوث فرمایا۔

نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے دین سے قبل تمام قدیم ادیان میں اس قدر تحریف ہو چکی تھی کہ ان کے اصل حقائق وتعلیمات کو بری طرح مسخ کر دیا گیا تھا لیکن دین اسلام کی رحمت کا اس بات سے اندازہ لگائیں کہ اس نے پہلے دن ہی اس بات اعلان کر دیا کہ لَاإِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ "دین میں کوئی زبردستی نہیں بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے۔ البقرہ(256-2)" بلکہ قرآن کریم نے تو بحث مباحثے سے گریز اختیار کرتے ہوئے یہ حکم دیا ہے کہ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ) اے رسولِ معظم! آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلایئے اور ان سے بحث (بھی) ایسے انداز سے کیجئے جو نہایت حسین ہو، بیشک آپ کا رب اس شخص کو بھی (خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گیا اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے (النحل:125)۔

اسلام میں تو غیر مذاہب کے معبودوں کو بھی برا بھلا کہنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے کہ مبادا نادانی میں غیر مذاہب کے ماننے والے جواب میں سچے رب کو برا بھلا نہ کہیں حالانکہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ شروع دن سے ان تمام مذاہب کے ماننے والوں نے باہمی اتحاد کر کے اسلام کو ختم کرنے کیلئے

محاذ قائم کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو ان کے درمیان بھی انصاف قائم کرنے کا حکم دیا "کہ اللہ صرف انصاف کرنے والوں کو اپنا دوست سمجھتا ہے" یہی وجہ ہے کہ کسی بھی اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو ان کے حقوق سے کبھی بھی محروم نہیں کیا گیا۔

ایک دفعہ حبشہ کے حکمران شاہ نجاشی کی طرف سے ایک وفد رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مہمان نوازی کے تمام فرائض خود رسول اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے انجام دیئے۔ صحابہ کی ایک بڑی جماعت نے جب مہمان نوازی کے حقوق ادا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو رسول اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ انہوں نے میرے ساتھیوں کی خدمت کی تھی، اس لئے میں خود اپنے ہاتھوں سے ان کی خدمت کروں گا۔ نبی اکرم ﷺ نے غیر مذاہب کے افراد کو تو تمام مساجد کی سردار مسجد نبوی میں عبادت کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی تھی۔

ایک دفعہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد رسول اکرم ﷺ سے ملنے کیلئے حاضر ہوا، عیسائیوں کی نماز کا جب وقت آن پہنچا تو انہوں نے مسجد نبوی میں نماز پڑھنا شروع کی تو مسلمانوں نے انہوں نے روکنے کی جونہی کوشش کی تو رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کو منع فرماتے ہوئے عیسائیوں کو نماز پڑھنے کی مکمل اجازت دی اور عیسائیوں نے اپنے عقائد کے مطابق رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی ساری جماعت کے سامنے الٹی سمت کی طرف منہ کر کے اپنی نماز ادا کی۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام کے اصل دشمن مشرکین عرب تھے اور مسلمانوں کے خلاف تمام مذاہب کے ماننے والے قبائل نے ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا تھا اور مسلمانوں کو تکلیف و ایذا پہنچانے اور ان کو ختم کرنے کیلئے برسوں جنگ و جدل اور حملوں میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا مگر مسلمانوں کو اپنا وجود باقی رکھنے کیلئے جنگ کے دوران مقابلے کا حکم تو ضرور دیا لیکن دورانِ جنگ بھی کسی بیجا زیادتی و ظلم کی اجازت نہیں دی حتیٰ کہ کھڑی فصلوں اور درختوں کو کاٹنے سے بھی منع فرما دیا گیا۔ قرآن کریم میں بڑی صراحت کے ساتھ حکم دیا گیا کہ "جو لوگ تم سے لڑیں، تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑو لیکن کسی قسم کی کوئی زیادتی مت کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ جن لوگوں نے صلح حدیبیہ میں مسلمانوں کو مسجد احرام جانے سے زبردستی روک دیا تھا جبکہ تمام مسلمان احرام کی حالت میں تھے، ان سے بھی زیادتی کرنے سے روک دیا گیا۔ قرآن کریم میں یہ حکم نازل ہوا کہ "جن لوگوں نے تمہیں مسجد احرام جانے سے روکا تھا، ان کا یہ عمل زیادتی کا سبب نہ بنے"۔ قرآن و حدیث میں کئی مواقع پر ایسے اور بے شمار احکام موجود ہیں جس میں اسلام کی رواداری، اخوت اور محبت کے بیش بہا دروس موجود ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنی غیر مسلم اقلیتوں کو کیا حقوق دیئے ہیں اور مسلم ریاستوں نے کہاں تک ان پر عمل کیا ہے؟؟ تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو بین ثبوتوں کے ساتھ اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ غیر مسلم اقلیتوں کیلئے اسلام سراسر ایک رحمت، امن اور بھائی چارے کا مذہب ثابت ہوا ہے۔ ان کے دورِ حکومت میں ان اقلیتوں کو جو حقوق و اختیارات اسلام نے دیئے ایسے حقوق و اختیارات تو ان کی اپنی قوم اور اپنے ہم مذہب حکومتوں میں بھی میسر نہ تھے۔ ان کی حیثیت تو غلاموں سے بھی بدتر تھی اور ان کا کام تو اپنا خون پسینہ بہا کر اپنے حاکموں اور جاگیرداروں کیلئے سامان تعیش فراہم کرنا ہوتا تھا۔ ان کو ادنیٰ ادنیٰ غلطیوں پر انتہائی وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔

وہ قومیں جو آج خود کو بڑا مہذب اور اخلاق کے اعلیٰ اقدار کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، ان کی تاریخ خود ان کی لائبریریوں میں ان کا منہ چڑا رہی ہے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال سمجھنے کیلئے ایک یہی واقعہ کافی ہو گا کہ شیفرڈ بش مغربی لندن برطانیہ کا ایک بہت مشہور علاقہ ہے جو "بش چرواہے" کے نام

سے آج بھی موسوم ہے۔اس چرواہے کے غلطی سے چلائے ہوئے تیر سے اس کاؤنٹی کے شہزادے کے محبوب ہرن کی آنکھ پھوٹ گئی جس کی پاداش میں اس شہزادے نے اس قبیلے کے تمام افراد کی آنکھیں پھوڑدیں، جہاں ایسی کئی اور وحشیانہ سزاؤں کا بھی اس کتاب میں ذکر ملتا ہے وہاں اسلام میں مسلم اقلیتوں کو جو حقوق دیئے گئے، ان کا بھی ذکر موجود ہے۔

حضرت عمر فاروق کے زمانے میں پورا جزیرۃ العرب اسلام کے زیر نگیں ہو چکا تھا۔ غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا سب سے پہلا واقعہ نجران کے عیسائیوں سے معاہدے کا ملتا ہے جس کا نعم البدل اور نظیر آج تک تاریخ دینے سے قاصر ہے۔ ہمیں آج بھی تاریخ میں اس معاہدے کی بارہ شرائط ملتی ہیں۔

(1)ان کی جان ہر حال میں محفوظ رہے گی(2)ان کی زمین وجائیداد اور تمام مال واسباب ان کے اپنے قبضے میں رہے گا(3)ان کو مکمل مذہبی آزادی ہو گی اوران کے مذہبی عہدیدار بدستور اپنے اپنے عہدوں پر قائم رہیں گے اوران کو معزول کرنے کا اختیار بھی ان کے اپنے پاس ہو گا(4)ان کی عبادت گاہوں، صلیبوں، عورتوں اور بچوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا(5)ان کی کسی بھی چیز پر ہر گز قبضہ نہیں کیا جائے گا(6)مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ ریاست جب بھی جہاد کا اعلان کرے گی تو تمام مسلمانوں پر اس کی تعمیل فرض ہو گی، تاہم ان سے کسی بھی قسم کی کوئی بھی فوجی خدمت نہیں لی جائے گی(7)پیداوار کا عشر بھی نہیں لیا جائے گا(8)ان کے ملک میں فوج بھی نہ بھیجی جائے گی(9)ان کے مقدمات کا فیصلہ انہی کے قوانین کے مطابق کیا جائے گا(10)ان پر کسی قسم کا کوئی ظلم بھی نہ ہونے پائے گا(11)کسی ناکردہ گناہ کی پاداش میں کسی اور کو گرفتار نہ کیا جائے گا اور(12)ان پر کسی بھی قسم کا کوئی بھی ظلم روا رکھنے کی قطعاً اجازت نہ ہو گی۔

غیر مسلموں کو ان کے مذہب ومسلک پر بر قرار رہنے کی پوری آزادی ہو گی۔ اسلامی مملکت ان کے عقیدہ وعبادت سے تعرض نہ کرے گی۔ اہلِ نجران کو حضور نبی اکرم ﷺ نے جو خط لکھا تھا اس میں یہ جملہ بھی درج تھا:ولنجران وحاشیتہم جوار اللہ و ذم محمد النبی رسول اللہ علی نفسہم وملتہم ورضہم وموالہم وغائبہم وشاہدہم و بیعہم وصلواتہم، لا یغیروا اسقفا عن اسقفیتہ ولا راہبا عن رہبانی ولا واقفا عن وقفانیتہ وکل ما تحت یدیہم من قلیل و کثیر.طبقات ابن سعد(۲۲۸:۱:۳۵۸)نجران اوران کے حلیفوں کو اللہ اوراس کے رسول محمد ﷺ کی پناہ حاصل ہے۔ ان کی جانیں، ان کی شریعت، زمین، اموال، حاضر وغائب اشخاص، ان کی عبادت گاہوں اوران کے گرجاگھروں کی حفاظت کی جائے گی۔ کسی پادری کو اس کے مذہبی مرتبے، کسی راہب کو اس کی رہبانیت اور کسی صاحب منصب کو اس کے منصب سے ہٹایا نہیں جائے گا اوان کی زیر ملکیت ہر چیز کی حفاظت کی جائے گی۔ اس معاہدے میں اقلیتوں کو وہ تمام حقوق عطا کر دیئے گئے جو ان کے جان ومال کے تحفظ کیلئے ضروری تھے اور جس کا انہوں نے اپنے ہم مذہب حکومتوں میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ان بارہ شرائط سے اسلام کا اپنی اقلیتوں سے اخوت ورواداری اور عدل وانصاف کے اس سنہری دور کا پتہ چلتا ہے جو صدیوں تک نافذ العمل رہا جس سے متاثر ہو کر بغیر کسی جبر کے ہزاروں افراد اسلام کے دائرہ کار میں نہ صرف داخل ہوئے بلکہ ان میں کئی افراد نے اسلام کی بے مثال خدمت بھی کی۔ اسلام میں ذمیوں کی جان مسلمانوں کی جان کے برابر قرار دی گئی۔ اس زمانے میں یہ عام دستور تھا کہ قاتل کو مقتول کے بدلے میں قتل کر دیا جاتا لیکن اگر مقتول کے ورثاء راضی ہو جاتے تو قصاص کی بجائے خون بہا ادا کر دیا جاتا اور یہی دستور (یعنی قصاص وخون بہا) رسول اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے کے بعد بھی عرصہ دراز تک رائج رہا۔ مشہور تاریخی کتاب بیہقی میں یہ روایت ملتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے دور میں ایک مسلمان نے ایک ذمی

اہل کتاب کو قتل کر دیا، رسول اکرم ﷺ کے سامنے جب یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ پر ذمی کے ساتھ کئے گئے عہد پورا کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہے اور قصاص میں مسلمان کو قتل کرنے کا حکم دے دیا گیا"۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ ذمیوں کی جان و مال بھی مسلمانوں کے جان و مال کے برابر سمجھی جاتی تھی اور قصاص و خون بہا اور دیت کا جو قانون مسلمانوں کیلئے رائج تھا وہی قانون غیر مسلم اقلیتوں کیلئے بھی تھا اور اسی طرح غیر مسلم اقلیتوں کی جائیداد اور املاک کی مکمل ذمہ داری بھی اسلامی ریاست پر عائد ہوتی تھی۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مفتوحہ علاقوں میں وہی قانون نافذ کئے جو خود مسلمان علاقوں میں رائج تھے۔ کسی قسم کے قانون میں کوئی تفریق روا نہ رکھی گئی تھی۔

آج بھی تاریخی کتب میں شام و عراق اور مصر میں اقلیتوں کے ساتھ اخوت و رواداری اور عدل و انصاف کا ذکر ملتا ہے اور اس سے دوسرے مفتوحہ ملکوں کے بارے میں قیاس بھی کیا جا سکتا ہے۔ جب عراق فتح ہوا تو اس وقت بڑے بڑے صحابہ کی رائے تھی کہ یہاں کی اراضی مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائے لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے اس سے بالکل مختلف تھی اور ان کا اصرار تھا کہ اس زمین پر انہی کاشتکاروں اور زمینداروں کا قبضہ برقرار رہنا چاہئے جو اس کو پہلے سے کاشت کر رہے ہیں بلکہ آئندہ بھی ان کی نسلیں اس زمین پر کاشت جاری رکھیں اور اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کئی دن کے بحث و مباحثے کے بعد صحابہ کرام کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا اور اس طرح مفتوحہ علاقوں کی تمام اراضی سابقہ مالکان کے پاس رہنے کا قانون تشکیل پا گیا کہ یہ اراضی نسل در نسل منتقل ہوتی رہے گی اور وہ اپنی مرضی سے اس کی خرید و فروخت بھی کر سکتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ان کو مالکانہ حقوق دیئے گئے اور حکومت کو بھی ان اراضی کو واپس لینے کا کوئی اختیار نہیں تھا تاوقتیکہ متعلقہ فریق کو اس کی مرضی کے مطابق اس کا معاوضہ ادا کر دیا جائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب کوفہ آباد ہوا تو شہر میں ایک جامع مسجد کی تعمیر میں حیرہ کے خستہ و کھنڈر محلات کا ملبہ استعمال کیا گیا۔ ان محلات کا کوئی وارث نہ تھا لیکن زمین ذمیوں کی تھی جس کیلئے اس ملبے کی قیمت ذمیوں کے جزیہ سے منہا کر کے عدل و انصاف کی ایک اعلیٰ مثال قائم کی گئی۔ تاریخ میں مفتوحہ اقوام سے جو معاہدے نقل کئے گئے ہیں ان میں اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی کی سرکاری ضمانت دی گئی تھی۔ جس طرح اسلامی بیت المال کسی مسلمان کے معذور ہو جانے یا بوجہ عمر رسیدگی اور غربت کے محتاج ہو جانے پر کفالت کی ذمہ داری لیتا ہے اسی طرح اسلامی بیت المال پر ایک غیر مسلم کے معذور ہونے یا عاجز ہونے کی صورت میں اس کی کفالت لازم ہے۔ کتاب الاموال میں ابو عبید نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے: ان رسول اللہ ﷺ تصدق صدقہ علی اہل بیت من الیہود فہی تجری علیہم. رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ایک گھرانہ کو صدقہ دیا اور حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی وہ انہیں دیا جا رہا ہے۔

عہد صدیقی میں شام کے مفتوحہ علاقوں میں معاہدے کی ایک مثال حضرت خالد بن ولید نے اہل حیرہ کو جو امان نامہ لکھ کر دیا تھا اور شام کے پادری کو ایک تحریری معاہدے میں اس کی مکمل ضمانت دی گئی: کسی بھی حال میں ان کی خانقاہیں یا گرجا گھر قطعاً مسمار نہیں کئے جائیں گے اور ان کو تہواروں پر ناقوس بجانے اور صلیبیں اٹھا کر جلوس نکالنے کی بھی مکمل آزادی ہو گی اور ایک دوسری روایت کے مطابق نماز کے اوقات کا لحاظ کرتے ہوئے وہ جب چاہیں ناقوس بجا سکتے ہیں۔ ان کیلئے یہ حق بھی رکھا ہے کہ جو کوئی شخص بڑھاپے کے سبب از کار رفتہ ہو جائے یا اس پر کوئی آفت نازل ہو جائے، یا وہ پہلے مال دار

تھا پھر فقیر ہو گیا یہاں تک کہ اس کے ہم مذہب لوگ اس کو صدقہ و خیرات دینے لگے، تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا اور اسے اور اس کے بال بچوں کو ریاست کے بیت المال سے خرچ دیا جائے گا۔ اگر کوئی ذمی مر جائے اور اس کے حساب میں مکمل جزیہ یا جزیہ کا بقایا واجب الادا ہو تو وہ اس کے ترکہ سے وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے ورثا پر اس کا بوجھ ڈالا جائے گا کیونکہ یہ اس پر قرض نہیں ہے۔ امام ابو یوسف لکھتے ہیں: اگر اس پر جذیہ واجب ہو تو اس کی کل یا کچھ ادائیگی سے قبل وہ مر جائے تو اس پر بقیہ واجب الادا جزیہ وارثوں سے وصول نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ اس پر قرض نہیں ہے۔ (کتاب الخراج:32)

اسی طرح حضرت ابو عبیدہ نے بھی شام کے بعض مفتوحہ علاقوں غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی کا تحریری معاہدہ کیا جو آج بھی تاریخی کتابوں میں موجود ہے اور خلفائے راشدین کے دورِ حکومت میں ان معاہدوں کی مکمل پاسداری کی گئی اور ان معاہدوں میں کسی تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا گیا۔ امام ابو یوسف نے ان معاہدوں کی تصریح کی ہے کہ حضرت ابو بکر، عمر فاروق، عثمان غنی اور علی المرتضیٰ رضوان اللہ اجمعین کے ادوار میں ان معاہدوں کی مکمل پاسداری کی گئی بلکہ ان مذہبی خانقاہوں کے پجاری، راہبوں اور دیگر عہدیداروں کے ساتھ ساتھ ان کے اوقاف کو بھی برقرار رکھا اور ان عہدیداروں کو سرکاری خزانے سے باقاعدہ وظائف جاری کئے گئے۔ اسی طرح مصر میں مفتوحہ علاقوں میں ان مذہبی علاقوں کے ساتھ جس قدر اراضی وقف تھی، نہ صرف ان کو بحال رکھا بلکہ ان عبادت گاہوں کی تزئین و آرائش کیلئے باقاعدہ سرکاری معاونت بھی کی گئی۔ مقریزی کے زمانے میں ایک گرجا گھر کے ساتھ ڈیڑھ ہزار فدان اراضی وقف تھی جس کی کاشت پر بھی کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے اس سنہرے ادوار میں نہ صرف ان کی مذہبی عبادت گاہوں کی مکمل حفاظت کی گئی بلکہ بہت سے نئے گرجا گھر، آتش کدے اور مندر تعمیر ہوئے جس میں بیشتر سرکاری اراضی استعمال کرنے کی اجازت بھی دی گئی۔ اس طرح اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں اللہ کے ہاں جوابدہی کا خوف بھی ان پر طاری رہا اور عدل و انصاف کی وہ درخشاں مثالیں قائم کیں کہ جس کی مثال آج کے روشن خیال و تہذیب یافتہ ممالک میں بھی نہیں ملتی۔

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ولید بن عبد الملک اموی نے دمشق کے کلیسا یوحنا کو زبردستی عیسائیوں سے چھین کر مسجد میں شامل کر لیا۔ بلاذری کے مطابق: جب حضرت عمر بن عبد العزیز تختِ خلافت پر متمکن ہوئے اور عیسائیوں نے ان سے ولید کے کلیسا پر کیے گئے ظلم کی شکایت کی تو انہوں نے اپنے عامل کو حکم دیا کہ مسجد کا جتنا حصہ گرجا کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اسے منہدم کر کے عیسائیوں کے حوالہ کر دو اور ان کی دل آزاری کا معقول معاوضہ بھی دیا جائے۔ (فتوح البلدان:150)

راجہ داہر کے ظلم کے خلاف جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تو سب سے پہلے تمام ادیان کے پیروکاروں اور ہندوؤں کو مکمل امان اور مذہبی آزادی کا اعلان کیا گیا۔ الغرض اسلام نے اقلیتوں کے جان و مال اور مذہبی اقدار کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ مسلم اخوت و رواداری کا یہ عالم تھا کہ جب محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلایا گیا تو اس وقت بیشتر ہندوؤں نے اپنے مندروں و عبادت گاہوں اور گھروں میں محمد بن قاسم کے حسنِ سلوک کی وجہ سے اس کے بت سجا رکھے تھے۔ اسلام میں ان کے جان و مال اور مکمل مذہبی آزادی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس زمانے میں ہندوؤں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق بڑے بڑے عہدوں پر مامور بھی کیا گیا جہاں ان کے تمام مقدمات ان کے اپنے مذہبی رسوم و رواج کے مطابق طے کئے جاتے تھے۔ اقلیتوں کے بارے میں بے تعصبی، وسعت قلبی، اعلیٰ ظرفی اور عدل و انصاف کی یہ وہ چند مثالیں ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں اقلیتوں کو کس قدر امان اور تحفظ حاصل تھا لیکن اس کے برعکس آج کے روشن خیال اور مہذب مغرب اور ننگ انسانیت متعصب ہندو بھارت میں کیا ہو رہا ہے اس کی تازہ مثالیں ان دو خبروں

میں ملاحظہ فرمالیں۔

یورپی ملک جرمنی کے شہر برلن میں مسلم اور یہودی تنظیمیں ختنے پر پابندی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کر رہی ہیں۔ کولون کی ایک عدالت نے حکم دیا تھا کہ صرف مذہبی بنیادوں پر نوزائیدہ بچوں کی ختنہ سنگین جسمانی نقصان کے برابر ہوتی ہے۔ اس فیصلے کے بعد جرمن میڈیکل ایسوسی ایشن نے قانونی کارروائی سے بچنے کیلئے تمام ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ وہ بچوں کی ختنہ نہیں کریں سوائے اس کے کہ جب یہ عمل طبی طور پر ضروری ہو۔ اِس سے پہلے یورپ کی یہودی اور مسلمان تنظیمیں اِس ایک معاملے پر متحد ہو گئی تھیں اور انہوں نے مشترکہ طور پر جرمنی کے قانون سازوں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ بچوں کی ختنہ کے حق کا تحفظ کریں۔ بیویریا میں ایک راہب کی جانب سے ختنے کرنے پر ان سے تفتیش کی جارہی ہے۔

ہندوستان کی راجدھانی سے صرف 65 کلومیٹر دور شہر روہتک کے ایک گاؤں کٹولی میں ہندو نیتاؤں کے 14 / افراد پر مشتمل ایک پنچائت میں ایک تغلقی فرمان کے مطابق مسلمانوں کی مسجد جس میں وہ اجتماعی طور پر نماز پڑھتے تھے، اس کو فوری طور پر مسمار کر دیا گیا ہے، اور یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ گاؤں میں تمام مسلمان فوری طور پر اپنی داڑھی منڈوادیں۔ آئندہ کوئی بھی داڑھی والا شخص اس گاؤں میں داخل نہیں ہو سکتا، اگر کسی کو اس گاؤں میں آنا ہے تو اس کو اپنی داڑھی منڈوا کر آنا ہو گا۔ اس ہندو پنچائت نے جن چھ احکام پر مبنی فرمان جاری کئے ہیں ان میں پہلا فرمان یہ ہے کہ گاؤں کے ایک مسلمان نوجوان کے ہاتھوں ایک ہندو کی بکری مر گئی جس کی وجہ سے اسے جیل میں بند کر کے اس پر مقدمہ دائر کر دیا گیا ہے، حکومت کی طرف سے جیل کی سزا کاٹنے کے باوجود وہ عمر بھر گاؤں میں داخل نہیں ہو سکتا جبکہ مسلمانوں نے اس بکری کی مالیت سے کئی گنا زائد جرمانہ بھی ادا کر دیا ہے۔

دوسرا فرمان یہ کہ دھان کی کٹائی کے فوری بعد مسلمانوں کے قبرستان کو مکمل طور پر صاف کر دیا جائے گا گویا تمام قبروں کو مسمار کر کے میدان بنادیا جائے گا۔ تیسرا فرمان یہ کہ کسی بھی مسلمان مولوی اس گاؤں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہو گی اور چوتھا فرمان یہ کہ نہ ہی گاؤں کا کوئی فرد نماز پڑھے گا اور نہ ہی کسی بھی قسم کی اسلامی رسومات پر عملدرآمد کرے گا، پانچواں فرمان یہ کہ کسی بھی نئے مولود بچے یا بچی کو اسلامی نام نہیں دیا جائے گا بلکہ اس کا ہندو طرز پر نام رکھا جائے گا اور گاؤں میں جتنے بھی مسلمان جو صدیوں سے یہاں بس رہے ہیں اپنے اسلامی ناموں کو ختم کر کے سرکاری ریکارڈ میں ہندوؤں کے نام سے از سر نو اپنی رجسٹریشن کروائیں گے، چھٹا فرمان یہ کہ اگر کسی مسلمان خاندان کا کوئی فرد کسی دوسرے گاؤں یا شہر سے کسی اپنے مسلمان رشتے دار کی وفات پر تعزیت کیلئے آئے گا تو اسے بھی گاؤں میں داخل ہونے سے قبل اپنے چہرے سے داڑھی کو مکمل صاف کر کے آنا ہو گا۔

اس فرمان کے جاری ہونے کے بعد گاؤں کے وہ تمام افراد جو کئی برس تک بھارت کی فوج میں بھی اپنی خدمات سرانجام دے چکے ہیں، ان کے چہروں سے بھی جبراً داڑھی کو صاف کر دیا گیا ہے۔ اس انسانیت سوز فرمان پر عملدرآمد کیلئے وہاں کے مسلمانوں کو ایک مہینے کی مہلت دی گئی ہے جس کے بعد اس فرمان کی خلاف ورزی کرنے والے کے گھر کو جلا دیا جائے گا۔

مندرجہ بالا ان دو مثالوں سے اندازہ لگالیں کہ جمہوریت کے چیمپئن ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا لیکن مسلمانوں کی آنکھ کا تنکا ان کو گراں گزرتا ہے۔

بروز ہفتہ 23 ذوالحج 1445ھ 29 جون 2024

دوست دشمن کی تمیز

"اوبھرا گامیا توتے آزاد ہو گیا پر اسی تے ہمیشہ لئی غلام ہو گئے، اج اسی اپنے پر کھاں اگے بڑے شرمندہ ہاں اور اپنی آون والی پیڑھی اگے بڑے شرمندہ ہاں"۔ (اوبھائی گامیا "غلام محمد" تم تو آزاد ہو گئے لیکن ہم تو ہمیشہ کیلئے غلام بن گئے ہیں، اپنے بزرگوں کے سامنے بڑے شرمندہ ہیں اور اپنی آنے والی نوجوان نسل کے سامنے بھی شرمندہ ہیں)۔ یہ رقت آمیز منظر تیس سال کے بعد میری آنکھوں کے سامنے آج پھر تازہ ہو گیا جس نے ہر دیکھنے والے کو آبدیدہ کر دیا تھا جب سارا گاؤں دو دیرینہ دوستوں بابا غلام محمد اور بابا ہرنام سنگھ کی نہ رکنے والی آہ وزاری اور سسکیوں کے ساتھ سفید داڑھیوں کو تر کرتے ہوئے بے اختیار بہتے آنسوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ دونوں دوست قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ مل رہے تھے اور ہرنام سنگھ اور بابا غلام محمد اس پیرانہ سالی میں ایک دوسرے کو اس طرح مل رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے اندر ضم ہو جائیں گے۔ مسلم سکھ دوستی کی اس مشترکہ میراث کو ظالم طاقتوں نے جدا تو کر دیا لیکن ان کی محبت والفت کو پانچ دہائیوں کا فراق اور مضبوط کر دے گا، اس کی کسی کو بھی توقع نہ تھی۔

سکھ مذہب کے بانی اور پہلے گرو "بابا نانک" 15 / اپریل 1469ء لاہور اور شیخوپورہ کے وسط ایک گاؤں "بھوئے دی تلونڈی (موجودہ ننکانہ) میں ایک کھتری نسل کے ہندو کلیان چاند داس بیدی جو "کالو مٹھا" کے نام سے مشہور تھے، کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ہندوستان پر سلطان لودھی کی حکومت تھی۔ بابا گرونانک کے والد "علاقے کے ایک مسلمان جاگیر دار رائے بلوار بھٹی کے ہاں پٹواری تھے۔ سکھوں کے ہاں نومبر کے مہینے میں چوہدویں کے چاند کی رات کو ان کے جشن پیدائش پر "اکاش دیوا اس" منایا جاتا ہے، اور اسی جشن میں شمولیت کیلئے 60 سکھ خاندانوں کا یہ گروپ میرے ساتھ پاکستان گیا جہاں حکومتی اور عوامی سطح پر بڑے والہانہ استقبال نے لاہور ائیر پورٹ پر تمام سکھ خاندان کے افراد کو نہ صرف حیران کر دیا بلکہ آبدیدہ کر دیا۔ اس دوران ہمیشہ کی طرح پاکستانی حکومت کے علاوہ پاکستانی عوام نے دل کھول کر ان سکھوں کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

بابا گرونانک کا بچپن ان کی ہمشیرہ کے سسرال میں گزرا۔ ان کی ہمشیرہ کا نام "بے بے نانکی" تھا۔ سکھ روایات کے مطابق پانچ سال کی عمر سے ہی بابا جی مذہبی کہانیوں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے والد نے انہیں سات سال کی عمر میں روایتی تعلیم کیلئے اسکول میں داخل کروا دیا۔ فطری ذہانت کے باعث بہت جلد اپنے ہم جولیوں سے آگے نکل گئے۔ نو سال کی عمر میں جب پروہت نے ایک مذہبی تقریب میں جانو نامی دھاگا پہنانا چاہا تو انہوں نے اس رسم کو ادا کرنے سے انکار کر دیا گویا ان کے اندر توحید کی ایسی کوئی کرن چھپی ہوئی تھی جس نے ان کو ایسے انکار کی طاقت فراہم کی۔ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر سنسکرت کے علاوہ عربی اور فارسی پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔ بابا کے بہنوئی لاہور میں گورنر کے ہاں ناظم جائداد کی حیثیت سے ملازم تھے، سرکاری امور کی ادائیگی میں بابا جی اپنے بہنوئی کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔ بابا گرونانک کے اس مذہبی رجحان نے سب سے پہلے ان کی ہمشیرہ "بے بے نانکی" کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے بابا گرونانک کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کر لیا۔

بابا گرونانک کا یہ بچپن سے معمول تھا کہ وہ سورج نکلنے سے قبل گھر کے قریب ندی کے ٹھنڈے پانی میں اتر جاتے اور وہاں خدائے واحد کی حمد بیان کرتے تھے۔ سکھ روایات کے مطابق 1499ء تیس سال کی عمر میں بابا جی نے گاؤں کے قریب "کالی بین" ندی میں ایک گہرا غوطہ لگایا اور جب کافی دیر تک اپنے دوستوں کے پکارنے پر بھی پانی کی سطح پر نہ آئے تو ان کے دوستوں کو بڑی تشویش ہوئی۔ گاؤں میں موجود دولت نامی مسلمان غوطہ خور نے ندی کا وہ خاص حصہ چھان مارا لیکن بابا جی کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ گاؤں والوں کو بابا جی کے ڈوب جانے کا قطعی یقین ہو گیا لیکن تین دن کے بعد بابا جی اچانک اپنے

گھر لوٹ آئے لیکن اپنے غائب ہونے کے بارے میں ایک دن مکمل خاموش رہے۔ اگلے دن لوگوں کے بے انتہا اصرار پر اپنی خاموشی توڑتے ہوئے بولے:

"نہ کوئی مسلمان ہے اور نہ ہی کوئی ہندو ہے، تو پھر میں کس کے راستے پر چلوں؟؟؟ میں تو بس خدا کے راستے پر چلوں گا جو نہ مسلمان ہے نہ ہندو ہے"۔

انہوں نے اپنے غائب ہونے کی بابت یہ بھی بتایا کہ ان تین دنوں میں انہیں خدا کے دربار میں لے جایا گیا جہاں انہیں "امرت" خدائے واحد کی محبت کا جام پلایا گیا جہاں انعام کے طور پر خدا نے اپنی رحمتوں اور بالادستی کا وعدہ فرمایا۔ خدا نے اسی توحید کے پیغام پر عمل کرنے اور دوسروں کو پہنچانے کا حکم بھی دیا، جس کے بعد باباجی نے فوری طور پر اپنی کل جمع پونجی غریبوں میں تقسیم کر دی اور اپنے بہت ہی قریبی دو مسلمان دوستوں "بالا مطرب اور مردانہ" کے ہمراہ اسی توحیدی عقائد کی ترویج کیلئے گاؤں چھوڑ کر ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گئے۔

سکھ روایات کے مطابق بابا گرونانک کے پہلے چار طویل سفروں (اداسی) میں بلاشبہ ہزاروں میل کی طویل مسافت میں "توحید" یعنی خدائے واحد کے سچے پیغام کا درس مقصود رہا۔ بنگال سے آسام، تامل ناڈو، کشمیر، لداخ، تبت اور آخری مشہور سفر بغداد سے ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ دیگر عرب ممالک میں بھی اپنے عقیدے کے پرچار میں مشغول رہے۔ ان کا آخری اور پانچواں سفر اندرون پنجاب رہا جہاں انہوں نے بے شمار مریدوں کو بت پرستی کی لعنت سے آگاہ کرتے ہوئے توحید کی طرف مائل کیا اور اس پیغام میں ان کے دو مسلمان ساتھی "بالا اور مردانہ" ان کے پیغام کو گیت اور سنگیت کی شکل میں ڈھال کر لوگوں کو متوجہ کرتے تھے۔ بابا گرونانک نے ابتدائی تعلیمات میں سب سے پہلے جھوٹ کو ترک کرنے، مذہب کی غیر ضروری رسومات سے پرہیز، مذہبی کتب کے عین مطابق زندگی گزارنے کے اصول اور بغیر کسی وسیلے کے اللہ تک رسائی کی تعلیمات سے روشناس کروایا اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر چھپے ہوئے پانچ خطرناک امراض (چھپے ہوئے چوروں) تکبر، غصہ، لالچ، ناجائز خواہشات اور شہوت سے مکمل پرہیز کا حکم دیا گویا توحید کا درس اور پانچ امراض کی نشاندہی یقیناً اسلام کے وہ بنیادی سنہری اصول ہیں جن سے بابا گرونانک اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے بھی اپنے عقیدت مندوں کیلئے ان کو ضروری جانا۔

انہوں نے سکھ مذہب کی مکمل عمارت تین ایسے بہترین رہنما ستونوں پر استوار کی جس سے ان کی مذہب اسلام سے محبت و یکسانیت کا پتہ چلتا ہے:

1۔ نام جپنا: اس سے مراد خدا کا نام لیتے رہنا، اس کے گیت گاتے رہنا اور ہر وقت اسی کو ذہن و زبان میں تازہ رکھنا ہے۔ جبکہ قرآن ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ "يَاأَيُّهَاالَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا: اے اہل ایمان خدا کا بہت ذکر کیا کرو۔ (احزاب:41)

2۔ کرت کرنی: اس سے مراد دیانت داری سے محنت کر کے رزق حلال کمانا ہے جبکہ اللہ نے قرآن کریم میں دعاؤں کی قبولیت کی اولین شرط رزق حلال کو قرار دیا ہے۔ يَاأَيُّهَاالنَّاسُ كُلُوا مِمَّافِي الْأَرْضِ حَلَالًاطَيِّبًا: لوگو جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ۔ (البقرہ:168)

3۔ ونڈ چھکنا: اس سے مراد دولت کو بانٹنا ہے اور مل جل کر کھانا ہے۔ قرآن ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ "إِنَّمَاالصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (التوبہ:60) صدقات (یعنی زکوۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیئے یہ حقوق) خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔ گویا بابا گرونانک کے وضع کردہ سکھ مذہب کے تینوں بنیادی اصول قرآن کریم سے ماخوذ ہیں۔

گرونانک سکھ مذہب کے صرف بانی ہی نہیں بلکہ واحدانیت، تصوف اور روحانیت کا پرچارک بھی ہیں۔ آپ مسلمانوں کے عظیم روحانی پیشوا حضرت بابا فرید گنج شکر کے ہمعصر تھے۔ اپنے طویل تبلیغی سفروں میں بابا گرونانک کو کئی جید مسلمان عالم مبلغوں کے ساتھ ملاقات اور مکالمے کے کئی مواقع ملے۔ ہمیشہ سے صوفی منش مبلغ مسلمان اپنے مدارس اور خانقاہوں پر غریبوں کے مفت کھانے پینے کا خصوصی اہتمام کرتے چلے آئے ہیں جو ابھی تک جاری وساری ہے جس کو عرفِ عام میں "لنگر" کا نام دیا جاتا ہے۔ بابا گرونانک نے بھی اپنے طویل سفر کرنے کے بعد بقیہ زندگی گزارنے کیلئے 1522ء میں کرتارپور گاؤں کی بنیاد رکھی (جو بھارت اور پاکستان کی سرحد پر پاکستان میں واقع ہے) جہاں "کرتان اور لنگر" کی تقریبات کا آغاز کرتے ہوئے اپنے عقائد کی ترویج و تبلیغ کے ساتھ ساتھ غریبوں کو مفت کھانے پینے کی سہولت فراہم کی۔ سکھ مورخین کے مطابق اس دھارمک بستی کیلئے جہانگیر بادشاہ نے اپنی شہزادگی کے دوران ہی گروارجن صاحب کو نذر کر دی تھی۔ اس جگہ پر گروصاحب نے ایک دھرم شالہ بھی بنوائی۔ مشہور سکھ سکالر گیانی گیان سنگھ کے مطابق کرتارپور کو آباد کرنے کی تحریک ایک مسلمان میر عظیم خان نے شروع کی تھی اور کرتارپور پنجاب کی ایک مقدس بستی بن گئی تھی۔ اکبر بادشاہ بابا گرونانک سے خصوصی محبت کرتے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے کرتارپور کیلئے ساری زمین تحفہ میں دی تھی۔

اسی طرح امرتسر شہر کی ابتدا کے بارے میں یہ ذکر بھی تاریخ میں ملتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کے شہنشاہ اکبر نے امرتسر کا علاقہ سکھوں کے چوتھے روحانی پیشوا گرورام داس کو دے دیا تھا اور رام داس نے یہاں رام داس پور کی بنیاد ڈالی جس کا نام بعد میں امرتسر ہوا لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے 1565ء میں گروامر داس اور پھر 1579ء میں گرورام داس اور 1606 میں گروارجن دیو کو علاقے کی پیشکش کی تھیں جنہیں ان تینوں اشخاص نے قبول نہیں کیا تھا۔ گروامر داس کی نسبت یہ بھی تاریخ میں آتا ہے کہ جاگیر قبول کرنے سے انکار کے بعد اکبر نے وہ جاگیر جس پر امرتسر قائم ہوا، امر داس کی بیٹی بی بی بھانی کو شادی کے تحفے کے طور پر دے دی تھی جس سے امر داس انکار نہ کر سکے، مزید یہ کہ اکبر نے سکھوں کے تمام علاقوں کو محصول ادا کرنے سے آزاد کر دیا تھا۔ امرتسر کیلئے پرانے نام رام داس پور کے علاوہ گروچک اور رام داس چک بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ کرتارپور (پاکستان) میں 1539ء میں اپنے انتقال سے قبل گرونانک نے گروانگد دیو کو نیا گرونامزد کر دیا تھا پھر تیسرے گروامر داس (1479ء تا 1574ء) کے بعد آنے والے چوتھے گرورام داس 1534ء تا 1581ء نے امرتسر کے پرانے تالاب کی مرمت کا کام شروع کیا اور اس کے درمیان میں ایک مندر یا گردوارا دربار صاحب تعمیر کیا جس کو ہری مندر بھی کہا جاتا ہے۔ شہنشاہ اکبر اور اس کے بعد بھی عمومی تعلقات رام داس پور (امرتسر) سے نہ صرف اچھے رہے بلکہ مغلیہ سلطنت میں رام داس پور کی حیثیت نیم خود مختار علاقے کی سی تھی۔

امرتسر میں واقع دربار صاحب کیلئے زمین بھی اکبر بادشاہ نے ہی دی تھی۔ 1589ء میں لاہور کے نیک سیرت فقیر اور مشہور خدا رسیدہ بزرگ حضرت میاں میر صاحب نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ گوروارجن جی کا پیار سب سے زیادہ میاں میر جی سے تھا۔ یہ مسلمان فقیر تھے، جن کے ہاتھوں گروجی نے 1949)۔ گوروصاحب نے صرف اس پوتر استھان کی بنیاد ہی ایک پوتر مسلمان ہر مندر صاحب کی بنیاد رکھوائی تھی (بحوالہ رسالہ ہنویاں قیمتاں جنوری کے ہاتھوں سے نہیں رکھوائی بلکہ زمین بھی ہر مندر کیلئے وہ چنی جو ایک مسلمان بادشاہ اکبر کی طرف سے نذر کی گئی تھی۔ (بحوالہ بھارتی راشٹریہ کانگریس امرتسر 1956ء)۔ اس بارے میں ایک سکھ ودوان یوں لکھتے ہیں: 1923ء میں جب تالاب کی سیوا کی گئی تھی تو مالیر کوٹلہ کے نواب کی جتھے داری کے

ماتحت دو سو انتہائی معزز مسلمان پوتر گارے کی ٹوکریاں اٹھانے کیلئے امرتسر آئے تھے۔(بحوالہ رسالہ خالصہ پارلیمنٹ گزٹ اکتوبر 1956ء)

بعد ازاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں اس کا سنہری جڑاؤ بھی ایک مسلمان انجینئر محمد یار خان نے تیار کیا تھا۔ایک مشہور سکھ سکالر سردار گور بخش سنگھ شمشیر لکھتے ہیں: ایک مسلمان فقیر حاجی محمد مسکین بابا گرونانک کے پیار کی کشش میں امرتسر آئے اور 31 دسمبر 1925ء کو دن کے دو بجے انہوں نے ایک بہت قیمتی چندن کا چنور بڑی عقیدت سے بھائی ہیر اسنگھ راگی کی معرفت دربار صاحب کی نذر کیا۔اس نانک پریمی مسلمان نے یہ چندن کا چنور 5 برس اور سات مہینے کی محنت سے تیار کیا تھا جس کی ایک لاکھ پینتالیس ہزار باریک تاریں ہیں۔ان کو 9 من 14 سیر چندن سے تیار کیا گیا تھا۔آج کل یہ چنور بڑی حفاظت کے ساتھ جلوخانے میں رکھا ہوا ہے۔جب یہ چندن کا چنور فقیر نے نذر کیا تھا تو سری ہر مندر کی طرف سے ایک سو پونڈ کے قیمتی دو شالے ان کو بطور خلعت دیئے گئے تھے۔بحوالہ رسالہ امرتسر مئی 1938 سکھوں کی ایک مقدس زیارت پنجہ صاحب پاکستان کے ضمن میں ایک سکھ سکالر گیانی گیان سنگھ یوں لکھتے ہیں: پنجہ صاحب کا تالاب خواجہ شمس الدین صاحب نے بنوایا تھا۔وہاں پر موجود گوردوارہ کو مشہور مسلمان نواب خان آف قلات نے ایک وسیع جاگیر عطا کی تھی۔(بحوالہ گوردھام سنگرہ ص 22)

گورو گوبند سنگھ صاحب کے اپنے زمانے کے مسلمان رئیسوں اور عام لوگوں کے ساتھ نہایت دوستانہ تعلقات تھے چنانچہ میر گامے شاہ، میر حسن شاہ، چودھری پیر علی، بلونت خان، چودھری پھتو، چودھری سمو، جمال خان وغیرہ آپ کے جگری دوستوں میں سے تھے اور آپ کی سیوا کرتے تھے۔سکھ مورخین نے لکھا ہے کہ پٹنہ (بہار) میں وہاں کے قاضیوں نے گورو تیغ بہادر صاحب کو ایک باغ نذر کیا تھا جسے آج کل گورو کا باغ کہتے ہیں۔بہادر گڑھ (پٹیالہ) میں گورو تیغ بہادر صاحب کئی ماہ ٹھہرے تو وہاں پر ایک مسلمان علی خان نے دل و جاں سے آپ کی بہت خدمت و تکریم کی۔متھرا کے نواب نے گورو گوبند صاحب کو ایک باغ نذر کیا تھا جسے آج کل نذر باغ کہا جاتا ہے۔

بہت سے سکھ مورخین کے علاوہ ایک اور مشہور سکھ سکالر سردار گیان سنگھ لکھتے ہیں: جب پہاڑی راجاؤں اور مہاراجوں نے گرو گوبند صاحب کے خلاف مورچہ شروع کیا تو پانچ سو اداسی سادھو جن کی گوروصاحب کی روٹیوں پر پرورش ہوئی تھی، موقعہ آنے پر میدان سے بھاگ گئے۔جب بدھو شاہ کو معلوم ہوا تو وہ دو ہزار سپاہی لے کر میدانِ جنگ میں آیا اور اس لڑائی میں بدھو شاہ کے دو بیٹے بھی گوروصاحب کی طرف لڑتے ہوئے مارے گئے جس کے نتیجہ میں گورو گوبند صاحب کو آنند پور صاحب چھوڑنا پڑا، اور آپ ماچھی واڑہ کے جنگلوں میں چلے گئے اور مسلمان حاجیوں کا جیسا لباس پہننا پڑا۔اس موقعہ پر سب سے پہلے غنی خان اور نبی خان نے گوروصاحب کی سیوا کیلئے خود کو پیش کیا اور انہوں نے گوروصاحب کو پالکی میں بٹھا کر انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔اس طرح ان دو بھائیوں نے گورو گوبند سنگھ صاحب کو دشمنوں سے بچا کے محفوظ مقام پر لے گئے۔غنی خان اور نبی خان کی اس خدمت پر گورو صاحب نے ایک حکم نامہ لکھا کہ "نبی خان اور غنی خان مجھے اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔اس واقعہ کا حوالہ سکھوں کی مختلف کتابوں میں درج ہے جن میں گور پرتاپ سورج گرنتھ ورت، ظفر نامہ سٹیک، جیون کتھا اور سکھ اتہاس نامی کتابیں قابل ذکر ہیں۔(بحوالہ تواریخ گورو خالصہ اردو ص 158) سکھ مورخین لکھتے ہیں کہ گورو گوبند صاحب کی پہاڑی راجاؤں کے ساتھ جتنی بھی لڑائیاں ہوئیں ان میں گوروصاحب کی طرف سے بہت سے مسلمان کمانڈر بھی شامل رہے اور ان لڑائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان کمانڈروں میں بدبیگ، الف خان، صیاد خان، صیاد بیگ، میمون خان وغیرہ شامل تھے۔

سکھ مورخین نے دعویٰ کیاہے کہ مغلوں کے آخری فرمانروابہادر شاہ ظفر نے گورو گوبند صاحب کو اسلام کی ایک برگزیدہ شخصیت کی ایک یادگار اور متبرک تلوار نذر کی تھی، جو آج بھی سری کیس گڑھ آنند پور میں موجود ہے۔ مذکورہ ایک سکھ وِدوان نے رسالہ سنت پاہی (اگست 1951) میں تحریر کیاہے کہ سکھ ودوان سردار کاہن سنگھ کے مطابق اس تلوار کے ایک طرف کلمہ شریف اور دوسری طرف "نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ" لکھاہے"۔ الغرض مسلمانوں نے اپنی نہایت مقدس اور لاثانی چیز بھی گوروصاحب کو عطا کی تھی۔ اس سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتاہے کہ مسلمان آپ کی کتنی عزت کرتے تھے اور مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان کس قدر خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔ مغل بادشاہوں کے ساتھ گورو صاحبان کے کس قسم کے خوشگوار تعلقات تھے، اس کا اندازہ لگانے کیلئے اوپر درج کئے گئے واقعات نہایت چشم کشاہیں۔ جہاں مسلمان بادشاہوں، نوابوں، رئیسوں،، فقیروں اور صوفیوں نے گوروصاحبان کے ساتھ نہایت دوستانہ اور برادرانہ تعلقات قائم کئے تھے وہاں سکھ صاحبان نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ اور خوشگوار تعلقات قائم رکھے ہیں۔ چنانچہ گوروصاحب نے اپنے خرچے سے کرتارپور ہر گوبند پور اور امرتسر وغیرہ جگہوں پر عالی شان مسجدیں بنائی ہیں۔

بابا کے جانشین گوروانگد نے ان کی تعلیمات کو عام کرنے کیلئے قدیم کلاسیکی پنجابی زبان میں گرمکھی رسم الخط کو متعارف کرایا۔ 1551ء میں امرداس تیسرے گُرو منتخب ہوئے، ان کی 1574ء میں وفات کے بعد چوتھے گورورام داس نے امرتسر کی بستی آباد کی، جس کیلئے شہنشاہ اکبر نے اخراجات ادا کرنے کے علاوہ 500 بیگھے زمین بھی وقف کی۔ رام داس کی وفات کے بعد 1581ء میں ان کا بیٹا گُروار جن جانشین منتخب ہوئے۔ گُروار جن دیو نے ہی سکھوں کی مقدس کتاب "گورو گرنتھ" مرتب کی جس میں پہلے پانچ گروؤں کی (1469ء سے لیکر 1708ء تک 239 سال پر محیط تعلیمات) کو گُرمکھی زبان میں ہی تحریر کیا گیاہے۔ یہ 3381 / اشعار پر مشتمل ہے جو کہ ہندوؤں کی مقدس کتاب "رگ وید" سے تقریباً تین گنا بڑی ہے۔ اس میں بابا گورونانک، بھگت کبیر اور بابا فرید کے اشعار شامل ہیں۔

سکھوں کے تمام مذہبی مقامات گوردواروں میں یہ کتاب موجود رہتی ہے اور مذہبی تہواروں کے مواقع پر اس کتاب کے مندرجات پڑھ کر اور گاکر سامعین کو سنائے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں سکھوں کے خدا کی جو پہچان بتائی گئی ہے وہ بعینہ قرآن مجید کی دی ہوئی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ آج سکھ مذہب کے تمام افراد کثرت سے "ست سری اکال" (سچا، بڑا، خدا) کا دعائیہ جملہ استعمال کرتے ہیں جس کا ترجمہ حیرت انگیز طور پر "اللہ اکبر" ہے اور سکھوں کا سب سے بڑا نعرہ "واہگورو کا خالصہ واہگورو کی فتح" بھی قرآن کریم کی مشہور آیت (قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ) کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے) کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے۔ چنانچہ دنیا کے دو مذاہب اسلام اور سکھ مذہب ایسے مذاہب ہیں جن کے ہاں خدائی کا تصور شرک سے پاک ہے۔

بالآخر کرتارپور میں ہی پیر 22 ستمبر 1539ء (9 جمادی الاوّل 946ھ) کو صوفی منش بابا گرونانک اپنے ہزاروں عقیدت مندوں کو داغِ مفارقت دیکر اسی ربِّ کائنات کی طرف لوٹ گئے جس کا وہ دنیا میں پرچار کیا کرتے تھے۔ ان کے جسدِ خاکی کی آخری رسومات کیلئے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ٹھن گئی تو بابا گرونانک کی وصیت کے مطابق یہ فیصلہ کیا گیا کہ بابا کے جسدِ خاکی کے گرد پھول رکھ دیئے جائیں، اگلے دن جن کے پھول تازہ ہوں گے وہی ان کی آخری رسومات کے حق دار ہوں گے۔ اگلے دن جب چادر ہٹائی گئی تو لاش غائب تھی اور دونوں اطراف کے پھول تروتازہ تھے۔ چنانچہ ہندوؤں نے اپنے حصے کے پھولوں کو نذرِ آتش جبکہ مسلمانوں نے اپنے حصے کے پھولوں کو دفن کر دیا، آج کرتارپور میں دونوں کے مقامات موجود ہیں۔

بابا گرونانک کی اہلیہ محترمہ سلاخانی سے ان کے دو بیٹے "سری چند" اور "لکشمی چند" تھے۔ سکھ روایات کے مطابق سری چند بہت عابد اور زاہد انسان تھے جن کی لمبی داڑھی اور سر کے طویل بال تھے۔ سکھ مذہب کی تعلیمات کے مطابق ہمارا جسم خدا (اللہ، بھگوان، جسے بھی آپ خدا مانتے ہیں) کی دین ہے اور ہمیں اِسے ویسا ہی رکھنا چاہئے جیسا خدا نے عطا کیا ہے۔ اس میں غیر فطری طریقوں سے کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہئے، یہ خدا کی ناشکری کے مترادف ہے۔ اسی حکم کی وجہ سے پختہ عقیدے کے مالک سکھ اپنے جسم کے بال نہیں کٹواتے جبکہ لکشمی چند نے شادی کی اور ان کے بھی دو بیٹے ہوئے۔ بابا گرونانک نے اپنی تعلیمات سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مشترکہ مذہبی ہم آہنگی کی بے حد کوشش کی لیکن توحید تو نام ہی بت شکنی کا ہے اسی لئے ایک اور نیا سکھ مذہب وجود میں آ گیا۔ مسلمانوں کیلئے بابا گرونانک کی تعلیمات قطعاً نئی نہیں کیونکہ یہ وہی تعلیمات ہیں جو اس سے قبل آسمانی صحائف، قرآن کریم اور خاتم النبیین ﷺ کی سیرتِ مبارکہ میں موجود ہیں۔

لیکن کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان اس قدر محبت واخوت کا رشتہ استوار کرنے والے بابا گرونانک کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کی ایسی فصیل کھڑی کر دی گئی کہ آج کی نوجوان نسل کو آمنے سامنے کھڑا کر دیا گیا لیکن کیا وقت نے ان تمام سازشوں کو بے نقاب کر دیا ہے؟ وہ کیا وجوہات تھیں کہ جن کی بدولت مسلم سکھ دوستی اور برادرانہ تعلقات دشمنی اور نفرت میں تبدیل ہو گئے۔ بابا گرونانک سے مسلمانوں کی محبت اور عقیدت کا یہ عالم کہ ان کی آخری رسومات کیلئے میدان میں اتر آئے اور بالآخر بابا کی وصیت کے مطابق ان کے حصہ میں جو تازہ پھول آئے ان کو دفن کیا گیا اور آج تک وہ جگہ مرجع خلائق ہے اور یہی وہ مقام ہے جس نے ابھی تک سکھوں اور مسلمانوں کو مضبوط رشتے میں جکڑ رکھا ہے۔

بابا گرونانک کی بنیادی تعلیمات میں غریبوں، مسکینوں اور کمزور لوگوں کی حمائت کا سبق موجود ہے جس کا اسلام بھی بڑی سختی سے حکم دیتا ہے۔ بابا گرونانک نے جب کرتارپور کو اپنی تعلیمات و تبلیغ کا ذریعہ بنایا تو وہاں ہر خاص وعام کیلئے لنگر کا انتظام بھی اسی لئے کیا تاکہ وہاں غریبوں مسکینوں اور محتاجوں کو کھانے پینے کی سہولت میسر آ سکے اور ان میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جو اپنے علاقے میں ہونے والے مظالم سے تنگ آ کر یہاں مقیم ہو گئے تھے جن کی حفاظت کا بیڑہ خود بابا گرونانک اور ان کے مریدوں نے اٹھایا۔ اس طرح باباجی کی تعلیمات کا شہرہ دور دراز تک پھیل گیا اور دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بالآخر سکھوں کے دسویں گرو گوبند نے غریبوں میں سے اپنے پانچ ساتھیوں کا چناؤ کر کے ان کو پانچ پیاروں کا لقب عطا کیا اور اس طرح پہلی مرتبہ سکھ مذہب میں باقاعدہ طور پر خالصہ تحریک نے جنم لیا۔

اس زمانے ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے فرمانرواں اورنگ زیب کی حکومت تھی اور اس کے دربار میں تمام مذاہب کے لوگ بلا تفریق مختلف عہدوں پر فائض تھے۔ بعض ہندو عہدیداروں نے جب ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد کو سکھ دھرم میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے ایک گہری سازش کر کے اورنگ زیب کو ان کے خلاف اکسانا شروع کر دیا کہ سکھ مغل حکومت کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ ہندو اپنی سازش میں اس لئے بھی کامیاب ہو گئے کہ ان دنوں اورنگ زیب کا بھائی دارشکوہ بھی فرار ہو کر سکھوں کے ہاں پناہ گزیں تھا، اس لئے انہوں نے اس موقع سے سیاسی فائدہ اٹھاتے ہوئے اورنگ زیب کو سکھوں کے خلاف لشکر کشی پر آمادہ کر لیا کہ کوئی بھی حکومت اپنی سلطنت کے خلاف باغیوں کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی جبکہ دوسری طرف سکھ یہ سمجھتے تھے کہ ان مظالم کے خلاف ان غریبوں کی حمائت بابا گرونانک کے حکم کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلیہ دورِ حکومت میں سکھوں کے خلاف جنگ کوئی مذہبی جنگ قطعاً نہ تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو سکھوں کی افواج میں ایک کثیر تعداد مسلمانوں کی نہ ہوتی جو

گرونانک سے محبت کی بناء پر اپنی جانیں قربان کرنے کیلئے میدان جنگ میں نہ صرف کود پڑے بلکہ بڑی شجاعت کے ساتھ اپنی جانیں بھی قربان کیں جس کا تذکرہ سکھ بڑے احترام سے آج بھی اپنی تاریخ میں محفوظ کئے ہوئے ہیں۔

بالآخر یہ مسلم سکھ اتحاد جو کہ بابا گرونانک کی محبت کی مشترکہ میراث تھی، رنجیت سنگھ کی معیت میں پنجاب پر حکومت بنانے میں کامیاب ہو گیا اور تاریخ گواہ ہے کہ رنجیت سنگھ نے اپنے دربار میں تمام اہم عہدے مسلمانوں کے سپرد کئے اور کئی سال مسلمانوں کی وفاداری اور محبت کے بل بوتے پر یہ ایسا امن وامان کا دورِ حکومت تھا جس کا آج بھی سکھ بڑے تفاخر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہی ہندو عناصر جنہوں نے اورنگ زیب کو سکھوں کے خلاف اکسایا، بعد ازاں انگریز کے ساتھ ملی بھگت کر کے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی داغ بیل ڈالی اور ایک سازش کے تحت ہندوستان سے مغلیہ دورِ حکومت کو ختم کرانے میں کامیاب ہو کر انگریز کے دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ رنجیت سنگھ کی پنجاب میں کامیاب حکومت کے پیچھے سکھ مسلم اتحاد کی مشترکہ میراث کا طاقتور جذبہ موجود تھا اور انگریز اس بات سے واقف تھے کہ اس خطے میں یہی دونوں قومیں جنگجو ہیں اور یہاں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ ان دونوں قوموں کے درمیان کوئی ایسی منافرت اور دشمنی نہ پیدا کر دی جائے جس سے ان دونوں قوموں کے درمیان ایک ایسی خون ریز جنگ شروع ہو جائے جس سے یہ نہ صرف ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جائیں بلکہ ہمیشہ کیلئے دشمنی اور نفرت کی ایسی دیوار کھڑی ہو جائے کہ اس خطے میں کبھی بھی ان کا دوبارہ ایسا مثالی اتحاد نہ ہو سکے۔

برہمن اور انگریز کی مشترکہ سازشوں نے بالآخر مغلیہ دورِ حکومت میں وہ تمام ہندو جو سکھوں کا روپ دھار کر ان میں شامل ہو گئے تھے، اس تحریک کو لیکر آگے بڑھے اور اس امپیریل جنگ کو سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی جنگ سے تشبیہ دیکر تاریخ کو مسخ کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے نتیجے میں ایک ایسی نفرت کی آگ پھیلا دی جس کے شعلوں نے بالآخر رنجیت سنگھ کے پنجاب میں مسلم سکھ اتحاد کو جلا کر خاکستر کر دیا اور انگریزوں کو پنجاب پر قبضہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ انفرادی طور پر بعد ازاں سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ شیر وشکر تو ہو گئے لیکن انگریزوں نے ہمیشہ حکومت کرنے کیلئے "ڈیوائڈ اینڈ رُول" تقسیم کرنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس خطے میں سکھوں اور مسلمانوں کو سیاسی طور پر دور رکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب برطانیہ کا سورج بھارت میں غروب ہو رہا تھا تو قائداعظم جو بابا گرونانک کی تعلیمات مسلمانوں اور سکھوں کی مشترکہ میراث کی تاریخ سے واقف تھے، انہوں نے سکھوں کے لیڈر ماسٹر تاراسنگھ کو نہ صرف ہندوؤں کی ذہنیت اور سازشوں سے آگاہ کیا بلکہ پاکستان کے اندر سکھوں کو مکمل مذہبی آزادی کے ساتھ تمام بنیادی ومساوی حقوق کی یقین دہانی بھی کروائی لیکن ماسٹر تاراسنگھ نے اپنی کوربصری کی بناء پر سکھوں کی آزادی کا یہ سنہرا موقع گنوا دیا جسے آج حریت پسند سکھ قوم بھی اپنا سب سے بڑا مجرم سمجھتی ہے کہ جن کے اس ناعاقبت اندیش فیصلے نے انہیں بے رحم برہمن بھیڑیوں کے سامنے پھینک دیا۔

عیار برہمن نے ایک گہری سازش کے تحت قیام پاکستان کے موقع پر سکھوں کے ہاتھوں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام، مسلمان خواتین کی بے حرمتی اور بے یارومددگار قافلوں میں لوٹ مار، قتل وغارت گری کا ایسا بازار گرم کروایا کہ بعض مقامات پر کچھ جذباتی مسلمان بھی اپنے ردعمل پر قابو نہ رکھ سکے۔ برہمن کی دوررس سازش کامیاب رہی تاکہ یہ دونوں قومیں مشترکہ سرحد پر رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ میں جلتے رہیں۔ کیا یہ قتل عام بابا گرونانک یا ان کے بعد آنے والے سکھ مذہب کے گروؤں کی تعلیمات کے مطابق تھا یا اسلام میں اس کی کہاں اجازت تھی؟؟؟ اس کے برعکس جس ہندو قوم کو خوش کرنے کیلئے سکھوں نے مسلمان کی ریل گاڑیوں کی ریل گاڑیوں کو تہہ تیغ کیا اور لاشوں سے

بھرے خون آلود ڈبے پاکستان بھیجے، اس ہندو قوم نے سکھوں کو کون سا انعام دیا؟؟؟ پاکستان میں تو سکھوں کے سارے مقدس مقامات محفوظ ہیں جبکہ اندرا گاندھی نے امرتسر میں واقع سکھوں کے دربار صاحب کی حرمت کو بھارتی فوج کے ناپاک بوٹوں نے بری طرح پامال کر دیا اور وقت نے قائد اعظم کے دانشمندانہ فیصلے کی تصدیق کر دی۔

بابا گرونانک کی روشن تعلیمات کو اس وقت اور تقویت ملی جب روس کے سرخ ریچھ نے اچانک افغانستان پر اپنی ناپاک جارحیت کا ارتکاب کیا جس کے نتیجے میں جہاں 30 لاکھ افغان مہاجرین کو پاکستانی قوم نے اپنے گلے لگایا وہاں 35 ہزار کے لگ بھگ افغان سکھوں کو بھی پاکستانی مسلمانوں نے اپنے سر آنکھوں پر جگہ دی اور تاریخ نے بابا گرونانک کی ان اسلامی تعلیمات "مسلم سکھ اتحاد کی مشترکہ میراث" کو سچ ثابت کر دکھایا۔ پاکستان کے مسلمان آج بھی سکھوں کے ساتھ حسن سلوک کا وہی رویہ رکھتے ہیں جس کیلئے بابا گرونانک نے بے انتہا محنت کی تھی۔ قدرت کا انعام اور فیصلہ دیکھئے کہ نہ صرف بابا گرونانک کی جنم بھومی اور آخری آرام گاہ بلکہ سکھوں کے بیشتر مذہبی مقامات سرزمین پاکستان میں واقع ہیں جن کی زیارت کیلئے ہزاروں سکھ ہر سال وطنِ عزیز کی سرزمین پر مہمان بن کر آتے ہیں بلکہ مشرقی پنجاب سے بہنے والے دریاؤں کا پانی، سب کا رخ پاکستان کی جانب ہے جو سکھوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کی طرف محبت اور الفت کے ساتھ گلے ملنے کا اشارہ دیتے ہوئے اپنے مشترکہ دوست اور دشمن میں تمیز کا سبق دے رہے ہیں۔

پاکستان واحد ملک ہے جہاں سکھ مذہب اور اس کے پیروکار سب سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے سکھوں کے مذہبی مقامات کی دیکھ بھال میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان کے بانی قائد اعظم محمد علی جناح کے ایک سو تیسویں یومِ پیدائش پر کاکول اکیڈمی کے جن کیڈٹس نے مزار کے گارڈز کے فرائض سنبھالے، ملکی تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ قائد اعظم کے مزار پر خاتون کیڈٹس یا کسی سکھ کیڈٹ نے سلامی پیش کی ہو۔

بابا ہر نام سنگھ کے تڑپتے و کانپتے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک یادگار جملہ بھی تو میں آج تک نہیں بھول سکا جو انہوں نے لاہور بی بی سی کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہو کہا: "یہ وہی لاہور اسٹیشن ہے جب 1947ء میں یہاں ٹرین رکی تھی، میں کہہ رہا تھا کہ یہاں ٹرین کیوں رک گئی ہے اور مارے خوف کے یہ دعا کر رہا تھا کہ جلد سے جلد روانہ ہو اور آج میں دعا کر رہا ہوں کہ کاش یہ ٹرین ہمیشہ کیلئے یہاں رک جائے اور زندگی یہیں تمام ہو جائے"۔

بروز منگل 26 ذوالحج 1445ھ 3 جولائی 2024ء

ماتھے کا جھومر، سیدنا حضرت عمرؓ

اقبال نے تو کہا تھا کہ گہری تاریکیوں میں مرنے والوں کے ماتھے ستاروں کی طرح راہ دکھاتے ہیں، پھر یہ کیا ہوا کہ جلیل القدر ہستیوں کی یاد صرف خراجِ تحسین کا عنوان بن کر رہ گئی ہے۔ ہر سال فاروق اعظم کا دن گزر جاتا ہے لیکن ہمارے حکمرانوں کو یہ سوچنے کی بھی توفیق نہ ملی کہ ہمارا کل ان کی یاد سے منور اور معتبر ہو سکتا ہے اور ان کی شخصیت آج بھی رہنما ہو سکتی ہے! کچھ سال پہلے ایک نوجوان سیاستدان ہمسفر تھے، ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ ساتھ بیٹھا ہوا فردان سے بے نیاز ہو جائے تو یہ خود ہی بڑے پر جوش انداز میں اپنے تعارف کے بعد گفتگو کا بڑے عالمانہ انداز میں سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ تعارف کے بعد کہنے لگے کہ "آج کل ماؤزے تنگ اور امام خمینی کو پڑھ رہا ہوں"۔ عرض کیا "ضرور پڑھئے، یہ ہمارے عہد کے اہم ترین لوگ ہیں، تاریخ پہ جن کا گہرا نقش ہے اور اپنی اقوام کی تقدیر کو جنہوں نے بدل ڈالا لیکن اگر سیاست سیکھنی ہو، اگر قوت فیصلہ کو بہتر بنانا ہو اور اگر یہ سمجھنا ہو کہ بہتر حکمرانی کن اوصاف اور کن اصولوں کا تقاضہ کرتی ہے تو حضرت عمرؓ بن خطاب کو ضرور پڑھئے"۔

کیا مسلمان سیدنا عمرؓ بن خطاب کو پڑھتے ہیں؟ جواب ہو گا کہ نہیں! وہ ان پر فخر کرتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں، ان کی عظمت و شوکت کو یاد کر کے خود کو تھامتے اور سہارا پکڑتے ہیں لیکن پڑھتے نہیں ہیں۔ حزب المجاہدین کے سربراہ محمد صلاح الدین کو ان کے ساتھی نے بہت برا طعنہ دیا تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور یہ جواب دیکر خاموش ہو گئے کہ "رہنما سیرت نہیں پڑھتے، وہ نہیں جانتے کہ ہمدردی، حسنِ ظن اور خیر خواہی کے بغیر زندگی ادھوری ہے"۔

ماضی میں رہنے والے قدامت پسندی کے مارے مسلمان اگر سیدنا عمرؓ فاروق کی حیات کا مطالعہ کریں تو ان پر کھلے کہ آئین نو سے ڈرنا اور طرزِ کہن پر اڑنا جہالت کی ایک قسم ہے۔ غیر مسلم مؤرخ بھی تحقیق اور عرق ریزی کے بعد یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ خلیفہ ثانی سیدنا فاروق اعظمؓ ہی ایسی عظیم الشان ہستی ہیں جو اسلام کو ایک جیتے جاگتے نظامِ حیات کی شکل میں سامنے لائے جو آج بھی دنیا کی رہنمائی کیلئے کافی ہے اور اگر مسلمانوں کو ایک اور عمرؓ میسر ہوتے تو اس وقت ساری دنیا میں اسلام کا غلبہ ہوتا۔ یقیناً حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت اتنی عظیم اور ان کا مقام اتنا بلند ہے کہ "عمرؓ" کا نام سنتے ہی کوئی شخص ابہام کا شکار نہیں ہوتا۔ جب بھی اسلام کے عملی فلاحی نظام کی بات ہو تو ہر سننے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص سیدنا عمرؓ فاروق کو تو جانتا ہو مگر ان کے "دس برس چھ ماہ چار دن" پر مشتمل "دور خلافت میں ہونے والی حیرت انگیز کامیابیوں سے واقف نہ ہو۔

جمادی الآخر 13 ہجری میں خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے اپنی مرض الوفات میں سیدنا عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرنے کا عہد نامہ لکھوانے کے فوری بعد اپنے مکان میں جمع لوگوں سے مخاطب ہوئے اور کہا: "میں نے اپنے کسی بھائی بند کو خلیفہ مقرر نہیں کیا بلکہ عمرؓ کو مقرر کیا، کیا تم اس پر راضی ہو؟ تو سب نے "**سمعنا و اطعنا**" کہا۔ 22 جمادی الآخر 13 ہجری میں خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی وفات کے بعد، مسلمانوں کے متفقہ طور پر سیدنا عمرؓ فاروقؓ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرنے کے بعد سیدنا عمرؓ مسند آرا خلافت ہوئے۔

خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے پہلے ہی دن آپ نے لوگوں کے سامنے اس بات کی وضاحت کر دی کہ لوگوں سے حکومت کس طرح معاملہ کرے گی۔ آپ نے کہا: لوگو! وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو چکا ہے، اب ہمارے ساتھ جو بھی معاملہ ہو گا، ظاہری حالات اور اعمال کے مطابق ہو گا۔ ظاہراً جس نے

خیر و بھلائی کا رویہ اپنایا، ہماری طرف سے اسے امن و امان کی ضمانت ہے۔ باطنی اور چھپے ہوئے راز کی ٹوہ ہم نہیں لگائیں گے، یہ اللہ اور بندے کے درمیان ہے، اللہ باطن کے مطابق اور نیتوں کے لحاظ سے بندوں سے حساب لے گا۔ اسی طرح جس شخص سے شر اور فساد ظاہر ہو، ہم اس کے خلاف قانونی کاروائی کریں گے۔ اگر وہ کہتا بھی رہے کہ دل اور نیت سے اس کا ارادہ فتنہ و فتور کا نہ تھا تو ہم اس کے ظاہری عمل کے مقابلے پر اس کے اس دعوے کو قبول نہ کریں گے۔

اس بنیادی اصول کے مطابق سیدنا عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ وحی فی الحقیقت منقطع ہو چکی تھی اور اس کے اصول قرآن و سنت کی صورت میں واضح اور محکم تھے، پس مخلوق کیلئے اگرچہ حاکم وقت ہی کیوں نہ ہو، یہ حق نہ تھا کہ وہ ظاہری اعمال سے صرف نظر کر کے یہ فیصلہ دینا شروع کر دے کہ لوگوں کے دلوں میں کیا ہے۔ اسی مضمون کو خود صاحب وحی ﷺ نے بیان فرمایا ہے "مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ لوگوں کے دل چھید کر دیکھوں یا ان کے پیٹ چاک کر کے راز معلوم کروں۔ (بخاری) 14 صدیاں قبل حضرت عمرؓ نے ایک صالح معاشرہ کیلئے حکمران اور رعایا کے حقوق و فرائض کے بنیادی اصول وضع کر دیئے۔

تنظیم خیر خواہی اور اطاعت کے ستونوں پر قائم ہوتی ہے۔ بقول حضرت عمرؓ "اطاعت ہو گی تو جماعت قائم رہے گی۔، اطاعت کے بغیر جماعت قائم نہ رہ سکے گی۔" سچی بات یہ کہ اطاعت کے بغیر نہ کوئی جماعت قائم رہ سکتی ہے، نہ ادارہ، نہ خاندان، نہ تنظیم۔ سیدنا عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد، رعایا سے ان کے فرائض سے متعلق باز پرس کی، جس سے ایسا مثالی معاشرہ قائم ہوا جس میں ہر فرد اپنے دینی، معاشرتی و سماجی فرائض اور قانونی و اجتماعی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے ادا کرنے لگا۔ اسی لئے قابل رشک فاروقی دور کو اپنے مسائل کا حل گردانتے ہوئے آج بھی یاد کرتے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے اواخر جمادی الثانی وفات پائی، اور حضرت عمرؓ مسند آرائے خلافت ہوئے۔ سابق خلیفہ کے عہد میں جھوٹے مدعیان نبوت، مرتدین، اور منکرین زکوٰۃ کے خاتمے کے بعد فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا۔ 12 ہجری میں عراق پر لشکر کشی کے نتیجے میں حیرہ کے تمام اضلاع فتح ہو گئے تھے۔ اسی طرح 13 ہجری میں شام پر حملہ ہوا، اور اسلامی فوجیں سرحدی اضلاع میں پھیل گئیں۔ ان مہمات کا آغاز ہی تھا کہ خلیفہ وقت کا انتقال ہوا، اور سیدنا عمرؓ نے عنان حکومت سنبھالتے ہی پوری توجہ ان اہم مہمات کی تکمیل پر مبذول کر دی۔

آپؓ کے عہد خلافت میں ہونے والی فتوحات کا حال بہت طویل ہے۔ حضرت عمرؓ کے وصال کے وقت اسلامی مملکت کا رقبہ 2511665 مربع میل تھا۔ اس رقبہ میں تقریباً 1309501 مربع میل خود سیدنا فاروق اعظمؓ کے حُسنِ تدبر کی بدولت اسلامی قلمرو میں شامل ہوا۔ سیدنا عمرؓ کی عدیم النظیر حکمت عملی اور خوبی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دور حکومت میں اسلامی فوجیں روزانہ 300 مربع میل رقبہ اسلامی حکومت میں شامل کرتی تھیں۔ 23 ہجری کے اختتام پر فتوحات فاروقی کی حدیں، شمال میں بحر خزر کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ مقام دربند سے تقریباً سو میل آگے شمال تک (کوہ قاف کے آگے تک)، جنوب میں اردن اور اس کے جنوب میں واقع جزائر تک، مشرق میں پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں مکران تک، مغرب میں لیبیا کے شہر طرابلس تک تھیں۔

سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں اتنے بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں کہ انسان اپنی تمام تر شعوری کوششوں کے باوجود یہ فیصلہ

نہیں کر سکتا کہ آپؓ کے کس کارنامے کو سب سے بڑا اور اصل کارنامہ سمجھے۔ سیدنا عمرؓ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ، آپؓ نے دینی شورائی بنیادوں پر ایسا آئینِ حکومت وضع اور عادلانہ نظام قائم کیا جو مسلمانوں کی جملہ سعادتوں اور ترقیوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کے بنیادی حقوق، بلا تفریق مذہب اور رنگ و نسل کا ضامن تھا۔ اس نظام حکومت نے افراد کی ایسی تربیت کر دی جس کی مثال آج ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔

بحرین سے طویل مسافت طے کر کے ابو ہریرہ پانچ لاکھ دینار اٹھائے مدینہ میں داخل ہوئے تو عمرؓ بن خطاب کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ تمہارا دماغ تو درست ہے، کیا تم گنتی جانتے ہو؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ ان کا دماغ بھی درست ہے اور وہ گنتی بھی خوب جانتے ہیں۔ فراغت نہ دینے والے ہنگاموں کے سبب ٹیکس کا مال جمع ہوتا رہا، ایسے میں مشاورت ہوتی اور بحث کی جاتی۔ سیدنا علیؓ ابن طالب نے فرمایا "بانٹ دیجئے"، فرمایا: محتاج کو بقدر ضرورت دیا جا چکا۔ پھر پلٹ کر سوال کیا، شاہانِ عجم ایسے میں کیا کرتے تھے؟ عمارت بنائی، حساب کتاب کے رجسٹر تیار ہوئے، قبطی منشیوں کو ملازم رکھا اور اسلام میں پہلی بار خزانہ وجود میں آیا۔ چھبیس ادارے.....جی ہاں مستقل طور پر 26 نئے ادارے قائم کئے، مثلاً ملٹری انٹیلی جنس اور سوشل سیکورٹی کو تو ایسا عروج بخشا کہ 14 صدیوں کی مجموعی انسانی ذہانت بھی اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکی۔

چھبیس ادارے.....جی ہاں مستقل طور پر 26 نئے ادارے قائم کئے، مثلاً ملٹری انٹیلی جنس اور سوشل سیکورٹی کو تو ایسا عروج بخشا کہ 14 صدیوں کی مجموعی انسانی ذہانت بھی اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکی۔ سیکنڈے نیویا میں اسی لئے سوشل سیکورٹی کو عمر لاء کہا جاتا ہے اور برطانیہ میں اس تصور کے معمار نے کہا تھا کہ اس نے یہ سب مسلمان عبقری کی سوانح سے اخذ کیا۔

ہنگامی طور پر لیکن پائیدار اور مستقل بنیادوں پر ایک نیا ادارہ وجود میں آ گیا۔ وظائف کا سلسلہ شروع ہوا تو محتاجوں، کمسن بچوں کے والدین، اصحاب کبار اور اہلِ بیت کو ان کے گھروں میں خاموشی کے ساتھ وظائف کی رقوم پہنچا دی جاتیں۔ اہل بیت کو زیادہ وظیفہ دیا جاتا لیکن وہ تو ایک ہاتھ سے وصول کرتے تو دوسرے ہاتھ بانٹ دیتے۔ آمدن بڑھی تو دودھ چھڑانے کے بعد نہیں، بچوں کی فوری پیدائش کے بعد وظیفہ شروع کر دیا جاتا۔ پھر بیروزگاروں کو اور ایک بے نوا یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو مفلس غیر مسلموں کی فہرست بنانے کا حکم جاری کر دیا گیا کہ مستقل طور پر ان کی احتیاج کو دور کرنے کی سبیل ہو سکے۔ ایک سفر میں معلوم ہوا کہ ریگزار کے فرزند بیمار، مرتے ہوئے اور بوڑھے جانوروں کا چارہ بند کر دیتے ہیں تو سرکاری خزانے سے چارہ فراہم کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔

حضرت عمرؓ کی مومنانہ مخلصی کی قوت، بہادری و جانبازی، مجاہد فی سبیل اللہ کی اولوالعزمی، جہاندیدہ رہنما کی تجربہ کاری، فطری قابلیت کی بنا پر دیکھتے ہی دیکھتے اس زمانے کی سپر پاور کا نعرہ لگانے والی طاقتوں کو اسلام کے زیر نگیں کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے قیصر و کسری کو اپنے جوتے کی نوک پر ایسے اڑا دیا جیسے چٹیل میدان میں فٹ بال کھیلا جاتا ہے انہوں نے اپنی انفرادی صلاحیتوں سے عرب کی اس وادی غیر ذی زرع کے اندر رہ کر وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو بڑی بڑی حکومتوں اور مجلسوں کیلئے بھی انتہائی دشوار تھے۔ گورنروں کا تقرر، ججوں کا انتخاب، فوجی افسروں کا چناؤ، لشکروں کی تربیت و تنظیم، فوجی نقل و حرکت اور کمک کے احکام بھیجنا، نقشے بنانا، شہروں کی حدیں کھینچنا، قانون سازی، تقسیم مال غنیمت، حدود و تعزیرات کا اجراء وغیرہ، الغرض یہ تمام خدمات آپ اپنی صوابدید، اصابت رائے، تیزی ذہن، دور بینی و عزیمت سے انجام دیتے رہے۔ ان جلیل القدر خدمات کے ساتھ آپ خاک نشین

اور عوام کے ساتھ مل جل کر رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی خلافت کا زمانہ آج تک عدل وامن اور انتظام کے لحاظ سے دنیا کا اعلیٰ ترین مثالی دور مانا گیا ہے۔ محاسن بے شمار ہیں لیکن بنیاد یہ کہ ایک درد بھرا دل رکھتے تھے۔ قرآن قرار دیتا ہے کہ حکمران کو صاحبِ علم، توانا اور اجلا ہونا چاہئے۔ وہ ایسے ہی تھے، فیصلہ کبھی مؤخر نہیں کرتے، کوئی علمی نکتہ سامنے آتا تو اصحاب کبار سے کرید کرید کر پوچھتے۔ عبداللہؓ بن عباس اور عبداللہؓ بن مسعود کو اسی لئے عزیز رکھتے کہ صاحبانِ علم تھے۔ عدل اولین ترجیحات میں سب سے بڑی ترجیح تھا۔ اصحاب بدر تک سے رعائت نہیں کرتے۔ اپنے آقا ﷺ اور صدیقؓ اکبر کو یہی کرتے دیکھا تھا اور وہ ساری عمرؓ اس پر قائم رہے۔ اپنی کسی رائے کو غلط پاتے تو علی الاعلان تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ معذرت کر لیتے، زعم کا روگ کبھی نہیں پالا۔ ہمیشہ بلالؓ حبشی کے احترام میں کھڑے ہو جاتے اور علیؓ ابن طالب کے بارے میں ایک بار یہ کہا "اگر علی نہ ہوتے تو عمرؓ برباد ہو جاتا"۔

دمشق میں امین الامت کی سادگی اور درویشی دیکھ کر رو دیئے۔ معمولی لباس پہنتے، کچے گھر میں رہتے اور عام مسلمانوں میں نہ صرف گھل مل کر بلکہ ان میں سے ہر ایک کو سوال اور اعتراض کی کھلی اجازت دیتے۔ معاشرے کو سنوارنے کا نسخہ ان کے نزدیک یہ تھا کہ حکمران طبقہ درست رہے اور اس کا کردار، عامیوں کا رہنما ہو، لہٰذا حکام، گورنروں حتیٰ کہ اصولی معاملات میں اصحاب کبار تک سے سختی برتتے۔ جناب خالدؓ بن ولید کا معاملہ یہی تھا۔ حکمرانی طاقتوروں کے گٹھ جوڑ اور اہل رسوخ کو رعائتیں دیکر چلائی جاتی ہیں۔ اسلام نے اس طرز کو بدل ڈالا تھا اور عمرؓ اس روش کے نگہبان تھے۔ تعلیم کو فروغ دیا۔ عدل کے معاملے میں انتہا درجہ کی سختی برتی۔ بیمار کے علاج اور محتاج کے رزق کی ریاست ذمہ دار ٹھہرایا۔ امن کو ہر حال میں قائم رکھا اور ہر چند امیر معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص جیسے بارسوخ گورنروں پر سخت تھے مگر سیاسی استحکام کیلئے گاہے بگاہے تلخ گھونٹ پی لیتے لہٰذا ان دونوں کو ڈانٹا مگر معزول نہیں کیا کہ امن کیلئے استحکام لازم ہوتا ہے۔

دنیا میں جس قدر حکمران گزرے ہیں ہر ایک کی حکومت کی تہہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا۔ یہاں تک کہ اگر اتفاق سے وہ مدبر یا سپہ سالار نہ رہا تو دفعتاً فتوحات بھی رک گئیں یا نظام حکومت کا ڈھانچہ بگڑ گیا لیکن سیدنا عمرؓ کو اللہ پر بھروسہ اور اپنے دست وبازو کا یقین تھا کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی عجیب وغریب معرکہ آرائیوں کو دیکھ کر لوگوں کو خیال پیدا ہو گیا کہ فتح وظفر کی کلید انہی کے ہاتھ میں ہے لیکن جب سیدنا عمرؓ نے ان کو معزول کر دیا تو کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ کل میں سے کون سا پرزہ نکل گیا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران کی نسبت بھی لوگوں کو ایسا وہم ہو چلا تھا، وہ بھی الگ کر دیئے گئے اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ یہ سچ ہے کہ سیدنا عمرؓ ایک بہترین منتظم کے ناطے حکومت کو اس طرح چلایا کہ جس پرزے کو جہاں چاہا نکال لیا اور جہاں چاہا لگا دیا، مصلحت ہوئی تو کسی پرزے کو سرے سے نکال دیا اور ضرورت ہوئی تو نئے پرزے تیار کر لیے۔

رعایا کو ایک ایسی شریفانہ، پرامن، مطمئن اور بامقصد زندگی گزارنے کا موقع ملا جس کی ماضی وحال میں مثال ڈھونڈنا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ احساسِ جوابدہی اور محاسبہء نفس نے ان کے دورِ عہد میں زمین کو اللہ کے نور سے معمور کر دیا۔ دنیا کی ہزار ہا سالہ تاریخ کے سامنے بظاہر ایک بہت ہی مختصر عہدِ فاروقی کی تاریخ میں کشور کشائی، سیاست، حکومت، جمہوریت، اخوت، آزادی، مساوات، عدل اور فلاحِ انسانی کا یہ درخشاں ترین باب قوموں اور ملکوں کیلئے روشنی کا منبع اور ایک بہترین آئیڈیل ہے۔ نیکی وسعادت، حرکت وعمل کا یہ ایک ایسا سنہری دور تھا جس کا سو فیصد اعادہ خود اسلام کی تاریخ میں بھی نہ ہو سکا۔ دراصل عمر فاروق اعظمؓ بن کر تاریخ کے سٹیج پر نمودار ہونا دعاونگاہِ محمدی ﷺ کا فیضان تھا۔

تمام انسانوں سے گہری ہمدردی ان کے طرز حکمرانی کی اساس تھی اور ظاہر ہے کہ یہ رحمتہ للعالمین ﷺ کی تعلیم کا ثمر تھا اور جناب ابو بکرؓ کا ورثہ بھی

جنہیں وقت کم ملا۔ عظیم اوصاف کے حامل ہیں۔ غصہ تھا لیکن اگر ذرا سی زیادتی بھی ہوتی تو معافی مانگنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کرتے۔ اوّل اوّل عورتوں کو اہمیت نہ دیا کرتے۔ خود فرمایا: ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ عورتیں بھی کوئی چیز ہیں، یہ تو ہم نے آنجناب ﷺ سے سیکھا..... دراز قد، گورے چٹے، انتہائی بارعب اور فصیح، ہمیشہ غور و فکر میں منہمک رہتے، ہمیشہ سیکھتے رہنے والے، انتہائی سادہ، بہت منکسر، خوبیوں پر کبھی نازنہ کرتے، ہمیشہ کوتاہیوں کی فہرست اور خود کو سنوارنے کی فکر میں مبتلا رہتے۔

آخری ایامِ حیات میں آپؓ نے خواب دیکھا کہ ایک سرخ مرغ نے آپؓ کے شکم مبارک میں تین چونچیں ماریں، آپؓ نے یہ خواب لوگوں سے بیان کیا اور فرمایا کہ میری موت کا وقت قریب ہے۔ ایک روز اپنے معمول کے مطابق نماز کیلئے مسجد میں تشریف لے گئے، مسجد میں پہنچ کر نمازیوں کی صفیں درست کرنے کا حکم دیا۔ صرف تکبیر تحریمہ کہنے پائے تھے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کا مجوسی غلام ابولؤلؤ (فیروز) جو ایک زہر آلود خنجر لیے ہوئے مسجد کی محراب میں چھپا ہوا بیٹھا تھا، اس نے آپؓ کے شکم مبارک میں تین زخم کاری اس خنجر سے لگائے، آپؓ بے ہوش ہو کر گر گئے اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے آگے بڑھ کر امامت کی، مختصر نماز پڑھ کر سلام پھیرا، ابولؤلؤ نے چاہا کہ کسی طرح مسجد سے باہر نکل کر بھاگ جائے، مگر نمازیوں کی دیوار نما حائل صفوں سے نکل جانا آسان نہ تھا، اس نے اور تیرہ صحابیوں کو زخمی کر دیا جن میں سے سات جانبر نہ ہو سکے، اتنے میں نماز ختم ہو گئی اور ابو لؤلؤ پکڑ لیا گیا، جب اس نے دیکھا کہ وہ گرفتار ہو گیا تو اسی خنجر سے اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ بالآخر حق تعالیٰ نے آپ کی دعائے شہادت کو قبول فرمایا اور مُصلائے رسول ﷺ پر آپ کو 27 ذوالحجہ بروز (بدھ) زخمی کیا گیا اور یکم محرم (اتوار) آپؓ نے 63 سال کی عمر میں شہادت پائی۔ حضرت صہیبؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور خاص روضۂ نبویؐ میں حضرت ابو بکرؓ صدیق کے پہلو میں آپؓ کی تدفین ہوئی۔

ہم نے یہ پاکستان حاصل کرتے ہوئے اپنے رب سے یہ وعدہ تو کئی بار کیا کہ ہم ان بندوں کو جو بندوں نے اپنے غلام بنا لئے ہیں، ان کو ان بندوں کی غلامی سے نکال کر رب کی غلامی میں دے دیں گے، لیکن ہم نے اب تک ساری عمر وعدہ خلافی میں گزار دی اب یہ سوچتے ہیں کہ ہم پر ایسے حکمران کیوں مسلط کر دیئے گئے جو ہم سے غلام در غلام ہونے کا مطالبہ کرتے ہیں اور خود ملک کا کھربوں روپیہ لوٹ کر بھی خود کو بے گناہ اور معصوم ظاہر کرتے ہیں۔

آج ہم اپنے اسلاف کا تذکرہ تو بڑی محبت، تفاخر اور تعظیم سے کرتے ہیں لیکن صد افسوس! ہم ان سے کچھ سیکھتے نہیں۔ اگر ہم اب بھی اس عہد جدید میں قرآن و سیرت کی اساس پر زندگی بسر کرنے کا ارادہ باندھ لیں تو تب اسلام کے ماتھے کا جھومر جناب سیدنا عمرؓ بن خطاب کی تعلیمات ہمارے کردار کو معتبر اور منور کر سکتی ہیں۔ فاروق اعظمؓ کی حکومت مسلمانوں کی حکمرانی کی مسلمان معاشرے کی وہ بہترین تصویر، نمونہ اور آئیڈیل مثال ہے جس کو تاریخ نے اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے۔ اس آئیڈیل کی طرف سفر کا آغاز کئے بغیر اسلامی نظام کے دعوے خواہ کس قدر دلفریب ہوں، درحقیقت کھوکھلے ہیں۔

تمہیں جو ناز ہے آزادئ سوال پہ آج — خبر بھی ہے یہ اجازت عمرؓ کے ساتھ آئی
خدا نے یوں بھی دیا ان کے مشوروں کو مقام — کبھی تو یوں کہ شریعت عمرؓ کے ساتھ آئی
وہ جس کا عدل "عمرؓ لاز" بن کے جاری ہے — وہ باوقار عدالت عمرؓ کے ساتھ آئی

بروز ہفتہ یکم محرم الحرام 1446ھ 7 جولائی 2024ء

حکایاتِ خونچکاں

ہماری حالت تو ایسے جاں بلب مریض جیسی ہو گئی ہے جو بڑی مشکل سے رینگتا ہوا اپنے معالج کے پاس تو پہنچ جاتا ہے لیکن اس میں اتنی ہمت باقی نہیں کہ وہ یہ بھی بتا سکے کہ اس کو کیا تکلیف یا کیا بیماری ہے۔ معالج کے پوچھنے پر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں دواں ہیں اور زخموں سے چور جسم کے ہر اعضاء کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سالوں پرانی بیماریوں کا کرب اور سارے جہاں کا درد سمٹ کر اس کے چہرے سے عیاں ہے لیکن بتانے کیلئے اس کی اپنی زبان اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ ماسوائے سسکیوں، آہوں اور کراہوں کے درمیان صرف اشارے سے کبھی سر کی طرف، کبھی دل پر ہاتھ رکھ کر اور کبھی دونوں ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر رکھ کر زور سے رونا شروع کر دیتا ہے۔ جب معالج تھوڑا حوصلہ دلاتا ہے تو پھر اس کی جانب ایک عجیب سی امید اور آس کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں امید وار رحم کی درخواست کے ساتھ خاموش بیٹھ جاتا ہے۔

اب تو باباجی کا ٹیلیفون بھی بہت کم آتا ہے حالانکہ مجھے ان کی کڑی تنقید بھی اچھی لگتی ہے۔ یہی حال آجکل ان لوگوں کا ہے جن کے سینے میں اس مملکت خداداد پاکستان کا درد آبلہ بن کر ایک ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے اور درد کی شدت سے ان کو ایک پل چین میسر نہیں اور دکھ کی بنا پر ان کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی ہے۔ نیم شب جب وہ اپنے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ان کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔ اللہ سے رحم اور امید کے ساتھ پاکستان کیلئے شفاء اور سلامتی کی عاجزانہ دعاؤں کے ساتھ اپنے ان شہداء کا واسطہ دیتے ہیں جو اس ملک کی خاطر قربان ہو گئے۔ میرا وجدان تو اس وقت مجھ کو شدید بے چین کر دیتا ہے اور سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے جب کبھی یہ سوچتا ہوں کہ ان سوا لاکھ بے گناہ بیٹیوں اور بہنوں کو روز قیامت کیا جواب دوں گا جن کو اس مملکت پاکستان کی خاطر مشرقی پنجاب میں ہم چھوڑ آئے تھے، جو آج بھی آسمان کی طرف منہ کر کے اپنا قصور پوچھتی ہوں گی! صرف مشرقی پنجاب کے ان پانچ ہزار سے زائد کنوؤں کا حال کس قلم سے کیسے لکھوں جن میں مسلمان بچیاں اپنی آبرو بچانے کیلئے کود گئیں۔ ان ہزاروں بچوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے جن کو ان کے ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے تلواروں اور بھالوں کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ آج بھی لاکھوں افراد اپنے پیاروں کو یاد کر کے چپکے چپکے اپنے اللہ کے حضور اشک بار ہو کر اس پاکستان کیلئے ان کی قربانی کی قبولیت کی دعائیں کرتے ہیں!

لکھتے رہے ہم پھر بھی حکایات خونچکاں
ہر چند کہ اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ حالت صرف ان لوگوں ہی کی نہیں جنہیں میرے رب نے حالات و واقعات کا ادراک دیا ہے۔ وہ کسی بڑی آندھی یا طوفان کے آنے سے پہلے ہی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور فوری طور پر اپنے تئیں ان خطرات سے آگاہ کرنا شروع کر دیتے ہیں، منادی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دن رات اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے دامے درمے اور سخنے اسی کام میں لگ جاتے ہیں کہ کسی طرح ان خطرات کا تریاق کیا جائے۔

آج کل ذرا سی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی حیرت میں گم چہرہ لئے ایک دوسرے سے یہی سوال کرتا پھر رہا ہے، کیا ہونے والا ہے اور اب کیا بنے گا؟ ہمارا مستقبل کیا ہے، ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک دوسرے سے کوئی اچھی خبر کی تمنا دل میں لئے ہوئے، ایک امید کی شمع آنکھوں میں سجائے جیسے بستر مرگ پر پڑے مریض کے لواحقین کسی معجزے کی آرزو میں کسی حکیم، حاذق سے مرض کے تریاق ملنے کی نوید کیلئے بے تاب ہوتے ہیں یا کسی صاحب نظر کی دعا کے محتاج جس سے مریض کی جاں بچنے کی آس ہو جائے لیکن شائد اب مریض کو کسی حکیم کے تریاق، کسی ڈاکٹر کی دوا یا پھر کسی صاحب نظر کی

دعا سے زیادہ کسی ماہر سرجن کی ضرورت ہے اور شائد آپریشن میں جتنی دیر ہو گی مریض کی جان بچنے کے امکانات اتنے ہی مخدوش ہو جائیں گے، مریض کی حالت اتنی ہی بگڑتی چلی جائے گی، مرض اتنا ہی پھیلتا جائے گا، آپریشن اتنا ہی لمبا اور تکلیف دہ ہو جائے گا۔

ہمارے ہاں یہ سلسلہ چل نکلا ہے کہ لوگوں کو مذہب کی آڑ میں اس قدر بزدل بنا دو کہ وہ محرومیوں کو قسمت اور ظلم کو آزمائش سمجھ کر صبر کر لیں۔ حقوق کیلئے آواز اٹھانا گناہ سمجھیں، غلامی کو اللہ کی مصلحت قرار دیں اور قتل کو موت کا دن معین سمجھ کر چپ رہیں۔ غلام قومیں بد کرداروں کو بھی دیوتا مان لیتی ہیں اور آزاد قومیں عمر بن خطاب جیسے بے مثل حکمرانوں کا بھی محاسبہ کرتی ہیں۔

جس دن ہم نے اپنے بچوں کو یہ ذہن نشین کرا دیا کہ ہمارے ہیرو وہ نہیں جو جنگ و جدل اور خون بہانے کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں بلکہ جس دن ہم نے انہیں یہ سکھانا شروع کر دیا کہ ہمارے ہیرو تو وہ ہیں جو انسانی و حیوانی زندگی کا احترام اپنے رب کے خوف کا حکم سمجھ کر خود پر فرض کر لیتے ہیں، اور ان کی راتیں اللہ کے خوف سے سجدوں میں جھکی رہتی ہیں اور یہ ہیرو ہمارے سائنسدان، اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہمارے استاد بنیں گے تو پھر ہی معاشرے سے ہمارے بچے جرائم اور تشدد سے نفرت کرنا سیکھیں گے ۔اس لئے اپنے بچوں کو حق اور باطل میں فرق سمجھاتے ہوئے ایسی زندگی سے محبت سکھائیں جو ہمیشہ کی اخروی زندگی کا زادِ راہ بن سکے۔

مجھ سے مایوسی کا گلہ بالکل نہ کریں اور نہ ہی میرا مقصد بلاوجہ آپ کو ڈرانا ہے لیکن آپ ہی مجھے یہ بتائیں کہ آپ کا کوئی عزیز جو آپ کو بہت ہی پیارا ہو وہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو جائے، سب سے پہلے آپ اس کے بہتر علاج کیلئے دنیا کے بہترین ڈاکٹر، بہت ہی سمجھدار طبیب یا بڑا نامور حاذق تلاش کرنے میں دن رات ایک کر دیں گے اور اس کی زندگی بچانے کیلئے اپنی توفیق سے بڑھ کر خرچ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ یہ تمام وسائل مہیا ہونے کے بعد آپ سجدے میں رو رو کر اپنے عزیز کی شفایابی کیلئے اپنے معبود کو اس کی تمام جملہ صفات کا واسطہ بھی دیں گے، تب جا کر آپ کے دل کو اطمینان آئے گا کہ وہی شفا کا منبع ہے اس سے بہتر کون ہے جو ہماری دعاؤں کو شرف قبولیت دے گا۔

پاکستان اللہ کا خوبصورت تحفہ اور ایک بیش بہا قیمتی نعمت ہے۔ اس کے حصول کیلئے ہم نے اپنے رب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہمیں ایسی زمین عطا فرما جہاں ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لا سکیں لیکن گزشتہ 77 برس سے ہم عہد شکنی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور پاکستان کو ہم نے لاغر اور بیمار کر دیا ہے۔ بس اس کا صرف یہی ایک علاج ہے کہ ہم اپنے اس پروردگار کے سامنے اعترافِ جرم کر کے سجدہ ریز ہو کر اجتماعی معافی مانگیں اور اللہ کی اس رسی کو مضبوطی سے تھام لیں جو ہمارے دلوں کو دوبارہ جوڑ دے اور ہمارے دلوں کو تمام عصبیتوں، سیاسی اور مذہبی منافرت سے پاک کر دے۔

آمین

بروز سوموار 2 محرم الحرام 1446ھ 8 جولائی 2024ء

شدید تشنج میں مبتلا

"میں کل خصوصی طور پر آپ سے ملنے چاہتا ہوں، لندن میں میرا قیام صرف آٹھ گھنٹے کا ہو گا، کیا آپ کے پاس وقت ہو گا کہ چند گھنٹہ ہم اکٹھے مگر اکیلے گزار سکیں۔" میں اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ "کیوں نہیں، میں آپ کو خود لینے کیلئے ایئر پورٹ پہنچ جاؤں گا۔ میں نے اس کی فلائٹ کی تفصیلات ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر محفوظ کر لیں۔ اس کا بچپن اور جوانی امریکی ریاست ایریزونا میں بسر ہوئی۔ یہ ریاست بے آب و گیاہ پہاڑوں، ریگستانوں اور تھوڑے سے باغات کی وجہ سے بالکل ایسے لگتی ہے جیسے بلوچستان ہے۔ اگر ان وادیوں کے درمیان ایک شاندار موٹروے نہ گزر رہی ہو اور جگہ جگہ خوبصورت ہوٹل اور پٹرول پمپ نہ ہوں تو ایسے لگے جیسے سوراب سے پنجگور جا رہے ہیں یا پھر کاکڑ خراسان سے لورالائی جا رہے ہیں۔

میساچوسٹس یونیورسٹی سے اس نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی اور ایک عام امریکی کی طرح زندگی گزارنے لگا۔ چونکہ ایک ایسی ریاست سے اس کا تعلق تھا جہاں پانی کی کمی کا مسئلہ تھا، اس لئے اس نے اپنے علم کو پانی کی تلاش اور ترسیل کیلئے مخصوص کر لیا۔ اکثر پڑھے لکھے امریکیوں کی طرح اسے بھی عالمی اداروں اور بڑی بڑی عالمی کمپنیوں میں ملازمت ملنا مشکل نہیں تھی۔ اسے بھی ایک ایسی ہی ایک انٹرنیشنل کمپنی میں ملازمت مل گئی جس کی وجہ سے اسے افریقہ کے ایسے ممالک میں کام کرنے کا موقع ملا جہاں قحط، خشک سالی، غربت اور محکومیت ہر جگہ نظر آتی تھی۔ یہاں اس امریکی کے سامنے اس کے اپنے ملک اور اپنے ہم مذہب لوگوں کا دہرا معیار پہلی دفعہ نظر آیا۔

صومالیہ میں اس کی پوسٹنگ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس نے قحط زدہ لوگوں کی امداد کے نام پر آئے ہوئے امریکیوں کو ایک خاص تعصب کے ساتھ مسلمانوں پر گولیاں برساتے دیکھا۔ اس نے سوڈان میں کیمیائی ہتھیار تباہ کرنے کے نام پر وہاں کی سب سے بڑی دوائیوں کی فیکٹری تباہ ہوتے دیکھی، جس کے بعد وہاں کے مسلمان عام اسپرین کی گولی کیلئے بھی ترسنے لگے اور یہاں تک کہ 9 جولائی 2011ء کو اس ملک کے دو ٹکڑے کر کے ایک حصہ پر عیسائی حکومت قائم کر دی گئی، اس کے ساتھ ہی براعظم افریقہ کا اب تک کا سب سے بڑا معدنیات سے مالا مال ملک دو حصوں میں یعنی شمالی اور جنوبی سوڈان میں تقسیم کر دیا گیا جبکہ مئی 2011ء کے آخر میں شمالی افریقا کی حکومت نے تیل سے مالا مال علاقے "ابئی" پر استعمار کی در پردہ مدد سے قبضہ کر لیا تھا جس پر اب تک شمال اور جنوب دونوں اپنا دعویٰ کر رہے ہیں۔

میری اس سے ملاقات آج سے 25 سال پہلے جنوری 1999ء میں ایشین ڈویلپمنٹ بینک کے ہیڈ کوارٹر "ماندایولونگ منیلا" میں ہوئی۔ مجھے وہ اپنے مسلمان ہونے کے انتہائی دلچسپ واقعہ سے بھی آگاہ کر چکا تھا۔ ہزاروں کمروں کی اس عمارت میں اس صرف اس کے کمرے کے باہر بسم اللہ الرحمن الرحیم کی خوبصورت گولڈن تختی لگی ہوئی تھی۔ یوں تو منیلا کے شہر میں ہزاروں مسلمان رہتے ہیں اور ایشین بینک میں بھی کئی س مسلمان کام کرتے ہیں جن میں پاکستانی بھی ہیں لیکن جس کمرے کے دروازے سے اس بات کا اظہار ہو کہ وہ مسلمان ہے، وہ جوزف کا کمرہ تھا جو اب اپنے آپ کو یوسف کہتا تھا۔ ایک قد آور گورا امریکی جسے اللہ تعالیٰ نے ہدائت دی تو اس نے صومالیہ کی ایک کالی مسلمان لڑکی سے شادی کر لی۔ ہدائت کا نور بھی عجب ہے، آدمی کے ارد گرد اپنا ہالہ بنا لیتا ہے۔ منیلا کے مسلمان بھی اس ہالے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ وہ دیکھتے تھے کیا عجیب امریکن ہے، انگریزی بول رہا ہو تو ہمیشہ اللہ کے ذکر پر "اللہ سبحانہ تعالیٰ" پڑھتا ہے "گاڈ" کا لفظ قطعاً استعمال نہیں کرتا اور پیارے محمد ﷺ کا نام آئے تو پورا درود شریف پڑھتا ہے۔ وہ تمام الفاظ جو مسلمان کی پہچان ہیں، جیسے اسلام علیکم، بسم اللہ، سبحان اللہ اور الحمد اللہ، سب اسی طرح بولتا ہے۔

کبھی اس نے "ہائے، تھینکس گاڈ، گڈ لک" نہیں کہا۔ اتنے بڑے ادارے میں کام کے دوران ہزاروں تقریبات ہوتی ہیں، کسی کی بات پسند آجائے تو تالی نہیں بجاتا، زور سے اللہ اکبر کہہ دیتا ہے۔

اس کے گھر میں ایک عجیب عالم تھا جو میں نے دیکھا۔ حجاب میں ملبوس ایک بیوی اور ایک سات سالہ بیٹی فاطمہ، میں جس دن اس کے گھر گیا تو یوسف نے بتایا آج کے دن یہ پیدا ہوئی تھی لیکن اس گھر میں کوئی سالگرہ کا سماں نہیں تھا۔ میں نے پوچھا تو فاطمہ نے خود کہا میں سالگرہ نہیں مناتی۔ میں نے کہا: اس میں "میرے ماں باپ ہی میرے بڑے گہرے اور اچھے دوست ہیں اور میری اچھی دوست آتے ہیں، تمہیں تحفے ملتے ہیں۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا باتوں سے خوش ہو کر تحفے دیتے ہیں، پھر اس رسم کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تحفے کی تفصیلات پوچھیں تو اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ "آپ کو شائد علم نہیں کہ میری والدہ حافظِ قرآن ہیں اور میں نے بھی اپنی والدہ کی مدد سے پچھلے ہفتے مکمل قرآن کریم حفظ کیا ہے، بھلا اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے"۔ یوسف کی بیوی نے کہا "ہم لوگ یہاں کسی کلب وغیرہ میں نہیں جاتے، ڈانس نہیں کرتے لیکن ایک دفعہ ہم تینوں بے اختیار خوشی سے ناچ اٹھے جب پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔"

لیکن جس بات نے مجھے حیرت اور شرمندگی میں ڈال دیا وہ شائد ہم سب کو بحیثیت مسلمان حیرت میں ڈال دے۔ میں اس کے ساتھ ایشین بینک کے ایک کمرے میں جسے لوگوں نے نماز پڑھنے کیلئے مخصوص کیا تھا، نماز پڑھنے گیا۔ میں قصر کی آدھی نماز پڑھ کر تھوڑی دیر میں باہر آگیا، لیکن اسے وہاں سے باہر آنے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ میں حیران تھا کہ یہ شخص میرا اتنا بھی خیال نہیں کرتا کہ میں باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں یہ سوچ رہا تھا اور کڑھ بھی رہا تھا کہ وہ میرے پاس آیا اور بڑی شرمندگی اور انتہائی عاجزی سے کہنے لگا کہ "اصل میں تم لوگوں نے بچپن سے رب کریم کا ذکر سنا ہوتا ہے، مسلمان گھر میں پیدا ہوتے ہو، اس لئے تم نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا تصور ذہن میں لانے میں کتنی آسانی ہوتی ہے، مجھے اس کیفیت کو خود پر طاری کرنے میں اور ذہن کو یکسو کرنے میں تو آدھ گھنٹہ لگ جاتا ہے کہ میں رب ذوالجلال کے حضور کھڑا ہوں جو میرے دل و دماغ کے چھپے ہوئے خیالات سے بھی واقف ہے۔ آپ مہربانی کر کے کوئی ایسا طریقہ بتاؤ کہ میں جلدی سے اللہ تعالیٰ کے تصور میں اپنے آپ کو یکسو کر سکوں"۔ اس جملے کو سن کر میں لرز اٹھا اور میری آنکھوں سے یک دم آنسو چھلک پڑے، شرم سے میرا سر جھک گیا۔ میرے دامن میں ایمان کی کمتری کے سوا کچھ نہ تھا اور چند منٹ قبل میں بلڈنگ کی جس بلندی پر کھڑا نیچے گاڑیوں اور انسانوں کے اژدھام جو معمولی نقطوں کی طرح نظر آرہے تھے، یوں محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے یہاں سے نیچے دھکا دے دیا ہے۔ یوسف میری یہ حالت دیکھ کر پریشانی میں افسوس کا اظہار کر رہا تھا کہ اس نے نجانے کوئی دل دکھانے والی بات کہہ دی ہے لیکن وہ اب تک نہیں جان سکا کہ مجھے جو آئینہ اس نے دکھایا، میں اس میں خود کو دیکھ کر نڈھال ہو گیا ہوں۔

میں شرمندہ کیوں نہ ہوتا، ہم تو اپنے رب کے سامنے جاتے ہوئے اتنا بھی خوف نہیں کھاتے جتنا ایک پٹواری یا تھانیدار کے سامنے جاتے ہوئے کھاتے ہیں۔ ہم انگلش میڈیم میں چار جماعت پڑھ لیں تو ہمیں اتنی دیر تک سکون نہیں ملتا جب تک تھوڑا منہ ٹیڑھا کر کے "وش یو گڈ لک، اوہ گاڈ" نہ کہہ لیں۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی دیکھ کر یوسف مجھ سے متاثر ہو رہا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی وجہ سے رو رہا ہوں، حالانکہ میں تو اپنے ایمان کی کمزوری، اپنے عمل کی کمتری اور شرمندگی کی وجہ سے رو رہا تھا۔ صحیح تھا، تھانیدار، پٹواری، وزیر، چیف سیکرٹری، گورنر اور وزیر اعلیٰ ایسے کئی خداؤں کے سامنے خوف سے کانپنے والے مجھ جیسے مسلمان ایک اَن دیکھے اللہ کے سامنے کیسے خوف سے کانپ سکتے ہیں؟

قارئین! مجھے اس کی آمد کا سن کر ایک خوف طاری ہو گیا ہے کہ اگر اس نے اپنا یہ سوال دہرا دیا کہ آخر مسلمان اس قدر ذلیل و رسوا کیوں ہو رہے ہیں تو اس کا میں کیا جواب دوں گا؟ تمہارے کہنے پر میں نے اکتوبر 2007ء میں اپنے کیریئر کو داؤ پر لگا کر اس وقت کے فوجی آمر پرویز مشرف سے ملاقات کر کے ان کی خواہش پر پانچ نکاتی فارمولہ دیا تھا اور ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ اگر آپ اپنے موجودہ وزیر اعظم (شوکت عزیز) کی مالیاتی پالیسیوں پر عملدرآمد فوری طور پر روک دیں تو یہ ملک کے حق میں بہتر ہو گا، اس نے بلا جھجک یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر اس پر عمل نہ کیا گیا تو اگلے بیس سال میں ایٹمی پاکستان کا کیا حشر ہو گا۔ میں جب آج کا پاکستان دیکھتا ہوں تو اس کے بتائے ہوئے سارے خدشات کو سامنے دیکھ کر دل بیٹھنے لگتا ہے۔

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے بھید جانتا ہے!

بہت شدید تشنج میں مبتلا لوگو!

یہیں قریب، محبت کا ایک قریہ ہے

یہاں دھوئیں نے مناظر چھپا رکھے ہیں

مگر افق بقا کا وہاں سے دکھائی دیتا ہے

یہاں تو اپنی صدا کان میں نہیں پڑتی

وہاں خدا کا تنفس دکھائی دیتا ہے

بروز بدھ 4 محرم الحرام 1446ھ 10 جولائی 2024ء

حسینؓ ہمارے ہیں.....!

یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ محرام الحرام شروع ہوتے ہی سارا ملک اللہ کے فضل سے حسینی بن جاتا ہے، ہر بات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس بات پر ساری قوم کا اتفاق ہے کہ "حسینؓ ہمارے ہیں" تو پھر کیوں نہ ہم آج ایک فیصلہ کریں کہ آج کے بعد جو طرز حکومت، جو انداز زندگی، جو اسلوب، اور روشن نقوش، حضرت حسینؓ نے چھوڑے ہیں، ہم ان سے انحراف کر کے کسی فرقہ پرستی، کمیونزم، سوشلزم، اور باقی ازم جو ہم نے بنائے ہوئے ہیں، ان پر لعنت بھیجتے ہیں اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ آیئے آج اس بات کا عہد کریں کہ حضرت حسینؓ نے جن عظیم مقاصد کیلئے قربانی دی، ان مقاصد کو ہم اپنا شعار بنائیں گے لیکن افسوس کہ آج ان مقاصد کی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ صرف اپنے مفاد کے حصول کیلئے نام لئے جاتے ہیں۔ پہلی بات میں عرض کرنا چاہوں گا، شہادت نعمت ہے یا مصیبت؟ اگر شہادت مصیبت ہے، تو رویا جائے گا، ماتم کیا جائے گا، پیٹا جائے گا اور اگر شہادت نعمت ہے تو خراج تحسین پیش کیا جائے گا۔ شہادت یقیناً نعمت ہے، اور میرے رب کا فرمان ہے کہ شہید زندہ ہوتا ہے مگر تمہیں شعور نہیں۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مُردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔ ﴿البقرہ:154﴾

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

یہاں سے پہلے کیوں نہ شروع کریں اور آج طے کر لیں کہ شہادت کے دن سے پہلے سوگ منانا ہے یا بعد میں، پہلے منانا ہے تو کتنے دن پہلے شروع کریں، اور بعد میں کتنے دن تک لے جانا ہے۔ اسلام کی تاریخ تو شہیدوں کے خون سے رنگین ہے، کیا تاریخ اسلام میں ایک ہی امام مظلوم حضرت حسینؓ ہیں، نہیں، آپ کو اسی تاریخ میں حضرت عثمان غنی جیسا مظلوم بھی نظر آئے گا کہ جن کی حکومت 44 لاکھ مربع میل پر تھی، جن کے درِ اقدس پر سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حکم پر حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پہرہ دیتے رہے، جو چالیس دن تک پیاسے رہ کر پیغمبر ﷺ کے شہر مدینہ میں شہید ہو گئے لیکن آج اس دن عید منائی جاتی ہے، آخر کیوں؟ کیوں اس دن تعطیل نہیں منائی جاتی؟

یکم محرم امام عدل و حریت حضرت فاروق اعظمؓ کی شہادت کا دن ہے لیکن کسی نے اس دن تعطیل کا مطالبہ نہیں کیا۔ 21 رمضان المبارک جناب حضرت علی المرتضیٰؓ کی شہادت کا دن ہے، 22 جمادی الثانی صدیق اکبرؓ کی وفات کا دن ہے، 15 شوّال سید الشہداء حضرت حمزہؓ کی شہادت کا دن ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کے فرمان کے مطابق وہ تمام شہیدوں کے سردار ہیں، ان تمام شہداء کے دنوں پر عام تعطیل کیوں نہیں ہوتی؟ صرف محرم الحرام کے چند دن تمام ملک کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں کیوں تعطیل کی جاتی ہے؟ آخر یہ کن عوامل پر طے ہو گا کہ کن عظیم المرتبت شہداء کی یاد میں ہماری عدلیہ، قانون ساز اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں، تمام تعلیمی ادارے مکمل بند ہوں گے؟ ہم کب اپنا یہ غیر منصفانہ طرز عمل بدلیں گے؟

بند کیجئے یہ جمہوریت کے نعرے؟ ملک میں بسنے والے کروڑوں افراد کے دلوں پر اس دن چھریاں چلتی ہیں جب سیدنا حضرت عمرؓ فاروق کی شہادت کا دن ہوتا ہے، تو کوئی پوچھنے والا نہیں، حضرت عثمانؓ کی شہادت کا دن ہوتا ہے۔ کسی سرکاری و غیر سرکاری ادارے کو خبر تک نہیں۔ اگر آپ تاریخ اسلام دیکھیں تو کوئی دن بھی شہادت سے خالی نظر نہیں آئے گا، چھٹی کیجیے، سارا سال گھروں میں آرام کریں، کار حکومت کو بند کریں، پہلے حکومت کون سے تیر مار رہی ہے، ویسے بھی شب روز ہمارے حکمرانوں کی ایک دوسرے پر دشنام طرازی کا مقابلہ جاری ہے جس نے معاشی بدحالی اور سیاسی ابتری کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ اب تو بہانہ بھی میسر آ گیا ہے کہ سارے دن تو شہیدوں کے دن ہوتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی شہیدوں نے ہمیں چھٹی کرنا

سکھایا ہے۔ شہیدوں نے تو ہمیں درد دیا ہے، اب تو یہ ہمارا کام ہے کہ ایسے قیمتی درد کو کہاں اور کیسے سنبھالیں۔

آیئے دس محرم کو فیصلہ کیجیے کہ حسینؓ جس عظیم مقصد کیلئے آپ نے جان دی ہے۔ ہم آپ کے اس عظیم مقصد یعنی اسلام کی سربلندی کیلئے، اسلام کے خلاف جو سازشیں اٹھائی گیئں، جو اسلام کے خلاف کسی انداز سے کوئی سازش سامنے آئے گی تو ہم اس کا بیڑہ غرق کر کے دم لیں گے، ہم انہیں کیفر کردار تک پہنچا کر دم لیں گے۔ دس محرم کو ایک مضبوط عزم کے ساتھ یہ فیصلہ کریں کہ حضرت حسینؓ نے ہمیں رونے اور پیٹنے کیلئے نہیں چھوڑا بلکہ دنیا میں جاری فسق وفجور، ظلم وستم اور فرقہ واریت کو ختم کرنے کیلئے اپنے نانا محمد عربی ﷺ کے لائے ہوئے دین کو من وعن نافذ کرنے کیلئے اپنے پورے خانوادہ کی لازوال قربانی دی۔

دکھ تو اس بات کا ہے کہ آج حسینؓ کا نام وہ لیتے ہیں جنہیں نمازیں نصیب نہیں، قرآن کی تلاوت نصیب نہیں، آج سیدہ زینبؓ اور سیدہ ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ جن کے رات کی تاریکی میں جنازے اٹھے اور آج ہماری خواتین ان صدموں کی یاد دن کے اجالے میں ننگے سر بکھرے بالوں سے مناتی ہیں، ایمانداری سے سوچیں اور فیصلہ کریں کہ آخر ہمارے اس عمل کا ان پاکیزہ نفوس سے کیا تعلق ہے؟ کیا نسبت ہے؟ کیا رشتہ ہے ان عظیم شخصیات سے؟ ان سے اگر کوئی تعلق ہے تو آج طے کرنا ہو گا اور عہد کرنا ہو گا کہ ہم اس ملک میں وہ نظام لائیں گے جس کیلئے نواسہ رسول نے خود نماز کی حالت میں اور اپنی آنکھوں کے سامنے اور اپنی گود میں اپنے ننھے اور معصوم بیٹے کے حلق میں اترے ہوئے تیر کے بعد بہنے والے خون کو اپنے ہاتھوں میں جمع کر کے رب سے فریاد کی کہ اے بارالہٰا اگر تو اس طرح راضی ہے تو میں تیری مرضی پر راضی البر ضا ہوں۔ کیا ہمیں معلوم نہیں کہ میرے آقا ﷺ نے تو ان کی ماں کی گود میں ہی "جنت میں جوانوں کے سردار" ہونے کی خوش خبری سنادی تھی: یہ حسینیت ہے، اور اگر۔۔۔۔!

نام حسینؓ کا لیا جائے..... فحاشی عام ہو!

نام حسینؓ کا لیا جائے..... رشوت عام ہو!

نام حسینؓ کا لیا جائے..... بے حیائی عام ہو!

نام حسینؓ کا لیا جائے..... شراب کا دور چلے!

نام حسینؓ کا لیا جائے..... رات کو شباب وکباب کی محفلیں جمیں!

یہ حسینی نہیں ہیں..... ان کا حسینؓ سے کوئی تعلق نہیں!

نام حسینؓ کا لیا جائے۔۔۔۔۔ رات کو شراب وکباب کی محفلیں جمیں

جو حسینؓ کے کردار کو اپناتا ہے..... حسینؓ سے تعلق اسی کا ہے

سوال یہ ہے کہ کیا ہم میں کوئی ایسا محب رسول نہیں بچا جو رسول اللہ ﷺ کے اتنے قریبی رشتہ دار صحابہ اور دیگر صحابہ پر زبان طعن دراز کرنے والوں کو زبانی جواب ہی دے سکے؟ آخر ہماری غیرت ایمانی کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہم مسلمانوں کو قرآن کی یہ آیت بھول گئی ہے: بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کیلئے اُن کی اپنی ذات پر مقدم ہے، اور نبی کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں، مگر کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین ومہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو۔ یہ حکم کتابِ الٰہی (قرآن) میں لکھا ہوا ہے۔ (احزاب:6)

بروز جمعۃ المبارک 6 محرم الحرام 1446ھ 12 جولائی 2024ء

نہایت اس کی حسینؓ ابتداء ہے اسمٰعیلؑ

اسلامی سال کا آغاز ماہ محرم الحرام سے ہوتا ہے۔ امم سابقہ میں بھی اس کو ماہ معظم سمجھا جاتا تھا اور آج بھی ماہِ محرم کی عظمتوں سے کسی کو انکار نہیں اور خصوصاً یوم عاشورہ تو ملت اسلامیہ کا ناقابل فراموش دن ہے۔ بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے جو بزرگیاں دنوں کے اعتبار سے امتِ محمدیہ کو عطا کی ہیں، اس میں یہ دن دسویں بزرگی کا ہے اور بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب انبیاء پر مختلف انعامات اسی دن فرمائے! سیدنا ابی عباس رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عاشورہ کے دن آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں کو پیدا فرمایا، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق بھی اسی دن فرمائی، حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ بھی اسی دن باریاب ہوئی، اسی دن ان کو جنت میں داخل فرمایا گیا۔ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ بھی اسی دن پیدا ہوئے، ان کے بیٹے کا فدیہ قربانی بھی عاشورہ کے دن دیا گیا۔ فرعون کو بھی اسی دن دریائے نیل میں غرق کیا گیا اور حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیف بھی اسی دن دور فرمائی گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش بھی یوم عاشور کو معاف فرمائی گئی اور حضرت عیسیٰ علیہ لسلام ابن مریم کی ولادت بھی اسی دن ہوئی اور قیامت بھی یوم عاشورہ کے دن ہی واقع ہو گی۔ (غنیۃ الطالبین)

لیکن ان تمام عظمتوں کی وجہ تسمیہ شہادتِ حسینؓ کے عظیم واقعہ کی چھاپ ہماری اسلامی تاریخ پر اس قدر زیادہ ہے کہ اب عملاً ہمارے لئے کسی اور واقعے کی اتنی اہمیت ہی نہیں رہی اور نہ ہی ہم اس سے واقف ہیں۔ شہادت حسینؓ حق کے مقابلے میں ہم دوسری عظمتوں کا نہ تو ہم ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

اسلام کی روح یہ ہے کہ وہ ناحق اور باطل کے سامنے سر کٹادے لیکن ہر گز اس کو جھکنے نہ دے، اس عظیم عمل کو شہادت کہتے ہیں اور اس شہادت کی اعلیٰؓ ترین مثال اور تکمیل کا نام بلاشبہ "شہادتِ حسینؓ" ہے جنہوں نے چھ ہزار کے لشکر کے سامنے عام روایت کے مطابق بہتر (72) مجاہدوں کے ساتھ ٹکر لی اور ان ظالم حکمرانوں کے سامنے سر جھکانے کی بجائے لڑ کر اپنی جاں جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ یہی وہ کردار ہے جس کی بناء پر ہم یوم عاشورہ کی یاد مناتے ہیں لیکن تاریخ کے جھروکوں کو بغور دیکھیں تو ہمیں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ علیؓ ہم السلام دو مختلف قسم کے طریقہ کار کی علامت نظر آتے ہیں۔ ہمیں جہاں حضرت حسینؓ سیاسی طریقہ کار کے علمبردار نظر آتے ہیں وہاں حضرت حسنؓ غیر سیاسی طریقہ کار کی حکمت کے مینار دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت حسینؓ نے حاکم وقت کے ساتھ جنگ کر کے جو سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی وہاں یہی مقاصد حضرت حسنؓ نے جنگ کے میدان سے واپسی کے ذریعے حاصل کئے۔ اس اہم اور لطیف فرق کو سمجھنے کیلئے ہمیں تاریخ کی اس تصویر کے ہر پہلو کو بڑی ایمانداری سے دیکھنا ہو گا اور ان تاریخی واقعات کو سامنے رکھ کر ان عظمتوں کی مینارۂ ہدائت کو اپنی قوموں کی زندگی کیلئے مشعلِ راہ بنانا ہو گا۔

تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مکہ میں قدیم زمانے سے قریش کے دو خاندان بنو ہاشم اور بنو امیہ آباد تھے اور ان میں خاندانی رقابت بھی چلی آرہی تھی لیکن جب بنو ہاشم کے ایک فرزند نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مخالفت میں بنو امیہ سب سے آگے تھے۔ لیکن فتح مکہ (8ھ) کے بعد عرب کے دوسرے قبائل کی طرح بنو امیہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور عہد رسالت اور خلافتِ راشدہ میں بنو امیہ کے لائق افراد نے مختلف اسلامی عہدے بھی حاصل کئے جس کی ایک درخشاں مثال حضرت عثمانؓ ابی عفان ہیں۔ اس دور میں (25ھ تا 35ھ) میں بنو امیہ کا اثر و رسوخ تمام دوسرے قبائل سے کہیں زیادہ ہو گیا۔ اس کے بعد جب حضرت علیؓ ابن طالب کا انتخاب بطور امیر المومنین ہوا تو اس وقت بنو امیہ نے محض شہادت عثمانؓ کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر پہلے ہاشمی خلیفہ

کے خلاف پرانی رقابت کو از سر نو زندہ کر دیا جس کی وجہ سے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کا پورا زمانہ خلافت (35ھ تا40ھ) باہمی خانہ جنگیوں اور شورش میں گزرا، اور آخر اس کی انتہاء ایک ملعون جنونی عبد الرحمان ملجم کے ہاتھوں شہادت کے ذریعے ہوئی۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد آپ کے لختِ جگر حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ صرف عراق اور خراسان کی خلافت امام حسنؓ کے حصے میں آئی جبکہ شام، فلسطین، یمن، حجاز اور مصر وغیرہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے زیر قبضہ تھے جنہوں نے خونِ عثمانؓ کے مسئلے کی بناء پر حضرت علیؓ کی بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بھلا اب حضرت امام حسنؓ کو خلیفہ کیسے تسلیم کر لیتے؟ ربیع الاوّل 41ھ کو صورتحال اس نوبت کو آن پہنچی کہ امام حسنؓ کے ساتھ چالیس ہزار سے زائد مسلح افراد تھے اور دوسری طرف حضرت امیر معاویہ کے جھنڈے تلے ساٹھ ہزار کا لشکر مرنے مارنے کیلئے ایک اشارے کا منتظر تھا۔ یہاں پر حضرت امام حسنؓ کا وہ تاریخی، غیر سیاسی کردار سامنے نظر آتا ہے جس کے متعلق عام قاری تو کجا ہمارے دانشور اور علماء حضرات بھی بے خبر نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ امام حسنؓ کا یہ عظیم کردار لوگوں کے سامنے ابھی تک کھل کر سامنے نہیں آسکا جس طرح امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ ہے۔

حضرت حسنؓ نے اپنے والد کے پانچ سالہ خلافت کے پر آشوب زمانے میں مسلمانوں کو خود بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہوتے دیکھا تھا اس لئے باہمی خون خرابہ اور نہ ختم ہونے والے سلسلے کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کیلئے خود میدان سے ہٹ گئے اور خلافت کا عہدہ حضرت امیر معاویہ کے حوالے کر دیا اگرچہ حضرت حسنؓ حق پر تھے اور امت کے جائز خلیفہ تھے۔

اس کے بعد دو عشرے (41ھ تا60ھ) تک حالات پر سکون رہے اور اسلامی سلطنت کی سرحدوں میں بھی خاصی توسیع ہوئی۔ امیر معاویہ کے انتقال (رجب60ھ) تک حالات بڑے پر سکون رہے لیکن جب خلافت کا مسئلہ دوبارہ کھڑا ہوا تو امام حسینؓ جو اپنے باپ کی شہادت اور بھائی کی خلافت سے دستبرداری سے خوش نہ تھے، انہوں نے یزید کی خلافت سے اسی طرح انکار کیا جس طرح اس سے پہلے حضرت معاویہ نے ان کے والد محترم حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہیں سے امام حسین (4ھ تا61ھ) کا وہ کردار شروع ہوتا ہے جس کی یاد اب یوم عاشورہ کو منائی جاتی ہے۔

عتبہ بن ابی سفیان نے جب مدینے میں یزید بن معاویہ کیلئے لوگوں سے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا تو امام حسینؓ معذوری کا اظہار کر دیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے اہل وعیال کو لیکر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ یہاں آپ کی آمد سے قبل مکہ کے لوگ عبد اللہ بن زبیر پر بیعت کر چکے تھے اور یہ صورتحال حضرت حسینؓ کو قابل قبول نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حسینؓ اور آپ کے اہل خانہ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے جو عملاً اس وقت مکہ کے حاکم تھے۔

شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کیلئے مکہ و مدینہ کے حالات ساز گار نہیں تھے جس کی بناء پر اسلامی ریاست کا دارالخلافہ 36ھ میں مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گیا تھا۔ اس طرح امام حسنؓ نے بھی خلافت سے دستبرداری کے بعد 41ھ میں کوفہ کو خیر باد کہہ دیا تھا اور مدینہ میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ اب جب یزید کو خلافت ملی تو اہل کوفہ کی محبت اہل بیت کیلئے جوش میں آئی اور انہوں نے خطوط کے ذریعے امام حسینؓ کو خلافت کیلئے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ امام حسنؓ اہل کوفہ کی نفسیات اور صورتحال کی نزاکت کو اچھی طرح جان چکے تھے، اسی لئے اپنے بھائی کو وصیت میں اہل کوفہ کے بارے میں اپنی آراء سے آگاہ کر چکے تھے کہ: کوفہ والوں کے فریب میں مت آنا اور میں اچھی طرح جان چکا ہوں کہ نبوت اور خلافت دونوں ہمارے

خاندان میں جمع نہیں ہو سکتیں اس لئے تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم اس معاملے میں خاموش رہو"۔

لیکن حضرت حسینؓ اپنے لئے ایک کردار کا انتخاب کر چکے تھے وہ تھا "خلافت منہاج نبوت کا تحفظ" اور اس ادارے کے انہدام سے اہل اسلام کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس سے بھی امت مسلمہ کے اعصاب پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔ ان کے سامنے شہادتِ عثمانؓ کا واقعہ رونما ہوا، ان شورشوں نے حضرت حسینؓ کے اعصاب پر بھی بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف فتنوں نے پہلے اموی خلیفہ کے زمانے میں قصرِ خلافت کو بری طرح اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی مسلمانوں کو باہم خانہ جنگی سے بچانے کیلئے اپنی جان قربان کر دی حالانکہ اس وقت مدینے کے وفادار مسلمانوں کی جماعت آپ کے مکان پر موجود تھی اور بنو ہاشم کی تو ایک بڑی جماعت ان کی معاون و مددگار بھی تھی لیکن حضرت عثمانؓ نے ان سب کو قسم دلا کر اپنے مسلمان بھائیوں پر حملہ سے روک رکھا تھا اور اپنے گھر بیٹھ کر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے رہے۔ دراصل وہ بھی شریعت کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے کہ: وَقَاتِلُوا فِی سَبِیلِ اللهِ الَّذِینَ یُقَاتِلُونَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوا اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِینَ اور اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑیں اور زیادتی نہ کرو بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (بقرہ۔190)

اپنی طرف سے جارحیت کا آغاز بندۂ مومن کیلئے کسی طور پر بھی جائز نہیں کہ مسلمان دعوت و نصیحت کے ذریعے کوئی خیر کی راہ نکالتا ہے نہ کہ قتال کا راستہ اختیار کرکے، اس کے بعد اگر دوسروں کی طرف سے جارحیت کا آغاز ہو تو دو صورتیں ہیں، جارحیت کا آغاز اگر کفار کی طرف سے ہو تو پھر بھی مخصوص شرائط کے تحت اس کے دفاع کا حکم ہے لیکن اگر جارحیت کا آغاز اگر مسلمان کی طرف سے ہو تو ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ دفاع کے طور پر بھی اپنے دینی بھائی پر وار نہ کیا جائے۔: لَئِنْ بَسَطتَ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآنَا بِبَاسِطٍ یَدِیْ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ﷺ اِنِّی اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعَالَمِین "اگر تو نے مجھے مارنے کیلئے اپنے ہاتھ کو بڑھایا تو میں تجھے مارنے کیلئے اپنے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا"۔ (المائدہ۔28)

ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے آنے والے فتنے سے جب ڈرایا تو لوگوں نے پوچھا کہ ہم کو آپ ﷺ کا کیا حکم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں اپنی کمانوں کو توڑ ڈالو، اپنی تانت کو کاٹ ڈالو، اپنی تلواروں کو پتھر پر پٹک دو، اپنے گھروں کے اندر بیٹھے رہو، اگر تم کو مارنے کیلئے کوئی تمہارے گھر میں گھس آئے تو تم آدم علیہ السلام کے دو لڑکوں میں سے بہتر لڑکا بنو، قتل ہو جاؤ مگر قتل نہ کرو۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ بن عفان نے اصول شریعت کی اتنی بڑی عملی مثال قائم کر دی اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کے بہتر بیٹا بن گئے لیکن حضرت امام حسینؓ کے سامنے اس عظیم المرتبت کارنامے کے بعد آنے والے واقعات نے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کر دی کہ اگر حضرت عثمانؓ "خلافت علیؓ منہاج نبوت" کا دفاع کرتے (اور اس ادارہ خلافت کی حفاظت کی خاطر چند ہزار نفوس شہید بھی ہو جاتے تو یقیناً خلافت کا ادارہ انتشار اور انارکی سے محفوظ رہتا اور حضرت علیؓ جو ساری توانائیوں کے باوجود اپنے دور خلافت کے پانچ سال ان شورشوں اور باہمی جنگ و جدل پر قابو نہ پا سکے اور بالآخر ان منہ زور فتنوں نے ان کی جان لے لی) تو آج خلافت کیلئے مسلمانوں میں آپس میں ایسی خونریزی نہ ہوتی اور تاریخ اسلام میں جنگ جمل اور جنگ صفین اور بعد کے سانحات کیلئے کوئی جگہ نہ ہوتی۔

اسی طرح حضرت حسنؓ کو مسلمانوں نے اپنی آزاد مرضی سے بلا جبر و اکراہ خلیفہ مقرر کیا تھا، وہ نہ صرف برحق خلیفہ تھے بلکہ ان کی خلافت بھی منہاج نبوت پر قائم تھی، ان کے مقابلے میں حضرت امیر معاویہ کا دعویٰ خلافت ویسا ہی بلاجواز تھا جیسا حضرت علیؓ کے مقابلے میں، کیونکہ خلیفہ کے انتخابات

اور تقرر کا اختیار اہل شوریٰ یعنی اہل حجاز کے جلیل القدر صحابہ رضوان علیٰہم کو حاصل تھا۔ حضرت امیر معاویہ کا شمار طلقاء میں تھا، اس لئے طلقاء کو خلافت کے تقرر میں کوئی عمل دخل حاصل نہ تھا۔ حضرت معاویہ کا حضرت علیؓ کے خلاف محاذ آرائی، تصادم، اطاعت سے انکار اور بغاوت کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ مرکزی حکومت میں بطور ماتحت خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کا شوریٰ سے کوئی تعلق نہ تھا، اس طرح حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ بھی خلیفہ برحق تھے۔ وہ خلافت کے ادارے کے محافظ تھے۔ اس ادارے کے تحفظ اور دفاع کیلئے جو جنگیں لڑیں ان میں حضرت علیؓ حق پر تھے اور ان جنگوں کے نتیجے میں جو خون خرابہ ہوا اس کی بھی ذمہ داری حضرت علیؓ پر ہرگز عائد نہیں ہوتی۔

حضرت حسینؓ کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ حضرت معاویہ کے اس طرزِ عمل نے حضرت حسنؓ کو بھی اسی دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا جہاں وہ آج ہیں، یا تو وہ خلافت کے ادارے کا تحفظ فرماتے یا مسلمانوں کو خانہ جنگی کے منہ زور فتنے سے بچالیں۔ حضرت حسنؓ نے امن پسندی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے مسلمانوں کو تو خانہ جنگی سے بچالیا لیکن انہیں "خلافت علیؓ منہاج نبوت" کے انہدام کا صدمہ یقیناً برداشت کرنا پڑا۔ اس حکمت عملی نے امت سے بڑی بھاری قیمت وصول کی اور بعد میں حضرت حسینؓ اور اہل حجاز کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ حضرت حسینؓ نے اپنے والد گرامی حضرت علیؓ کو بھی خلافت کے ادارے کی حفاظت کی خاطر شہید ہوتے دیکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت حسنؓ نے ان تمام حالات کا عملی مشاہدہ کرتے ہوئے اپنے لئے غیر سیاسی طریق کار کا انتخاب کیا، اس پر نہ صرف عمل کیا بلکہ اپنے بھائی کو بھی اس کی وصیت کی لیکن حضرت حسینؓ نے اپنے لئے سیاسی طریق کار کا راستہ منتخب کر کے اپنے والد حضرت علیؓ کی سنت پر عمل کیا۔

یہاں امام حسنؓ کے غیر سیاسی طریق کار کی وضاحت از حد ضروری ہے۔ اس کیلئے پہلے ہمیں مستند احادیث اور اسلامی تاریخ کی بے شمار مستند کتابوں سے مدد لینا ہوگی۔ یزید کے مقابلے میں جو صورتحال حضرت حسینؓ کو پیش آئی اس سے کہیں زیادہ مشکل حضرت حسنؓ کو حضرت معاویہ کے مقابلے میں پیش آچکی تھی مگر آپ نے اس سے مختلف ردعمل کا اظہار کیا جس کا نمونہ ہمیں حضرت حسینؓ کے آخری خطبہ سے بھی ملتا ہے جہاں حضرت حسینؓ نے بھی جنگ وجدل سے بچنے کیلئے تین شرائط پیش کی تھیں۔ (طبری جلد 4 صفحہ 313)

احادیث کی کتب میں حسنینؓ کے بارے میں بہت سے روائتیں ملتی ہیں جن میں حضرت حسینؓ کیلئے زیادہ تر "محبت" کا ذکر ہے جو نواسہ ہونے کی حیثیت سے آپ کیلئے بالکل فطری ہے اور دوسری طرف امام حسنؓ کے بارے میں جو روایات نہ صرف سنداً زیادہ قوی ہیں بلکہ فطری محبت سے آگے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ: حسنؓ بن علیؓ سے زیادہ کوئی شخص نبی اکرم ﷺ سے مشابہ نہ تھا"۔ طبعی مشابہت کے علاوہ یہ ایک واقعہ بھی ہے کہ صحیح روایات میں امام حسینؓ کیلئے کوئی پیشگی کردار کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور دوسری طرف یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے امام حسنؓ کے بارے میں ایک عظیم کردار کرنے کی پیشین گوئی ارشاد فرمائی تھی۔

حضرت ابو بکرؓ صدیق فرماتے ہیں کہ "میں نے رسول اکرم ﷺ کو منبر پر دیکھا جہاں حسنؓ بن علیؓ آپ کے پہلو میں تھے۔ ایک بار آپ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور دوسری بار ان کی طرف، اور فرماتے تھے یہ میرا لڑکا ہے، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروادے گا (بخاری)

رسول کریم ﷺ کی یہ پیش گوئی امام حسنؓ کی زندگی میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ حضرت امام حسنؓ کی بیعت 40ھ میں اس حال میں ہوئی کہ

مسلمانوں کی باہمی لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ بنوامیہ اور بنوہاشم کی رقابت عروج پر تھی، نہ تو یہ ایک دوسرے کو ختم کر سکے تھے اور نہ ہی ہار ماننے کو تیار تھے۔ حضرت حسنؓ نے جب بیعت لی تو آپ نے لوگوں سے یہ اقرار بھی لیا کہ "میں جس سے جنگ کروں گا تم اس سے جنگ کروگے، جس سے میں صلح کروں گا تم اس سے صلح کروگے"۔ اب حضرت حسنؓ کی خلافت گویا حضرت معاویہ کیلئے نیا چیلنج تھی۔ اس کے مقابلے کیلئے میدان میں جہاں حضرت معاویہ کا 60 ہزار کا لشکر دمشق سے چلتا مدائن کے میدان میں پہنچا تھا وہاں امام حسنؓ بھی اتنی ہی قوت کا لشکر کوفہ سے لیکر مقابلے میں آن کھڑے ہوئے تھے۔ گویا پہاڑوں کا لشکر آمنے سامنے تھا بلکہ امام حسنؓ کے سپاہی تو حضرت علیؓ کے ہاتھ پر موت کی بیعت بھی کر چکے تھے اور لڑنے مرنے سے کم کسی چیز پر بالکل آمادہ نہ تھے۔

مدائن کے میدان میں معاویہ بن سفیان نے امام حسنؓ بن علیؓ کو یہ پیغام بھیجا کہ "جنگ سے بہتر صلح ہے، مناسب یہ ہے کہ آپ مجھے خلیفہ تسلیم کرلیں اور میرے ہاتھ پر بیعت کرلیں"۔ امام حسنؓ نے غور وفکر کے بعد اس پیشکش کو منظور فرمالیا اور خلافت امیر معاویہ کے سپرد کر دی حالانکہ امام حسنؓ کے پرجوش حامیوں کو یہ بات قبول نہ تھی۔ آپ نے ایک تاریخی فقرے میں جواب دیا: خلافت اگر معاویہ کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا، اگر میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا۔ اس صلح کے بعد حضرت امیر معاویہ نے حضرت امام حسنؓ کیلئے ایک لاکھ درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ (حافظ ذہبی 1 لعبر جلد 1 صفحہ 48)

اس طرح امام حسنؓ کے پیچھے ہٹ جانے سے مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اتفاق میں تبدیل ہو گیا اور مدائن کا میدان اسلامی تاریخ میں جمل وصفین کے بعد تیسری خونریزی کے عنوان سے بچ گیا اور مسلمانوں کی وہ قوت جو خلیفہ ثالث کے زمانے سے باہمی جنگ وجدل میں مصروف تھی اور جن کی وجہ سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا، اب دوبارہ اسلامی فتوحات کی خبریں بہم پہنچا رہا تھا اور اسلام کی اشاعت وتوسیع جو ان خانہ جنگیوں کی وجہ سے رک گئی تھی، اس کا بھی بند دروازہ جس نے کھولا وہ حضرت امام حسنؓ ہی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیچھے ہٹنا سب سے بڑی بہادری ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس بہادری کیلئے اپنے آپ کو تیار کر سکیں، بظاہر تو یہ میدان سے واپسی کا فیصلہ تھا، اس سے مسلمانوں کی قوت باہم مقابلہ آرائی سے بچ گئی اور اسی طاقت نے مسلمانوں کی فتوحات کا خارجی میدان میں سکہ بٹھا دیا۔ اگر اس وقت حضرت امام حسنؓ خلافت پر اصرار کرتے تو عجب نہیں مسلمان پہلی صدی ہجری میں آپس کی خانہ جنگیوں میں برباد ہو جاتے اور اسلام جو آج ایک عالمگیر مذہب چین سے لیکر مراکش تک اپنی برکات سے ہمیں فیض یاب کر رہا ہے اس کی شکل کچھ اور ہوتی تو گویا غیر سرکاری طریق کار سے اختلاف کرنے کی ہمت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ بعد کے حالات نے حضرت حسنؓ کے اس کردار کو بلاشبہ امت محمدیہ ﷺ پر ایک گراں قدر احسان ثابت کیا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ حضرت حسینؓ کے کردار پر نگاہ ڈالیں تو ان کے بھی طریق کار کو ایسی تقویت ملتی ہے کہ جس نے "خلافت علیؓ منہاج نبوت" کے تحفظ، دفاع اور اس کے احیاء کیلئے قربانیوں کی ایک ایسی پرعزم تاریخ رقم کی ہے جو قیامت تک مظلوموں کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہو گی۔ حضرت امام حسینؓ نے خلافت کے ادارے کو بچانے کیلئے کوفہ کے لوگوں کے سخت اصرار پر اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلمؓ بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا، گو حضرت مسلمؓ بن عقیل اس منصوبے سے متفق نہ تھے تاہم حضرت حسینؓ کے اصرار پر کوفہ چلے گئے۔

تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً اٹھارہ ہزار آدمی نیابتاً ان کے ہاتھ پر بیعت ہو چکے تھے لیکن جب یزید کے حکم پر عبیداللہ بن زیاد نے حضرت مسلمؓ بن عقیل اور ان کے کوفی میزبان ہانی بن عروہ کو محل کی چھت پر کھڑا کر کے قتل کر دیا تو کوفہ والوں کو گویا یزید کا پہلا پیغام تھا کہ حضرت حسینؓ کی

بیعت کی قیمت کیا ہو گی۔ اسی وقت کوفہ والے خاموش اپنے گھروں میں دبک گئے اور حضرت حسینؓ جو کہ ان بے وفا لوگوں کی قیادت کیلئے آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکے تھے، اپنے سفر سے بالکل واپس نہ لوٹے حالانکہ مکے میں تمام جلیل القدر صحابہ رضوان اللہ علیہ اجمعین نے ان کو اس سفر سے منع کیا تھا۔ عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس، عمرو بن سعد بن العاص، عبد الرحمٰن بن حارث رضوان اللہ علیہ اجمعین اور مکہ کے دوسرے بزرگوں نے شدت سے حضرت حسینؓ کو منع فرمایا بلکہ حضرت عبد اللہؓ بن زبیر نے کہا کہ آپ کوفہ جانے کی بجائے مکہ کی حکومت قبول فرمائیں۔ آپ ہاتھ بڑھائیں میں سب سے پہلے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ عبد اللہؓ بن جعفرؓ بن ابی طالب نے مدینہ سے خط لکھ کر بااصرار منع کیا لیکن حضرت امام حسینؓ کی اولوالعزم طبیعت اس پر کسی طور راضی نہ ہوئی، حتیٰ کہ انہوں نے حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ کی اس آخری بات کو بھی ماننے سے انکار کر دیا کہ عورتوں اور بچوں کو مکہ میں چھوڑ کر سفر کریں یا کم از کم حج کے بعد روانہ ہوں جس میں صرف چند دن باقی ہیں۔

امام حسینؓ ذوالحج 60ھ کے پہلے ہفتے میں کوفہ کے راستے میں حضرت عبد اللہؓ بن مطیہ سے جب ملے تو انہوں نے بصد احترام حضرت امام حسینؓ سے کہا: "میں آپ کو قسم دلاتا ہوں کہ آپ واپس مکہ تشریف لے جائیں، اگر آپ بنو امیہ سے خلافت چھیننے کی کوشش کریں گے تو وہ ضرور آپ کو قتل کر ڈالیں گے اور پھر ہر ایک ہاشمی ہر ایک عرب اور ہر ایک مسلمان کے قتل پر دلیر ہو جائیں گے"۔ لیکن حضرت امام حسینؓ نے واضح الفاظ میں اپنے رفقاء کو بتا دیا تھا کہ ان کے پیش نظر "خلافت علیؓ منہاج نبوت" کے احیاء کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی نظام اطاعت میں خلافت کی جو اہمیت ہے اس سے حضرت حسینؓ پوری طرح باخبر تھے۔ اسلامی نظام اطاعت کے استحکام کیلئے اولی الامر کے ادارہ کو جس انداز میں رسول اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے قائم فرمایا تھا، اس کے تحفظ اور دفاع کیلئے حضور اکرم ﷺ نے جو تاکید فرمائی تھی وہ بھی حضرت حسینؓ کے علم میں تھی۔ معاویہ بن ابی سفیان کے مقرر کردہ خلیفہ یزید بن معاویہ نے اس اداہ کی تعظیم اور تقدس کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اس ادارہ کے انہدام سے اسلامی معاشرہ کو دینی اور سیاسی نقصان جو پہنچ رہا تھا اس کو دیکھ کر حضرت حسینؓ جیسی شخصیت کا بیٹھ جانا بڑا مشکل تھا۔

تاہم آخر وقت میں کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ کو صورتحال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ حضرت مسلمؓ بن عقیل کی شہادت، کوفہ کے لوگوں کی بے وفائی، یزید کے لشکر جرار کے مقابلے میں آپ کا مختصر قافلہ بظاہر پہاڑ اور چیونٹی کا مقابلہ، لیکن حضرت حسینؓ نہائت بہادر، جرأت مند اور انتہائی شریف النفس تھے۔ وہ موت سے بالکل خوفزدہ نہیں تھے مگر اپنے ساتھ نیز عورتوں اور بچوں کیلئے اپنے دل میں جذبہ رحم کی پیدائش کو روکنا ان کیلئے ممکن نہ تھا چنانچہ آخری دن محرم الحرام کی دس تاریخ 61ھ کربلا کے میدان میں یزید کی فوج کے سامنے جو تقریر فرمائی وہ فصاحت و بلاغت کا بے نظیر شاہکار ہے۔ آپ نے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا: عیسیٰ کا گدھا اگر باقی ہوتا تو تمام عیسائی قوم قیامت تک اس کی پرورش کرتی، تم کیسے مسلمان اور امتی ہو کہ نبی ﷺ کے نواسے کو قتل کرنا چاہتے ہو!

دراصل کوئی دوسری قسم کا مسئلہ ہوتا تو کوفی مسلمان شائد عیسائیوں سے چار ہاتھ آگے ہوتے لیکن یہاں یزید کے لشکر کے سامنے نواسہ رسول ﷺ ان کے سیاسی حریف کے طور پر کھڑے تھے اور سیاسی حریف کو نہ مسلمان بخشنے کو تیار ہوتے ہیں نہ عیسائی۔ وہی یزید جس نے 64ھ میں مدینہ پر چڑھائی کی تھی، اس نے مسلم بن عتبہ کو تاکیدی حکم دیا تھا کہ حضرت امام حسینؓ کے صاحبزادے حضرت زین العابدینؓ کا پورا پورا خیال رکھنا کیونکہ وہ مدینے میں سیاسی زندگی سے الگ ہو کر مدینہ کے نواح میں الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے کیونکہ یزید نے اپنے باپ سے سیاست کا ایک اصول ورثے میں جو لیا تھا اس پر بڑی سختی سے کاربند تھا: "میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک حائل نہیں ہوتا جب تک وہ ہمارے اور ہماری سلطنت کے

درمیان حائل نہ ہوں۔(ابن تاثیر کامل جلد4 صفحہ 5)

چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ آخر وقت میں حضرت حسینؓ یزید سے صلح کیلئے راضی ہو گئے تھے۔ انہوں نے یزید کے نمائندے عبید اللہ بن زیاد کے سامنے تجاویز پیش کیں:

1۔ میں مکہ واپس چلا جاؤں اور وہاں خاموشی کے ساتھ عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاؤں۔

2۔ مجھے کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو کہ وہاں کفار سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں۔

3۔ ایک تیسری شرط بھی ہے لیکن امت میں فساد پیدا ہونے کی بناء پر گریز کر رہا ہوں۔

حضرت حسینؓ کے رویے میں تبدیلی سے یزید کی فوجوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اگرچہ کربلا کے میدان میں وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء تھے، اس کے باوجود نواسۂ رسول کے احترام کا یہ حال تھا کہ دونوں طرف کے لوگ مل کر نماز ادا کرتے تھے اور اکثر حضرت حسینؓ ہی کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے۔ عبید اللہ بن زیاد کے پاس جب یہ پیغام پہنچا تو وہ بھی بغیر لڑائی کے اس عمدہ حل پر بہت خوش ہوا لیکن اس کا مشیر شمر ذی الجوشن جو کہ حضرت حسینؓ کا پھوپھا اور انتہائی بری طبیعت کا مالک تھا، اس نے عین وقت پر عبید اللہ بن زیاد کا ذہن پھیر دیا۔ اس نے حضرت حسینؓ کے لوٹنے کے سارے راستے بند کر دیئے اور بالآخر کربلا کا وہ معرکہ جس میں عمرو بن سعد نے پہل کر کے حضرت حسینؓ کے قافلے پر پہلا تیر پھینک کر اس کا آغاز کیا تھا جس کا انجام حضرت حسینؓ کی شہادت پر منتج ہوا۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ عمرو بن سعد حضرت حسینؓ کا رشتے میں سوتیلا ماموں اور شمر ذی الجوشن پھوپھا تھا۔

تاریخ کے ان دو کرداروں پر ملت اسلامیہ قیامت تک جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ گو حضرت حسینؓ نے بھی آخری وقت میں حضرت حسنؓ کے غیر سیاسی طریقہ کار کو بھی عمل میں لانے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ کو حضرت حسینؓ سے "خلافت علیؓ منہاج نبوت" کے تحفظ اور دفاع کا کام لیکر ان سے بے مثال قربانی لینا مقصود تھی اور ان کی شہادت سے امت مسلمہ تک یہ پیغام پہنچانا مقصود تھا کہ حالات کیسے ہی پر آشوب اور دگرگوں ہوں، اسلامی نظام حکومت، اسلامی نظام اطاعت کے قیام و نفوذ جو کہ ایمان کے اوّلین تقاضوں میں سرفہرست ہیں، کی کوشش ہر وقت، ہر زمانے میں جاری رکھنی چاہئے جب تک خلافت کے ادارہ کو مکمل اس کی اصلی شکل میں بحال نہ کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ بھی ان کرداروں میں بے شمار دوسرے اسباق ہمارے لئے موجود ہیں، صرف شرط یہ ہے کہ ہم خود مخلص ہوں۔

غریب و سادہ رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتداء ہے اسمٰعیلؑ

بروز جمعۃ المبارک 6 محرم الحرام 1446ھ 12 جولائی 2024ء

حسینیت کے خفیہ درخشاں پہلو

سن 11 ہجری جس وقت حضور ﷺ کا وصال ہوا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر 7 سال تھی، یعنی خالص بچپن کی عمر تھی، اس حساب سے سن 61 ھجری کو کربلا میں یزید کے مقابلے میں آکر شہید ہوتے وقت آپ کی عمر 57 سال بنی۔ گویا حضور کے وصال کے وقت سے کربلا کے معرکہ تک درمیان میں آپ کی عمر مبارک کے 50 سال کا طویل عرصہ گذرا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی عمر کے یہ 50 قیمتی سال کہاں گذرے؟ کیونکہ جب بھی حضرت حسین کا ذکر ہوتا ہے تو یا تو آپ کے بچپن کا ذکر ہوتا ہے مثلاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام خود حضور ﷺ نے تجویز فرمایا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ دوران نماز بحالت سجدہ حضور کے کاندھے پر سوار ہوئے تو حضور ﷺ نے سجدہ طویل کر دیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے حضرات حسنین کو کاندھوں پر بٹھایا ہوا ہے، تو میں نے کہا واہ کیا خوب سوار ہے، میری بات سن کر حضور نے فرمایا یہ بھی تو دیکھو کہ کیا خوب سواریاں ہیں۔ حضور ﷺ نے ایک بار دوران خطبہ حضرات حسنین کو آتے دیکھا تو ممبر سے اتر کر دونوں نواسوں کو اپنی گود میں بٹھالیا یا پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر کے آخری ایام کا ذکر ہوتا ہے کہ جب آپ یزید کے مقابلے میں میدان میں آئے۔

سوچنے کی بات تو ہے کہ باقی کی پوری عمر جو آپ کی حیات مبارکہ کا 87 فیصد حصہ بنتا ہے وہ آپ نے کہاں گزاری؟

کس کے ساتھ گزاری؟

کس کی ماتحتی میں گزاری؟

کس خلیفہ کی خلافت کے تحت گزاری؟

نمازیں کس مسجد میں پڑھیں؟

کس کس امام کے پیچھے پڑھیں؟

رشتہ کہاں کیا؟

آپ کی بہن حضرت ام کلثوم کے لئے آپ کے گھر بارات کس کی آئی؟

آپ کے دولہا بھائی کون بنے؟

دوستی اگر کسی سے کی تو وہ کون کون تھے؟

وظیفہ کس سے لیتے رہے؟

وزیر مشیر کس کے بنے؟

حضرت ابو بکر کی سوا 2 سالہ مدت خلافت میں آپ کہاں تھے؟

حضرت عمر کے پونے 11 سالہ مدت خلافت میں آپ کدھر تھے؟

حضرت عثمان کے پونے 12 سالہ مدت خلافت میں آپ کہاں تھے؟

حضرت علی کے پوتے 5 سالہ دور خلافت میں کہاں مصروف رہے؟
حضرت امیر معاویہ کے سوا 19 سالہ دور حکومت میں آپ کہاں تھے؟
آیئے ان تمام سوالوں کا مستند تاریخی کتب سے پوچھتے ہیں جن کتابوں پر تمام مسلمانوں کو نہ صرف یقین ہے بلکہ اپنی کئی کتابوں اور خطبات میں انہی کتب سے استفادہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ ان تمام سوالوں کا جواب یہ ہے کہ آپ اس تمام طویل دورانیہ میں انہی تمام مقدس ہستیوں کے مقتدی، رشتہ دار، معاون، وزیر، مشیر، حامی، اور دست و بازو بنے رہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے لیکر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک سب کے ہاتھوں پر بیعت کی ہے آپ نے ان کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنی بہن حضرت ام کلثوم کا نکاح کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنی غیرت، محبت، شادی، غمی، دوستی، دشمنی اور رشتہ داریاں سب سانجھی کر لی تھیں آپ نے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت سکینہ کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن عمرو سے کر کے اور اپنی دوسری بیٹی فاطمہ بنت حسین کا نکاح حضرت عثمان کے دوسرے پوتے عبد اللہ بن عمرو سے کر کے حضرت عثمان سے سارے رشتے جوڑ رکھے تھے۔ اسی طرح جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا تو آپ نے حضرت عثمان کے گھر کی چوکیداریاں کیں۔

یہ سب وہ حقائق ہیں جن سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پوری عمر کنایہ ہے مگر اہلسنت، اہل حدیث اس 50 سالہ دور حسینیت سے متعلق نہ سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ امت سے مخفی کیوں ہیں اور نہ ہی جواب تلاش کر کے امت کے اختلافات ختم کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ اہل تشیع تو مر کر بھی یہ حقائق قوم کے سامنے نہیں لائیں گے، کیونکہ اس صورت میں ان کے مذہب کی عمارت کا دھڑن تختہ ہو جائے گا۔

سچ یہ ہے کہ حسینیت صرف یزید کے مقابلے میں آ کر امر ہونے کا نام نہیں بلکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عملاً یہ بھی ثابت کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبر کی اقتداء کا نام بھی حسینیت ہے۔

حضرت عمر، عثمان، امیر معاویہ کی امامت کو تسلیم کرنے کا نام بھی حسینیت ہے۔

حضرت عمر، حضرت عثمان سے رشتے داریاں کرنے کا نام بھی حسینیت ہے۔

حضرت عثمان کے گھر کے چوکیداری کا نام بھی حسینیت ہے۔

اور تمام حضرات صحابہ سے محبت کرنے کا نام بھی حسینیت ہے۔

حسینیت کو صرف کربلا تک محدود کر کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی باقی 50 سالہ حیات مبارکہ کو چھپانے والا حضرت حسین کا دشمن تو ہو سکتا ہے دوست کبھی نہیں۔

بروز سوموار 9 محرم الحرام 1446ھ 15 جولائی 2024ء

فلاحی ریاست کا خواب!

ایک بزرگ نے نصیحت کی، تمہارے سامنے کوئی ہاتھ پھیلائے تو یہ ہاتھ خالی نہ جانے دو۔ حضور اکرم ﷺ نے تو یہ بھی فرمایا کہ پاس کچھ نہ ہو تو مسکراہٹ بھی ایک صدقہ ہے اور پھر بات ان مانگنے والوں کی شروع ہوئی جو پیشہ ور گداگر ہیں یا صحت مند اور تندرست و توانا ہیں مگر گلیوں بازاروں میں مانگتے پھرتے ہیں۔ پیشہ ور گداگروں کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ کچھ لوگ ان کا کاروبار بھی کرتے ہیں اور کچھ مانگنے والے جعلی معذور بن جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان بزرگ نے یہی کہا کہ کوئی کیا بھی ہو، اس کا صرف پھیلا ہوا ہاتھ دیکھو اور اسے خالی واپس نہ جانے دو۔ ایسے بحث مت کرو کہ ہٹے کٹے ہو ،نوکری مزدوری کیوں نہیں کرتے۔ تم نہیں جانتے کہ اس صحت مندی کے باوجود اس کی کیا مجبوری ہے۔ اس کو اللہ تعالی پر چھوڑ دو اور تم اپنا فرض ادا کر دو۔

میں نے جب اس بات پر غور کیا تو میرے دل نے ان بزرگ کی بھرپور تائید میں یہ گواہی دی کہ کیا واقعی ہم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبانی کلامی ہمیں جو خدا نے دے رکھا ہے ہم اس کے حق دار ہیں؟ ہماری حالت تو یہ ہے کہ دن رات خدا کے واضح احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ایمان لاتے ہیں مگر عمل اس کے مطابق نہیں کرتے۔ ہماری حالت تو اس ملازم جیسی ہے جو مالک کے ہر حکم پر حاضر جناب تو کہے مگر اس کے حکم کو بجانہ لائے! زبان سے خدا کو رازق تسلیم کرتے ہیں مگر در حقیقت اپنی کوششوں کو اپنا رازق سمجھتے ہیں، نوکری کو، کاروبار کو یا کسی دوسرے قسم کے معاشی حربے کو۔ ربِّ کریم نے جو صفات اپنی ذاتِ برتر کیلئے مخصوص کر رکھی ہیں، وہ ہم اپنے رویّے میں پیدا کر کے اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں جو ناقابلِ معافی ہے۔

افسوس کہ اللہ کے مجبور بندوں سے بحث کرتے ہوئے ہم اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں کہ ہمارا کریم رب ہماری کتنی ہی کوتاہیوں سے در گزر کر کے ہمیں ہم کسی عمل روزی دیتا ہے اور اس دنیا کے عیش کراتا ہے۔ کیا ہم اللہ کے ان بندوں میں شامل ہیں جو ایک وقت کی روٹی جتنی بھی اطاعت کرتے ہیں؟ کیا قرار دے سکیں؟ سچی کے معاوضے میں اپنا کچھ حق جتا سکتے ہیں؟ کیا ہم اپنے رب کی اتنی مزدوری کرتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ موجود ہے اس کو جائز بات تو یہ ہے کہ صبح جب ناشتہ کرنے لگتا ہوں تو کبھی یہ سوچتا ہوں کہ مجھے یہ کیوں مل رہا ہے؟ میری ضرورت کے مطابق سب کچھ موجود ہے مگر کس عمل اور کس محنت کے عوض میں؟ مجھے اپنے لیل و نہار میں کوئی ایسا عمل دکھائی نہیں دیتا کہ میں ایک لقمے کا حقدار بھی کہلا سکوں۔ ہم تو ایک بے دین اور عملاً اللہ کے منکروں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میرا ایک دوست کہہ رہا تھا کہ پاکستان میں کپڑے کے دوکانداروں کے گز چھوٹے ہیں، ناپ تول کے دوسرے پیمانے بھی معیار کے مطابق نہیں۔ شائد ہی کوئی ایسا پٹرول پمپ ہو جس کے میٹر درست ہوں اور تیل خالص ہو۔ عام خیال تھا کہ موٹروے کے پٹرول پمپ درست ہوتے ہیں، میں اکثر دوران سفر پاکستان انہی پٹرول پمپوں سے تیل لیتا تھا لیکن ایک دن یہ خبر چھپی کہ یہاں کے کئی پٹرول پمپوں کی جانچ پڑتال کی گئی تو ان میں سے آدھے سے زیادہ ایک قوم پر عذاب اسی غلط نکلے۔ ایک مستند حدیث ہے جو قوم ناپ تول میں بد دیانتی کرتی ہے اس کا رزق روک لیا جاتا ہے لیکن ہمیں اس کی پرواہ نہیں۔ لئے نازل ہوا، اور وہ ناپ تول میں بد عنوانی کی سزا میں تباہ و برباد کر دی گئی مگر عبرت کون پکڑے؟ ہمارے ہاں جن کو اس ملک کے خزانے کا امین ہونا چاہئے تھا وہ کروڑوں اربوں ملک و قوم کا لوٹ کر اپنے بیرونی بینک اکاؤنٹس میں محفوظ کر لیتے ہیں اور ایک این آر او کے طفیل پھر سے اس ملک کے

خزانے پر خوب ہاتھ صاف کئے بلکہ ہر آنے والی حکومت سابقہ حکمرانوں کے ملکی خزانے لوٹنے کے تاریخی ریکارڈ جب قوم کے سامنے رکھتی ہے تو سانس بند ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

میں جب کبھی ملک کی موجودہ صورتحال پر نظر دوڑاتا ہوں جہاں حاجیوں کی تعداد کے لحاظ سے پاکستان دنیا میں دوسرے نمبر پر اور عمرہ کرنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ہے جبکہ دنیا بھر میں ایمانداری کے انڈکس کے مطابق پاکستان کا 160 نمبر ہے، ورلڈ جسٹس پراجیکٹ کی سالانہ رپورٹ میں پاکستانی عدالتی نظام کو قانون کی حکمرانی کی پابندی کرنے والے ممالک میں سب سے نچلے نمبر 139 ممالک میں سے 130 ویں نمبر پر رکھا گیا ہے 1500 یونٹ کو 500 یونٹ لکھنے والا رشوت خور میٹر ریڈر، خالص گوشت کے پیسے وصول کر کہ ہڈیاں بھی ساتھ تول دینے والا قصائی دھڑلے سے کام کر رہے ہیں۔

خالص دودھ کا نعرہ لگا کر ملاوٹ کرنے والا دودھ فروش، بے گناہ کی ایف آئی آر میں دو مزید ہیروئین کی پڑیاں لکھنے والا انصاف پسند ایس ایچ او، گھر بیٹھ کر حاضری لگوا کر حکومت سے تنخواہ لینے والا مستقبل کی نسل کا معمار استاد، کم ناپ تول کر پورے دام لینے والا دوکاندار، 100 روپے کی رشوت لینے والا عام معمولی سا سپاہی، معمولی سی رقم کیلئے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے والا وکیل، سو روپے کے سودے میں دس روپے غائب کر دینے والا بچہ، آفیسر کیلئے رشوت میں سے اپنا حصہ لے جانے والا معمولی سا چپڑاسی، کھیل کے بین الاقوامی مقابلوں میچ فکسنگ کر کے ملک کا نام بدنام کرنے والا کھلاڑی بھی ہمارے ہاں ملے گا۔

ساری رات فلمیں دیکھ کر سوشل میڈیا پر واہیات اور جھوٹ پر مبنی پروپیگنڈے کو آگے بڑھانے والا اور فجر کو اللہ اکبر سنتے ہی سونے والا نوجوان، کروڑوں کے بجٹ میں غبن کر کے دس لاکھ کی سڑک بنانے والا ایم پی اے اور ایم این اے، لاکھوں غبن کر کے دس ہزار کے ہینڈ پمپ لگانے والا جابر ٹھیکدار، ہزاروں کا غبن کر کے چند سو میں ایک نالی پکی کرنے والا ضمیر فروش کونسلر، غلہ اگانے کیلئے بھاری بھر کم سود پہ قرض دینے والا ظالم چودھری، زمین کے حساب کتاب و پیمائش میں کمی بیشی کر کے اپنے بیٹے کو حرام مال کا مالک بنانے والا پٹواری اور ریونیو آفیسر سینہ پھلائے اپنے دھندے میں مصروف ہیں۔

ادویات اور لیبارٹری ٹیسٹ پر کمیشن کے طور پر عمرہ کرنے والے ڈاکٹر، اپنے قلم کو بیچ کر پیسہ کمانے والا صحافی، منبر رسول پر بیٹھ کر دین کے نام پر چندے اور نذرانے والے مولوی اور پیر صاحبان۔۔۔۔۔ جب ہر کوئی کشتی میں اپنے حصے کا سوراخ کر رہا ہو تو پھر یہ نہیں کہنا چاہئے کہ "فلاں کا سوراخ میرے سے بڑا تھا، اس لئے کشتی دوب گئی!" سبھی قصوروار ہیں اور ہر کوئی سوشل میڈیا کو بغیر تحقیق کے بے تحاشہ استعمال کر کے خود کو بری الذمہ سمجھتا ہے اس دور میں اگر ہم پرنئے اور پرانے پاکستان کی گردان کرنے والے سیاستدان مسلط ہیں، ہمارے اعمال کی سزا نہیں تو اور کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ اب ان حالات میں ملک کی بہتری کیلئے کیا کرنا چاہئے؟ بالآخر وہ کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے ہمارا ملک ایسے بے شمار ماہرین سے محروم ہوتا جا رہا ہے جو ایمانداری سے ملک کی خدمت کا جذبہ دل میں رکھتے ہیں۔

سودی نظام کو فی الفور ختم کئے بغیر ہم کبھی بھی فلاحی ریاست بنانے کے خواب کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ ہمارے ملکی آئین میں اسلام کے بارے میں شقیں

موجود ہیں مگر ہمارے حکمران آج تک سیکولر رہے ہیں اور سیکولرازم میں ملک کی نجات سمجھتے ہیں۔ دنیا کے سیکولر لیڈر ہمارے آئیڈیل ہیں اور سود جو خدا اور رسول ﷺ کے خلاف جنگ ہے، اسے ہم نے جائز قرار دے رکھا ہے اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ یعنی ہم اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں (العیاذ باللہ)۔ انہوں نے اس کی بھرپور تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ واقعی اس کے علاوہ اور کوئی علاج ممکن نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بظاہر ہمارے جو سیاسی لیڈر اسلام کا نام دن رات لیتے ہوئے نہیں تھکتے، ان کے اپنے سارے دھندے بینکوں کے ساتھ سودی کاروبار میں ملوث ہیں اور قومی ٹیکس بچانے کیلئے اور اپنی سخاوت کے اظہار کیلئے انہی کاروبار سے کچھ خیراتی ادارے بھی رواں دواں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شائد اس طرح جہاں خلقِ خدا کے دل جیتے جاسکتے ہیں اسی طرح خالق کو بھی راضی کر کے اس کی جنت کے حق دار ٹھہریں گے۔

بات گداگر کی ہو رہی تھی اور آپ کو معلوم نہیں کہ کوئی کیوں گداگر ہے؟ ایک عورت کیوں طوائف ہے؟ ہم عورت کو طوائف بناتے ہیں، لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اسے گرفتار کر لیتے ہیں کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہے اور اس کی سزا سنگساری ہے۔ میں جب بھی پاکستان جاتا ہوں تو مختلف ٹریفک لائٹس پر جو لڑکا اخبار بیچ رہا ہے، اس کی محنت سے خوش ہو کر اخبار لے لیتا ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے ہاتھ کو خالی نہ جانے دیں۔ کیا یہی کچھ کم ہے کہ وہ ہاتھ آپ کا نہیں، کسی دوسرے کا ہے اور آپ دینے والے ہیں لینے والے نہیں!

نیا اسلامی سال شروع ہو گیا ہے، آیئے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر ملک سے سودی نظام کے خاتمے کی نہ صرف دعا مانگیں بلکہ اس قبیح فعل پر گڑگڑا کر توبہ واستغفار بھی کریں نجانے کون سے پل کسی ایک کی دعا پاکستان کی تقدیر بدل کر رکھ دے۔

بروز بدھ 11 محرم الحرام 1446ھ 17 جولائی 2024ء

واپسی کا سفر

ہر صبح سوشل میڈیا اور سینکڑوں ای میل اور خطوط ایسے بھی ملتے ہیں جس میں قارئین اکثر خاصے غصے میں جھنجلائے پاکستان کی سلامتی کے بارے میں بڑے پریشان کن سوال کرتے ہیں..... ٹیلیفون پر بہت دیر تک اس بات کی تکرار رہتی ہے کہ تم ہر وقت اس زخم خوردہ کا ماتم کرتے رہتے ہو۔ اس کے لٹ جانے کا منظر پیش کر کے خود تو پتہ نہیں روتے ہو کہ نہیں مگر ہمیں رلاتے رہتے ہو۔ کیا بات ہے کہ چند حروف تسلی کے یا چند امید بھری باتیں کیوں نہیں کرتے؟ یہ محبت بھری شکایات جب ان کو میری طرح مایوسی کے اس لق دق صحرا میں پریشان کرتی ہیں تو یہ جی بھر کر مجھ سے لڑتے جھگڑتے ہیں کہ عملدرآمد کب ہو گا اور اس پر کوئی کان بھی دھرے گا کہ نہیں؟ میں ان کے یہ تمام مطالبے سن چلو ٹھیک سہی مگر اس کا جو حل تم تجویز کر رہے ہو اس پر کر حیرت میں گم ہو جاتا ہوں کہ مدتوں جس شان و شوکت اور عظمت رفتہ کے لٹ جانے کا میں ماتم کر رہا ہوں، جن اقدار کی تباہی کا ہر روز نوحہ لکھتا ہوں اس کے اسباب کی نشاندہی بھی تو کرتا ہوں، ان کا اپنی عقل کے مطابق علاج بھی تجویز کرتا ہوں کہ اپنی انہی گم گشتہ اقدار کی طرف لوٹ جانے میں ہی ہماری عافیت ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ واپسی کا سفر کیسے ہو؟

ہم تو شاید بہت دور نکل آئے ہیں، زمانہ بھی بدل گیا ہے۔ اس دور کے تقاضے کچھ اور تھے اور اس دور کے مطالبے کچھ اور ہیں۔ اب سفر کیلئے گھوڑوں اونٹوں کی بجائے سپر سانک جہاز اور تلوار کی بجائے خطرناک قسم کے ایٹمی ہتھیار میدان میں آ گئے ہیں، بغیر پائلٹ کے میزائل برسانے والے ڈرون جہاز آ گئے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے جواب ہیں جو ان اقدار کی طرف جانے سے گریز کرتے ہیں لیکن میں اس وقت حیران ہو جاتا ہوں کہ عدل و انصاف قائم کرنے کیلئے ایسے کون سے ایٹمی ہتھیاروں، میزائلوں کی ضرورت ہے؟ عدل تو ایک درخت کے نیچے ننگی زمین پر بیٹھ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

انصاف کے وعدوں کو پورا کرنے کیلئے کسی جدید کمپیوٹر یا کسی ایسے آلے کی بھی ضرورت نہیں۔ عہد، قول اور وعدہ تو صدیوں سے قوموں کی دیانت اور غیرت کی پہچان رہا ہے اور سچ بولنے کیلئے کسی ایسے سائنسی جدید آلات اور ٹیکنالوجی کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ تو انسانوں کے بیدار ضمیر کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ وہ چاہے کسی مقام یا کسی بھی عہدے پر فائز ہوں، ان کو دھوکے، جھوٹ، دغابازی اور مکاری سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ تو سچ کے نشے میں اس قدر مست ہوتے ہیں کہ دھوکے، جھوٹ، دغابازی اور مکاری کی ترشی بھی ان کے قریب تک نہیں پھٹکتی۔ وہ تو سچ کے سحر میں اس قدر گرفتار ہوتے ہیں کہ اس کیلئے اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ بڑے سے بڑا نقصان اور ہزیمت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ سب کچھ غربت، تنگدستی اور کسمپرسی کی حالت میں بھی ہو سکتا ہے۔ کسی ایم آئی ایف یا عالمی بینک کی مدد درکار نہیں ہوتی۔

جب سے یہ اقدار ہمارے ہاں متروک ہوئی ہیں اس وقت سے ذلت اور رسوائی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ یہ تو وہ اقدار تھیں جن کی وجہ سے اس امت پر رحمتوں اور برکتوں کا سایہ اور دوسری قوموں کے دلوں پر ہیبت، رعب اور دبدبہ چھایا ہوا تھا۔ غیر مسلم دانشور بھی یہ بات لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ اسلام میں اگر ایک اور عمر ہوتا تو ساری دنیا پر اسلام کا نظام عدل قائم ہو جاتا۔ مغربی دنیا کا یہ دانشور ایک مشہور عیسائی خانوادے سے تعلق کے باوجود اپنی کتاب "بڑے آدمی" میں پہلا مقام سیدنا محمد ﷺ، دوسرا مقام سیدنا حضرت عمر اور تیسرا مقام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دینے پر مجبور ہو گیا۔

روم کا سفیر مدینے کی گلیوں میں اس نظام عدل کو قائم کرنے والے بادشاہ کے بارے میں استفسار کر رہا تھا تو اس کو بتایا گیا کہ ہمارے ہاں تو کوئی بادشاہ نہیں مگر ایک آدمی کو ہم نے اپنا منتظم مقرر کر رکھا ہے۔ اگر اس سے ملنے کی خواہش ہے تو وہ سامنے درخت کے نیچے ایک پتھر پر سر رکھے سو رہا ہے۔ ہر قسم

کے خطرات سے بے پرواہ چند گھڑیوں کیلئے آرام کرنے والے کے چہرے کی طرف دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھا کہ یقیناً اس عادلانہ نظام کی بدولت دنیا کی قیادت وسیادت ان کا حق ہے۔ حالانکہ یہ تو وہی عرب تھے جن کے بارے میں ایران کے بادشاہ نے بڑے تمسخر کے ساتھ کہا تھا کہ "اے عرب کے جاہل اور گنوار بدوؤں! کیا تم وہی نہیں ہو کہ جب تم کبھی کوئی شور وغوغا کرتے تھے تو ہم صرف اپنے چند سرحدی محافظوں کو کہتے کہ تمہارا دماغ درست کر دیں تو تم فوری دبک کر اپنے صحرائی خیموں میں چھپ جاتے۔ شاعر فردوسی نے اس منظر کو اپنے شاہنامہ میں اس طرح محفوظ کیا ہے:

شیر شتر خوردن سوسمار

عرب را بجائے رسید است وکار

کہ تخت کیہاں را کنند آرزو

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اونٹنی کا دودھ پینے اور جنگلی گوہ کا گوشت کھانے والو عربو! تم کو کیا سوجھی کہ تم ایران کے تخت کی آرزو کرنے لگ گئے ہو۔ کیا منظر ہے یہ اے آسماں، تم پر تفو ہے۔

لیکن کیا کبھی کسی نے یہ سوچا ہے کہ ان جاہل، گنوار اور صحرانشیں بدوؤں کی حالت کس سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی نے بدلی تھی۔ ترقی اور ٹیکنالوجی تو اس وقت بھی اپنے زمانے کے مطابق اپنے عروج پر تھی۔ وہ جو اہرام مصر کی پیمائشوں اور تقویمی گرہوں کو کھولتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان اس وقت بھی الجبرا اور سائنس کی معراج پر تھا۔ روم اپنی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ ایران کے دربار کی شان وشوکت اور تزک واحتشام دیکھنے کے لائق تھا۔ بابل اور نینوا کے معلق باغات اور محلات کے پر شکوہ تذکرے اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ پھر ایسا کیا تھا کہ میرے رب نے اس دنیا کی قیادت وسیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں سونپ دی جن کے گال بھوک کی وجہ سے پچک اور پیٹ کمر کے ساتھ لگ گئے تھے، جن کو تلواروں کے نیام تک میسر نہیں تھی اور پرانے چیتھڑوں سے ان تلواروں کو ڈھانک کر رکھتے تھے۔ وہ کیا صفات تھیں کہ ان کے ہاتھوں میں صرف سیاسی نہیں بلکہ دنیا کی علمی اور سائنسی قیادت بھی آگئی۔

وہ جن کے شہر اور شہری سہولیات ساری دنیا کیلئے ایک نمونہ بن گئیں۔ دنیا کو اس وقت معلوم ہوا کہ گلیاں اور سڑکیں پکی اینٹوں اور پتھروں سے کس طرح بنائی جاتی ہیں۔ حمام میں گرم پانی بھی ہوتا ہے، گلیوں میں رات گئے چراغ بھی روشن کئے جاتے ہیں تاکہ راہگیروں کو رات چلنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ وہ جو فلکی سیاروں کی چالوں کیلئے رصد گاہوں کے امین بنے، جو الجبرا، فزکس، کیمسٹری اور طب کے امام ٹھہرے اور آج کی تمام سائنسی ترقی میں ان کے ایجاد کئے فارمولے ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر کئی صدیوں تک ان کا راج بھی رہا، کیا یہ سب دنیا کے کسی بھی مروجہ سائنسی اور تہذیبی اصولوں کے تحت ممکن ہوا تھا۔

ایسے ہی ایک قوم منگولیا کے ریگستانوں سے اٹھی تھی، چنگیز خان نے اس قوم کے چند قبیلوں کو متحد کیا تھا اور پھر یہ قوم طوفان کی طرح اس پورے علاقے کو روندتی ہوئی گزر گئی لیکن آج اس قوم کا تاریخ میں ظلم، بربریت کی داستانوں کے علاوہ کوئی ذکر نہیں ملتا اور ساری دنیا میں ایک نفرت کی علامت کے علاوہ کچھ بھی ان کے حصے میں نہیں ہے مگر عرب کے ان جاہل، گنوار اور ان پڑھ بدوؤں نے ایسا کیا کمال کر دیا تھا کہ دنیا کا کوئی بھی مؤرخ عصبیت کے باوجود آج بھی ان کو فن تعمیر، فلسفہ، طب، خطاطی اور دوسرے بیسیوں علوم کا ماخذ، محقق اور استاد مانتا ہے۔ یہ سب کمال اور ہنر ان کے دروازوں پر کیوں

دستک دینے چلے آئے۔اس لئے کہ ان میں میرے پیارے ختمی الرسل محمد ﷺ کے تزکیے نے وہ خصوصیات پیدا کر دی تھیں جن کی بنیاد پر خالقِ کائنات مہربان ہوتا ہے۔

وہ اپنے مربی سے جن کو وہاں کا بچہ بچہ امین وصادق کے ناموں سے جانتا تھا، اپنے رب کا یہ فرمان سن کر کانپ اٹھے تھے کہ خبر دار! تمہیں کسی قبیلے کی محبت اس بات پر مجبور کر دے کہ تم انصاف کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دو۔ انہیں اس بات کا قوی یقین تھا کہ اگر ہم نے اس زمین پر اللہ کا بتایا ہوا نظام عدل قائم کر دیا تو وہ ہم پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کے خزانوں کی بارش کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر کے زمانے میں جب فتوحات کا دروازہ کھلا تو ایک معرکہ میں مال غنیمت کے اس قدر ڈھیر لگ گئے کہ اطراف میں بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان نعمتوں کو دیکھ کر خلیفہ ثانی حضرت عمر اور ان کے ساتھیوں نے رونا شروع کر دیا کہ کہیں آخرت کی نعمتوں کی بارش دنیا میں تو نہیں شروع ہو گئی۔

انہوں نے اپنے آقا و مربی ختمی الرسل محمد ﷺ سے سن رکھا تھا کہ مومن بدکار ہو سکتا ہے، چور ہو سکتا ہے کہ گناہ اس سے سرزد ہو جائیں لیکن مومن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنے آقا و مربی ختمی الرسل محمد ﷺ سے یہ بھی سن رکھا تھا کہ جب ایک شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس کے جسم سے ایک ایسی بدبو نکلتی ہے کہ رحمت کے فرشتے اس سے کئی فرسنگ دور بھاگ جاتے ہیں۔ یہی سچ بولنے کی صفت نے اس دور کی تاریخ میں لوگوں میں اعتراف جرم کی یہ جرأت پیدا کی انہوں نے خود زنا کے جرم کا اقرار کیا اور سزا کیلئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ انہیں اپنے وعدوں کا پاس تھا کہ ان کا رب ان سے یہ کہتا ہے کہ تم سے تمہارے وعدوں کے بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ یہ وہ کمال تھا جو میرے پیارے ختمی الرسل محمد ﷺ نے ان کی زندگیوں میں پیدا کیا تھا۔

انہیں یہ بھی واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ اس امت پر ہی نہیں بلکہ اس پوری دنیا کی ترقی کی بنیاد ہی ان تین ستونوں پر رکھی ہوئی ہے۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیں کہ کیا میرا ماتم اور میرے نالے درست نہیں کہ اپنی انہی گم گشتہ اقدار کی طرف لوٹ جانے میں ہی ہماری عافیت ہے؟

ہم گلیوں، بازاروں، حلف اٹھا کر عدالتوں، اسمبلیوں اور اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھ کر کس دھڑلے سے ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں اور جھوٹی گواہیاں دیکر امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ کیا ساری دنیا کے سامنے ہم زبانی اور تحریری وعدے کر کے پوری مکاری کے ساتھ برملا یہ نہیں کہتے رہے کہ یہ کون سے قران وحدیث ہیں؟ کیا ہمارے ذمہ جو امانت سپرد کی گئی ہے کہ جب تم حکمران بنو تو عدل وانصاف کا نظام قائم کرو، اس میں کھلم کھلا خیانت نہیں کر رہے؟ ملک کی سب سے اعلیٰ عدالتوں کے منصفین کے احکام کی روگردانی کر کے عدل وانصاف کی بری طرح تضحیک کے مرتکب نہیں ہوئے؟ اس پر مستزاد کہ اعلیٰ عدلیہ کو دھوکہ دیتے ہوئے سوئس عدالتوں کو ملک و قوم کی لوٹی ہوئی دولت کی بابت خود ہی تمام مقدمات بند کرنے کا خط لکھ دیا گیا۔

قوم کو تو یہ عجب تماشہ بھی یاد ہے کہ جب یہاں کی مفلوک الحال قوم سیلاب کی تباہ کاریوں میں مبتلا تھی تو قوم کا سربراہ صدر زرداری اپنے بچوں کو لیکر تفریح کیلئے پیرس کے انتہائی خوشگوار اور شاندار موسم میں عالمی شہرت یافتہ شاہراہ "شانزے لیزے" میں گھوم رہا تھا، فرانس کے عجائب گھر، کھنڈرات

سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور فرانسیسی حکومت کی میزبانی کے مزے لوٹ رہا تھا اور بالآخر برطانیہ کے بے مقصد دورے میں اپنے ہی ایک جیالے کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہو گیا لیکن قوم ایسے سسٹم میں گرفتار ہے کہ آج ایک مرتبہ پھر آزمودہ صدر پھر سے اسی عہدے پر براجمان ہیں۔

دو قومی نظریہ کی بنیاد پر حاصل کردہ معجزاتی ریاست کا ازلی دشمن بھارت کا اعلیٰ افسر جب اپنی عدالت عالیہ میں اپنی ہی ریاست کے بارے میں حلفیہ اقرار کر رہا ہے کہ بھارتی پارلیمنٹ اور ممبئی حملوں میں خود بھارتی حکومت ملوث تھی اور ہمارے اسی میڈیا پر بیٹھے کچھ ننگ دیں اور وطن فروش اینکر میڈیا پر نہ صرف بھارت کی وکالت کر رہا تھا بلکہ اب بھی وہ انتہائی بے شرمی کے ساتھ پاکستانی اداروں پر الزام تراشی کر کے اب بھی خود کو محب وطن کا علم تھامے قوم کو بھاشن دیتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود آپ اپنے لئے کس منہ سے عزت و کامرانی کا حق مانگتے ہیں؟ جب تک آپ یہ سب کچھ نہیں بدلتے، اس نام نہاد میڈیا گروپ کا بائیکاٹ نہیں کرتے اور اس نظریاتی ریاست کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈہ سے توبہ نہیں کرتے تو میرے رب کی رحمت کے فرشتے اس جھوٹ سے تو کئی فرسنگ دور بھاگ گئے ہیں۔

یاد رکھیں ہماری ذلت و رسوائی اس وقت ختم نہیں ہو سکتی جب تک ہم واپسی کا سفر شروع نہیں کرتے۔ اس کا تو وعدہ ہے کہ تم نے اگر ایفائے عہد نہ کیا تو دنیا کی رذیل قوموں سے رسوا ہو جاؤ گے۔ آج اگر ہم اپنے اس وطن کی مٹی سے وفاداری کا حق بھول گئے ہیں تو گویا پھر ہم اپنے آقا کی پہچان بھی بھول چکے ہیں جس نے ہمیں ماہِ رمضان کی مبارک شب قدر کو یہ پاک وطن عطا فرمایا تھا۔ آج ہم دنیا میں جو ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں، کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ ہمارا آقا جو ساری دنیا کا خالق و رازق ہے، جو دنیا و آخرت کے تمام خزائن کا مالک ہے، اس سے مانگنے کی بجائے ہم آئی ایم ایف اور عالمی اداروں کی تمام شرائط کو بلا چون و چرا مان کر بھیک کا کشکول اٹھائے در بدر ہو رہے ہیں اور اپنی حکومت کو سہارا دینے کیلئے امریکا اور بھارت کی غلامی کیلئے تن من دھن داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں اور دوسری طرف ایک سیاسی جماعت اپنے لیڈر کو جیل سے رہائی دلوانے کیلئے اسی ملک کے در پر سوالی بن کر پہنچ جاتے ہیں جن پر پورا منہ کھول کر اپنی حکومت کو گرانے کا الزام لگاتے رہے، کبھی ملک کے خلاف عالمی مالیاتی اداروں کو خطوط لکھے گئے اور اب باقاعدہ ملک میں دہشتگردوں کے خلاف آپریشن کی مخالفت میں برملا قوم کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اب اسی امریکا نے آپریشن کو روکنے کیلئے کھلم کھلا دباؤ ڈالنے کیلئے پاکستان میں ہونے والے انتخابات کے خلاف قرارداد منظور کر کے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا ہے اور وہ جماعت جس کے لیڈر کی رہائی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو امریکا کو للکار کر کہتا تھا کہ ہم کسی کے غلام نہیں تو آج اس مکافاتِ عمل کے بعد کہاں کھڑے ہیں۔

پھر ایسے سیاستدان کو کیا کہیں گے جو خود کو عالمِ دین، مفتی اور ایک دینی جماعت کے سربراہ بھی ہیں، جو برسوں سے عمران خان کو یہودیوں کا ایجنٹ کہہ کر مخاطب کرتے رہے اور عمران خان بھی مولانا کی تذلیل کیلئے مختلف عنوانات سے اپنے جلسوں میں للکارتے رہے اور آج ان دنوں ایک دوسرے کو گلے لگانے کیلئے بیتاب ہیں۔ کیا یہ اس وقت جھوٹ بول رہے تھے یا اب جھوٹ کا سہارا لیکر شیر و شکر ہو رہے ہیں۔ یہ بھی مکافاتِ عمل ہے کہ قدرت نے ان سب کے چہروں کے تمام نقابوں کو تار تار کر دیا ہے لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ روزِ جزا کے دن جب کوئی بھی فرد ایک قدم تک نہیں ہلا سکے گا جب تک وہ اپنے منہ سے نکلے ہر لفظ کا حساب نہیں دے گا تو اس وقت یہ کیا جواب دیں گے۔

کچھ تو سمٹو کہ نظر ہم بھی اٹھا کر دیکھیں
ہم کو اے جلوۂ بے باک حیا آتی ہے

بروز جمعۃ المبارک 13 محرم الحرام 1446ھ 19 جولائی 2024ء

قرآن کا فلسفہ اور سائنس کی ترویج

اسلام کی اثر آفرینیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس نے جہاں توحید کے اسرار فاش کیے ہیں، عظمتِ انسانی کا پرچم لہرایا ہے، اخلاق و سیر کے گوشوں کو پاکیزگی عطا کی ہے، جہاں دلوں میں محبت الٰہی کی شمعوں کو روشن کیا ہے اور ایسے پاکیزہ اور ایسے اونچے معاشرہ کی تخلیق کی ہے کہ جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے وہاں مذاہب عالم پر اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے فکر و تعمق کے دواعی کو اکسایا ہے، عقل و خرد کے اجالوں کو عام کیا ہے اور دنیا کے تیرہ و تاریک افق پر استدالال و استنباط کے نئے نئے آفتاب ابھارے ہیں۔

کیا یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے کہ بادیہ نشینانِ عرب تھوڑے ہی عرصے میں تہذیب و تمدن کے فرازِ اعلیٰ پر فائز ہو جائیں، حکمت و دانش کے افسردہ میکدوں میں پھر سے جان ڈال دیں اور علوم و فنون کے اجڑے ہوئے دریا میں چہل پہل پیدا کر دیں، اور کیا یہ امر تعجب خیز نہیں کہ عرب کی اُمی اور ناآشنائے حرف قوم دیکھتے ہی دیکھتے فلسفہ و حکمت کے تخت دادرنگ پر تسلط جمالے اور نہ صرف یونانیوں کے بادہ فکر و اندیشہ سے تشنہ کامان ادراک کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے بلکہ اس کے جرعوں میں کیف و ذوق کی ان سرمستیوں کا بھی اضافہ کر دے جو اسلام کی دعوت عرفاں کے ساتھ خاص ہیں۔

ہماری رائے میں یہ محیر العقول انقلاب نتیجہ ہے قرآن حکیم کی ان تعلیمات کا جن سے تحقیق و تجسس کی روح بیدار ہوئی اور یہ تبدیلی اور عظیم تغیر مرہون منت ہے اس وحی کا جس کا حرف آغاز "اقراء" ہے۔ قرآن حکیم نے کیوں کر مسلمانوں میں خالص علمی ذوق کی پرورش کی اور کس طرح ان کے اسلوب فکر کو سائنس اور فلسفہ کے حسین سانچوں میں ڈھالا؟ اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب تلاش کرنے کیلئے ہمیں ان چار نکات پر غور کرنا ہو گا۔

1۔ قرآن حکیم نے اس عالم ہست و بود کی معروضیت کو واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا۔ زندگی کو احترام کی نظر سے دیکھا اور بتایا کہ مسلمان کا نصب العین دنیا و آخرت کے حسن اور نکھار سے بہرہ ور ہونا ہے۔

2۔ اس کتاب ہدیٰ نے اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا کہ اس کائنات میں جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے نظام و قاعدہ کی استواریاں پائی جاتی ہیں، اور اس کی تخلیق میں متعین غرض و غایت پنہاں ہے۔

3۔ اسی صحیفہ مبارکہ نے پہلے پہل اور ہمیشہ کیلئے اس مغالطہ کو دور کر دیا کہ دین اور عقل و خرد کے تقاضوں میں تضاد رونما ہے۔

4۔ اور یہ بھی اسی کتاب کا اعجاز ہے کہ اس نے فکر و استدالال کی ان راہوں کی طرف رہنمائی کی جنہیں ہم منطق کی اصطلاح میں استقرار کہتے ہیں۔

اس کائنات کی نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ خوب صورت آسمان، یہ ہرے بھرے اشجار، یہ سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے دریا، یہ ٹھوس پتھر اور ایستادہ پہاڑ حقیقی وجود سے بہرہ یاب ہیں یا ان کا وجود محض باطل اور نظر و خیال کی سیمیائی ہے؟ اس بارے میں ارباب فلسفہ و مذہب میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن علوم و فنون کی پرورش وارتقاء سے متعلق دو بالکل ہی متضاد نظریے دنیا میں رائج رہے ہیں۔ اگر کائنات موجود ہے اور یہ عالم ہست و بود وجود خارجی سے متصف ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے فکر و نظر کا صحیح اسلوب اختیار کیا ہے اور علوم و فنون کی نشاط و آفرینیوں اور تہذیب و تمدن کی نقش آرائیوں کیلئے وجہ جواز ڈھونڈ لینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اگر اس عالم کی حقیقتیں صرف تصور یا صورت کا کرشمہ ہیں یا ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے زندگی کی اہمیتوں کو گھٹایا ہے، اس کی غرض و غایت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے اور ایسی راہبانہ اور غیر عمرانی زندگی کی حوصلہ افزائی کی ہے جس سے انسانیت کو بجز قنوط اور مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔

نفی وایجاب کے یہ دونوں راستے نہ صرف جدا جدا ہیں بلکہ دونوں مختلف منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایجاب کے معنی زندگی کی گہما گہمی اور ارتقاء کے ہیں۔ علم وفن کے فروغ کے ہیں۔ آگے بڑھنے اور کائنات کی ناہمواریوں پر قابو پانے اور اس کو اپنے دائرہ تسخیر میں لانے کے ہیں، اور نفی کا مطلب محرومی، یاس، قنوط اور جہل ونادانی یا جمود و پسماندگی کو اپنانا ہے۔

اس بنا پر اسلام نے اس عالم آب وگل کو اگر تسلیم کیا ہے تو اس کے معنی صرف یہاں کی ابھرتی ہوئی اور نمایاں ومحسوس حقیقتوں کو مان لینے ہی کے نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے انسانی علم وبصیرت پر پورے پورے اعتماد کا اظہار کیا ہے اور فکر ونظر کا ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جس کی یقین افروزی کسی تشکیک کی متحمل نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام نے کائنات کی معروضی حیثیت کو مان کر اس اساس اور بنیاد کی نشاندہی کی ہے کہ جس پر آگے چل کر انسانی فکر وتجربہ کے غرفے استوار ہوتے ہیں۔

یونانی حکما کی اکثریت اس عالم رنگ وبو کو مانتی تھی ان میں استخوانِ نزاع صرف یہ دو باتیں تھیں کہ اس کی ترکیب وساخت میں کن عناصر کو دخل ہے یا یہ کہ یہ عالم، ساکن وراکد ہے یا متحرک۔ افلاطون ان میں پہلا شخص ہے جس نے اس مسلمہ سے انحراف اختیار کیا اور بحث ونزاع کے اس دھارے کو ڈھائی سو سال کے بعد اس نقطہ کی طرف موڑ دیا کہ جس عالم مادی کی ترکیب وساخت کے بارے میں اب تک میدان مناظرہ گرم رہا۔ اس کے متعلق سوچنے کی بات دراصل یہ ہے کہ آیا یہ عالم حقیقی عالم بھی ہے یا نہیں، افلاطون کے نزدیک یہ دنیا حقیقی دنیا کا محض عکس یا مثنی ہے اور وہ حقیقی، مکمل اور غیر متغیر دنیا صرف تصور یا صورت کی جلوہ گری سے تعبیر ہے۔ افلاطون کا اشکال دراصل اس عالم کی ناہمواریوں پر مبنی ہے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ یہاں نقص یا شر ہی کا دور دورہ ہے، زلزلوں کی تباہ کاریاں اور تغیر وفنا کی ہولناکیاں ہیں تو وہ ایسے عالم کو حقیقی عالم ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ اس نقص یا شر کو ڈیمی ارج کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ جس نے ان تصورات کاملہ اور نصب العینی صور کو مادہ میں مرتسم کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یہ نقص مادہ کا ہے۔ اس کی صلاحیت قبول وپذیرائی کا ہے کہ ان کامل تصورات کو پوری طرح اپنا نہیں سکا ہے۔ افلاطون نے کائنات کی اس تعبیر سے گو تصوریت کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر اس عالم مادی کی مکمل نفی پر منتج ہوئی تاہم اتنا غنیمت ہے کہ اس نے ایک صورت گر ازلی اور مادہ کے وجود کو بہر حال تسلیم کیا۔

عیسائیت نے جب اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مذہبی اذعانیات کو عقل وخرد کی روشنی میں پیش کیا جائے تو اسے افلاطون کے نظریات اور پلاٹینیوس کی تشریح، پذیرائی کیلئے زیادہ موزوں معلوم ہوئی، جن میں تصور یا روح کو قدرتاً فوقیت وامتیاز حاصل ہے اور جسم کی حیثیت ایسی برائی یا رکاوٹ کی ہے جو قلب وروح کی پرواز اور ترقیامت میں حائل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک ایک شخص جسم کے تقاضوں سے رستگاری حاصل نہیں کر لیتا اور جسمانی خواہشوں اور ولولوں سے دامن کشاں نہیں رہتا اس وقت تک نجات کے استحقاق سے محروم رہتا ہے ظاہر ہے یہ طرز فکر سراسر زندگی کی ٹھوس اور ضروری حقیقتوں سے گریز اور فرار پر مبنی ہے اور سوچنے کے اس نہج کا منطقی نتیجہ ہے جس کو افلاطون اور اس کے شارح پلاٹینیوس کے تتبع میں عیسائیت نے اختیار کیا۔

اگر کائنات کے مظاہر معروضیت سے متصف ہیں تو پھر جسم بھی معروضی ہے اور اس کے تقاضے بھی اپنی آغوش میں معروضیت لیے ہوئے ہیں اور اس بنیاد پر اگر غور کیجیے تو ان تقاضوں اور خواہشوں کی پرورش اور ارتقاء کا مسئلہ بھی بجائے حسیت کے حقیقت نگری قرار پاتا ہے۔ اس بارے میں فیصلہ کن

نکتہ دراصل یہ ہے کہ کوئی بھی عمل، یاتگ و پو کی کوئی بھی صورت حتیٰ کہ مجاہدہ اور ریاضت بھی ان معنوں میں روحانی نہیں ہے کہ اس میں قطعاً جسم کا حصہ نہیں ہے، خواہش و تمنا کی کار فرمائی نہیں ہے، ہمارے نزدیک کسی عمل یا فعل میں، جو بہر حال جسمانی ہی ہوتا ہے۔ روحانیت کا عنصر اس وقت ابھرتا ہے جب آپ اس کو ان محرکات نفسی کی بناء پر اختیار کرتے یا انجام دیتے ہیں جو کسی عظیم نصب العین یا کسی بلند قدر سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جب یہ فعل یا عمل ذاتی منفعت کی سطح سے اونچا ہو کر کسی آفاقی یا انسانی مطح نظر سے ہمقراں ہوتا ہے، ورنہ کوئی فعل یا عمل اپنے روپ میں روحانی یا غیر روحانی نہیں ہوتا۔ عمل و فعل کی یہ ثنویت اس غلط مفروضے پر مبنی ہے کہ انسان جسم و روح کی دو متضاد حقیقتوں سے ترکیب پذیر ہے حالانکہ جسم و روح دو علیحدہ علیحدہ اور مخالف چیزوں کا نام نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت انسانی کے دو پہلو ہیں دو پرتو ہیں۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ انسان کے سوچنے اور عمل کرنے کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح کو ہم روحانی کہتے ہیں اور ایک جسمانی۔

عالم ومافیہ کو غیر حقیقی قرار دینے کی دوسری واضح مثال ہمیں ہندو اصول "مایا" میں ملتی ہے جس کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ یہ دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ دھوکہ ہے اور ہرگز اس لائق نہیں کہ انسان یہاں رہے. یہاں کی دلچسپیوں سے دل بہلائے یا تہذیب و تمدن کی طرفہ طرازیوں کو شائستہ اعتناء سمجھے۔ "مایا" کے اس منفی فلسفہ نے زندگی کے کارزار میں اپج، جرات اور تخلیق واختراع کی نشاط آفرینیوں سے ہندوؤں کو کس درجہ محروم رکھا، یہ صرف تاریخ ہی کا مسئلہ نہیں زمانہ حال کا اشکال بھی ہے کیونکہ اس کی تہہ میں سوال یہ پوشیدہ ہے کہ آیا عالم کے بارے میں یہ غیر سائنسی اور غیر ہمدردانہ نقطہ نظر انسانوں میں تحقیق و تجسس کی روح بیدار کر سکتا ہے اور اس کائنات سے متعلق اس گہرے لگاؤ، عمیق توجہ اور مبنی بر کاوش التفات کو پیدا کر سکتا جو علم و عرفان کیلئے بمنزلہ اوّلیں شرط کے ہے۔ رادھا کرشنن نے "ایسٹرن ریلیجنز اینڈ ویسٹرن تھاٹ" میں اعتراض کے اس تیکھے پن کو محسوس کیا ہے اور جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے جواب کی نوعیت سے ڈاکٹر شویزر کی تسکین ہوتی ہے یا نہیں۔

مایا کی اس فلسفیانہ اور متصوفانہ تعبیر سے صرف یہ بات سمجھ پائے ہیں کہ ہندو اہل فکر نے مغربی تہذیب کے زیر اثر اس خلیج کو بالآخر محسوس کر ہی لیا ہے، جو زندگی کے تقاضوں اور زندگی کی نفی کے مابین حائل ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس خلیج کی نشاندہی سب سے پہلے اسلام نے کی لیکن اس وقت نہ عیسائی اقوام نے اس پر غور کیا اور نہ ہندو فلسفہ نے "مایا" کی اس نئی تعبیر و تشریح کی ضرورت سمجھی۔ لیکن اب جبکہ زمانہ کے ارتقاء نے دونوں کو زندگی کی شور شوں میں دھکیل دیا ہے۔ دونوں ہی جان گئے ہیں کہ رہبانیت اور "مایا" کا فلسفہ موجودہ زمانہ میں چلنے والا نہیں۔

یہ جان لینے کے بعد کہ کائنات کی معروضی حیثیت تسلیم کر لینے سے کیونکر سائنسی ذہن اور مزاج پیدا ہوتا ہے اور اس نقطہ نظر کو اپنا لینے سے تہذیب و تمدن کے مختلف گوشوں میں کس درجہ دوررس اور خوشگوار تبدیلیاں معرض وجود میں آتی ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کس کس اسلوب سے بیان کیا ہے:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهمَا وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاء كُلَّ شَئْ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (انبیاء:30)

کیا کافروں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے جلے تھے ہم نے ان دونوں کو جدا جدا کر دیا اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں کیا اس پر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

(2) خَلَقَ اللّٰه السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضَ بِالْحَقِّ انَّ فِيْ ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ(عنکبوت:44)

"خدا نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا اور اس میں یقیناً صاحب ایمان لوگوں کیلئے نشانی ہے۔"

(3)أَ فَلَايَنظُرُونَ اِلَى الْابِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ، وَالَى السَّمَاءكَيْفَ رُفِعَتْ،وَالَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ،وَالَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ(غاشیہ:71-20)

کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے عجیب روپ میں ان کو پیدا کیا گیا ہے اور آسمانوں کی طرف نظر نہیں دوڑاتے کہ کیسا بلند کیا گیا ہے، اور پہاڑوں کے بارے میں نہیں سوچتے کہ کس طرح استادہ کیے گئے ہیں اور زمین پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح اس کو ان کے پاؤں تلے بچھایا گیا ہے۔

(4)وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاء الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ(ملک:59)

"اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو ستاروں کے چراغوں سے زینت بخشی۔"

(5)فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ(الشوریٰ:11)

"آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔"

سورہ نحل میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ کائنات کو معروضیت کے لباس سے آراستہ کرنا، اور تخلیق و اختراع کے خلعت سے نوازنا ہی تو وہ صفت ہے جس کی وجہ سے ہمیں اپنی تمام مخلوق سے امتیاز حاصل ہے۔

(6)أَ فَمَن يَخْلُقُ كَمَن لاَّ يَخْلُقُ

"کیا جو تخلیق و ابداع سے کام لیتا ہے وہ ایسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے۔"

تخلیق عالم کیلئے قرآن حکیم نے جو پیرایہ بیان اور الفاظ بیان کیے ہیں، ان سے ان تمام تصورات کی نفی ہو جاتی ہے کہ جن کو تصوریت نے جنم دیا ہے ۔ دوسرا نقطہ بھی کچھ کم اہم نہیں اگر یہ عالم، بخت و اتفاق کا کرشمہ نہیں بلکہ اس کو حکیم و دانا خدا نے بنایا ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس میں نظم و ترتیب ہو۔ قاعدہ اور قانون ہو اور اس کو اس نہج سے ڈھالا جائے کہ انسان اس سے پورا پورا استفادہ کر سکے۔

جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اس نے کائنات کے بارے میں بار بار اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ اس کارگاہ حسن میں کہیں بھی بھونڈا پن یا نقص نہیں۔ کہیں بھی نظم و ترتیب کی کوتاہیاں نہیں۔ یہاں ہر چیز کا ایک انداز ہے اور ہر شے قرینہ اور ڈھنگ کی آئینہ دار ہے۔

قرآن حکیم اس عالم کو انسانی اغراض و مفادات کے منافی قرار نہیں دیتا۔ اس کو معاند اور غیر ہم آہنگ نہیں مانتا بلکہ اس کو اس لائق ٹھہراتا ہے کہ انسان یہاں رہ سکے۔ اس کی نشاط آفرینیوں میں شریک ہو سکے اور اس کے حسن اور نکھار سے ذوق و کردار کی زلف دوتا کو سنوار سکے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہنا چاہیے کہ اس کے اندر پنہاں ان جاری و ساری قوانین کو جان سکے، اور ان کو معاشرہ کی بہتری اور بہبود کیلئے استعمال کر سکے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سائنس کو فی نفسہ غرض و غایت سے کوئی سروکار نہیں اس کا موضوع بحث تو صرف یہ ہے کہ یہ مادہ کے مضمرات ارتقاء کو معلوم کر سکے اور اس علم کی روشنی میں تجربہ و آگاہی کے مزید قدم اٹھا سکے۔ حدود و بحث میں الجھنے کی بجائے یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ خالص سائنسی نقطہ نظر سے یہ عالم کسی غرض و غایت کی طرف رہنمائی نہیں کرتا، یا یوں کہنا چاہیے اس بارے میں اس کی روشنی قطعاً غیر جانبدارانہ ہے۔ اس سے نہ تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ عالم بامقصد ہے، اور اس چیز کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ بامقصد نہیں ہے لیکن اگر فلسفیانہ نقطہ نظر سے دیکھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس عالم میں بغیر غرض و مقصد کو مانے اور بنا کسی غایت و معنی کے تسلیم کیے، مظاہر ہستی کی کوئی معقول توجیہ ممکن ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں دوٹوک سوال

یہ ہے کہ یہ عالم مادی کیوں قاعدہ قانون کی افادیتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ پانی کیوں پیاس بجھاتا ہے، کھانے سے کیوں سیری اور توانائی حاصل ہوتی ہے اور معدہ کی ترکیب وساخت کیوں اس وضع کی ہے کہ وہ کھانوں کو آسانی سے جزوبدن بنا سکے۔ اسی طرح عقاقیر اور جڑی بوٹیوں میں صحت بخشی کی صلاحیتیں کیوں مضمر ہیں۔ زیادہ واضح لفظوں میں جواب طلب یہ سوال ہے کہ یہ عالم اور اس کے تمام مشمولات بحیثیت مجموعی کیوں ان خصوصیات کے حامل ہیں کہ ان سے بو قلموں ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ کیا صرف یہ انسان کی تلاش اور دریافت کا نتیجہ ہے کہ اس نے ان اشیاء میں افادیت کے مختلف پہلوؤں کو ڈھونڈھ نکالا۔ یا افادیت کے یہ پہلو چونکہ پہلے سے اشیاء میں اللہ کی تدبیر وحکمت نے ودیعت کر رکھے تھے اس لیے ہماری طلب وجستجو کے نتیجے میں ہمیں معلوم ہوئے۔

ظاہر ہے تخلیق کا یہ انداز صاف صاف غمازی کرتا ہے کہ یہ عالم ہست وبود بغیر کسی حکمت وارادہ کے یونہی اس انداز کا نہیں بن گیا ہے کہ انسان یہاں کی سازگاریوں سے لطف اندوز ہو سکے اور یہاں کی ایک ایک چیز کو اپنی ضرورتوں کیلئے استعمال کر سکے یا یہ جانا بوجھا اور سوچا سمجھا ہوا نظام ہے جو انہی اغراض کے پیش نظر قائم کیا گیا ہے۔

ہم دراصل غایتی اسلوب فکر کی نمائندگی کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے اس عالم کے بارے میں جس نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے اس سے علم اور سائنس کے تقاضے کہیں زیادہ خوبی سے تکمیل پذیر ہوتے ہیں کیونکہ جب قرآن حکیم بار بار اس حقیقت کو بیان فرمائے گا کہ اس عالم کی ہر ہر شئے تمہارے لیے ہے حتی کہ یہ اتھاہ سمندر، وسیع وعریض زمین یہ تاباں اور فروزاں چاند وسورج اور یہ لیل ونہار کی تبدیلیاں اور گردشیں تمام تر تمہارے ہی فائدے کیلئے وقف ہیں تو اس اسلوب اظہار سے لامحالہ انسان کے دل میں ان سب کو جاننے کی شدید خواہش کروٹ لے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ غایتی طرز استدلال پر کچھ اعتراضات بھی وارد ہوتے ہیں چنانچہ ان میں سب سے زیادہ مشکل اور تیکھا سوال یہ ہے کہ اگر کائنات کا یہ مرقع کسی باکمال ذات کا نقش حسیں ہے تو اس میں مصیبت، ظلم، بیماری اور اندوہ وتشویش کے داغ دھبے کیوں نظر آتے ہیں یا پھر ایک فلسفی کے الفاظ میں اگر اس دبستان کا نصف حصہ فکر، ذوق، حسن اور عقل وہنر کے پھول بوٹوں سے آراستہ ہے تو دوسرے نصف حصے میں دشمنی، کینہ، بیماری اور حرص وآز کی عفونتوں کے ڈھیر کیوں پڑے ہیں؟

ہیوم نے اپنے مکالمات میں ایسی نوع کے اعتراضات پر تشکیک کا قصر رفیع تعمیر کیا ہے کہ خیر میں آخر شر کے پیوند کی کیا ضرورت تھی اور حسن وزیبائی کے ساتھ قبح وعیب کی نمائش کا کیا موقع تھا؟

افلاطون نے تو یہ کہہ کر سوال کی سنگینی سے پیچھا چھڑا لیا کہ یہ عالم جس پر تم اعتراض کر رہے ہو حقیقی کب ہے؟ یہ تو حقیقت کی بھونڈی تصویر ہے۔ حقیقی عالم تصورات یا صور کا ہے جو واقعی خوبصورت مکمل اور غیر متغیر ہے لیکن ہمارے لیے یہ مشکل ہے کہ جواب کی اس نوعیت پر اطمینان کا اظہار کر سکیں اس لیے کہ ہم تو قرآن کی رو سے اس عالم کی معروضیت کے پُرزور حامی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس اشکال سے نکلنے کی تین معقول صورتیں ہیں:

1- یا تو ہم کیٹس کے اس موقف کو تسلیم کر لیں کہ یہ عالم درحقیقت ایک درسگاہ ہے جہاں عملی تربیت دی جاتی ہے کہ ہم شر اور تضاد کی ناسازگاریوں کو

خیر و توافق کے سانچوں میں ڈھالنے کا فن سیکھیں۔ دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں جو تضاد و نقص پایا جاتا ہے وہ قدرت کے سہو و تغافل کا نتیجہ نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ ہماری عقل و دانش میں اضافہ ہو اور ہم یہ جان سکیں کہ ان پر قابو پانے کا کیا طریقہ ہے۔

2- یا معتزلہ کی زبان میں یوں کہیں کہ یہ عالم اپنی موجود شکل ہی میں بہترین ہے اور شر و نقص کا احساس محض اضافی ہے یعنی جزئیات کے ادھورے سے علم کی بناء پر ہے۔ اُس حکمت کی بناء پر نہیں جو ہمہ خیر اور خوبی ہے۔

3- اور یا پھر بدرجہ آخر اس نقطہ نظر کو مان لیں کہ اعتراض کی یہ نوعیت اس عالم سے متعلق ہے جو ہنوز معرض تعمیر میں ہیں یعنی اگر ارتقاء کا عمل جاری ہے اور اس عالم امکان کو ابھی اور نکھرنا ہے اور تکمیل و اتمام، کی مزید منزلیں طے کرنا ہے تو کیوں نہ نقص و شر کے اس عیب کو عبوری اور عارضی شئے قرار دیا جائے جس کو بالآخر انسان کی سعی اور کوشش سے مٹنا اور ختم ہونا ہے۔

ان مطالب کی تائید میں قرآن حکیم کے ان شواہد پر غور فرمایئے

1-ذَلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ(یٰس:38)

"یہ اندازہ ہے عزیز اور صاحب علم خدا کا"

2-اِنَّاجَعَلْنَامَاعَلَی الْأَرْضِ زِیْنَۃً لَّھَالِنَبْلُوَھُمْ أَیُّھُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً(الکہف:7)

"بلاشبہ جو کچھ زمین پر ہے اسے ہم نے اس کیلئے سنوارا اور بنایا تا کہ انہیں آزمائیں کہ ان میں کس کا کام بہتر ہے۔"

3-ھُوَ ٱلَّذِي جَعَلَ لَكُمُ ٱلۡأَرۡضَ ذَلُولٗا فَٱمۡشُواْ فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُواْ مِن رِّزۡقِهِۦۖ وَإِلَيۡهِ ٱلنُّشُورُ(ملک:15)

وہی ذات ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے رام کر دیا تا کہ تم اس کے گوشوں میں چلو پھرو اور اس کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف جانا اور جی اٹھنا ہے۔

4-الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ(الرحمٰن:5)

"اور سورج اور چاند کا ایک حساب متعین ہے"

5-قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْ قَدْراً(الطلاق:3)

"اور اللہ تعالیٰ نے ہر ہر شئے کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے"

6-وَسَخَّرَلَکُمُ اللَّیْلَ وَالنَّھارَوَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَوَالنُّجُومُ مُسَخَّرَات(النحل:12)

"اور تمہاری خدمت میں لگا دیا رات اور دن کو سورج اور چاند کو اور تمام نجوم و کواکب کو بھی مسخر کر دیا۔"

7-أَلَمْ تَرَأَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ(الحج:65)

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ زمین میں ہے، اس کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔"

8-وَمَاخَلَقْنَاالسَّمَاء وَالْأَرْضَ وَمَابَیْنَھُمَالَاعِبِیْنَ(دخان:38)

"اور ہم نے زمین اور آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔"

وہ تیسرا نقطہ جو سائنس اور فلسفہ کی ارتقائی کڑیوں کو آگے بڑھانے کا باعث ہو سکتا ہے اور جس کی بدولت مسلمانوں نے تین چار صدیوں ہی میں علوم عقلیہ کو ثریا تک اچھال دیا، یہ تھا کہ فکر و دانش کی پرواز اور فطرت کے انکشافات میں کہیں ایسا موڑ نہیں آتا کہ جہاں دین کی استواریاں مجروح

ہوں۔ قرآن حکیم نے جس نقطہ نظر کی پرورش کی، اس کا حاصل یہ تھا کہ عقل و دین میں کوئی تضاد پایا نہیں جاتا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پتو ہیں۔ جس پروردگار نے انسانی روح کی تابش و ضو کیلئے اقدار کی تلقین کی ہے، زندگی کا نقشہ ترتیب دیا اور انسان کی علمی رہنمائی کیلئے فقہ و قانون کے حسین سانچے بخشے ہیں، وہ بھلا یہ کیوں چاہے گا کہ اس کی عطا کردہ عقل و خرد کی صلاحیتیں ان اقدار کے خلاف پڑیں، زندگی کے اس نقشے کی تغلیظ کریں اور ربوبیت کے اس پہلو کو جھٹلانے کا باعث قرار پائیں کہ جس سے مقصود ہی یہ ہے کہ انسان کو اس کائنات میں اس کا صحیح صحیح مقام عطا کیا جائے اور ان تمام فکری و عقلی اور عملی خوبیوں سے مکمل طور سے نوازا جائے جو اس کو خلافت الٰہیہ کی مسند بلند پر فائز کرنے میں مدد و معاون ہو سکتی ہیں، مذہب و عقل میں دوئی کی ایک ہی صورت ممکن ہے کہ ہم کائنات میں ثنویت کے قائل ہو جائیں اور اس بات کو مان لیں کہ مذہب و دین کے تقاضوں کی تکمیل وارتقاء تو اللہ کے ذمہ ہے، اور عقل و خرد کی طرفہ طرازیوں کی تخلیق کا ذمہ کسی ایسی قوت نے لے رکھا ہے جس کا تعلق خیر کی بجائے شر سے ہے، تضاد اور نفی سے ہے اور اس قوت نے عقل و خرد کی جدت طرازیوں کو پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے تاکہ دونوں میں ہمیشہ ٹھنی رہے اور کبھی بھی مصالحت اور یکجہتی قائم نہ ہو سکے لیکن اگر انسان ایک ہے، اس کی فطرت ایک ہے اور اس پوری کائنات میں ایک ہی اللہ کی فرمانروائی اور حکومت کا سکہ رواں ہے، تب یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ ذہن و عقل میں تصادم و تضاد رونما ہو یا کسی درجے میں بھی دوئی پائی جائے کیونکہ جب دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اصل اور جڑ ایک ہے تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان دونوں میں نہ صرف یہ کہ تضاد و تنافر نہ ہو بلکہ اس کے برعکس کامل ہم آہنگی اور اتحاد پایا جائے اور یہی وہ طرزِ فکر اور اسلوب نگاہ ہے جس کو قرآن حکیم نے عقل و ذہن کے بارے میں اختیار کیا ہے۔

مذہب اور عقل یا دین اور سائنس کے تجربات زندگی کے دو لاینفک پہلو ہیں، جن سے کسی بھی طرح ہم دامن کشاں نہیں رہ سکتے اس لیے کہ اگر ہم علم کے اس ذریعہ پر اعتماد نہیں کرتے ہیں جو ہمیں لاکھوں انبیاء کی وساطت سے پہنچا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس عظیم تہذیبی و روحانی ورثہ سے محرومی اختیار کر لیتے ہیں جس سے کردار و اخلاق سنورتے ہیں، ایمان و یقین کی دولت، بے پایاں کی تعمیر حاصل ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کی وجہ سے ہمیں تگ و دو، اور جد و جہد کیلئے ایک متعین اور بامعنیٰ نصب العین دستیاب ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر ہم عقل و خرد کے تقاضوں کو بیدار نہ رکھیں تحقیق و مشاہدہ سے کام نہ لیں، نئے نئے تجربات و انکشافات سے بہرہ مند نہ ہوں اور اس بات کا اندازہ نہ کریں کہ ہمارے تجربات اور غور و فکر کس حد تک فطرت کے رازہائے سربستہ کو فاش کر سکتے ہیں تو اس سے جو نقصان پہنچے گا اس کا تحمّل کب آسان ہے؟ اس سے ہماری شخصیت نامکمل رہے گی یعنی اپنے ان مضمرات عقلی کے اظہار سے قاصر رہے گی جو زمان و مکان میں نئے نئے انقلابات کی تخلیق کرتے رہتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے دائرے سکڑ کر خشک ہو جائیں گے، فکر ٹھس اور مردہ ہو جائے گی، اور زندگی کے پورے نظام کو وہ تازہ اور ساز گار آب و ہوا میسر نہیں آسکے گی جس میں کسی زندہ و متحرک ثقافت کا نہال پھلتا پھولتا اور پنپتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا ہمیں اگر بھرپور زندگی بسر کرنا ہے اور فکر و نظر کے دقائق سے لیکر قلب و روح کے لطائف تک ہر ہر شئے سے استفادہ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ ہم ایسا مدرسہ فکر تسلیم کریں جو دین و دنیا اور عقل و مذہب دونوں کی برکات کا یکساں حامل ہو، اور اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا مدرسہ فکر اسلام اپنے دامن میں ان دونوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

قرآن حکیم اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں ہو سکتے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم عقائد و تصورات میں ثنویت برقرار نہیں رکھ سکتے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے ہم کائنات، فطرت یا اپنے گردوپیش کے حالات کے بارے میں ایک رائے قائم کریں اور علوم و فنون سے اخذ کردہ نتائج کی بناء پر ہم جن تصورات و عقائد کو حق بجانب سمجھیں وہ دوسری نوعیت کے حامل ہوں۔ اگر مذہب و دین اللہ کا پیغام ہے اور اس علم ازلی کی فیض رسانیوں کا نتیجہ یہ ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں کسی لغزش یا کوتاہی کا امکان نہیں تو پھر یہ

ضروری ہے کہ اس سے اخذ کردہ تعلیمات کسی طرح بھی روح عصر کے منافی نہ ہوں یعنی کسی بھی دور میں علم و تجربہ کا کوئی بھی انکشاف اہل حق کے حلقوں میں اچنبھانہ پیدا کر سکے بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ جب بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات سے کوئی نئی حقیقت فکر و نظر کے سامنے آئے ایسا معلوم ہو کہ اس میں کوئی انوکھا پن نہیں بلکہ اصولی حد تک جانی پہچانی سی حقیقت ہے۔ ہاں یہ بات البتہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی ان میں تصادم و تضاد محسوس ہوتا ہے اور ایسی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ گویا یہ دونوں باہم حریف ہیں، جن میں فیصلہ کن لڑائی چھڑ گئی ہے اور نظر بہ ظاہر اب صرف یہی امکان باقی ہے کہ دونوں میں سے ایک زندہ رہے اور دوسرا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنی شکست تسلیم کر لے۔ جن لوگوں نے مغرب میں احیائے علوم کی تحریک کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ کلیسا اور سائنس کے مابین اس طرح کے متعدد موڑ آئے ہیں جن میں دونوں حریف خم ٹھونک کر ایک دوسرے کے مقابلے میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔

لیکن تصادم کی یہ شکل عارضی ثابت ہوئی ہے اور بعد کی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اصل میں ان دونوں میں تضاد غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور عموماً اس وقت محسوس ہوتا ہے جب یا تو مذہب و دین کی تعبیر صحیح اصولوں پر مبنی نہ ہو اور یا پھر سائنس اور علوم سے غیر سائنسی اور غیر علمی نتائج اخذ کیے جائیں۔ اگر مذہب کی تعبیر و تشریح میں ان سائنٹیفک اور علمی اصولوں کو مد نظر رکھا جائے کہ جن کی روشنی میں کسی بلند تر حقیقت کی صحیح معنوں میں تعیین ہوتا ہے اور سائنس سے صرف وہی نتائج اخذ کیے جائیں جو آخری اور اٹل ہوں تو ناممکن ہے کہ دونوں میں ذرہ بھی اختلاف رونما ہو۔

علاوہ ازیں یہ تصادم اور تضاد بڑی حد تک ہماری جلد بازی اور بے صبری کا رہین منت بھی ہوتا ہے۔ ہماری عادت یہ ہے کہ سائنس کے ہر نئے انکشاف پر شور مچا دیتے ہیں کہ بس اب مذہب و دین کی خیر نہیں حالانکہ وہ انکشاف کسی حیثیت میں بھی آخری اور فیصلہ کن نہیں ہوتا بلکہ اگلے انکشاف کی محض تمہید ہوتا ہے اور اگلا انکشاف اگر حرفِ آخر بھی ہو تب بھی اس سے اصول دین کا کچھ بھی نہیں بگڑتا بلکہ اس کے برعکس ہوتا صرف یہ ہے کہ بعض جزئی اور تشریح طلب مسائل میں مذہب و دین کی تشریح و تعبیر کا انداز و اسلوب بدل جاتا ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ لطیف اور زیادہ اونچا ہو جاتا ہے، یہی نہیں زیادہ یقین افروز بھی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے مطالعہ کائنات پر بہت زور دیا ہے اور بار بار فکر و ذہن کو متوجہ کیا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی وسیع تر دنیا پر غور کرے۔ آسمان اور زمین کو دیکھے۔ اختلاف لیل و نہار کو ہدف تعقل ٹھہرائے۔ ہواؤں کے دوش پر سوار ہو۔ سحاب و ابر کی فیض رسانیوں کے حدود کا جائزہ لے۔ پہاڑوں کی استواری کو زیر بحث لائے۔ اونٹ کو دیکھے اور فطرت کے ان عجائبات کو ملاحظہ کرے جو اس کی تخلیق میں ودیعت کر دیے گئے ہیں۔ فکر و نظر اور غور و تفحص کی یہ دعوت چونکہ یا پہلو ہے جس کی بناء پر مسلمانوں میں علوم عقلیہ کیلئے طلب و جستجو کے داعیے بیدار ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان صحرا نوردوں نے محض اسلام کی بدولت تہذیب و تمدن کے بلند ترین میناروں کو چھو لیا اور طب، کیمیا، جغرافیہ، فلکیات، منطق، فلسفہ اور کلام میں اتنی ترقی کی کہ برسوں یورپ ان کی تحقیقات کو جویاں رہا۔

مطالعہ و مشاہدہ کی اس دعوت میں دو باتیں خصوصیت سے قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن حکیم نے جس فکر و تعمق کی دعوت دی وہ ارسطاطالیسی استخراجی فکر نہیں ہے کہ جو نتائج کے اعتبار سے بالکل عقیم اور بے ثمر ہے اور جس سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں بلکہ فکر و تعمق کا مزاج استقرائی ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جزئیات کے مطالعہ و تجربہ سے کلیات اخذ کیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ راہ ٹھیٹھ سائنس کی راہ ہے اور اس میں نت نئے انکشافات کا بہر حال خطرہ موجود ہے لیکن اس کے باوجود قرآن حکیم کا اصرار ہے کہ تم اس نہج پر غور کرو اور اسی انداز سے سوچو اور فکر و نظر کی ضیاء افروزیوں کو عام کرو۔ اللہ تعالیٰ جو علام الغیوب ہے خوب جانتا ہے کہ اس راہ کے خطرات کیا ہیں اور اس مطالعہ و تحقیق سے علمی دنیا میں کیا کیا انقلاب آنے والے

ہیں۔اس کے ہوتے ساتے جب رب کائنات کا حکم ہے کہ مسلمان ذہنوں کو ٹھس نہ ہونے دیں۔ علم و تحقیق کی شمعوں کو روشن رکھیں اور تحقیق و تفحص کا پرچم چار دانگ عالم میں لہراتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم جن نظام حیات کا داعی ہے اس میں اور عقل کی تیز رفتاریوں میں کہیں تصادم و تناقض کا خطرہ پنہاں نہیں۔

یہ ہے قرآن کا فلسفہ اور سائنس کی ترویج میں فکری حصہ۔ تفصیل اور حوالہ کیلئے درج ذیل آیات پر غور فرمایئے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًافِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَالنَّاسَ عَلَيْهَا(روم:30)

تو تم ایک طرف کے ہو کر دین (اللہ کے رستے) پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ (اور) اللہ کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (اختیار کئے رہو) اللہ کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

يُؤتِيْ الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْأُوتِيَ خَيْراً كَثِيْراً(البقرۃ:269)

"حکمت و دانش جسے چاہتے ہیں ارزانی فرما دیتے ہیں اور جس کو حکمت و دانش سے نوازا گیا اسے بڑی چیز مل گئی۔"

قَدْجَاءكُم بَصَآئِرُمِن رَّبِّكُمْ(الانعام:104)

"بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے بصائر آ چکے ہیں۔"

وَمِنهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَاآتِنَافِيْ الدُّنْيَاحَسَنَةً وَفِيْ الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَاعَذَابَ النَّارِ(البقرۃ:201)

اوران میں کچھ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی بہتری سے بہرہ مند کیجیے اور ہم کو آگ کے عذاب سے محفوظ رکھیے۔"

مَّاجَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ(الاحزاب:4)

"اللہ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں رکھے"

أَفَلَمْ يَنظُرُوااِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَاوَمَالَهَا مِن فُرُوجٍ،وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ،تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ(ق:6-8)

کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کیونکر بنایا ہے۔ اور کیونکر آراستہ کیا اور سجایا ہے۔ اور اس میں کوئی رخنہ تک نہیں۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور بچھایا۔ اور اس میں پہاڑوں کو جمایا اور اس میں ہر طرح کی خوش منظر چیزیں اگائیں اس لیے کہ اس کی طرف رجوع ہونے والا ہر بندہ ان پر غور کرے اور عبرت پذیر ہو۔

اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِوَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ(البقرۃ:164)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں۔ اور یکے بعد دیگرے دن کے آنے میں۔ اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں، آدمیوں کے نفع کی چیزیں اور اسباب لیکر اور بارش کے پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا۔ پھر اس سے زمین کو زندہ کیا جبکہ یہ خشک ہو چکی تھی۔ اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو آسمان اور زمین کے مابین مسخر ہے۔ دلائل ہیں ان لوگوں کیلئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو علم و فن کی ترقی ہوئی اور کندی، رازی، ابن ماجہ، ابن سینا، فارابی اور ابن رشد و غزالی ایسے عظیم مفکرین پیدا ہوئے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یونان و ایران کے سرمایہ تہذیب و تمدن نے ان کے قلب و ذہن میں یکایک تبدیلی پیدا کر دی تھی بلکہ اس کی بڑی اور بنیادی وجہ وہ داخلی انقلاب تھا جس کو قرآن حکیم کی تعلیمات نے پیدا کیا اور وہ تڑپ اور لگن تھی جو اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں خود بخود کاوش و جستجو کا باعث ہوئی۔ ورنہ یہ وہی عرب تھے جو کافور کو نمک سمجھتے تھے اور چاندی کو سونے سے زیادہ قیمتی جانتے تھے۔ جو طرح طرح کے اوہام کا شکار تھے لیکن تاریخ کے اوراق زندگی کے ہر پہلو پر ان کی تحقیقات سے نہ صرف فائدہ اٹھانے کی گواہی دے رہے ہیں بلکہ زندگی کو آداب و سلیقہ سکھانے کیلئے ان کی پیروی کر رہے ہیں۔

بروز اتوار 15 محرم الحرام 1446ھ 21 جولائی 2024ء

شرم کس احساس کا نام ہے؟

بہت عجیب ہیں ہم۔ میں تو بدنصیب کہنے والا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہی کہنا چاہتا ہوں۔ اندر مجھے روکتا ہے کہ نہیں اتنا آگے نہ جاؤ۔ ہمارے کردیتے رویے، ہمارا برتاؤ، ہماری بودوباش، ہماری خواہشات سب کچھ عجیب ہے۔ خواب بھی، ہم تضادات کا مجموعہ ہیں۔ جو اہم ہے اسے نظر انداز ہیں، جو ثانوی ہے اسے اوّلیت دیتے ہیں۔ میں بندہ نفس ہوں، مجھے بندہ رب بننا تھا اور بندہ رب وہ ہے جو اس کی چلتی پھرتی، جیتی جاگتی، ہنستی گاتی تصویروں سے محبت کرے۔ لیکن ٹھہریئے! مشروط محبت نہیں.... بس محبت، جس میں اخلاص ہو، طلب نہ ہو۔ بس دینا ہی دینا، لینا کچھ نہیں، کھلے بازو اور کھلا دل، تنگ دلی کا گزر بھی نہ ہو۔ طمع اور لالچ چھو بھی نہ سکیں..... بس خالص محبت۔ میرا رب تو اس سے محبت کرتا ہے جو اس کی مخلوق سے محبت کرے۔ کتنا عجیب ہے یہ رویہ کہ میں کسی سے محبت کرتا ہوں اور اس کی تخلیق سے صرف نظر!

وہ وقت آج بھی مجھے یاد ہے..... جناب حسن مطہر کے ہاں مکہ مکرمہ میں، عمرہ سے ابھی لوٹے تھے اور مدینہ منورہ کی تیاری تھی، بڑا سا ڈرائنگ روم اور سفید بالوں والے باباجی.... اور کچھ دوستوں کی بحث پر ان کی مسکراہٹ۔ میں نے انسانی شکل میں بہت فرشتے دیکھے ہیں، وہ بھی ایسے ہیں، بہت تحمل اور بہت صبر والے.... اور مجھے تو دونوں چھو کر بھی نہیں گزرے۔ جب بہت دیر ہو گئی تو انہوں نے مجھ سے کہا "تو سمجھ گیا ہے ناں، ویسے ہی یہ بحث کر رہے ہیں!" تو میں بہت ہنسا اور کہا "نہیں باباجی مجھے کچھ کچھ تو سمجھ آ گیا، پوری طرح نہیں"۔ "اوپگلے جب تجھے کسی کی بری عادتیں بھی اچھی لگیں، اس کے غصے پر بھی پیار آئے، تو اس کی جھڑکی سن کر بھی سرشار ہو، اس کی ڈانٹ سننا چاہے بلکہ خود ایسی حرکت کرے کہ وہ تجھے ڈانٹ دے، تجھ میں سے "تو" نکل جائے اور "وہ" بس جائے، انا صرف دم نہیں توڑے بلکہ فنا ہو جائے، جب وہ دھتکار دے اور تو اور قریب آئے.... جب تجھ میں، تیری رگ وپے میں، تیری نس نس میں، لہو کی ہر بوند میں وہ سما جائے تو سمجھ لینا ہاں! اب ہے محبت، اگر ایسا نہیں تو عبث ہے، سب عبث، سب کارِ عبث ہے۔

ہاں مجھے سمجھ آ گیا تھا، تجربہ تو کوئی بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ بالکل ایسا ہی ہے۔ مجھے عجیب لگتا ہے۔ ہم سب اللہ کی محبت کے طلبگار ہیں اور مخلوق سے بیزار۔ نجانے کیا ہے یہ۔ میں اسے قید کرنا چاہتا ہوں جبکہ محبت آزادی ہے۔ وہ سارے عالم کا رب ہے، ساری کائنات کا رب ہے اور میں اسے صرف رب المسلمین سمجھ بیٹھا ہوں۔ وہ لامحدود ہے اور میں اسے محدود کر کے اپنی بوتل میں بند کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کے بندوں کو تقسیم کرتا ہوں خانوں میں، وہ سب کو دیتا ہو اور میں سب سے روکتا ہوں۔ وہ وسیع ہے اور میں تنگ دل۔ میں بندوں کا حساب کتاب اس پر نہیں چھوڑتا، خود کو توال بن گیا ہوں۔ میں محبت تو کیا کروں نفرت کا بیج بوتا رہتا ہوں۔

میں کون ہوتا ہوں اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان آنے والا! میں ڈنڈے اور بندوقیں لیکر انسان پر ٹوٹ پڑا ہوں۔ وہ جبر سے منع کرتا ہے اور میں اپنی بات طاقت سے منوانا چاہتا ہوں۔ میں اس کی کوئی بات نہیں سنتا اور اس کا خلیفہ بنا پھرتا ہوں۔ مجھے میرے نفس نے برباد کر دیا ہے، میں اس کی مخلوق کیلئے آزار بن چکا ہوں اور رب سے تقاضہ کرتا ہوں کہ مجھے محبت سے دیکھے! میں خود ظالم ہوں اور رب سے طلب کرتا ہوں اس کا رحم! میں کسی کو بھی معاف کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں اور ہر دم اس کو کہتا ہوں کہ مجھے معاف کر دے! میں خود پیٹ بھر کر کھاتا ہوں اور اپنے آس پاس خاک بسر لوگوں سے بے خبر ہوں!

میں عجیب ہوں، میرے رب نے جو حقوق دیئے ہیں سب کو، میں وہ سلب کر کے بیٹھ گیا ہوں، میں اپنی بات محبت سے نہیں بلکہ دھونس دھاندلی اور دھمکی سے منواتا ہوں۔ میں اتنا ظالم ہوں کہ میرے گھر والے جنہیں میں نے اتنی محنت کر کے، سچ جھوٹ بول کر، ہلکان ہو کر ہر جائز و ناجائز کی پرواہ کئے بغیر انہیں پالا ہے، جب وہ اپنے حقوق جو میرے رب نے انہیں دیئے ہیں، طلب کر بیٹھیں تو میں ڈنڈا لیکر کو دپڑتا ہوں۔ اس وقت تو مجھے رب یاد نہیں آتا۔ میں بہت ظالم ہوں، جو رب نے حقوق دیئے ہیں میں نے وہ بھی چھین لئے ہیں اور دعویٰ کرتا ہوں محبت کا اپنے رب سے!

ہر بندے کا رب سے ایک خاص تعلق ہے اور ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا جو مجھے بتائے کہ کون رب کے کتنا قریب ہے.....وہ جو تسبیح لئے گھوم رہا ہے یا وہ جو سڑک پر تارکول بچھا رہا ہے، وہ جو موٹر میں گھوم رہا ہے یا وہ جو برہنہ پا ہے، ہاں موٹر تو کیا ہے جہاز میں بیٹھنے والا بھی اس کے قریب ہو سکتا ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں رب اور مخلوق کے درمیان آؤں! میں خود کو کیوں نہیں دیکھتا کہ میرا کیا تعلق ہے رب سے! میں اگر نماز پڑھتا ہوں تو بے نمازیوں کو حقارت سے دیکھتا ہوں۔ میں اگر روزہ رکھتا ہوں تو دوسروں سے خود کو اعلیٰ سمجھ بیٹھتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم ہے کیا مجبوری ہے کسی کی۔ وہ جانے اور اس کا رب.....مجھے تو اپنا کام کرنا ہے۔ جو مجھے کرنا چاہئے وہ نہیں کرتا اور جو نہیں کرنا چاہئے وہ کرتا چلا جا رہا ہوں۔ میں اپنے رب سے محبت کے جھوٹے وعدے سے کب باز آؤں گا! مخلوق سے نفرت اور رب سے محبت۔ مجھے تو کچھ پلے نہیں پڑتا، آپ کو سمجھ آ گیا ہو تو براہ مہربانی مجھے بھی سمجھائیے۔

میاں شہباز شریف صاحب جب بھی کیمرے اور مائیک کے سامنے آتے ہیں تو اب بھی اپوزیشن لیڈر بن کر قوم کے غریبوں کے درد کا بڑی دلسوزی سے ذکر کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ مہنگائی نے ان کی زندگی اجیرن کر دی ہے، بھول جاتے ہیں کہ بطور وزیر اعظم انہی کے حکم سے بجٹ میں ٹیکس بڑھائے گئے ہیں جس کے رد عمل میں مہنگائی کے طوفان نے عوام کی چیخیں نکلوا دی ہیں، انہی کے حکم سے بجلی اور گیس کے نرخوں میں اس قدر اضافہ کر دیا گیا ہے کہ قوم پر فاقوں کی نوبت آ گئی ہے لیکن دوسری طرف انہی کے حکم سے ہمارے ووٹوں سے منتخب ارکانِ اسمبلی کو اب سالانہ 20 کی جگہ 30 فری ہوائی جہاز کی ٹکٹیں ملا کریں گی اور عوام کو اس مد میں سالانہ ساڑھے بارہ ہزار اضافی ٹیکس دینا پڑے گا۔ یہ وہ تمام افراد ہیں جنہوں نے ووٹ سے قبل اپنے اپنے حلقے میں عوام کو اس مشکل سے نکالنے کی قسمیں کھائیں تھیں۔

ایک طرف عوام کا جینا مشکل کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف صدر پاکستان آصف علی زرداری کے پروٹوکول گاڑیوں کے قافلے کے بجٹ کو چار گنا بڑھا کر 44 / ارب روپے مختص کر دیئے گئے ہیں۔ قوم سر پیٹ رہی ہے کہ ان تمام اشرافیہ نے تو بغیر تنخواہ کام کرنے کا اعلان کر کے قوم پر احسان کیا تھا لیکن دوسری طرف ایوانِ صدر کے باغ کی آرائش کا بجٹ دوگنا کر کے 6 کروڑ روپے کر دیا گیا ہے۔ اکیلے صدر زرداری کی خدمت کیلئے ایوان صدر میں 85 ملازمین کی فوج موجود ہے اور روزانہ کی بنیاد پر دو سو سے زائد افراد کا کھانا بھی تیار کیا جاتا ہے جبکہ شنید تو یہ بھی ہے کہ اپنے پچھلے دورِ صدارت میں فرانس میں بیٹھے اچانک بھنڈی کھانے کو دل للچایا تو فرانس میں بھنڈی کی عدم دستیابی کی بناء پر خصوصی جہاز کو اس خدمت پر مامور کر دیا گیا لیکن قوم کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ آئی ایم ایف کی مرضی سے بجٹ بنانا ہماری مجبوری ہے لیکن کیا آئی ایم ایف کو یہ عیاشیاں نظر نہیں

آتیں؟ قوم کو یہ کیوں نہیں بتایا جاتا کہ ملکی معیشت کا بھٹہ بٹھانے کیلئے جو بجلی کے کارخانے آئی پی پی لگے ہیں، ان کے مالکان میں کتنے موجودہ اشرافیہ کے افراد شامل ہیں؟ قوم جہاں پل پل تڑپ رہی ہے وہاں ان دو خاندانوں اور اشرافیہ کی شہہ خرچیوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے جس سے خاکم بدہن ملک کے ڈوبنے کے آثار بڑھتے جا رہے ہیں۔

غیر ملکی قرضوں کا بوجھ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ صرف ان کے سود کی ادائیگی کیلئے قرض جیسی لعنت کا سہارا لینا پڑ رہا ہے اور ملک کے وزیر اعظم قوم کو یہ نوید سنا رہے ہیں کہ اگر ہم نے اب بھی آئی ایم ایف سے نجات حاصل نہ کی تو ہمارے لئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ شرم کس احساس کا نام ہے؟ یہ تمام قرضے آپ نے لئے ہیں جس سے عوام کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ وقت بھی جلد آنے والا ہے کہ مغرب کے بینکوں میں ملک سے لوٹی ہوئی تمام رقم کو ضبط کر کے یہ ملکی قرض ادا کیا جائے گا!

آپ سب آباد رہیں، خوشحال رہیں، دلشاد رہیں.... سب کو چلے جانا ہے یہاں سے، کسی کو بھی نہیں رہنا، بس نام رہے گا میرے رب کا۔
یہ میں تو نہیں کہہ رہا ناں، بابا اقبال کہہ رہے ہیں!

عجب واعظ کی دیں داری ہے یارب
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے
ہم اپنی دردمندی کا فسانہ
سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آواز اذاں سے

بروز منگل 17 محرم الحرام 1446ھ 23 جولائی 2024ء

سفاک منافق

رعونت، درندگی اور سفاکی، تہذیب کے ہر قرینے اور انسانیت کے ہر سلیقے سے عاری ہوتی ہے۔ وہ اپنی خوں آشامی کا جواز خود ہوتی ہے اور اپنی حیا باختگی کی دلیل خود تراشتی ہے۔ کسی کی برہمی، کسی کی تنقید اور کسی کی حرف گیری سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر ایسا ہونا ہوتا تو امریکا بہت پہلے سے اپنا چلن تبدیل کر چکا ہوتا اور اسے اندازہ ہو گیا ہوتا کہ اسلحے اور ٹیکنالوجی کے زور پر انسانوں کے پرخچے اڑانے اور بستیاں پیوند زمین کر دینے سے نہ کوئی قوم امریکی تاریخ حیا باختہ جنگوں، آزاد خود مختار ممالک کے امور میں ننگی مداخلت اور معصوم انسانوں کے قتل سر بلند ہوتی اور نہ کوئی ریاست آبرو پاتی ہے۔ جمہوریت اور آزادی کا درس دینے ، سے بھری پڑی ہے۔ اگر کسی کے پاس مستند اور مصدقہ اعداد و شمار جمع کرنے کا ہنر ہوتا تو پتہ چلتا کہ امن، انسانی حقوق جھوٹ کے کتنے داغ اور مکاری کے کتنے چھینٹے ہیں۔ والی سپر پاور کے دامن پر

بھول جایئے کہ چھ اگست 1945ء کو ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم "امن و آشتی" کے اسی علمبردار نے گرایا تھا جس سے تین لاکھ سے زائد انسان ہلاک اور لاکھوں اپاہج ہو گئے۔ بھول جایئے کہ 9 / اگست 1945ء کو اسی مبلغِ انسانیت نے ناگاساکی پر دوسرا ایٹم بم گرایا تھا جس سے شہر کی ایک تہائی آبادی ہلاک ہو گئی تھی۔ 261 سال پہلے 1763ء میں پہلے جراثیمی ہتھیار بھی امریکا میں موجودہ امریکیوں کے آباؤاجداد نے استعمال کئے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جنگی قیدیوں پر زہریلی گیس استعمال کرنے کا اعزاز بھی امریکا کے پاس ہے۔ 1925ء میں جب جنیوا کنونشن کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی لگا رہا تھا تو سب سے زیادہ مخالفت امریکا نے کی تھی اور اس پابندی کو قبول کرنے سے انکار بھی کر دیا تھا۔ یہ باتیں بھول جایئے کہ قصۂ ماضی ہو چکی ہیں لیکن آج بھی امریکا این پی ٹی پر دستخطوں سے انکاری ہے۔ وہ روس سے کئے گئے اینٹی بلاسٹک میزائلوں کے معاہدے سے بھی یکطرفہ طور پر منحرف ہو چکا ہے۔ آج بھی اس کے ایٹمی گودام میں 12 ہزار سے زائد ایٹم بم پڑے ہوئے ہیں۔ آج بھی اس کے پاس کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور آج بھی اس کی غارت گری اور انسانیت کشی جوں کی توں ہے بلکہ کئی گنا بڑھ چکی ہے بس تھوڑی سی یہ تبدیلی آئی ہے کہ اب نسل کشی کا کام اسرائیل سے لے رہا ہے۔

تقریباً 22 سال قبل جولائی 2002ء میں افغانستان کے ایک گاؤں میں شادی کی ایک تقریب جاری تھی۔ بچیاں ڈھولک کی تھاپ پر گیت گا رہی تھیں، پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ آسمانوں کی بلندیوں سے امریکی طیاروں نے دیکھا اور اسے طالبان کی جنگی تیاریوں کا کوئی کیمپ خیال کرتے ہوئے درجنوں بم گرا دیئے۔ عورتوں اور بچوں سمیت 48 بے گناہ انسانوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ عالمِ اسلام نے جھرجھری تک نہ لی۔ مری مری، منمنی سرگوشیوں کے سوا احتجاج کی کوئی لے بلند نہ ہوئی۔ قبریں کھدیں اور جلنے سے بچ جانے والے اعضاء دفن کر دیئے گئے۔ امریکی سنٹرل کمانڈ نے سینہ تان کر کہا ....."ہم اس حملے میں پوری طرح حق بجانب تھے، ہمارے جہازوں پر فائرنگ کی گئی تھی۔ اس سفاکی کے دو سال بعد ایسا ہی المیہ عراق کے ایک سرحدی گاؤں میں بھی پیش آیا جہاں شادی کی ایک تقریب پر بم برسا کر 55 / افراد کو موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔ زمین پر رینگتے کیڑوں مکوڑوں کو دیکھ لینے والی ٹیکنالوجی کو شادی کی تقریب "المہدی آرمی" کی چھاؤنی نظر آئی۔ خبر رساں ایجنسی رائٹر نے ایک عینی شاہد کے حوالے سے بتایا کہ شہید ہونے والوں میں 15 بچے اور 25 خواتین بھی شامل تھیں۔ ایک اور عینی شاہد نے العربیہ ٹی وی چینل کو بتایا کہ امریکی طیاروں نے کم و بیش ایک سو بم گرائے۔ ٹی وی چینل نے یہ بھی دکھایا کہ کس طرح لہو بہہ رہا ہے اور کس طرح ایک گرد سے اٹی ہوئی سڑک پر کٹی پھٹی لاشوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔

ابو غریب جیل اور بگرام ایئر بیس کی متعفن کہانیاں سامنے آنے کے بعد تحقیقات، گواہیاں، بیانات، کورٹ مارشلز اور باز پرس کا ڈرامہ بھی اس تہذیب یافتہ دنیا نے دیکھا لیکن اب تک کوئی نہیں جو اس کھلی بربریت پر امریکا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے۔ آج بھی جب وائٹ ہاؤس، پینٹاگون یا سٹیٹ آفس کا کوئی کارندہ کسی مسلمان ملک کا رخ کرتا ہے تو حکمرانوں پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیلئے سرخ قالین بچھتے، خیر مقدمی بینر لگتے اور پر تکلف ضیافتوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس کے خون آلود ہاتھوں کو تھامنا، مصافحہ کرنا اور چومنا اعزاز و افتخار خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی تشریف آوری کو اپنی عزت افزائی سمجھا جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں 18 کروڑ کے لگ بھگ انسان جنگوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اقوام متحدہ وجود میں آئی بھی تو خونریزی نہ روک سکی۔ اب تو امریکا نے کسی آزاد ملک پر حملہ آور ہونے کیلئے جھوٹے سچے پرمٹ کی روایت بھی ختم کر دی ہے اور "حفظِ ماتقدم" کا نیا فلسفہ تخلیق کیا ہے، گزشتہ صدی کے اختتام پر جولائی 1998ء میں اقوام متحدہ کے 120 رکن ممالک ہیگ میں جمع ہوئے۔ انہوں نے جینوا کنونشن کے ضابطوں کو زیادہ مؤثر بنانے اور جنگی جرائم کے مرتکب فوجیوں کو سزا دینے کیلئے انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کے چارٹر کی منظوری دی۔ اس عدالت کو عملاً وجود میں آئے ہوئے 26 سال ہونے کو ہیں لیکن امریکا کی بدمستیاں جاری ہیں۔ اس نے اس عدالت کے خلاف سب سے زیادہ واویلا کیا اور کہا "ہماری فوج تو دنیا کے ایک سو ممالک میں موجود ہے، ہمیں سیاسی وجوہ کی بناء پر اس عدالت میں گھسیٹا جاتا رہے گا۔"

عالمی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کیلئے صدر کلنٹن نے جاتے جاتے اس چارٹر پر دستخط تو کر دیئے لیکن قصر سفید میں قدم رکھتے ہی بش نے اپنے فرعونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس کی توثیق سے انکار کر دیا اور اوباما بھی انہی کی پالیسی پر کاربند ہیں۔ اس عدالت کو غیر مؤثر بنانے کیلئے امریکا نے دنیا کے 89 ممالک سے معاہدہ کر لیا ہے کہ اگر کوئی امریکی فوجی یا سویلین انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور جنگی جرائم میں ملوث پایا گیا تو اسے امریکا کے حوالے کر دیا جائے گا۔ امریکا نے قانون بنا رکھا ہے کہ جو ملک اس نوع کا معاہدہ کرنے سے انکاری ہو، اس کی امداد روکی جا سکتی ہے۔ احتیاط مزید کے طور پر امریکا نے 2002ء میں سلامتی کونسل کی ایک قرارداد کے ذریعے اپنے آپ کو ایک سال کیلئے اس عدالت سے مستثنیٰ قرار دلوایا، جولائی 2003ء میں اس میں مزید ایک سال کی توسیع کر دی گئی اور اس کے بعد اب تک ہر سال امریکا استثنیٰ کا حق دار ٹھہرتا ہے۔

ادھر امریکا کے لے پالک اسرائیل نے غزہ کی پٹی اور دیگر علاقوں میں گزشتہ 9 ماہ سے ایک دفعہ پھر بیگناہ فلسطینیوں کا خون بہانے کا سلسلہ جو شروع کر رکھا ہے، وہ تھمنے کا نام ہی لے رہا اور بھارت بھی کھل کر نہ صرف اسرائیل سپلائی کر رہا ہے بلکہ کئی سو ہندو بیروزگار نوجوانوں کو باقاعدہ بھرتی کر کے بیگناہ مسلمانوں کے خون بہانے کیلئے بھیجا گیا ہے اور اس عالمی سانحے کا مودی سرکار ایک اور خفیہ فائدہ یہ اٹھا رہی ہے کہ تیزی کے ساتھ کشمیر میں نوجوانوں کو گرفتار کر کے غائب کر رہی ہے اور مسلم اکثریت کو ختم کرنے کیلئے ہندوؤں کی آبادکاری کی جا رہی ہے۔ انہیں بلاسود قرضوں سمیت دیگر مالی امداد بھی فراہم کی جا رہی ہے اور واسرائیل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہندوؤں کی نئی آبادیاں بنائی جا رہی ہیں۔ ایک مرتبہ پھر مقبوضہ کشمیر میں کئی ہزار گمشدہ افراد کی اجتماعی قبروں کا انکشاف بھی ہوا جس کی بازگشت اب عالمی پریس میں بھی اٹھائی جا رہی ہے۔ کشمیری پہلے ہی برسوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے بھوک و مفلسی کا شکار ہیں اور بھارتی بنیاء یہ سمجھتا ہے کہ معاشی طور پر کشمیریوں کو تباہ کر کے ان کو حقِ خودارادیت کے نعرے سے دستبردار ہونے

پر مجبور کر دے گا، ان کے بعض لیڈروں کو خرید کر ان کشمیریوں کو بھارت کے ساتھ مکمل الحاق پر مجبور کر دیں گے لیکن بھارتی بنئے کی تمام مکاریاں اور چالبازیاں اب تک ناکام ہو گئیں ہیں۔

لیکن کسی سے کیا گلہ، مراکش سے انڈونیشیا تک ایک سناٹے کا راج ہے۔ بڑے بڑے بادشاہ، سلطان اور امیر، صف شکن سورما اور عالی قدر رہنماء خاموش ہیں۔ حرفِ مذمت تو دور کی بات ہے، خونِ مسلم کی ارزانی پر دو آنسو بہانے والا کوئی نہیں، آخر کون آنسو بہائے؟ سب کی آنکھیں تو وائٹ ہاؤس (قصر سفید) کی بارگاہِ ناز پر لگی ہوئی ہیں اور جب کوئی سواری وہاں سے ادھر کا رخ کرتی ہے تو قالینوں کا کاروبار چمک اٹھتا ہے اور پھولوں کی دوکانیں خالی ہو جاتی ہیں۔

انسانی حقوق کے عالمی چیمپئن نے غزہ اور کشمیر کے معاملے پر جس طرح انصاف دھجیاں اڑائی ہیں، انسانی حقوق کے تمام ادارے اس پر لعنت ملامت کر رہے ہیں مگر مغرب کے اس رویہ پر قدرت نے پوری دنیا کے سامنے ان کے دوغلے پن کو بے نقاب کر دیا ہے اور یہ دکھا دیا کہ خود کو مہذب کہنے والوں کے ہاں کتوں کو تو فیملی ممبر کا درجہ حاصل ہے مگر کسی جیتی جاگتی انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں!

آج تمہاری خونخواری پر حیرت ہے حیوانوں کو
تم تو کل تہذیب سکھانے نکلے تھے انسانوں کو
کیسا شوق چرایا تم کو شہروں کی بربادی کا
جگہ جگہ آباد کیا ہے تم نے قبرستانوں کو
اتنے بھی سفاک منافق دنیا نے کب دیکھے تھے
کتوں کا منہ چومنے والے قتل کریں انسانوں کو

بروز جمعرات 19 محرم الحرام 1446ھ 25 جولائی 2024ء

تضحیک و توہین

انسانوں نے بھوک وافلاس، غربت وبیروزگاری سے تنگ آکر چوریاں وڈاکے ڈالے ہیں، خودکشیاں کی ہیں، جرم کی دنیاکاراستہ اختیار کیاہے، اور کچھ نہیں بن سکاتواس علاقے سے ہجرت اختیار کرلی ہے لیکن جس معاملے کوانہوں نے ایک لمحے کیلئے، ذراسے توقف کیلئے بھی برداشت نہیں کیاوہ تضحیک تھی۔ کیونکہ عزت نفس ایک ایسی متاع ہے کہ جس کے لٹ جانے کے رنج پر انسان وہ بپھرا ہوا شیر بن جاتاہے کہ اس کے پنجے واپس نہیں مڑتے کہ جب تک انتقام نہ لے لیں۔ ول ڈیورانٹ نے اس تاریخی مائلے کو اپنی مشہورزمانہ کتاب "ہیروزآف دی ہسٹری" میں اس طرح تحریر کیاہے "تاریخ میں انقلاب معاشی حالات اور مجبوریاں نہیں لاتیں بلکہ تاریخ کے بگڑے ہوئے بچے لوگوں کی تضحیک اور تمسخر سے وہ لمحہ قریب کرلیتے ہیں جہاں لوگ خونخوار بھیڑیوں کی طرح ایوانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں"۔

اس کی ایک ادنیٰ سی مثال اور جھلک انقلاب فرانس میں بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔ والٹیئر ایک معمولی ڈرامہ نویس تھاجس کے ڈرامے معاشرے کی محرومیوں پر ایک بھرپور طنز ہوا کرتے تھے، جن کو دیکھ کر فرانس کے لوگوں کو اپنی ہی زندگی کے کردار نظر آتے تھے اور وہ اپناسارا غم وغصہ بھول کر چین کی نیند سوجاتے تھے۔ ان ڈراموں کی مقبولیت دیکھ کر شاہ فرانس کاایک منہ چڑا مشیر روہان حسد سے جلنے لگااور بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے جس کی بناء پر والٹیئر ایک سال کیلئے پیرس بدر کر دیا گیا۔ والٹیئر اپنی پیرس بدری کے بعد جب واپس آیاتواس کے قلم نے کسی بھی انتقامی کاروائی سے اجتناب کیا۔ پیرس واپسی پر اس نے دوبارہ لوگوں کی محرومیوں پر لکھناشروع کر دیالیکن اس دفعہ روہان نے والٹیئر کواپنے بھرے دربار میں طلب کر کے اس کی شدید بے عزتی اور تضحیک کی جس کابالآخر والٹیئر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع توکروادیالیکن ایک عورت جو والٹیئر کی بے حد مداح تھی اس سارے معاملے کو دیکھ کر بیہوش ہوگئی لیکن روہان نے والٹیئر کے گھر اپنے چند غنڈوں کو بھیج کر والٹیئر کو اس کے گھر سے نکال کر سب لوگوں کے سامنے بری طرح مارا پیٹااور خود وہاں پاس کھڑا مسکراتا رہا۔

والٹیئر جب اپنی توہین وتضحیک، کھلم کھلا مارپیٹ اور تمسخر کی شکائت کرنے بادشاہ کے محل میں چند لمحوں کی بھیک مانگنے گیاتو محل کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ یہ وہ لمحات تھے جس نے والٹیئر کو ڈرامہ نگار سے ایک کالم نویس اور فلسفی بنادیا۔ اس کے قلم نے لوگوں کی سوچوں کادھارا تبدیل کر دیا۔ لوگوں کو والٹیئر کی تحریروں کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔ والٹیئر کی مقبولیت دن بدن بڑھ رہی تھی اور لوگوں نے اس کو اپنا مسیحا سمجھناشروع کر دیا۔ ادھر روہان اور اس کے حواری بادشاہ کو والٹیئر کی مقبولیت سے ڈراکر اس کی تحریروں اور کتابوں پر پابندی لگواتے رہے۔ والٹیئر کی کتاب نیچرل لاء پر پابندی لگاکر اس کی تمام کاپیوں کو سرعام بازار میں آگ لگادی گئی۔ اب والٹیئر کی کتابیں خفیہ طور پر چھپتی رہیں اور لوگوں میں تقسیم ہوتی رہیں۔ والٹیئر کے تحریر کردہ کالم اور پمفلٹ متوسط درجہ کے لوگوں کی دل کی آواز بن کر ابھرے۔ بالآخر بادشاہ نے والٹیئر کو ملک بدر کر کے برطانیہ بھجوادیا مگر والٹیئر کی تحریروں میں مزید شدت آگئی۔ والٹیئر کے الفاظ دہکتے انگاروں کی مانند بادشاہ اور اس کے حواریوں پر برسنے لگے اور بالآخر وہ وقت آن پہنچاجب فرانس کے لوگوں نے بادشاہ لوئی اور اس کے حواریوں کو ایک بڑے چھرے یعنی گلیوٹین کے نیچے رکھ کر ذبح کر دیا۔ اس نے اپنی موت سے پہلے اس بات کا اقرار کیا کہ انقلاب فرانس والٹیئر اور روسو کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تضحیک اور توہین ہر معاشرے میں ایک والٹیئر کو جنم دیتی ہے اور انجام بھی بادشاہ لوئی سے مختلف نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ خوفناک!

پاکستانی قوم کی تضحیک اور توہین کا سلسلہ تو اس دن شروع ہو گیا تھا جب ہم نے اپنے ایک شہری ایمل کانسی کو خود اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر قصر سفید کے فرعون کے حوالے کیا تھا۔ ہم اگر اس وقت یہ مطالبہ کرتے کہ جناب! آپ اپنا وکیل لائیں اور ساری دنیا کے میڈیا کے سامنے ہم ایمل کانسی کا ٹرائل کریں گے لیکن مقدمہ ہماری عدالت میں چلے گا۔ لیکن اس کے برعکس ہم نے پاکستان کی کسی بھی عدالت کو بتائے بغیر ایمل کانسی کو امریکیوں کے حوالے کر دیا اور اس کے بدلے میں بخوشی ڈالروں کا بھرا تھیلا ہمارے حکمرانوں کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا۔ اسی لئے امریکی اٹارنی جنرل نے برملا عدالت میں کہا کہ پاکستانی تو صرف 20 ہزار ڈالروں کے عوض اپنی ماں کو بھی فروخت کر دیتے ہیں اور امریکی اٹارنی جنرل کے اس فقرہ کو دنیا کے سارے میڈیا نے نشر کیا۔

یہ انتہائی غلط اور تضحیک آمیز رسم ہماری سول حکومت کے دور اقتدار میں انجام پائی اور اس کے کچھ عرصہ بعد ہمارے کمانڈو پرویز مشرف نے تو اپنے پیشروں کو بھی مات کر دیا۔ جب امریکیوں نے باجوڑ میں ایک مدرسہ پر گائیڈڈ میزائل داغا جس میں معصوم اور بے گناہ 80 سے زائد بچے اور جوان شہید ہو گئے۔ کمانڈو صدر نے نہ صرف سیکورٹی کونسل سے رجوع نہیں کیا بلکہ تابعدار خوشامدیوں کی طرح فوراً اس کی ذمہ داری خود قبول کر لی کہ یہ میزائل ہم نے مارا ہے لیکن اس سے اگلے دن ہی امریکیوں کا بیان آ گیا کہ یہ میزائل حملہ انہوں نے کیا ہے اور وہ آئندہ بھی اپنے اہداف پر ایسے حملے جاری رکھیں گے۔

مشرف بڑے فخر سے اپنی سوانح حیات کے صفحہ 237 پر اعتراف کرتے ہیں کہ اگر کوئی عادتاً الزام تراشی کرتے ہوئے ہم سے یہ کہتا ہے کہ ہم نے "وار آن ٹیرر" کے حوالے سے کچھ نہیں کیا تو وہ صرف سی آئی اے سے یہ پوچھ لے کہ انہوں نے کتنی رقم انعام کے طور پر پاکستان کو ان خدمات کے صلے میں دی ہے۔ اسی صفحے میں مزید لکھتے ہیں کہ ہم نے 689 افراد گرفتار کر کے 369 افراد امریکا کے حوالے کر کے ملینز آف ڈالر کمائے!!! نجانے ہماری مظلوم بہن عافیہ صدیقی، ہمارے بے گناہ بھائی مسعود جنجوعہ، سیف اللہ پراچہ، ڈاکٹر عتیق الرحمان، ڈاکٹر عابد شریف، فیصل فراز، ماجد خان اور دوسرے قیمتی پاکستانیوں کی کتنی قیمت ان خونخوار درندوں نے وصول کی ہو گی۔ چھ سو سے زائد کی فہرست تو ہماری بیکس و مجبور بہن آمنہ جنجوعہ نے ترتیب دے رکھی ہے جس کو تھامے وہ ہر جگہ دہائی دیتی رہی کہ ہمارے پیاروں کو ہمارے حوالے کر دو، ہم تم کو امریکا سے زیادہ تاوان دینے کو تیار ہیں لیکن وہ آواز بھی تھک ہار کر خاموش ہو گئی۔ ہماری توہین اور تضحیک کا یہ سلسلہ اب بھی بند نہیں ہوا۔ اب تو دکھی ماؤں، بہنوں اور بچوں میں مزید انتظار کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ دراصل یہ ہمارے حکمرانوں نے اپنی بزدلی اور بے حمیتی کے سبب امریکیوں کو یہ اجازت دیکر انہیں آقا کے منصب اور قوم کو غلاموں کی فہرست میں کھڑا کر دیا ہے۔ افسوس کا مقام یہ ہے ہمارے حکمرانوں نے امریکیوں کے ساتھ ایک ایسا رشتہ استوار کر رکھا ہے جس میں وہ آقا ہیں اور ہم ان کے غلام۔

اسی رویہ کو دیکھتے ہوئے بھارتی بنئے نے بھی امریکی آقاؤں کی حمائت سے پاکستان کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کی وہ سب آزمودہ تراکیب استعمال کرنا شروع کر دی ہیں۔ بھارتی مطالبے سے پہلے ہی ہم نے اپنے ملک کی چند بڑی فلاحی اور رفاہی تنظیموں پر پابندی لگا کر اپنے افراد کو گرفتار کر کے گویا اعتراف جرم کر لیا۔ سلامتی کونسل میں اپنے پرانے دیرینہ مخلص دوست چین کو بھارت کی چال کے خلاف ویٹو استعمال کرنے سے منع کر دیا۔ اس خبر کے عام ہونے پر وطن عزیز میں ایک بوکھلاہٹ کا سماں پیدا ہو گیا اور قوم ابھی اس صدمے سے سنبھلی نہیں تھی کہ دو بھارتی طیاروں نے دن دیہاڑے پاکستان کی فضائی خلاف ورزی کر کے اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کی جسارت کر ڈالی۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے شاہین فوراً ان کی طرف لپکے اور وہ ناکام و نامراد

دم دبا کر بھاگنے میں عافیت جانی لیکن ہمارے حکمرانوں نے اسے تکنیکی غلطی قرار دیتے ہوئے بھارت کی صفائی دینی شروع کر دی جبکہ پاکستان کو بھارت کے اس عالمی جرم سے سلامتی کونسل کو آگاہ کرنا بہت ضروری تھا۔

اس نقش پا کے بوسے نے یاں تک کیا ذلیل
میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ہمیں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ بھارت نے پہلے دن سے پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اکھنڈ مہابھارت کا خواب وہ اب بھی اپنی آنکھوں میں سجائے بیٹھا ہے۔ بھارتی انتہاپسندوں کو شروع دن سے یہ خطرہ ہے کہ پاکستان اگر اس خطے میں طاقتور ہو گیا تو اس کے تین ایسے بڑے نقصان ہوں گے جن کی وجہ سے ان کے مستقبل کے سارے سہانے خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔ پہلا ان کے اکھنڈ مہابھارت کی تکمیل کا خواب ادھورا رہ جائے گا اور دوسرا ان کا کشمیر پر یہ دیرینہ اٹوٹ انگ کا راگ بے سرا ہو کر رہ جائے گا اور تیسرا ان کے توسیع پسندانہ عزائم کہ بحر ہند کے تمام ساحلوں پر بسنے والے ممالک پر بھارت کی اجارہ داری ہو گی، ایسا مضبوط پاکستان کی موجودگی میں ممکن نہیں ہو گا۔ انہی خطرات کی بنیاد پر اسرائیل بھی پاکستان کو اپنا پہلا اور سب سے بڑا دشمن گردانتا ہے کہ ایٹمی صلاحیت کے حامل پاکستان کی موجودگی میں اسرائیل اپنی سرحدوں کو مزید وسعت دینے سے قاصر رہے گا۔ ہنود اور یہود اس بات پر متفق ہیں کہ اب جنگ کی صورت میں پاکستان کو مٹانا آسان نہیں رہا اس لئے سازشوں کے ذریعے پاکستان کے اندر خلفشار برپا کر کے اس کو اندرونی طور پر اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ ان کے ناپاک مقاصد بغیر جنگ کے پورے ہو جائیں۔

اگست 1984ء میں ایک ایسے ہی واقعے کی نشاندہی امریکا کے ایک یہودی دانشور "ڈیوڈ ریز" نے برطانیہ کے ایک جریدے "روسی" 1990ء کے شمارہ ستمبر میں انکشاف کیا تھا کہ اسرائیل نے بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر فضائی حملہ کرنا چاہا لیکن بروقت اطلاع ملنے پر پاکستانی فضائیہ نے اپنی ایٹمی تنصیبات کی مسلسل نگرانی شروع کر دی۔ یہ صورتحال دیکھ کر اسرائیلی حملہ آور جنگی طیاروں نے سری لنکا کے ہوائی اڈوں کو استعمال کیا تھا اور اس وقت کی بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے پاکستان پر حملہ کرنے کیلئے یعنی (ڈی ڈے) نومبر کی پہلی تاریخ 1984ء بھی طے کر لی تھی لیکن پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملے کے جواب میں ایک خوفناک رد عمل کا بھی ایسا ہی جب اظہار کیا گیا اور ذاتی طور پر پاکستانی فوج کے سربراہ نے مائیکل مولن کو اس سے آگاہ کر دیا تھا کہ کسی بھی بھارتی مکروہ جسارت کو کھلی جنگ تصور کیا جائے گا اور پاکستان اپنی سلامتی کیلئے کسی حدود و قیود کا پابند نہیں ہو گا اور بھارت کو تو اپنے ٹکڑے سمیٹنا مشکل ہو جائے گا جس سے اس وقت جنگ کا خطرہ تو ٹل گیا لیکن اسی دن ٹرائیکا (بھارت، اسرائیل اور امریکا) نے یہ طے کر لیا کہ اب جنگ کے ذریعے نہیں بلکہ پاکستان کو ایسے اندرونی خلفشار میں مبتلا کر دیا جائے جس کی بناء پر ملک کو خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی معاشی طور پر ایسا کمزور کر دیا جائے کہ خود پاکستانی عوام مہنگائی اور غربت کے ہاتھوں اس قدر مجبور کر دیئے جائیں کہ روٹی کے بدلے بم سے دستبرداری کو بخوشی قبول کر لیں۔

پاکستان میں جس قدر تیزی کے ساتھ دہشتگردی میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی سیاسی انارکی پیدا کر کے مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں۔ دہشتگردی کو روکنے کیلئے دہشتگردوں کے تعاقب میں ان کی سرکوبی کیلئے اعلان ہو چکا ہے جس سے خطرات میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

یادرکھیں دشمن یہی چاہتا ہے کہ سیاسی انار کی پیدا کرنے کے ساتھ پڑوسی ممالک کے ساتھ خانہ جنگی کا ماحول پیدا کر دیا جائے تا کہ خاکم بدہن پاکستان کو اندر بیٹھے عناصر کے ہاتھوں ٹکڑے کر دیا جائے۔ یادرکھیں! پاکستان کو توڑنے والوں کا انجام ہم سب کے سامنے ہے۔ مجیب کو اس کے سارے خاندان سمیت ڈھاکہ میں کیفر کردار تک پہنچادیا گیا، اندرا گاندھی کو اس کے اپنے محافظ نے گولیوں سے چھلنی کر دیا اور جنرل یحیٰ خان ایک خطرناک بیماری کا شکار ہو کر چل بسا۔ پاکستان کو دو ٹکروں میں تقسیم کرنے والے ملک یونین روس کی یونین قائم نہ رہ سکی اور وہ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

پاکستان کو ختم کرنے کے بارے میں پچھلے کئی سالوں سے پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے لیکن اللہ کے فضل و کرم سے یہ ابھی تک دنیا کی تمام ظالم صہیونی طاقتوں کا مقابلہ کر رہا ہے لیکن صدمہ اس بات کا ہے کہ ملک میں ایک دفعہ پھر غیر آئینی کھلواڑ شروع ہو چکا ہے۔ حکومت اور اپوزیشن دونوں پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں، دونوں ایک دوسرے کو سیاسی اختلافات کو ذاتی دشمنی تک لے گئے ہیں۔ اب کوئی ایسی تیسری قوت نہیں جو ان کے درمیان اختلافات کی بھڑکتی آگ کو سرد کرنے کا کام کر سکے۔ عدلیہ کے پے در پے فیصلوں نے حکومت کو کئی آزمائشوں میں مبتلا کر دیا ہے جبکہ پیٹی آئی جو عدلیہ سے خار کھائے بیٹھی تھی، اب عدلیہ کے فیصلوں پر کسی بھی مصالحت کیلئے تیار نہیں جبکہ عدلیہ نے ایک مرتبہ ملکی حالات پر اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے خود کو بری الذمہ اور سیاسی جماعتوں کو آپس میں مذاکرات کا کہا تھا لیکن اس وقت ملک جس نازک دور میں داخل ہو چکا ہے، بعید نہیں کہ مزید تاخیر کے بعد اس کے سنبھلنا ناممکن حدود کو چھونا شروع کر دے جس کی بھاری قیمت سب کو ہی چکانا پڑے گی۔

پاکستان کے موجودہ حالات کیا مخبر صادق میرے رسول اکرم ﷺ کی بشارتوں کی نوید تو نہیں سنا رہے؟ کیا یہ دو وہی میدان جنگ نہیں جن کا تذکرہ آپ ﷺ نے یروشلم اور ہندوستان کا نام لیکر فرمایا ہے، امام بخاری کے استاد محترم امام نعیم بن حماد کی کتاب الفتن میں احادیث میں ان دونوں علاقوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ "اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے کچھ لوگ ہندوستان کے خلاف جنگ کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو فتح سے ہمکنار کرے گا، چنانچہ وہ ہندوستان کے بادشاہوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لائیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمادے گا اور وہ پھر شام میں عیسیٰ ابن مریم کو پائیں گے"۔ یہ دونوں معرکے الگ اور ان کے بیانات بھی جدا جدا ہیں لیکن یہ دونوں میدان جنگ جس تیزی سے گرم ہو رہے ہیں وہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہود فلسطین میں ہنود کی اسلحہ کی ترسیل کے ساتھ ہندوؤں نوجوانوں کو بھرتی کر کے مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہو چکا ہے۔ اب خواہ یہ معرکے آج ہوں یا کچھ دیر بعد، ایک بات مخبر صادق میرے رسول اکرم ﷺ کی بشارتوں سے واضح ہے کہ مغفرت اور فتح انہی دونوں مقامات کا حصہ اور انہی لوگوں کا مقدر ہے۔ تعجب اور حیرت تو یہ ہے کہ میرے مخبر صادق رسول اکرم ﷺ جن دو قوموں سے جنگ کو جنت کی بشارت سے مربوط کرتے ہیں ہم انہی سے دوستی، اعتماد کی فضا اور پرامن بقائے باہمی کی باتیں کرتے ہیں۔ اس رسول برحق ﷺ کی بشارتوں کے منکر روز حشر اس کی شفاعت کس منہ سے طلب کریں گے جن کے شب و روز ان صہیونی طاقتوں کے احکام کی تعمیل میں صرف ہو رہے ہیں۔

عربی کی ایک بڑی حکیمانہ مثل مشہور ہے کہ جب اونٹ بلبلانے لگے تو اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ، جب کوئی سیلابی ریلہ اپنے کناروں سے باہر آنے کی کوشش کرے تو اس کے سامنے سے بھی ہٹ جاؤ اور جب کبھی غلام کا چہرہ سرخ ہو جائے تو اس کے سامنے سے بھی ہٹ جاؤ۔ ہندوستان میں گجرات احمد آباد، کشمیر اور فلسطین میں غلام مسلمانوں کا نہ صرف چہرہ سرخ ہو گیا ہے بلکہ ان کی آنکھوں میں بھی برسوں کی توہین اور تضحیک کی سرخی بھی اپنے عروج پر ہے، برسوں ظلم و ستم سہتے سہتے ان کے صبر کا سیلاب بھی کناروں کو کسی بھی وقت توڑ کر ان صہیونی طاقتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالیجانے کو تیار ہے اور اسی طرح راجستھان سندھ کے صحراؤں میں اونٹوں نے بلبلانا شروع کر دیا ہے۔ تاج گرانے اور اچھالنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ پانی پت تو کبھی

بھی دور نہیں رہا لیکن اب یہ طوفان پانی پت سے ہوتا ہوا اپنے مستقل مستقر کی طرف اس طرح لپکے گا کہ آئندہ کئی صدیاں انسانیت کیلئے امن و امان کی ضامن رہیں گی۔ مقتدر اشرافیہ اور سیاستدانوں کو بھی پاکستانی قوم کی توہین اور تضحیک کی بڑی بھاری قیمت چکانی پڑے گی اور میرا وجدان اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ وہ وقت اب دور نہیں۔ لیکن دیکھئے بابا اقبال کیا کہتے ہیں!

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں؟
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سُود و بے اثر
تیغ و تُفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں
ہو بھی، تو دل ہیں موت کی لذّت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لَرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اُسے کہ مسلماں کی موت مر
تعلیم اُس کو چاہیے ترکِ جہاد کی
دُنیا کو جس کے پنجۂ خُونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زِرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پُوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر

بروز جمعۃ المبارک 20 محرم الحرام 1446ھ 26 جولائی 2024ء

خودکشی یا خودکش بمبار، فیصلہ کن گھڑی!

خاموشی کی زبان آپ سمجھتے ہیں؟ نہیں..... تو اس میں میرا کیا قصور! خاموشی میں ایک چیخ پوشیدہ ہوتی ہے، ایک احتجاج، ایک طوفان، اور جب خاموشی بول پڑے تو گھمسان کا رن پڑتا ہے، پھر کوئی نہیں بچتا.....جی، کوئی بھی نہیں۔ وہ جو محلات میں آسودہ ہیں اور وہ جو کھولیوں اور جھونپڑیوں میں تڑپ رہے ہیں سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بس دیکھتے جاؤ، ایک انتظار کے بعد کیا ہوتا ہے، حادثہ ایک دم تو نہیں ہوتا ناں! برسوں وقت اس کی پرورش کرتا ہے، پالتا پوستا ہے، پھر ایک دن لاوا پھٹ پڑتا ہے، پھر وہ دہکتی آگ کچھ نہیں دیکھتی.... مال و منال، عزت و آبرو، ذلت و رسوائی، زردار اور بے زر، کچھ بھی نہیں۔

عجیب سلسلہ چل نکلا ہے کہ ہمارے حکمران اور اپوزیشن دن دیہاڑے قوم کے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کر کے خود کو مسیحا ثابت کرنے کا سہرا اپنے سر سجانے کی کوششوں میں مگن ہیں۔ قوم کو بھیڑ بکریاں سمجھ کر خطاب کیا جاتا ہے، ان کے مصائب کا بڑی دلسوزی سے ذکر کر کے ہیرو بننے کی اداکاری کمال کی حدوں کو چھو رہی ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ آپ کے اعمال کے آئینے تو بکھرے پڑے ہیں اور وہ ہمیں شکل دکھانے سے باز نہیں آتے۔ آئینے کی لاکھ کرچیاں کر دیں، وہ کبھی اپنا کام نہیں چھوڑتے۔

انتخابات کو 6 ماہ گزر گئے، کیا قوم کے ٹیکسوں پر پلنے والے اسمبلی ممبران نے عوام کی فلاح کیلئے کوئی پروگرام دیا ہے، بس ایک دھینگا مشتی جاری ہے، ایک دوسرے پر الزامات کی بھرمار نے قوم کا سانس لینا مشکل کر دیا ہے۔ ہر کوئی قوم کو لوٹنے کیلئے کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا۔ کیا اپوزیشن نے بجٹ میں خود کو وصول کرنے والی مراعات کو ٹھکرایا ہے بلکہ دو درجن سے زائد قائمہ کمیٹیوں کے سربراہوں نے اسپیکر سے اپنے لئے نئی گاڑیوں کا مطالبہ کر دیا ہے۔ دوسری طرف عدلیہ کے ہر اس فیصلے کی توتائید کی جاتی ہے، انصاف زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں لیکن جونہی کوئی فیصلہ خلاف اتا ہے تو وہی عدلیہ مطعون ٹھہرائی جاتی ہے، گویا ہر کوئی اپنی فرعونی صفات و اختیارات کی حکمرانی چاہتا ہے۔

آپ کو یہ خبر تو مل چکی ہو گی کہ سلمان شہباز کے آئی پی پی "چنیوٹ پاور" کو تین مہینے کی 63 کروڑ کی کیپیسٹی پینٹ کی گئی ہے۔ یہ وہ ادائیگی ہے کہ جس کا تعلق اس بات سے ہر گز نہیں کہ چنیوٹ پاور نے کتنی بجلی پیدا کی اور کتنی تقسیم کی بلکہ یہ صرف اس کیپیسٹی کی ادائیگی ہے جو اس کے پلانٹ میں موجود ہے۔ یاد رہے کہ نواز شریف جون 2013ء میں وزیر اعظم بنے۔ اسی سال نومبر میں چنیوٹ پاور لمیٹڈ نے نیپرا میں پاور جنریشن کے لائسنس کیلئے درخواست دی۔ نیپرا کے افسر نے لائسنس کی درخواست کا جائزہ لینے کے بعد اسے مسنوخ کر دیا کیونکہ کمپنی نے بجلی کی ڈسٹری بیوشن کیلئے انفراسٹرکچر لگانے سے انکار کر دیا تھا۔ نیپرا کے اس افسر کو انکار کی کیا قیمت چکانی پڑی، وہ ایک الگ داستان ہے!

سیاں جی (نواز شریف) کو توال ہو اور سگا باپ پنجاب کا وزیر اعلٰی، تو پھر ڈر کیسا، ہنگامی طور پر فیصل آباد الیکٹرک اتھارٹی کی طرف سے ایک لیٹر لیا گیا جس میں انہوں نے اس بات کی حامی بھری کہ وہ اپنے خرچے پر چنیوٹ پاور سے ڈسٹری بیوشن لائن بچھانے کو تیار ہیں۔ چنانچہ جون 2014 کو سلمان شہباز کی کمپنی کا لائسنس منظور کر لیا گیا۔ اس لائسنس کی درخواست میں کہا گیا تھا کہ چنیوٹ پاور 62 میگاواٹ میں سے 15 میگاواٹ بجلی رمضان شوگر مل کو بیچے گی۔ رمضان شوگر بھی شریف خاندان کی ملکیت ہے۔ نیپرا کے قواعد کے مطابق آئی پی پی ایک میگاواٹ تک کی بجلی ڈائریکٹ پرائیوٹ کنزیومر کو بیچ سکتا ہے، اسے "بلک پاور پرچیز" کہتے ہیں اور سلمان شہباز کو 15 میگاواٹ بجلی بیچنے کی اجازت دے دی گئی گویا اس حکم نامے کے بعد آئندہ ان تمام ایماندار

آفیسر کو بھی متنبہ کر دیا گیا کہ سیٹھ منشاء کو استعمال کرتے ہوئے حسبِ منشا کام بہر صورت ہو کر رہیں گے اور کوئی ہماری منشاء کے خلاف زبان و قلم استعمال کرنے کی جرات نہ کرے۔

کہتے ہیں کہ لالچ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔۔۔ تین ماہ بعد چنیوٹ پاور نے لائسنس میں ترمیم کی درخواست کی جس کے مطابق چنیوٹ پاور لمیٹڈ مزید دوسری پرائیوٹ کمپنیوں کو بھی بجلی بیچنا چاہتا تھا۔ ان کمپنیوں میں شریف ڈیری فارمز، شریف ملک پراڈکٹس، یونیٹاس سٹیل، کرسٹل پلاسٹکس شامل تھیں۔ ان سب کمپنیوں کی ضرورت ایک میگاواٹ سے کم تھی اس لئے وہ بلک پرچیز کی کیٹیگری میں نہیں آتے تھے لیکن اوپر تایا نواز شریف بیٹھا تھا، نیپرا کے کسی افسر میں دم نہیں تھا کہ انکار کر سکے، اس لئے یہ درخواست بھی منظور کر لی گئی۔

چنیوٹ پاور پلانٹ گنے کے بھوسے اور چینی کے خام مال کو استعمال کر کے بجلی بناتا ہے۔ اس پلانٹ کی قانونی اور فنی میعاد 20 سال ہوتی ہے لیکن نیپرا نے چنیوٹ پاور کو 20 کی بجائے 30 سال کا لائسنس عنایت کر دیا۔ صرف یہی نہیں، نیپرا کا ماننا تھا کہ اس طریقے سے بجلی پیدا کر کے چنیوٹ پاور والے ماحولیات کی زبردست خدمت کریں گے، چنانچہ انہیں کاربن کریڈٹ کا بھی حقدار ٹھہرایا گیا جس کی مد میں سالانہ کروڑوں روپے مزید حکومت نے سلمان شہباز کو دینے شروع کر دیئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، چنیوٹ پاور لمیٹڈ، رمضان شوگر کے خام مال سے بجلی تیار کر کے اپنے ہی خاندان کی فیکٹریوں کو سستی بجلی بیچتی ہے اور کیپیسٹی پیمنٹ کے نام پر عوام کے ٹیکسوں سے ہر مہینے 21 کروڑ روپے مفت میں وصول کر لیتی ہے۔ یہ سب باتیں ہوا میں نہیں کہی گئیں، ان سب کے دستاویزی ثبوت بھی موجود ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے حکمرانوں کے دلوں میں شب و روز عوام کے دکھوں کا درد اس زور سے اٹھتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ نجانے یہ رات بھی گزار پائیں گے کہ نہیں۔

اُدھر دوسری طرف ہمارے یہی حکمران ملکی معیشت کی بربادی اور ڈوبنے پر شب و روز ماتم کر رہی ہے کہ قوم کو اس دھوکے میں رکھا جائے کہ یہ تو ملک کی تقدیر سنوارنے کے اعلیٰ اور ارفع کام کیلئے قربانیاں دے رہے ہیں اور عالمی اداروں اور امیر دوست ممالک کے سامنے مدد کیلئے ہاتھ پھیلائے کھڑے فریاد کر رہے ہیں لیکن کیا ہم جانتے ہیں کہ انہی حکمرانوں کی عیاشیوں کی بناء پر دنیا ہمارے بارے میں کیا سوچ رہی ہے۔

دنیا پاکستان کو ایک خطرناک ملک سمجھتی ہے۔ جب تک آپ اس حقیقت کو قبول نہیں کریں گے، آپ الجھتے رہیں گے۔ یہ تو ثابت ہو گیا کہ آپ معاشی طور پر اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ بیشتر مالی امور کے ماہرین اب ملک کو دیوالیہ قرار دے چکے ہیں، اس لیے آپ کسی بھی وقت دنیا کیلئے ایک مسئلہ بن سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کو دنیا کے مشاہدے کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے، ورنہ ہم ایسی کھائی میں گرنے جا رہے ہیں کہ قلم وہ منظر نامہ لکھنے سے لرزاں ہے۔ اب بھی اگر ہم نہ سنبھلے تو خاکم بدہن تاریخ بطور عبرت آپ کو یاد رکھے گی۔

معیشت دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ اگر آپ معاشی طور پر طاقتور ہیں تو آپ جوہری بم رکھ سکتے ہیں اور میزائل بنا سکتے ہیں۔ چین اور روس کے پاس بھی یہ ہیں لیکن دنیا انہیں خطرہ نہیں سمجھتی، کیوں؟ کیونکہ دنیا کا ماننا ہے کہ یہ دونوں ممالک معاشی طور پر مستحکم ہیں۔ وہ کبھی بھی اس دنیا کیلئے خطرہ نہیں بنیں گے اور کسی بھی صورت اپنی اس ایٹمی اسلحے کو کسی اور کے ہاتھ فروخت نہیں کریں گے لیکن پاکستان ایک کمزور ملک ہے، وہ اپنے جوہری اثاثوں کی زیادہ دیر تک حفاظت نہیں کر سکتا۔ یہ انہیں پیسے کیلئے فروخت کر سکتا ہے یا نفسیاتی دباؤ میں استعمال کر سکتا ہے، جس سے آپ دنیا کیلئے ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔

میں ایک مثال کے ساتھ اس مسئلے کی وضاحت کر دیتا ہوں۔ فرض کریں کہ آپ ایک غریب آدمی ہیں اورآپ کے پاس ایک بہت ہی مہلک اور قیمتی رائفل ہے۔ آپ اس رائفل کے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟ آپ اسے پیسے کیلئے فروخت کر سکتے ہیں، یا آپ اسے کسی کے سر پر رکھ کر انہیں لوٹ سکتے ہیں یا اس کی جان لے سکتے ہیں۔ دنیا سوچتی ہے کہ آپ اتنے بھوکے اور غریب رائفل بردار ہیں اور آپ کسی بھی وقت ان میں سے کسی بھی آپشن کو اپنا سکتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ ہمارے ایٹمی پروگرام کے مخالفین ایک لمحے کیلئے بھی ہمارے اس پروگرام کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور اقوام متحدہ جیسا ادارہ بھی ان کی لونڈی کے طور پر کام کر رہا ہے۔

برا نہ منائیں اور اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ ان حالات میں پہنچانے میں ہمارے حکمرانوں کا سب سے بڑا ہاتھ ہے کہ یہ اپنے اقتدار کیلئے ہر ناجائز حربے کو اپنے لئے جائز قرار دینے میں ماہر ہیں۔ پھر دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کے خلاف یہ تاثر بھارت نے اپنی پوری حکمت عملی کے ساتھ پھیلایا ہے۔ انڈیا نے 1990 کی دہائی میں ان گنت طلباء کو اسکالرشپ کے ساتھ امریکا، کینیڈا، برطانیہ ویورپ اور مشرق بعید کے ممالک بھیجا۔ انہوں نے اعلیٰ اداروں سے ڈگریاں حاصل کیں اور پھر انہیں عالمی اداروں میں ملازمت دلوائی۔ یہ لوگ امریکی کانگریس مین اور سینیٹرز کے عملے کا حصہ ہیں اور میڈیا انڈسٹری اور تھنک ٹینکس میں بھی ہیں بلکہ برطانیہ میں پہلی مرتبہ انڈین نژاد وزیر اعظم بن کر اپنی کابینہ کے اہم اداروں کی سربراہی بھی انڈین نژاد کے سپرد کر کے کئی برس انڈیا کے اس خواب کو حقیقت بھی بنا کر دکھا دیا۔ وہ وہاں بیٹھ کر ہر روز آپ کے خلاف خوف پھیلاتے ہیں اور دنیا اس خوف کو سچ مانتی ہے۔

آپ کا ماضی بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ آپ نے اکیلے ہی سوویت یونین کی طاقت کو تباہ کیا۔ آپ نے ہندوستان جیسی مکار طاقت کو ابھرنے نہیں دیا اور تمام تر معاشی کمزوریوں کے باوجود آپ وہ حاصل کر لیتے ہیں جو آپ چاہتے ہیں اور دنیا کو حیران و پریشان کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ نے جے ایف تھنڈر بھی بنایا ہے جس نے عالمی طور پر خود کو منوایا ہے، آپ میزائل ٹیکنالوجی میں وہاں کھڑے ہیں جس نے ان کی نیندوں کو حرام کر دیا ہے بلکہ اپنے کامیاب ایٹمی میزائلوں کے 100 فیصد صحیح نشانے کا تجربہ ان طاقتوں کے ماہرین کو بلا کر ان کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہیں لہذا عالمی پالیسی سازوں کو لگتا ہے کہ آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن عالمی طاقتیں آپ کو جنگ کا موقع نہیں دیں گی۔ ان کا ماننا ہے کہ آپ روایتی جنگ نہیں لڑ سکتے۔ آپ فوری طور پر حتمی ہتھیار کے ساتھ ایک جنگ شروع کریں گے، اور یہ پوری دنیا کیلئے خطرناک ہو گا، لہذا وہ آپ کو اس سطح تک نہیں پہنچنے دیں گے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ انڈیا نے بالاکوٹ میں سرجیکل اسٹرائیک کی۔ پاکستان نے شور مچایا لیکن دنیا کا کوئی ملک پاکستان کی مدد کیلئے آگے نہیں آیا، کیوں؟ کیونکہ دنیا اس بات کا اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ آپ کس سطح پر ردعمل دے سکتے ہیں۔ اگلے دن آپ نے دو بھارتی طیارے مار گرائے۔ بھارت نے 27 فروری کی رات کو سرحد پر 9 میزائل تعینات کیے اور آپ نے 14 میزائل تعینات کر کے ایک کھلا اور خطرناک پیغام دے دیا کہ پاکستان خود پر حملے کے جواب میں کہاں تک جا سکتا ہے جو کہ آپ کا حق بھی تھا۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے بھی جنرل ضیاء کی کرکٹ ڈپلومیسی کا واقعہ بھی ذہن میں رکھ لیں کہ کس طرح جنرل

ضیاء نے بھارتی سرزمین پر راجیو کو یہ پیغام دیا تھا کہ اگر اس نے اسرائیل کے ساتھ مل کر پاکستان پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو اس کے جواب میں دنیا میں پھر بھی 55 مسلم ریاستیں باقی رہیں گی لیکن صدیوں تک دنیا بھر میں ہندو ریاست کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔

اب یہی معاملہ ایک مرتبہ پھر درپیش آ گیا۔ 27 فروری کی رات سرد جنگ کے بعد دنیا کی سب سے خطرناک رات تھی۔ ایک چھوٹی سی شرارت پوری دنیا کو تباہ کر سکتی تھی۔ لہٰذا دنیا فوری طور پر متحرک ہو گئی اور بڑی مشکل سے حالات کو پر سکون کر دیا۔ یہ پاکستان کا ایک امتحان تھا، اس ٹیسٹ سے پتہ چلا کہ آپ لوگ ہمیشہ آخری جنگ کیلئے تیار رہتے ہیں، لہٰذا ان تمام قوتوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آپ کو دوبارہ اس سطح تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ وہ آپ کو اپنے میزائلوں کو باہر لانے کا موقع نہیں دیں گے۔ وہ آپ کو سرحدوں پر بھی مشتعل نہیں کریں گے۔ انہوں نے اس کا متبادل یہ سوچ کر فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ آپ کو معاشی طور پر تباہ کر دیں۔

میرے الفاظ نوٹ کر لیں۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آئی ایم ایف جان بوجھ کر آپ کے پیکیج میں تاخیر کیوں کرتا ہے؟ تاکہ ڈالر مزید مہنگا ہو جائے جس سے افراط زر بڑھتا جائے گا، قرضوں میں جہاں اضافہ ہو گا وہاں پیٹرول، گیس اور بجلی بھی مہنگی ہو جائے گی۔ اس سے ترقیاتی بجٹ میں بھی کمی آئے گی۔ اس سے بے روزگاری میں اضافہ ہو گا۔ اس سے ریاست کے ذریعے کا لعدم تنظیموں پر اتنا دباؤ پڑے گا کہ وہ حکومت کے خلاف بغاوت کریں گے۔ اس سے پاکستان کی برآمدات میں بھی اضافہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ٹیکسوں میں اتنا اضافہ ہو گا کہ عوام اس معاشی بوجھ تلے دب جائیں گے اور حکومت اور ریاست دونوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

پاکستان کے خلاف یہ خطرناک منصوبہ شروع ہو چکا ہے۔ آپ نے جیک رسل نسل کے کتوں کے بارے میں ضرور سنا ہو گا۔ یہ ایک چھوٹے سائز کا خوفناک کتا ہے جو ریچھ کا پیچھا کرتا ہے۔ یہ سائز میں اتنا چھوٹا ہے کہ ریچھ اسے پکڑ نہیں سکتا۔ یہ ریچھ کو پیچھے سے زخمی کرتا رہتا ہے اور اسے اتنا زخمی اور بے بس کر دیتا ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ جیک رسل مکمل طور پر مطمئن ہو کر اپنے مالک کو مطلع کرتا ہے، اور شکاری ریچھ کو گولی مار دیتا ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے بھی جیک رسل کی طرح ہیں۔ جیک رسل نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ آپ کو زخمی کر رہے ہیں۔ وہ ہر آئے دن آپ کو معاشی طور پر اتنا کمزور بنا رہے ہیں کہ آپ اپنے میزائلوں کو باہر لانا تو دور کی بات، انہیں فائر کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ آپ کے پاس سرکاری ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے کیلئے بھی پیسے نہیں ہوں گے۔ آپ ٹیکس جمع کرنے کا کام فوج کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں گے جس طرح آپ نے بجلی چوروں کے خلاف فوج کو میدان میں اتارا تھا۔

اور جس دن ایسا ہوتا ہے، تو پھر آپ اپنے دن گننا شروع کر دیں، کیونکہ ٹیکس جمع کرنے سے فوج کی ساکھ خراب ہو جائے گی۔ اس کیلئے لوگوں کی محبت کم ہونا شروع ہو جائے گی، اور فوج کے خلاف آپ کے ملک کی ایک جماعت پہلے ہی سوشل میڈیا پر محاذ کھول چکی ہے اور درپردہ اس جماعت کے سوشل میڈیا کو دشمن ممالک کی مکمل اعانت بھی حاصل ہے۔ امریکی اداروں کی طرف سے بھی انسانی حقوق کے نام پر آپ کو انتباہ کیا جا رہا ہے، برطانوی پارلیمنٹ میں بھی ان کے گماشتے سرگرم ہو گئے ہیں، اور عالمی ادارے یہی چاہتے ہیں۔ آپ کو معاشی طور پر زخمی کر کے اور لوگوں کے دلوں سے محبت کو ختم کرنے کے عمل پر تیزی سے کام کر رہے ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ اگر حالات اسی تیزی کے ساتھ بڑھتے گئے تو خاکم بدہن ایک دن ایسا نہ آ جائے کہ وہ آپ کو ہندوستان کے قدموں پر بٹھا دیں۔ اور آپ کو بھی بھوٹان اور مالدیپ بنا دیں۔ آپ امداد لیتے رہیں گے اور ان کے احکام کے مطابق ملک چلاتے رہیں گے اور بس۔

تاہم پہلی مرتبہ میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ فوج کو آئی پی پیز نامی تباہی کی ذمہ داری لینے سے بری نہیں کر سکتے۔ بد قسمتی سے فوج ہماری معیشت کی اس سب سے بڑی ڈکیتی پر ان لوگوں کی طرف سے آنکھیں بند کر رہی ہے جو ایک بار پھر اقتدار میں ہیں بلکہ پی ڈی ایم کا آزمودہ شاہکار ہے۔ قوم سمجھتی ہے کہ فوج در پردہ خاموش تو ہے لیکن یہ رویہ سیاستدانوں اور ان افراد کو انتہائی مہلک گولہ و بارود فراہم کر رہا ہے جو اپنے مفادات کیلئے قومی خزانے پر ایسا بوجھ بن گئے ہیں جو اس ملک کو ڈبونے کے درپے ہیں۔ باجوہ کے نظریے نے پاکستان کو اپنے تمام منفی اثرات کے ساتھ نشانہ بنایا، اس نے اپنے مفادات کے حصول کیلئے کشمیر کو فروخت کر دیا اور ملک کے دو درجن صحافیوں کو بلا کر اپنی بزدلی کی کہانیاں سنا کر قوم کو مایوس کیا۔ کشمیر کو انڈیا کی جھولی میں گرا کر فیض حمید کے توسط سے اجیت ڈوول کے ساتھ مودی کے پاکستانی دورے کا اہتمام کرنے میں مصروف تھا تاکہ اپنے آقاؤں کو خوش کر کے جہاں نوبل پرائز کا اہل قرار پائے وہاں اسے دوبارہ مدت ملازمت میں توسیع مل جائے جبکہ عمران خان نے تو اسے ایسی پیشکش بھی کر دی تھی جس کو خود عمران خان نے تسلیم بھی کیا لیکن جب بات نہ بن سکی تو عدم اعتماد کا راستہ کھول کر ہمیں یہ پی ڈی ایم تحفے میں دیا اور جب سے باجوہ نے عمران کے سر پر ہاتھ رکھنے کا سفر شروع کیا اور بعد ازاں پی ڈی ایم کو ہمارے سروں پر مسلط کیا ہم تب سے تیزی کے ساتھ اپنی تباہی کی طرف بگٹٹ بھاگ رہے ہیں۔ میں ہمت کر کے اگر یہ کہوں کہ آخر ہمیں ان بدمعاشوں کا ساتھ دینے کی کیا ضرورت تھی؟

ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہو گا، اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا ہو گا اور پھر حالات کو درست کرنے کے طریقے تلاش کرنا ہوں گے۔ آئی پی پیز کے لائسنس منسوخ کر کے ان سے قوم کی لوٹی ہوئی دولت بازیاب کی جائے اور اس کیلئے اگر عالمی عدالت میں بھی جانا پڑے تو اپنے مضبوط کیس کیلئے تیار ہونا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہمت کر کے باجوہ، فیض حمید اور چند دیگر سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے ساتھ ساتھ ان ججز کو جو ان کے اشارے پر فیصلے سناتے رہے، سب کو کٹہرے میں لا کر صفائی کا کام شروع کرنا ہو گا، فوری طور پر تمام اسمبلی کے ممبران، ججز، بیوروکریٹس، سیاستدان، جنرلز اور دیگر تمام سرکاری اداروں کے افراد کی تمام مراعات ختم کی جائیں جو کھربوں روپے سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔ کروڑوں روپے جو پروٹوکول پر خرچ کئے جا رہے ہیں، سب سے پہلے اس پر پابندی لگائی جائے، اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔

آپ یقین کریں کہ میرے انتہائی محترم عالمی شہرت یافتہ دوست پروفیسر انتھونی لیڈز نے اچانک مجھے یہ سوال کر دیا کہ کیا پاکستان اپنا قرض واپس کر سکے گا جبکہ اس سے قبل وہ مجھے صدر پاکستان زرداری کے پروٹوکول کی ایک ویڈیو ارسال کر چکے تھے۔ میرا شرم سے سر جھک گیا اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کبھی آپ نے سوچا کہ عالمی مالیاتی اداروں کو اشرافیہ کے ان تمام فضول چونچلوں کا علم ہے لیکن کیا انہوں نے کبھی اس پر پابندی کا کہا ہے؟ عالمی مالیاتی ادارے جب بھی کسی پابندی کا حکم دیں گے، اس کا تعلق پاکستانی عوام کی کمر توڑنے کی طرف ہو گا تاکہ پاکستانی عوام جلد از جلد بغاوت کیلئے باہر آئے اور بقیہ کام وہ خود سرانجام دیں گے۔

ہینڈ ڈیپچ ورک کا سہارا لینے کی بجائے ہمیں یہ کام فوری طور پر اخلاص کے ساتھ شروع کرنا ہو گا۔ یاد رکھیں! اگر ہم غلط دشمن کے خلاف یہ غلط جنگ لڑتے رہے تو حالات مزید خراب ہوتے جائیں گے اور عین ممکن ہے کہ مہنگائی کے ہاتھوں مجبور قوم خودکشیاں کرنے کی بجائے خودکش بمبار نہ بن جائیں؟ میں اس دن سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں!

بروز اتوار 22 محرم الحرام 1446ھ 28 جولائی 2024ء

حتمی انجام کیلئے تیار ہو جاؤ

14 / اگست 1947ء کو جب پاکستان دنیا کی سب سے زیادہ مسلم آبادی والی ریاست کی حیثیت سے نقشے پر ابھرا تھا تو قائد نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پہلا گورنر جنرل بنانے سے اس لئے انکار نہیں کیا تھا کہ وہ خود اس عہدے کے خواہاں تھے بلکہ اس لئے کہ اپنی قوم اور اقوام عالم کو یہ باور کروایا جائے کہ اب برطانوی راج ختم ہو گیا اور سلطانی جمہور کا زمانہ آ گیا ہے اور ملک کے فیصلے ملک کے اندر ہوں گے۔ یہ سیاسی آزادی کی علامت تھی۔ اس کے ایک سال بعد جب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ آیا پاکستان کے طے شدہ تمام اثاثے پہلے کی طرح "ریزرو بینک آف انڈیا" میں جمع رہیں یا اس کا اپنا بینک ہو، قائد اعظم نے فیصلہ کیا کہ آزاد ملک پاکستان کا اپنا آزاد بینک ہونا چاہئے، اس طرح انہوں نے اقتصادی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے قیام کا اعلان کیا اور کراچی میں بولٹن مارکیٹ میں واقع تاریخی عمارت میں پاکستان کے پہلے اسٹیٹ بینک کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ایسا معاشی نظام نہیں چاہتا جس میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہو جائے۔ سودی نظام کو استحصالی نظام قرار دیتے ہوئے ماہرین اقتصادیات اور علمائے دین کو تلقین کی کہ وہ اسلام کے اصولوں پر مبنی بینکاری کے قیام کیلئے تحقیق اور غور و خوض کریں۔ اسی طرح انہوں نے سابقہ مشرقی پاکستان کی بندرگاہ چٹاگانگ میں اپنے خطاب میں استحصال کے خاتمے اور فلاحی مملکت کے قیام پر زور دیا۔

انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں رہنما اصول متعین کیا اور کہا کہ پاکستان دنیا کے ہر ملک سے برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات کا خواہاں ہے لیکن ساتھ ہی مظلوم قوموں کی حمائت بھی جاری رکھے گا۔ یہ صرف سیاسی بیان نہیں تھا جیسا کہ ہمارے سیاستدان کرتے ہیں، بلکہ قائد نے فلسطین، جنوبی افریقا اور انڈونیشیا کے عوام کی جدوجہد آزادی کی کھل کر برملا حمائت کی، نسلی امتیاز اور نو آبادیات کے خاتمے کیلئے قرار واقعی اقدامات بھی کئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صرف مسلم ممالک کی آزادی کے حامی تھے تو جنوبی افریقا کی اکثریت تو غیر مسلم تھی تو پھر انہوں نے اس کی حمائت کیوں کی؟

قائد اعظم نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں سلطنت برطانیہ کے زمانے سے تعینات فوج کو ان کی چوکیوں سے واپس بلا لیا اور کہا کہ اب ہمارے قبائلی بھائی ہماری شمال مغربی سرحد کی حفاظت کریں گے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ 60 سال بعد کوئی خود ساختہ محافظ پاکستان امریکی قصر سفید میں بیٹھے فرعون کے حکم پر ان ویران چوکیوں پر جو اب کھنڈر بن گئیں تھیں، پھر فوج تعینات کر دے گا جیسے برصغیر کے برطانوی آقاؤں نے حریت پسندوں کی بستیوں پر سامراج کی گرفت مضبوط کرنے کیلئے تعمیر کیا تھا۔ جہاں سیاسی ایجنٹ چیدہ چیدہ قبائلی سرداروں کو رشوت دیکر ان کی وفاداریاں خرید لیتے تھے۔ یہ کاروبار اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گیا جب اسی آمر نے اپنے غاصبانہ اقتدار کو طول دینے کیلئے چند ڈالروں کے عوض قبائلی عوام کو کچلنے کیلئے امریکی سی آئی اے کو وہاں اڈے بنانے کی اجازت دی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ اس سے قبل خود ساختہ یا مغرب ساختہ دختر مشرق (مغرب) نے امریکی خفیہ پولیس ایف بی آئی کو پاکستان می سرزمین پر تھانے قائم کرنے کی اجازت دی تھی۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ قائد اعظم تو انگریز گورنر جنرل گوارہ کرنے کو تیار نہیں تھے اور ایک ایک کر کے نو آبادیات کی باقیات کو مٹانے کی مثال قائم کر کے رخصت ہوئے جبکہ ان کی وفات کے تقریباً نصف صدی کے بعد آنے والے حکمرانوں نے استعمار کے غیر ملکی گماشتوں اور جاسوسوں کی میزبانی کی بلکہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ کٹھ پتلی حکمران اپنے عوام سے خاص کر غیور قبائلیوں سے اس قدر خائف تھے کہ اپنے غاصبانہ قبضے کو بچانے کی خاطر غیر ملکیوں اور صہیونی و صلیبی عناصر کو اپنے ہاں قبائلی علاقوں میں جانے کی اجازت بھی دی۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے

کہ کسی حکومت کو خود اپنے ہی عوم سے، اپنے دین سے، اپنے اعتقادات سے، اپنے نظریات سے خطرہ محسوس ہو، جس سے خود کو محفوظ رکھنے کیلئے انہیں غیر ملکی ایجنٹ اور غیر اسلامی نظریات درآمد کرنا پڑے؟

قائداعظم کی 11 / اگست کی تقریر کا بعض لوگ اس طرح حوالہ دیتے ہیں کہ جیسے انہوں نے زندگی میں پہلی بار یہ تقریر کی ہے اور ان کی باقی تقاریر منسوخ ہو گئیں۔ یہ لوگ قائد کے متعدد بیانات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں انہوں نے واضح طور پر تواتر اور تکرار کے ساتھ یہ واضح کر دیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست ہو گی، ساتھ ہی قوم کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسلام میں پاپائیت یا برہمنیت جیسا کوئی طبقہ نہیں ہے جسے ریاست کی اجارہ داری کا کوئی پیدائشی حق حاصل ہو۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائد ایک سیکولر ریاست چاہتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہوں نے پاکستان کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ برصغیر میں دو سیکولر ریاستیں ہوں، ایک پاکستان اور دوسری اس کے پڑوس میں ہندوستان؟ پھر دو ریاستوں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اگر پاکستان حقِ خود ارادیت کے نتیجے میں وجود میں آیا تو اس میں اور بھارت میں اسلام کا عنصر انہیں ایک دوسرے سے ممیّز کرتا ہے۔

کون اس تاریخی حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ برصغیر کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے جذبہ یگانگت کے تحت مطالبہ پاکستان کی حمائت کی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مطالبہ پاکستان کی عوامی حمائت کے محرکات معاشی تھے، قطعاً غلط ہے کیونکہ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو قیام پاکستان سے کون سے معاشی فوائد کی توقع تھی؟ وہ تو بیچارے ہندو اکثریت کے یرغمال بن گئے، البتہ میں ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی نیتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جنہوں نے راتوں رات یونینسٹ پارٹی چھوڑ کر حکمران مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تاکہ ان کی مراعات باقی رہیں۔ میں بھارت سے نقل مکانی کرنے والے ان مفاد پرستوں کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا جو حصول جائیداد، مال و دولت اور جاہ و حشم کے لالچ میں پاکستان آئے۔ بلکہ پاکستان کی ایک لسانی جماعت کے اکثر رہنما ایسے بھی ہیں جو قیام پاکستان کے موقع پر تو ہندوستان میں ہی مقیم اس بات کا جائزہ لیتے رہے کہ پاکستان کے معاشی اور سیاسی حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اپنے کاروبار اور دوسری تمام املاک کو اچھے داموں فروخت کر کے پاکستان میں بھی مفادات سے خوب ہاتھ رنگے۔ پاکستان کی بیوروکریسی کے توسط سے پاکستان کی نوکر شاہی اور دوسرے ملکی اہم اداروں میں کالے انگریزوں کی طرح بطور حکمران قابض ہو گئے اور آج کھلے عام ملک کی لوٹ کھسوٹ کے علاوہ پاکستان کیلئے اپنے بزرگوں کی قربانی کا ذکر بھی بڑی بے شرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان مذکورہ طبقات کے محرکات یقیناً معاشی تھے لیکن خود پاکستان میں بسنے والے کروڑہا عوام نے اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر جدوجہد پاکستان میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ ان میں کتنے کٹ مرے، کتنی عصمتیں لٹ گئیں، لیکن ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔

یہ جذبہ ایمانی نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ اس کی پشت پر کربلا کی روایت تھی، اس کی آکسیجن تحریک خلافت کا نظریہ تھا۔ کیا مسلم عوام نے جس وطن کیلئے اتنی قربانیاں دیں، وہ اس لئے تھا کہ ان کے ملک پر امریکا کا تسلط قائم ہو جائے؟ کیا قائداعظم نے پاکستان کے اثاثے "ریزرو بینک آف انڈیا" سے نکال کر اس لئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں رکھے تھے کہ سٹی بینک کا ایک "کنٹری مینجر" درآمد کر کے اس کو ملک کا وزیراعظم بنا دیا جائے جو پاکستان کے قومی اثاثوں کو اونے پونے داموں میں فروخت کر کے اپنا کمیشن کھرا کر کے رات کے اندھیرے میں گم ہو جائے؟ ایک دخترِ مشرق کا نقاب پہن کر ملک کو ایک نئے ظالمانہ "آئی پی پیز" کے حوالے کرنے کی بنیاد رکھ جائے جو اب تک ملک کا کھربوں روپیہ ڈکار چکا ہے اور اب اس کے بعد ہر آنے والے حکمران اس بہتی گنگا میں ہاتھ پاؤں دھو رہے ہیں اور معاملہ یہی ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک اور طالع آزما اپنی مرضی کا ایک پلے بوائے ملک پر مسلط کر کے بادشاہ گر کا روپ اختیار کر لے اور وہ پلے بوائے نئے پاکستان بنانے اور اغیار کی غلامی سے نجات دلانے کے نام پر سٹیٹ بینک آئی ایم ایف کے حوالے کر دے۔

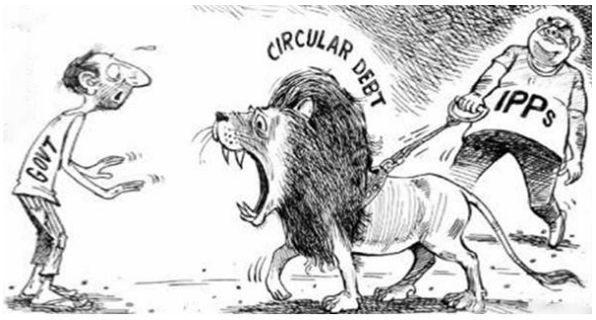

کیا قائداعظم نے کشمیر میں استصواب رائے عامہ کی حمایت اس لئے کی تھی کہ ہم اپنی ناکام خارجہ پالیسی کی بناء پر پاکستان کی شہ رگ کو اس قدر آسانی سے انڈیا کے حوالے کر دیں۔ ملک کا آرمی چیف قصر سفید کے فرعون کے قدموں میں بیٹھ کر کشمیر کا سودہ کر کے اپنے ہی ملک کے درد رجن سے زائد صحافیوں کا بلا کر اپنی بزدلی کا رونا روتے ہوئے اپنے ہتھیاروں کو ناکارہ قرار دیکر اپنے ازلی دشمن انڈیا کے سامنے سرنڈر ہو جائے اور آج بھی اسی ملک کے خزانے سے مراعات وصول کر رہا ہو اور کوئی اس کے جرمِ عظیم پر باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ اس وقت کا وزیر اعظم قصر سفید کے فرعون کے احکام کی تعمیل میں امریکا سے واپسی پر ائیر پورٹ پر ہی اپنے حواریوں کو جلسے کی صورت میں بلا کر یہ اعلان کرے کہ گویا میں ایک مرتبہ پھر ورلڈ کپ جیت کر واپس لوٹا ہوں۔ کشمیریوں کو یہ یقین دلائے کہ میں تمہارا وکیل ہوں، اس لئے کسی مظاہرے کی بھی ضرورت نہیں اور ہر جمعہ کو سقوط کشمیر پر ایک گھنٹے کی علامتی ہڑتال کا اعلان کر کے پہلے ہفتے چند منٹوں کیلئے فوٹو سیشن کر کے واپس لوٹ جائے اور پھر اپنے دورِ اقتدار میں کبھی اسے کشمیر یاد نہ آیا ہو۔ اب انڈیا کشمیر کی آبادی کو ایک سازش کے تحت کم کر کنے کیلئے لاکھوں ہندوؤں کو کشمیر میں بسا رہا ہے اور اسی متنازعہ کشمیر میں ترقی یافتہ ممالک کی سرمایہ کاری کانفرنس کا اہتمام کر کے اپنے ناجائز قبضے کو مزید مستحکم کر رہا ہے۔ کیا بھارت سے تمام متنازعہ امور پر کوئی خفیہ مفاہمت ہو چکی ہے جو مسئلہ کشمیر اب بھی ہماری ترجیحات سے غائب کر دیا گیا ہے۔

قائداعظم کی وفات کے چھ سال بعد ہی نوکر شاہی نے اپنی سرزمین پر امریکا کو فوجی اڈے دے دیئے جہاں سے سوویت یونین کے خلاف جاسوسی پروازیں جاری رہیں جس کے باعث روس پاکستان کو اپنا دشمن سمجھنے لگا اور کشمیر میں رائے شماری کی قرارداد کے خلاف حق تنسیخ استعمال کر کے اسے کالعدم بنا دیا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان سے فوجوں کی واپسی کی قرارداد کو بھی منسوخ کر کے بھارتی فوج کو مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے کا بھرپور موقع فراہم کر دیا۔ سات دہائیوں کے بعد روس کے ساتھ مراسم بحال کرنے کی کوششیں تو شروع ہوئی ہیں لیکن روس کی اپنے پڑوس آذربائیجان میں ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں الجھا دیا ہے، اور ادھر پاکستان کی معاشی حالت کو مزید برباد کرنے کیلئے سیاسی تناؤ کو عروج پر پہنچا کر ایک مرتبہ پھر دباؤ بڑھا دیا گیا ہے تا کہ اس کی آڑ میں ملک کو مزید انتشار میں مبتلا کر کے اپنے مقاصد حاصل کئے جائیں۔

قائداعظم نے کہا تھا کہ ملک میں جمہوریت ہو گی اور اب 18 ویں ترمیم کے بعد ہر صوبے کو اندرونی طور پر مالی خود مختاری حاصل ہو گئی ہے، جبکہ ان کے جانشینوں نے مشرقی پاکستان کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دینے سے انکار کر دیا تھا جو مشرقی بازو الگ ہونے کا سبب بنا۔ اسی ملک میں کمانڈو نے اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے امریکی کونڈالیزا رائس کے احکام بجالاتے ہوئے اپنی فوجی وردی میں دبئی میں جنرل کیانی کی معیت میں بے نظیر سے این آر او کا معاہدہ کرتے ہوئے انہیں ملک سے لوٹی ہوئی ساری دولت کے مقدمات سے بری کر کے ملک میں آنے کی دعوت دی جس سے دیگر ہزاروں قومی مجرموں نے بھی خوب فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے تمام جرائم سے یک قلم رہائی مل گئی لیکن ان تمام مراعات کے باوجود کمانڈو اپنا اقتدار نہ بچا سکا اور قومی دولت لوٹنے والوں نے ایک مرتبہ پھر ملکی دولت کو شیر مادر سمجھ کر ڈکارنا شروع کر دیا۔ اس طرح پاکستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا گیا اور استعمار کے گماشتے (خاکم بدہن) اس کے ٹوٹنے کا نہ صرف تاریخوں کا ذکر کرنے لگے اور اپنے شیطانی دماغوں سے اس کے نقشے بنانے لگے۔ یہ خبیث پاکستان کی نفرت میں اتنے اندھے ہو گئے کہ انہوں نے یہاں کھلم کھلا مسلح دہشتگردوں کی قبائلی علاقوں کے علاوہ بلوچستان میں ہندوستان کی مدد سے شورش پیدا کر دی ہے جس سے نمٹنے کیلئے ہماری افواج کو ہر روز اپنی جانوں کی قربانی دینی پڑ رہی ہے۔

ہماری بد قسمتی کا باب ابھی بھی بند نہیں ہوا۔ قوم نے اپنے سیاسی حکمرانوں اور مقتدر اشرافیہ سے جان چھڑانے کیلئے کبھی آزاد عدلیہ کیلئے سڑکوں پر اپنے جان و مال کی قربانی دی اور کبھی عمران خان کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اپنی تمام توانائیاں اس کے گود میں ڈال دیں لیکن پونے چار سال تک عمران خان نے قوم سے کئے گئے ہر وعدے پر یوٹرن لیتے ہوئے اسے اپنی سیاسی بالغ نظری قرار دیتے ہوئے قوم کے ساتھ کھلا دھوکہ کیا۔ ان کو جب اپنی غلط پالیسیوں کی بناء پر ملک کو اپنے پیشروؤں کی طرح عالمی مالیاتی اداروں کے کڑی شرائط کے ساتھ قرضوں کے بوجھ میں ڈبو کر ملک کو مہنگائی کے طوفان میں مبتلا کر دیا تو اپنے مخالفین کی عدم اعتماد کی تحریک کے دوران انہوں نے بالکل اسی طرح اپنے اقتدار کو ڈوبنے سے بچانے کیلئے ذوالفقار بھٹو کی طرح امریکا کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے تمام مخالفین کو امریکا کے ایجنٹ قرار دیتے ہوئے قوم کو اپنے دفاع کیلئے دہائیاں دینی شروع کر دیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے قوم کے اہم ادارے پر بھی تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے جو آج سے قبل کبھی بھی فوج کے خلاف ایسی ناپسندیدہ مہم نہیں دیکھی گئی اور سوشل میڈیا آئے دن اس بڑھتی ہوئی آگ پر ڈھیروں پٹرول پھینک کر اس میں اضافہ کر رہا ہے جس کو دیکھنے کے بعد وہی دشمن جو ایک عرصے سے ملک کی سلامتی کے خلاف منصوبے بنا رہے ہیں، ان کا کام بہت آسان ہو گیا ہے۔

وہی عدلیہ جس نے عمران خان کو امین و صادق کا سرٹیفکیٹ عطا کیا تھا، اسی عدلیہ کے حکم سے آج وہ پابند سلال ہے۔ وہی عمران خان اپنے دورِ حکمت میں عوامی اجتماعات میں امریکی خط لہرا کر اس کو مورد الزام ٹھہراتے رہے، لیکن دوسری طرف انہی کی جماعت کی سنئیر رکن شیریں مزاری اپنے ٹویٹ میں امریکی سفیر کے ہیلی کاپٹر پر طور خم سرحد کے دورے کی تصاویر لگاتے ہوئے اپنے شدید غصے کا اظہار کر رہی تھیں لیکن اس سے چند گھنٹوں کے بعد ان کی خیبر پختونخواہ حکومت کے وزیر اعلیٰ اور دیگر وزراء امریکی سفیر کے ساتھ ملاقات کرتے ہوئے یو ایس ایڈ کی طرف سے اپنے صوبے میں 20 سے زائد پراجیکٹس پر امریکی مدد کی تکمیل پر نہ صرف شکریہ ادا کر رہے تھے بلکہ امریکا کی طرف سے 36 گاڑیوں کا تحفہ بھی قبول کر رہے تھے۔ یہ دہرا معیار ساری قوم نے کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

آج ایک مرتبہ پھر پاکستان میں تمام سیاسی جماعتوں میں ایک دوسرے کے خلاف دشنام طرازی کا ایک طوفان جاری ہے جبکہ ملکی معاشی اور سیاسی ابتری نے قوم کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے ان تمام آزمودہ سیاستدانوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے نئے ایماندار افراد کے ساتھ اس ملک میں وہ نظام لایا جائے جو اس ملک کی تقدیر بدل دے۔ دور نہ جائیں صرف پیچھے یہ مڑ کر دیکھ لیں کہ اس ملک میں "آئی پی پیز" جیسے خطرناک پراجیکٹ کو کن شرائط پر پاکستان لایا گیا اور پھر ہر آنے والے حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اس کی آڑ میں ملک کے کھربوں روپے لوٹ لئے اور اب بھی عوام کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑا جا رہا ہے۔

ہمیں اس مقام پر لیجانے کی سازش ہو چکی ہے کہ ہمارے پاس تنخواہ دینے کیلئے بھی رقم موجود نہ ہو جبکہ ملک کے تمام اثاثہ جات پہلے ہی غیر ملکی مالیاتی اداروں کے پاس گروی پڑے ہیں اور شنید یہ ہے کہ ملکی ائیر لائن "پی آئی اے" جس کو عملاً تباہ کرنے کیلئے عمران خان کے ایک وزیر سرور خان نے خود اسمبلی میں کھڑے ہو کر ایسا بیہودہ جھوٹا اعلان کر دیا جس کے بعد ساری دنیا میں ہمارے جہازوں کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی گئی جبکہ بعد ازاں متعلقہ عالمی ادارے پاکستان کے تمام پائلٹ اس الزام سے بری بھی کر چکے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں پڑوسی ملک میں 346 / ایسے پائلٹ کا لائسنس منسوخ کر دیا گیا لیکن اس کے باوجود ان کی ائیر لائنز رواں دواں ہے۔

پاکستان کی شناخت پی آئی اے کو فروخت کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ شوریہ ڈوول، اجیت ڈوول کا بیٹا (بی جے پی) سے وابستہ، پاکستانی تاجر سید علی عباس کے ساتھ ٹارچ انویسٹمنٹ کمپنی کا شریک مالک ہے۔ یہ کمپنی پاکستان کے ای کامرس سیکٹر، جس میں جازکیش، ایزی پیسہ اور فنٹیک ایکو سسٹم، اسٹیٹ بینک آف پاکستان، سیکیورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان، پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن شامل ہیں، میں اپنے نمایاں شیئر ہولڈنگ کی وجہ سے تنازعات میں گھری ہوئی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ٹارچ انویسٹمنٹ کمپنی جو لکسن گروپ میں بھی حصہ رکھتی ہے اور میک ڈونلڈز اس کی بنیادی تنظیموں میں سے ایک ہے، (پی آئی اے) کی ممکنہ نجکاری کی روشنی میں، بھارتی اداروں کی جانب سے سید علی عباس جیسے پاکستانی افراد کے ساتھ اشتراک کے ذریعے پی آئی اے میں شیئر ہولڈنگ حاصل کرنے کے کوششوں میں مصروف ہے، جن میں ڈوول خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد بھی شامل ہیں۔ اس سے اس طرح کے لین دین کی شفافیت اور احتساب کے ساتھ ساتھ پاکستان کے قومی مفادات پر ممکنہ اثرات کے بارے میں اہم سوالات بھی اٹھتے ہیں۔ کیا ہماری عدلیہ نے ملک کے اتنے بڑے نقصان پر کوئی سوموٹو نوٹس لینے کی ہمت کی؟ یا ہمارے عسکری اداروں نے اس خطرے کا کوئی نوٹس لیا ہے؟

اس وقت ملک میں تمام اشرافیہ خود ملکی خزانے پر ایک بوجھ بن چکی ہے اور مراعات کی آڑ میں آسائشوں سے لطف اندوز ہو کر ملک کی بربادی پر آنکھیں موند کر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کیلئے ملک کو بچانے کیلئے ہنگامی بنیادوں پر خود عوام کو اب باہر نکلنا ہو گا اور اپنی تمام توانائیاں صرف کر کے ان تمام عہد شکنوں کو ان کے بیرونی آقاؤں سمیت حتمی انجام تک نہ صرف پہنچانا ہو گا بلکہ ان سے ملک کی لوٹی ہوئی دولت واپس لینے کیلئے جنگی بنیادوں پر قانون سازی کرنا ہو گی۔

بروز منگل 24 محرم الحرام 1446ھ 30 جولائی 2024ء

اقتدار اور جو تم پیزار

ہر سال کیلینڈر پر جب ماہ اگست شروع ہوتا ہے تو اس صدی کا سب سے بڑا معجزہ اور رب کائنات کا سب سے بڑا انعام "پاکستان" ہم سب کی خوابوں کی تعبیر سجدہ شکر بجالانے کا تقاضہ کرتا ہے۔ قائد اعظم کی قیادت کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان کا قیام ہے لیکن پاکستان کے قیام کی حقیقت کیا ہے؟ یہ برصغیر کی سیاسی صورتحال کا اتفاق ہے، کوئی تاریخی حادثہ ہے، برطانوی ہند کی وحدت کو ختم کرنے کی سازش ہے یا انسانی معاشرت کیلئے اللہ تعالیٰ کے قوانین کے عمل اور ردِّ عمل کا نتیجہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان دورِ حاضرہ میں عالمگیر امت مسلمہ کی بازیافت کا اعلان ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم.....!

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی

1924ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ وہ برائے نام مرکزیت جو مسلمانوں کو حاصل تھی وہ بھی ختم ہوگئی اور اس پر مسلمانوں سے دائمی بغض اور عناد رکھنے والی طاقتوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن اس واقعے کے سولہ برس بعد یعنی 1940ء میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے عالمگیر ملی تشخص کا اعلان کرتے ہوئے پاکستان کا مطالبہ کر دیا۔ غور کیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کر کے اجتماعی سطح پر اصولی اعتبار سے اتباعِ سنتِ نبوی ﷺ کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ ہمارے ہادی برحق رسولِ اکرم ﷺ نے ایمانی رشتے کی بنیاد پر ایک عالمگیر امتِ مسلمہ کی تشکیل فرمائی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے دورِ حاضر میں اسی تشخص کی تجدید فرمائی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے یثرب کی سرزمین کو پہلی اسلامی ریاست کیلئے منتخب فرمایا، برصغیر کے مسلمانوں نے اعلان کیا کہ یہاں اپنے اکثریتی علاقوں کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی شکل دیکر وہ اسے دورِ حاضر میں "عمل پذیر اسلام کی تجربہ گاہ" بنائیں گے۔ یثرب مدینتہ النبی ﷺ بنا، یہ خطہ پاکستان بنا۔

ایک اور حیرت انگیز بات یہ کہ دنیا کے دیگر تمام علاقوں کے مقابلے میں برصغیر کے مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور جب پاکستان کا مطالبہ کیا اس وقت یہاں مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ کے لگ بھگ تھی لیکن ہندو اکثریت کے مقابلے میں وہ تعداد بہت کم تھی، یعنی ایک چوتھائی تھی۔ تعداد کی وہ کمی پیشِ نظر رکھئے اور قرآنِ پاک میں سورۃ الانفال کی 26ویں آیت مبارکہ پر غور کیجئے جس میں ارشاد ہوا ہے:

"وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ، تم زمین میں تھے، تمہیں بے زور سمجھا جاتا تھا، تمہیں خوف تھا کہ لوگ تمہیں مٹا نہ دیں، پھر اللہ نے تمہیں جائے پناہ مہیا کی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق دیا، شائد کہ تم شکر گزار بن سکو"۔

آں کتاب زندہ، قرآن حکیم
حکمت ولایزال است و قدیم

پاکستان دورِ حاضر میں اس ارشادِ قرآنی کی تشریح اور اسلام کی نشاطِ ثانیہ کی علامت کے طور پر وجود میں آیا ہے اور اس تاریخ ساز عمل میں قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت نے اساسی اور کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہ بہت بلند رتبہ ہے اور اسی زاویہ نظر سے قائد اعظم کے شخصی کردار پر بھی غور و فکر کی

ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی اور رسول اکرم محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس سے قلبی وابستگی نے ان کی شخصی اور سیاسی دونوں زندگیوں کو کس طرح باہم مربوط اور منظم کیا۔ قائد اعظم نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے برطانیہ میں "لنکن ان" میں داخلہ لیا کیونکہ وہاں دنیا کی قانون ساز شخصیات میں سرِ فہرست ہمارے رسولِ اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی تحریر تھا اور پھر نصف صدی بعد قیامِ پاکستان کے وقت اقتدار کی منتقلی کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو ہم پر طنز کیا تھا، یہ کہہ کر "مجھے امید ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا وہی سلوک کیا جائے گا جیسا اکبرِ اعظم کے دور میں کیا گیا تھا" تو قائد نے فوری جواب میں کہا تھا کہ "مسلمانوں کی رواداری اکبرِ اعظم تک محدود نہیں ہے بلکہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ہمارے پیارے رسول اکرم محمد ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو فتح کر کے ان سے نہ صرف منصفانہ بلکہ فیاضانہ سلوک کیا تھا"۔

نوجوان قائد کے قلب میں رسول اکرم ﷺ سے وابستگی کی جو ایک روشن کرن تھی، اسی کرن کی روشنی ان کیلئے سیاست کی راہ کے انتہائی صبر آزما سفر میں بھی زادِ راہ بنی رہی۔ شخصی اعتبار سے قائد اعظم میں خامیاں بھی رہی ہوں گی لیکن ان خامیوں کے اثرات ان کی ذات پر یا اس سے متعلق افراد تک رہے جبکہ ان کی خوبیوں کے اثرات ان کی قیادت میں نمایاں ہوئے جس کی توانائی نے برِ صغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر دیرپا اور تاریخ ساز اثرات مرتب کئے۔

قائد اعظم نے قیامِ پاکستان کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اس اعتماد کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا تھا جو پورے برِ صغیر کے آباد مسلمانوں نے ان کی قیادت پر کیا۔ انہوں نے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو کبھی کسی غلط فہمی میں نہیں رکھا بلکہ بالکل واضح طور پر بار بار اعلان کیا کہ پاکستان اکثریتی صوبوں میں بنے گا اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو اس عظیم مقصد کیلئے قربانیاں دینی ہوں گی۔ سرزمین پاکستان کی آزادی کی یہ انفرادیت ہے کہ اس سرزمین کی آزادی کیلئے ان مسلمانوں نے بھی سوچ سمجھ کر قربانیاں دیں جن کا اس سرزمین سے کوئی براہِ راست کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن یہاں آباد مسلمانوں سے ایمانی رشتے کے تقاضے کا ان کو پورا شعور تھا، تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال موجو نہیں ہے۔ یہ قائد اعظم کی قیادت کی سحر انگیزی تھی اور وہ سحر انگیزی سچائی کی تھی، امانت و دیانت کی تھی۔ انہوں نے جذباتی نعرے بازیاں کبھی اختیار نہیں کیں۔ ان کو دو بہت بڑی طاقتوں کا سامنا تھا، ایک ہندو کانگریسی قیادت اور دوسری برطانوی حکومت۔ مادی اعتبار سے صورتحال بے سروسامانی کی تھی، مسلمان منتشر تھے، بکھرے ہوئے تھے لیکن ایمانی توانائی مسلمانوں کو بہر حال حاصل تھی۔ قائد اعظم کی قیادت کی صداقت نے اسی ایمانی توانائی کا شعور مسلمانوں میں بیدار کر دیا۔ اصل توانائی ان دیکھی طاقتوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ ایمان ان دیکھی توانائی ہے لیکن ساری نظر آنے والی طاقتوں پر غالب آجاتی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

قیامِ پاکستان کی راہ کی رکاوٹیں سامنے لایئے، مخالفین کی بھرپور سازشی منصوبہ بندیاں پیشِ نظر رکھئے، اس قتل و غارت گری کا تصور کیجئے جو صرف اس لئے برپا کی گئیں کہ پاکستان مستحکم بنیادوں پر قائم نہ ہو سکے اور وہ پھر جذبہ، وہ عزم اور تعمیر کا فیصلہ کن انداز جس سے جو کچھ بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا، اسے ممکن بنا دیا۔ پاکستان کا قیام دورِ حاضر میں اسلام کے احیاء کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا ہے:

"وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے، اور اللہ اپنی تدابیر فرما رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے"

اور سورۃ ابراہیم میں ارشاد ہے: وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ(46)

کافروں نے اپنی ساری چالیں چل دیکھیں لیکن ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا، حالانکہ ان کی چالیں ایسی غضب کی تھیں کہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ سچی بات یہ ہے کہ:

جہاں ہوں سعی بشر کی تمام راہیں بند
دیار دوست کا رستہ وہیں سے کھلتا ہے

ارشاداتِ قرآنی پیش نظر رکھئے اور پاکستان کے قیام سے لیکر پاکستان کے ایٹمی طاقت بن جانے تک کے واقعات پر غور کیجئے، انسانی معاشرت کیلئے قدرت کی منصوبہ بندی کی کارفرمائیاں واضح ہوتی چلی جائیں گی۔ قیامِ پاکستان کی ایک وجہ ہمارے مخالفوں کا شدید تعصب اور سیاسی ریشہ دوانیاں بھی بنیں۔ قیامِ پاکستان کو متزلزل کرنے کی ہر ممکن کوششیں کی گئیں اور ہر کوشش ناکام ہوئی اور ایٹمی طاقت کی حیثیت سے نمایاں ہونے میں جس عمل نے ہمارے لئے سب سے بہتر دلیل فراہم کی وہ بھارت کا ایٹمی دھماکہ تھا۔ پاکستان کی داخلی صورتحال اور اس کے وجود کے علاقائی اور عالمی اثرات پر مسلسل تدبر اور تفکر کی ضرورت ہے۔ جہاں ہم داخلی سطح پر سماجی تطہیر کے مرحلوں سے گزر رہے ہیں (وہاں نائن الیون کے بعد اس خطے کی صورتحال بالکل بدل چکی ہے۔ پاکستان دشمن قوتیں بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑی ہیں اور ایک فاسق وفاجر جنرل ہمیں جن خطرات کے بھنور میں پھینک کر پہلے ملک سے فرار اور اب اللہ کے ہاں بلا لیا گیا ہے، لیکن اس کے بوئے کانٹوں کی فصل اس کے بعد ہر آنے والی حکومت کی شکل میں قوم کو کاٹنا پڑی ہے اور اب بھی موجودہ حکومت تو اس سے بھی دس قدم آگے چل رہی ہے، اس لئے اس وقت دشواریاں پہاڑوں جیسی معلوم ہوتی ہیں)۔ قیامِ پاکستان کا علاقائی اثر یہ ہوا کہ بھارت اس سارے علاقے پر اپنا تسلط قائم نہیں کر سکا اور عالمی اثر یہ ہوا کہ جہاں اسلام عالمی سطح پر نمایاں سے نمایاں تر ہوتا چلا گیا وہاں ہماری بداعمالیاں اور نافرمانیوں نے یہ روزِ بد بھی دکھایا ہے کہ ایک ایٹمی قوت کا حامل ملک معاشی طور پر اس قدر کمزور و ناتواں کر دیا گیا ہے کہ عالمی گدھ شب و روز اس کے گرد منڈلا رہے ہیں۔

وقت کے دو پیمانے ہیں، شب و روز اور ماہ و سال۔ ایک پیمانہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے کاموں کیلئے مقرر کیا ہے۔ دوسرا پیمانہ اللہ تعالیٰ کے اپنے حساب کا ہے جس کا ایک "یوم" ہمارے ایک ہزار سال کے برابر یا اس سے بھی کہیں زیادہ کا ہے۔ دورِ رسالت مآب ﷺ میں انسانی معاشرت کیلئے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین اور انسانی اعمال میں مکمل ہم آہنگی، مثالی ہم آہنگی ہو گئی تھی لہٰذا تاریخ کی مکمل روشنی میں ایک مثالی معاشرہ، ایک مثالی مملکت وجود میں آ گئی۔ اس مثالی معاشرے کی روشنی جہاں تک پہنچائی جا سکتی تھی مسلمانوں نے پہنچائی۔ زمانے کا، انسانی معاشرہ کا، سفر تو اب بھی اسی سمت ہے لیکن اس راہ پر ہم مسلمانوں کو اپنے ایمان و عمل سے جو روشنی پھیلانی چاہئے تھی کہ سفر میں تیزی آ جائے، ہم صدیوں سے اپنا وہ فریضہ بھلا بیٹھے ہیں۔ قیامِ پاکستان نے ہمیں دورِ حاضر میں اپنے ایمانی کردار کی ادائیگی کا ایک اور موقع فراہم کیا ہے۔ پاکستان میں ہم گزشتہ 75 سالوں میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے یا اس کے شعور سے محروم ہو کر جو وقت ضائع کر چکے ہیں اور اس سے نسلِ انسانی کا جو خسارہ ہوا ہے ہم سب کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کے اعتبار سے اللہ کے سامنے اس کی جوابدہی کرنی ہو گی۔ کیا واقعی ہمارا ایمان ہے کہ جوابدہی ہو گی؟ کیا ہم کو اس حقیقت کا شعور بھی ہے کہ وہ جوابدہی ہونی ہے اور ضرور ہونی ہے؟ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ہم نے بہت بڑی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔

بے خبر تو جوہر آئینہ پیام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

لیکن سورۃ محمد کی آخری آیاتِ مبارکہ کے اختتامی الفاظ بھی کہہ رہے ہیں:"وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم"اگر تم اللہ کے حکم سے منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہیں ہوں گے"۔اس وقت ہمارا سب سے بڑا امتحان یہی ہے۔ کاش! ہمیں اس سچائی کا ادراک ہو جائے کہ اللہ کے خوف سے محرومی سب سے بڑی محرومی، سب سے تباہ کن محرومی ہے جس کا کوئی ازالہ کسی بھی صورت ممکن نہیں ہے!!!

حقیقت یہ ہے کہ چند نوں کے بعد پاکستان 14 / اگست کو 77 سال کا ہو جائے گا مگر 2022 اب تک کی تاریخ کا بدترین سال ہے۔ یاد رہے کہ ارض وطن ایوب خان، غلام محمد اور جسٹس منیر کی سازشوں کی وجہ سے ابتدا ہی سے مظلوم رہا۔ 1968 میں ایوب گیا، یحیی اور بھٹو نے بنگلہ دیش کی بنیاد رکھی، لیکن تقسیم کا اصل سبب ایوب ہی تھا اور پھر 1971 میں ارض وطن تقسیم ہو گیا۔ 18 ویں ترمیم کے تحت جو صوبوں کو اختیارات تفویض کئے جا چکے ہیں، اگر یہی کام 1970ء میں کر لیا جاتا تو ملک تقسیم نہ ہوتا۔ پھر شعلہ بیان بھٹو کے دور کی تباہی شروع ہوئی۔ بھٹو کے جعلی الیکشن پر پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے بائیکاٹ پر 1977 میں ضیا الحق کا مارشل لا آیا اور 1988 تک قوم نے وہ بھگتا۔ پھر 1988 تا 1993 جرنیلوں کے ماتحت بینظیر اور نواز شریف کے مختصر دور، پھر 1993 تا اکتوبر 1999 دوبارہ بے نظیر اور نواز شریف کے مختصر ادوار، اس کے بعد 1999 سے اگست 2008 تک نو سالہ پرویز مشرف کی آمریت کا دور رہا۔ قوم کی بدنصیبی اور المیہ یہ بھی ہوا کہ اس ملک میں ثاقب نثار نے جسٹس منیر کی بدترین یاد تازہ کر دی جو آج بھی اس ملک کے خزانے سے لاکھوں روپے ماہانہ اپنی آسائشوں کیلئے وصول کر رہا ہے۔

پھر زرداری کی صدارت اور پی پی پی کا پانچ سالہ دور۔ گیلانی اور راجہ اشرف کا دور، پھر نواز شریف کا تیسرا مختصر دور، جنرل پاشا ظہیر الاسلام وغیرہ پر سازشوں کا الزام بھی لگا۔ خاقان عباسی کا عارضی دور اور بعد ازاں جنرل باجوہ کے کندھوں پر بیٹھ کر عمران خان نے اقتدار سنبھالا۔ عمران کا 2018 سے اپریل 2022 تک پونے چار سالہ کا دور حکومت، جس میں جہاں بیرونی قرضوں میں ملک کو ڈبو دیا گیا وہاں ڈیڑھ لاکھ سے زائد جانوں کی قربانیاں دینے والا کشمیر فروخت کر دیا گیا۔ ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ فوج کے سپہ سالار اور وزیر اعظم کو قصر سفید کے فرعون نے بلا کر جو احکام جاری کئے، ان پر عمل درآمد کیلئے جہاں ایٹمی طاقت سے مسلح فوج کا سپہ سالار باجوہ دو در جن صحافیوں کو بلا کر کشمیر کے معاملے پر اپنی بزدلی کا اظہار کرتے ہوئے جنگ سے راہِ فرار کا سبق سنا رہا تھا جبکہ اسی فوج میں اگر خدمت گزار خچر اپنی کارگزاری سے محروم ہو جائے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے اور دوسری طرف عمران نے قوم کی توجہ ہٹانے کیلئے اپنی امریکا سے واپسی پر ہوائی اڈے پر ہی اپنی پارٹی کے جم غفیر کو بلا کر جلسہ کر کے اعلان کر دیا کہ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ میں ایک مرتبہ پھر ورلڈ کپ کا فاتح بن کر لوٹا ہوں اور اس کے ساتھ خود کو ہم بدنصیب کشمیریوں کا وکیل بن کر حکم دے ڈالا کہ اب مقبوضہ کشمیر کے متعلق انڈیا کے غاصبانہ قبضے کے خلاف کسی بھی قسم کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں، میں خود کشمیر کا کیس لڑوں گا۔ وزیر اعظم ہاؤس پہنچ کر اعلان کیا گیا کہ ہر جمعہ کے دن ساری قوم ایک گھنٹے کیلئے کشمیر کیلئے احتجاج کیلئے باہر نکلے گی اور خود صرف پہلے ہفتے دس منٹ کیلئے وزیر اعظم ہاؤس کے باہر فوٹو سیشن کے بعد انہیں کبھی کشمیر یاد نہیں آیا۔

بادشاہ گر باجوہ جو کشمیر کے معاملے کو اپنے مفادات کیلئے قربان کر کے اپنے آقاؤں کے توسط سے نوبل پرائز اور پھر سے توسیع کا خواب دیکھ رہا تھا، آئی ایس آئی کے سربراہ کی تعیناتی پر عمران خان کے ساتھ کھل کر اختلافات سامنے آگئے اور فیصلہ کر لیا گیا کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں تو پھر عدم اعتماد کا فیصلہ ہو گیا۔ پاناما کیس میں فارغ کئے جانے والے نواز شریف جو باجوہ کے خلاف کھلم کھلا آن لائن جلسوں میں تقریریں کر رہے تھے، زرداری جو اینٹ سے اینٹ بجانے کی دھمکیاں دے رہے تھے، اس تمام بھان متی کے کنبے کو جمع کر کے عمران کو فارغ کر دیا گیا جبکہ آخری دنوں میں ایوان صدر میں عارف علوی کی طرف سے بلائی گئی ملاقات میں عمران اپنے اقتدار کو بچانے کیلئے دوبارہ مدت ملازمت میں توسیع دینے کی آفر بھی کر رہا تھا لیکن گھر بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ آخری حربے کے طور پر قومی اسمبلی کے اسپیکر اسد قیصر نے بھی عمران کے احکام کی تعمیل سے معذرت کر لی تو ڈپٹی اسپیکر سوری کو آئینی طور پر پیش کی گئی تحریکِ عدم اعتماد کا حشر نشر کرنے کیلئے استعمال کیا گیا لیکن رات دیر گئے عدالتیں بھی لگ گئیں اور عدمِ اعتماد کی کامیابی کے بعد پی ڈی ایم کا کنبہ اس ملک پر مسلط کر دیا گیا۔

پی ڈی ایم کی چند ماہ کی حکومت میں نیب کا حشر نشر کر کے کرپشن کے تمام مقدمات ختم کرنے کے قوانین جاری ہو گئے اور پاکستانی روپے کی قدر خوفناک حد تک گر گئی اور ملک دیوالیے کے کنارے پہنچا دیا گیا۔ ادھر دوسری طرف 2014 کے دھرنے سے قوم روزانہ عمران خان کے ایک ایک گھنٹے کے خطاب سنتی چلی آ رہی تھی۔ عمران خان پر توشہ خانہ اور دیگر بدعنوانیوں اور کرپشن کے مقدمات نے ساری قوم کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ الیکشن کمیشن کے فیصلے نے عمران کے عدالتی امین و صادق کے القاب کو مشکوک کر دیا۔ ادھر قوم کو بھی سیاستدانوں کی تقاریر اور بیانات کا نشہ لگ چکا ہے اور سیاسی حریف بھی عمران کو دوسرا بھٹو ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک لمبی داستان ہے جس سے آپ سب ہی واقف ہیں۔ عمران جیل میں ہے لیکن ایک مرتبہ پھر عدلیہ کی دیوی ان پر ایسی مہربان ہوئی ہے کہ ان کے حریف 9 مئی کے واقعہ کو بغاوت قرار دیکر کبھی اس کی جماعت پر پابندی لگانے کی خواہش کا اعلان کرتے ہیں اور کبھی مفاہمتی بیان سامنے آ جاتا ہے۔ قوم پریشان ہے کہ ملک کو اس انتہائی نازک دور سے نکالنے کی بجائے اقتدار کی خواہش میں ایک دوسرے سے جو تم پیزار ہیں۔

فوج مارشل لا نافذ کرے گی تو پابندیاں لگ جائیں گی۔ عمران کے حوالے کریں گے تو مزید تباہی ہو گی۔ موجودہ حکومت کو میڈیا اور اپوزیشن چلنے نہیں دیتے۔ عدلیہ کا کردار بھی مشکوک ہو گیا ہے۔ ملک سودی قرضوں تلے ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ اسٹیٹ بینک کو آئی ایم ایف کی غلامی میں دیا جا چکا ہے۔ تجارت خسارہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ملک کا دھڑن تختہ ہو جائے، پرواہ نہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ فوج سب کو اکٹھا کر کے ایک سال کی ایمرجنسی نافذ کرے اور تمام سیاسی جماعتوں پر مشتمل قومی حکومت قائم کرے تاکہ معیشت مستحکم ہو جائے لیکن ضدی سیاست دانوں سے اس طرح کی قومی حکومت کے قیام کی توقع نہیں کی جا سکتی جو ملک کو دیوالیہ ہونے سے بچا لے۔

پھر 1971 اور 1977 جیسے حالات ہیں۔ ایک دوسرے کو بے ایمان اور کرپٹ ہونے کے الزامات نے ایک خوفناک ماحول پیدا کر دیا ہے، پولرائزیشن ہے، قوم تقسیم کی جا رہی ہے اور خانہ جنگی کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ساری قوم بے بسی میں اپنے رب سے استغفار کرتے ہوئے رحم کی دعا مانگ رہی ہے کہ پاکستان کو آزمائش کے دور سے نکال کر اسے نیک اور صالح قیادت عطا فرما: آمین

بروز جمعتہ المبارک 27 محرم الحرام 1446ھ 2/ اگست 2024ء

ہمارا پیارا پاکستان

ہمارا پاکستان دنیا کا عجیب و غریب ملک ہے۔ بلاشبہ برصغیر کی تقسیم جدید تاریخ کا ایک چونکا دینے والا واقعہ تھا جس کے نتیجے میں یہ قائم ہوا۔ جمہوری طریقے سے جمہوریت کیلئے قائم ہونے والی اس مملکت میں آمریت بھی بے حساب ہے اور جمہور کی جمہوریت نوازی کی بھی کوئی حد نہیں۔ اندازہ اس سے لگالیں کہ قوم اکیسویں صدی میں بھی پورے اطمینان سے چار فوجی حکومتیں بھگتا چکی ہے۔ یہاں جمہوریت سے لگن بھی ایسی ہے کہ پاکستان کی پہلی نصف صدی ہی کے اکانٹ میں نصف درجن ملک گیر جمہوری تحریکیں موجود ہیں۔ آزادی صحافت کیلئے مسلسل جدوجہد کی ایک شاندار تاریخ اس کے علاوہ ہے

دانشوروں اور صحافیوں کی اکثریت "بدتر منتخب حکمراں بہترین آمر سے بہتر ہے" کے فلسفہ جمہوریت کی ایسی پیروکار ہے کہ آج بھی یہ سابق کرپٹ حکمرانوں کیلئے اس زور سے بانہیں کھولے کھڑی ہے کہ ملک کے پاپولر سیاستدان اپنی تمام کرپشن اور سول آمریت سمیت اس میں سما گئے ہیں۔ یہاں ڈکٹیٹر چین سے حکومت کر سکتے ہیں نہ منتخب حکمران جو اقتدار کے روزِ اول سے خاتمہ حکومت تک خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ اپوزیشن "جمہوریت" سے ۔ پھر فرشتے اور لٹیرے تنگ آکر آمریت کو یاد کرنے لگ جاتی ہے، جب فوجی آمریت جلوہ گر ہوتی ہے تو الیکشن ہی سارے مسائل کا حل قرار پاتے ہیں مل کر جمہوریت کی صدائیں لگاتے ہیں۔ پیارے پاکستان میں فوجی سیاست کرتے ہیں اور سیاستدان تجارت، لیکن سیاست کی تجارت، بلکہ ہمارے پاپولر ووٹ بینکر تو سیاست کو صنعت کے درجے پر لے آئے ہیں، اسی لئے فرینڈلی اپوزیشن بھی اپنی باری کا انتظار کر رہی ہے۔

کچھ عملیت پسند تاجر کھلے عام کہتے ہیں اور بہت سے سوچتے ہیں کہ جیسے روزگاروں میں سب سے افضل تجارت ہے، اسی طرح تجارت میں سب سے منافع بخش کاروبار سیاست کا ہے۔ ،، پیسہ پہنچاؤ، جلدی بھیجو، جتنا بھیجو، قوم ہمارے ساتھ ہے ،، کی سیاسی، تجارتی تھیم پر یہ کاروبار چلتا ہے تو رکتا نہیں۔ روکنے کیلئے فوج بلانا پڑتی ہے یا وہ خود ہی تشریف لے آتی ہے۔ رہے عوام، بس جوق در جوق، ووٹ بھگتانا، فوجی انقلاب پر دیگیں چڑھانا، مٹھائیاں بانٹنا، پہلے خوشی اور پھر مہنگائی سے مر جانا یا تحریکِ جمہوریت میں شہید ہو جانا، ان کا سیاسی مقدر ٹھہرتا ہے۔ یہ تو ہوا سیاست و حکومت میں باوردی نجات دہندوں اور سیاسی تاجروں کا حصہ اور اس میں عوام کی شرکت کا 78 سالہ حساب۔ اس حساب سے پیارے پاکستان کی جو کتاب تیار ہوئی ہے اسے کھولو تو ایک سے بڑھ کر ایک عجوبہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ حیرت کا وہ وہ ساماں کہ سطر سطر پڑھ کر بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے "یہ ہے ہمارا پیارا پاکستان"۔

شہروں میں مال و جان اتنا ہی غیر محفوظ جتنی دیہات میں جاگیرداری مضبوط، کیا اسلام آباد کیا کراچی، دونوں شہروں میں قیامِ امن کے عالمی اجارہ داروں کی سفارتی املاک محفوظ ہیں نہ لاہور اور پشاور میں فائیو اسٹار ہوٹلز۔ جاگیردار، سیاستدانوں کا لبادہ اوڑھے، سیاست کے تاجروں اور باوردی نجات دہندوں ،ان کی زندہ باد، مردہ باد کرنے والے ابلاغ کاروں نے مل جل کر باہمی اخوت اور کمالِ مہارت سے اپنے پیارے عوام کیلئے ایسا نظامِ بد تشکیل دیا ہے کہ ملک کے اہل ترین افراد کو سات سمندر پار بھاگنے پر مجبور کر دیا، جو بچ گئے انہیں کونے میں لگا دیا گیا، اہلیت اور نااہلیت ماپنے کے پیمانے تبدیل کر دیئے گئے ۔ نااہل اور نکمے عرش پر پہنچا دیئے گئے اور اہل و مخلص فرش پر بٹھا دیئے گئے ہیں۔

واہ ری پاکستان کی جمہوریت! تیرے راج میں غریبوں کیلئے قصبوں دیہات میں بلا فیس بن استاد مع تنخواہ گھوسٹ اسکول (کہ مفت تعلیم کا اس سے بہتر اور کیا انتظام ہو سکتا تھا) اور ،، معززین وقت ،، کے بچوں کیلئے پانچ سے پندرہ ہزاری فیس کے اسکول بھی، جہاں خوراک، لباس اور تعلیم و تفریح کو ترستے

بچوں کا مستقبل سنوارنے کیلئے سیکڑوں آقا اور ان کی آقائی کو مضبوط بنانے والی فوج تیار کی جارہی ہے۔ پیارے پاکستان میں بڑی بڑی کاروں والوں کیلئے شایانِ شان موٹروے بھی ہے اور بے کاروں کے ٹھوکریں کھانے کیلئے گویا ہر گلی،، ٹھوکر وے،، ہے۔

اس عجیب و غریب مملکت میں اربوں کی لوٹ مار کر کے بیرونِ ممالک کے بینکوں میں محفوظ کرنے والے تو این آر او کے طفیل پھر سے حکومت کے سب سے اعلیٰ عہدوں پر براجمان اور پاکستانی بینکوں سے کروڑوں کے قرض خور کسی بھی حساب کتاب سے آزاد اور چار چار پانچ لاکھ کے قرض خواہ بینکنگ کورٹس کے کٹہروں میں خوفزدہ کھڑے ہیں کہ کب ان کے پانچ پانچ مرلے کے مکان بحق سرکار ضبط کئے جاتے ہیں اور کب ان کے ضامن کو ہتھکڑی لگتی ہے۔ اس ملک کی ایک اہم سیاسی جماعت جو ایک بڑے ووٹ بینک رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے، انتخابی مہم میں نعرہ لگاتی ہے کہ،، قوم کو لوڈشیڈنگ اور اس اندھیرے سے نجات دلائی ہے ہم نے،، اقتدار میں آکر کرائے کے بجلی گھروں کے نام پر ملک کے کھربوں روپے اپنے "آئی پی پیز" کو کیپیسٹی کے نام پر ہڑپ کر گئے ہیں اور کسی سے پوچھے بغیر ملک میں لوٹ مار کا ایک اور ایٹم بم چلا دیا ہے جس سے بجلی کا بل بھی عوام پر بجلی بن کر گر رہا ہے اور ئے روز خودکشیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ نصف سے زائد یہ بجلی گھر گوروں کے پاس گروی رکھیں گئے ہیں تاکہ اس کیآڑ میں ان کے ذاتی بھلی گھر بھی چلتے رہیں۔ غریب عوام کا دامن بجلی سے جلا کر خاکستر کر دیا گیا ہے اور اپنے بینک بیلنس میں اس بجلی سے ایک تازہ چمک اور روشنی وصول کر رہے ہیں۔ یہ ہے پاکستان کا حال! جس کا کوئی حساب نہیں۔ یہاں دو جمع دو چار نہیں، اس کا جواب کبھی دس اور کبھی صفر ہوتا ہے۔ اس کا بانی قائد اعظم جیسا تاریخ ساز ہے اور اس کا قیام سر سید اور اقبال کی دانش کا کمال ہے۔

ہمارے ہاں دیہاتوں کی معمولی پنچائت مختاراں بی بی پر حملہ آور ہونے، معصوم بچیوں کو ونی کرنے اور ہمارے سردار کے حکم پر زندہ تسلیم سولنگی کو کتوں کے آگے بھنبھوڑنے کیلئے چھوڑ دیئے جانے کے احکام جاری کر دیئے جاتے ہیں لیکن ہماری حکومتیں ان کا بال تک بیکا نہیں کر سکتی، لیکن دس ایڈوانی، بیس واجپائی اور سینکڑوں من موہن سنگھ اور مودی مل کر ڈاکٹر قدیر خان کے پاکستان پر حملہ آور ہونے کا سوچ نہیں سکتے (شکر الحمد اللہ)۔ یاد رہے یہ وہی ڈاکٹر عبد القدیر ہیں جن کو ڈکٹیٹر کے حکم پر ٹی وی پر کر قوم سے معافی مانگنا پڑ گئی تھی۔ اس لئے کہ ہم عجیب قوم ہیں، پاکستان ایک عجیب ملک ہے۔

میرے عزیز پاکستانی بہن بھائیو! آج یومِ آزادی ہے، سوچو! یہ حساب چلے گا؟ نہیں چلے گا۔ کبھی دو جمع دو سے صفر اور کبھی دس نکالنے والا حساب ختم کرو، اس کتاب کو بند کرو۔ آمل کر ایک نیا باب تحریر کریں جس میں دو جمع دو کا جواب چار ہی نکلے، پھر ہمارے بچے ایک اور باب رقم کریں گے جو درست ہو گا اور پھر ان کے بچے حساب میں ماہر ہو جائیں گے۔ یہ وقت ہو گا جب ہماری کتاب دنیا پڑھے گی۔ آؤ یہ کتاب رقم کریں، اسے رقم کرنے کیلئے اپنے اللہ سے رہنمائی لیں۔ اپنے (ووٹرز) ہی اور ابلاغ کاروں کے تراشے ہوئے بت توڑ دیں۔ آؤ! تقویٰ، نیکی، اخلاص، اہلیت اور دیانت ڈھونڈیں اور ڈھونڈ کر اسے عرش پر بٹھائیں اور بدی کو فرش پر دے ماریں۔

جاگ جاؤ پاکستانیو! اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر واللہ الحمد!!!

بروز اتوار 29 محرم الحرام 1446ھ 4/ اگست 2024

"اگر پاکستان نہ بنتا؟"

اگر پاکستان نہ بنتا تو کیا ہم دینی، اخلاقی، سیاسی، معاشی طور پر آج سے بہتر ہوتے، ہم دل جلوں کو یہ سوال سن کر شدید دکھ ہوتا ہے۔ یہ سوال بر عظیم پاک وہند اور خصوصاً پاکستان کے عام مسلمانوں کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا، وہ بیچارے تو سیدھے سادے مسلمان ہیں اور پاکستان کو اسلام کا گھر بلکہ ملجا وماویٰ جانتے ہیں۔ ان سادہ لوگوں کے نزدیک پاکستان اللہ تعالیٰ کا بیش بہا عطیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ وہ رحیم ذات ہیں جس نے ماہِ رمضان میں قرآن الفرقان نازل فرمایا، اسی خدائے رحیم ورحمان نے ماہِ رمضان مبارک کی ستائیسویں رات کو پاکستان جیسی عظیم الشان نعمت سے نوازا۔

"اگر پاکستان نہ بنتا؟" یہ الفاظ ہمارا کلیجہ جلا دیتے ہیں۔ یہ سوال کوئی بھی صاحبِ ایمان بآسانی نہیں سن سکتا اور وہ بھی اس عالم میں کہ پاکستان وجود میں آ چکا، دنیا کے چھوٹے بڑے ممالک کے مقابل خم ٹھونک کر ایک ایٹمی قوت بن چکا ہے۔ میزائل ٹیکنالوجی میں وہاں کھڑا ہے جہاں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ 78 سال ہونے کو ہیں، پھر ایسا سوال کیوں؟ کیا پاکستان کے وجودِ مسعود کو مشکوک کرنے کیلئے؟ جب تحریکِ پاکستان جاری تھی تو خدا پر ایمان رکھنے والا عام فرد مسلمان جس کے پاس سارا علم کلمہ طیبہ تک محدود تھا، وہ پورے یقین کے ساتھ اس تحریک کو دینی تحریک سمجھتا تھا اور نعرہ زن تھا "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "پاکستان کا مطلب کیا، **لا الہ الا اللہ**"۔ ہاں ان سادہ دل مگر قوی الایمان عام مسلمانوں کے مقابل لغت ہائے حجازی کے ہزاروں قارون اپنے علم کلام اور اپنی منطق کے پیچ وخم میں الجھے ہوئے، تماشائے لبِ بام کے اسیر اور رہین تھے، ان کے دماغ روشن تھے، انہیں قرآن حفظ تھے، ان میں سینکڑوں حفاظ بخاری ومسلم بھی تھے مگر ان کے قلوب پر تالے لگے ہوئے تھے ورنہ حقیقت کو کیوں نہ پا جاتے؟ ان علمائے عظام میں مٹھی بھر وہ بھی تھے جن کا دین ان کے قلوب میں جاگزیں تھا، جن کے دلوں کے پٹ کھلے تھے، یہ تھے وہ خوش قسمت علماء امت جو برا عظم پاک وہند کے عظیم ترین جہاد میں کود گئے اور سپاہیانہ لڑے مگر علماء کی اکثریت محروم رہی۔ یہ سوال کہ پاکستان کا بننا بہتر ہے یا مضر، یہ انہی علمائے کرام کا سوال تھا جن کا دین ان کے دماغ کی متاع تھا، جن کا دین ان کے قلب کا سرمایہ نہ تھا۔ قلب تو مقفل تھے، قرآن الفرقان کا ارشاد گرامی ہے کہ "آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتی، وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں،،۔ دوسرا گروہ روشن خیال متعلقین کا وہ طبقہ تھا جو خود کو اعلیٰ رتبہ ادب وشعر پر فائز سمجھتا تھا، تیسرا گروہ وہ کیمونسٹ حضرات کا تھا اور ان کا ایک معتدبہ حصہ ادیبوں اور شعراء میں شامل تھا مگر علماء کے سوا ان دونوں گروہوں کی مسلمانوں کے یہاں کوئی عوامی حیثیت نہیں تھی۔

اگر ماضی اور حال کے روابط عقیدت کے بندھن سے آزاد ہو کر سوچیں کہ آخر یہ کیا ہوا کہ ہمارے علماء مکرمین امت سے کٹ کر اور ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور کھڑے کھڑے شور مچاتے رہے کہ مسلمانوں کا فائدہ متحدہ بر عظیم میں ہندو غلبے کے تحت ہے نہ کہ ایک آزاد مسلم مملکت میں، جس کے باعث بر عظیم پاک وہند کے مسلمانوں کی دو تہائی آبادی ہندو کی محکومیت کے عذابِ الیم سے بچ سکتی تھی اور کچھ بھی نہ ہوا سہی، کیا اللہ کا یہ احسان کم ہے کہ کروڑوں کی مسلم آبادی کو ان کا آزاد وطن میسر آ گیا؟ وہ علماء اس زمانے میں یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زیرِ سایہ اسلام کا نفاذ زیادہ مشکل ہو گا، اس کے برعکس متحدہ ہندوستان میں اسلام کا نفاذ آسان تر ہو گا یعنی حکومت الہیہ اور نظامِ مصطفیٰ کا قیام حضرت امیر المومنین والمومنات، امیر الاحیاوالاموات گاندھی خوش صفات کے زیرِ اقتدار اور ان کے بت پرست دیگر ورثاء کے زیرِ حکومت بہتر طریق پر عمل میں آ سکتا ہے۔ گاندھی جی کے ذریعے نظامِ اسلام کا نفاذ سہل تر جاننے والے کون لوگ تھے؟ وہ علماء اکابر تھے جن کے نزدیک ہندو لیڈروں کی ہر بات حق تھی، مسلمان قائدین

کی ہر بات باطل۔ اگر ذرا غور کر لیں تو ایمان کی خاطر جنگ اور جہاد کرنے والے عام مسلمان تھے جن کا علم دین محدود تھا، ان کے مد مقابل سیکولر روش کے طالب، لغت ہائے حجازی کے قارون تھے، شیوخ القرآن، شیوخ الحدیث، خطبائے اسلام، ائمہ دین متین، حد ہو گئی علماء سیکولر، غیر علماء مسلمان بنیاد پرست، اسلام کے غلبے پر بھرپور ایمان کے مالک!

آج اسلامی بنیاد پرستی کے معنی تو یہی ہے ناں کہ مسلمان کو اسلام کی حقیقت پر یقین ہو۔ اس کا مطلب اسلام کا فراواں علم حتماً نہیں، اگر کوئی عالم بھی صاحبِ تصدیق ہو تو الحمدللہ، مگر عموماً جو دیکھا جا رہا ہے وہ متوسط طبقہ ہی مراد ہے۔ اہلِ دین اور اہلِ ایمان کا متوسط طبقہ وہ امت کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اس لئے کہ وہ غیرت والے ہیں۔ اس متوسط طبقے کو قوم کی اکثریت کثیرہ کا بھرپور تعاون حاصل ہے، خدا کے فضل سے پاکستانی عوام کا ایمان نہیں ڈولتا، وہ پاکستان کو اللہ کی عظیم نعمت جانتے ہیں اور پاکستان کے پروانے ہیں۔ مجھے اچانک ایک کتاب یاد آ گئی ہے جس کا نام،، انڈین ڈیسٹنی،، (تقدیرِ ہند)، مصنف کا نام تھا سرل مودک، مصنف عقیدے کی رو سے ہندو تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں متحدہ قومیت کے مخالفوں کی خوب کھال کھینچی ہے اور اس نظریے کے حامیوں کو خوب خوب اچھالا ہے۔ ماضی کے بہت سے اکابر میں شہزادہ داراشکوہ کی بے حد تعریف کی ہے۔ وہی داراشکوہ جس کے بارے میں حضرت علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

تخم الحادے کہ اکبر پرورید
بار دیگر در دل داراو مید
(الحاد کا بیج جو اکبر نے بویا تھا وہ دوبارہ شہزادہ داراشکوہ کے دل میں پھوٹ پڑا)

اور آپ کو سن کر حیرت ہو گی کہ مسٹر سرل مودک نے اس کتاب میں یہ بھی تحریر کر دیا کہ داراشکوہ کے مقابل ایک تنگ دل اور متعصب شخص اورنگ زیب تھا اور ہمارے دور میں داراشکوہ کا جانشین ابوالکلام ہے اور اورنگ زیب کا جانشین مسٹر جناح۔ یعنی اس کتاب میں سیکولر ذہن کا جانشین جس شخص کو بتایا گیا تھا وہ امام الہند، خطیب الہند،، اور متعصب تنگ دل مسلمان بتایا گیا مسٹر جناح کو،،۔ اور اورنگ زیب اور قائداعظم کے تعصب اور تشدد کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اس کا مطلب مہذب محاورے کے مطابق بنیاد پرست ہے۔ آپ سوچ لیں کہ یہ بیان ایک ہندو اسکالر کا ہے اور ساتھ ہی یہ یاد رکھیں کہ حضرت علامہ شبیر عثمانی نے قائداعظم کے جنازے کے موقع پر جو کلمات ارشاد فرمائے ان میں یہ الفاظ بھی تھے کہ قائداعظم محمد علی جناح حضرت اورنگزیب عالمگیر کے بعد برعظیم کے سب سے بڑے مسلمان تھے۔ ایمان و ایقان کا تعلق دل سے ہے۔ کلمہ طیبہ کے عربی حروف وہ مشرکین مکہ نہ سمجھ سکے جو ابوجہلی گروپ سے تعلق رکھتے تھے، کیا ان کو عربی نہیں آتی تھی؟ ان کو عربی آتی تھی اس کے باوجود کلمہ طیبہ کے الفاظ ان کیلئے غیر زبان کے اجنبی الفاظ تھے، بقول حضرت علامہ اقبال:

تو عرب ہو یا عجم ہو، ترا الٰہ الا
لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

ایمان کا مسئلہ قلب سے تعلق رکھتا ہے اور کفر کا بھی قلب سے۔ باقی رہا تعقل تو وہ میان غیاب و حضور سراب یا اعراف، وہ تیسری دنیا ہے مذکر اور مونث کے مابین ایک تیسری دنیا، کبھی امریکہ اور روس کے مابین ایک تیسری دنیا تھی۔ وہ افراد جو لغت ہائے حجازی کے قارون تھے وہ ایمان کی منطق کی میزان پر تولتے رہے اور فرمایا:

عشق فرمودہ قاصد سے سبک کام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی

یہ منطق باز اور تعقل طراز طبقہ اس وقت بھی لبِ بام تھا، آج بھی لبِ بام ہے، لہٰذا یہ حضرات اس وقت بھی پورے بر عظیم میں مسلمانوں کی محکومی کو مسلمانوں کے حق میں اللہ کی نعمت جانتے تھے اور مسلمانوں کی ممکنہ آزادی کو، ان کے آزاد وطن کو، ان کے اپنے آزاد جھنڈے کو، ان کے اپنے ٹینکوں ،اپنی توپوں اور اپنے سکوں کو اور ان کے اپنے اقتدار و اختیار کو پر خطر جانتے تھے، حیف جب وقتِ جہاد آیا تو وہ جن کو ائمہ مجاہدین بننا تھا ان کیلئے گویا آیاتِ جہاد منسوخ ہو گئی تھیں۔ حضرت علامہ اقبال نے بجا ہی تو کہا تھا:

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر!
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

دسمبر 1946ء میں انگلستان سے لوٹتے وقت حضرت قائد اعظم مصر میں چند روز کیلئے رک گئے تھے، لیاقت علی خان بھی ہمراہ تھے۔ مصر میں وہ موتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کرنے اور مصر کے اہلِ سیاست و اہلِ صحافت کو تحریکِ پاکستان کے مطالب، مقاصد اور مفادات سے آگاہ کرنے کیلئے گئے تھے۔ جناب زیڈ اے شیخ اور محمد رؤف کی انگریزی تصنیف،، قائد اعظم اور اسلامی دنیا،، میں کچھ کلمات درج ہیں جو قائد اعظم نے مصر کے اکابر کی خدمت میں ارشاد فرمائے تھے۔ قائد اعظم نے وزیر اعظم مصر نقراشی پاشا اور سابق وزیر اعظم اور وفد پارٹی کے قائد نحاش پاشا کی ضیافتوں میں شرکت کی اور اہلِ صحافت کی دعوتوں میں بھی۔ اے کاش قائد اعظم کے وہ سارے بیانات کوئی اکھٹے کر سکتا جو عربی اور انگریزی اخبارات میں ان دنوں شائع ہوئے۔ دسمبر کے نصف آخر کے مصری انگلستانی اخبارات اور ہندوستان کے خصوصاً ڈان اخبار کے تراشے ملاحظہ فرمائیں جو آج بھی برٹش لائبریری میں محفوظ ہیں۔

والپرٹ اور زیڈ اے شیخ وغیرہ نے جو لکھا اس میں قائد اعظم کا اس امر پر زور تھا کہ "تم مصر والے بلکہ سارے مشرقِ وسطیٰ والے اس بات سے واقف نہیں ہو کہ انگریز کے جانے کے بعد جو مملکت انگریزی استعمار کی وارث بنے گی وہ کتنی بڑی اور طاقتور ہو گی، تم لوگ ایک نئی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے ،تمہاری نہر سویز آج انگریز کے اشارۂ ابرو پر کھلتی اور بند ہوتی ہے تو کل ہند و مملکت کا حکم نافذ ہو گا، ہاں! اگر ہم وہاں پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ہند و مملکت کی توجہ کا مرکز ہم ہوں گے، تم عیش کرنا۔ اس لئے یہ امر ذہن نشین رہے کہ ہم ہندوستان میں فقط وہیں کے مسلمانوں کی جنگِ آزادی نہیں لڑ رہے ہیں۔ ہم ہندو کی اجتماعی نفسیات کو سمجھتے اور جانتے ہیں، وہ غیر ہندو عناصر کو اپنے معاشرے میں زندہ نہیں رہنے دیتے، ہمیں معلوم ہے کہ اگر ہم وہاں ہار گئے تو ہم نہ صرف از روئے تمدن مٹا دیئے جائیں گے بلکہ از روئے دین بھی نابود ہو جائیں گے، اور اگر ہم وہاں مٹ گئے تو ہمارے ارد گرد کے مسلمان ممالک بھی مشرقِ وسطیٰ سمیت برباد ہو جائیں گے۔ آپ صفحہ ہستی سے محو ہو جائیں گے، لہٰذا یاد رکھیں کہ اگر ہم ڈوبیں گے تو اکھٹے، تیریں گے تو اکھٹے"۔

قائد اعظم جو ہماری جغادری علماء اور دین کے قیادت کاروں کے نزدیک روحِ دین سے بے بہرہ تھے، محض صاحب بہادر تھے بلکہ فاسق و فاجر تھے، وہ تو سارے عالمِ اسلام کے باب میں پاکستان کی اہمیت سمجھتے تھے اور اس اہمیت کو اہلِ مصر کے ذریعے سارے عالمِ عرب کے ذہن نشین کروا رہے تھے مگر خود ہندوستان میں بیٹھے علماء اکابر اس بیچارے کی بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں تھے اس لئے کہ وہ ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے زمرہ شیوخ، ائمہ اور

خطباء وصلحاء میں شامل نظر نہیں آتے تھے اور نہ گاندھی کی طرح لنگوٹی باندھتے تھے۔ ظاہر بین حضرات کے نشہ خود بینی اور مرض خود فروشی نے قائد اعظم کے قلب کا عالمِ اخلاص ونور نہ دیکھا۔ مرزا غالب نے کیا خوب کہا:

قمری کف خاکستر وبلبل قفس رنگ!

اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

قمری کا رنگ خاکستری، بلبل خوشنما رنگوں کا مجموعہ، بلبل برعظیم کے باشندوں نے دیکھا ہی نہیں، وہ سرسبز اور سرد منطقوں میں پایا جانے والا خوبصورت پرندہ ہے۔ قمری بھی عاشق زار اور بلبل بھی جگر فگار، پھر کون سا لباس عشق کی نشانی ہے؟ غالب یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ عشق کا تعلق جان ودل سے ہے لباس سے نہیں، عاشق کا لباس عاشقی ہے۔

بڑے دکھ کی بات ہے کہ اعلیٰ پائے کے ادباء وشعراء کی اکثریت تحریکِ پاکستان سے الگ رہی۔ یہ بڑے شعراء اور ادباء عموماً متعقل تھے اور فیشن کے طور پر قومی معاملات سے نفور، ہندو گانٹھ کا پکا تھا کہ وہ اپنی ہر پارٹی، ہر گروہ اور ہر پلیٹ فارم پر ہندو تھا۔ ہندوؤں میں کیمونسٹ بھی تھے مگر ہندو مفادات کے باب میں وہ بھی فقط ہندو تھے، ہندوؤں میں رائے بہادر اور سر بھی تھے مگر وہ بھی اپنی قومی امنگوں سے ہم آہنگ تھے، خود ان کی اپنی قوم نے ان کو ہندو جاتی کے مفادات کا دشمن کبھی نہ جانا، وہاں کانگرس اور مہاسبھائی معناً ایک تھے۔ وہ سارے لیڈر قوم کے مشترک لیڈر تھے، وہ مشرک تھے مگر عملاً وحدت پسند، ادھر مسلمان موحد تھے مگر تفرقہ ہی تفرقہ، لہٰذا عملاً مشرک (قرآن نے امت میں تفرقہ پیدا کرنے والوں کو مشرک قرار دیا ہے)۔ تحریکِ پاکستان پھیل کر فقط مسلم لیگ ہی کا مسئلہ نہیں رہ گئی تھی تاہم ہمارے علماء کبار کی بھاری اکثریت کو اس میں مسلمانوں کا مفاد نہیں بلکہ فساد نظر آتا تھا، ایسا کیوں تھا؟

سب سے بڑا باعث تو یہ تھا کہ ان کے بلند بام علمی مناصب کے نصاب کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں نہ تاریخ اسلام سے نہ تاریخ ہند سے۔ اپنی معاصر ارد گرد کی تاریخ سے بھی ناآگاہ، تاریخ سے بھی ناواقفیت، جغرافیئے سے بھی لاعلم، اپنے محل وقوع کا سرے سے ہی علم نہیں۔ 1965ء کا ذکر ہے کہ میں میٹرک کا طالبِ علم تھا۔ میرے شہر فیصل آباد (لائل پور) کی سب سے بڑی جامع مسجد کے خطیب اعلیٰ اور مدرسہ کے سربراہ (مسجد اور مدرسے کا نام بطور احترام مخفی رکھنے پر معذرت) نے پوچھا کہ یہ ہٹلر کا وطن جرمل (جرمنی) کہاں ہے؟ میں کیسے بتاتا، لہٰذا میں نے شہر کے ایک کتب خانے سے دنیا کا نقشہ خرید لیا اور مسجد سے ملحق مدرسے کی لائبریری کی دیوار کے ساتھ لٹکا دیا۔ مدرسے کے سربراہ نے تمام معلمین اور سنئیر طلباء کو بلا لیا۔ وہ سب لوگ مجھ سے بے حد محبت اور پیار کرتے تھے، مسجد ومدرسہ کے تمام بزرگ مجھے اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں آج بھی ان کو اپنا مربی سمجھ کر ان کو ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھتا ہوں۔

مدرسہ کی تمام اہم شخصیات، اساتذہ اور طلباء نقشے کے سامنے دائرہ کی شکل میں بیٹھ گئے۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ علماء اجل نقشے پر شمال اور جنوب نہیں بتا سکتے تھے۔ جغرافیئے کا یہ عالم، تاریخ ہند سے بالکل ناواقف، معاصر غیر اقوام کے دھندوں سے قطعاً بے نیاز، یہ حضرات دینی علوم خصوصاً حدیث شریف اور فقہ میں طاق تھے، منطق میں طرار اور صرف ونحو میں طیار.....! اس مدرسے کا علمی درجہ ملک بھر میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا، اور اب بھی ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل آج بھی پاکستان کے ہر علاقے میں معزز علماء وفضلا اور اہل افتاء میں شامل ہیں اور کچھ تو آج پاکستان کی صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے اراکین اور وزارت کے مزے بھی لوٹ رہے ہیں۔ اس عظیم درسگاہ کا نصاب اگر دیوبند شریف ہی کے مطابق تھا تو عیاں ہے کہ دیوبند شریف کے فارغ التحصیل حضرات شائد چند ایک کو چھوڑ کر حالات گردوپیش سے خواہ وہ معاشی تھے خواہ انتظامی تھے یا

سیاسی، کس قدر آگاہ تھے ؟اس کے باوصف اصرار تھا کہ مسلمان اپنے سارے فیصلے سیاسی امور سمیت، فقط علماء حضرات کے حسبِ فرمان کریں۔

میں اس وقت بھی سوچتا تھا اور آج بھی سوچتا ہوں، اس وقت بھی اظہارِ خیال کرتا تھا اور آج بھی اظہارِ خیال کرتا ہوں کہ ہمارے علماء حضرات میں سے کتنے تھے جن کو مسجد اور مدرسے کی زندگی سے باہر کے امور کا تجربہ تھا، ان میں سے کتنے تھے جن کو کسی معمولی ٹاؤن کمیٹی کے کاروبار کا بھی علم تھا؟ کیا انہوں نے ہندو کے ساتھ مل کر کبھی کسی دفتر، تجارتی حتیٰ کہ علمی ادارے میں بھی کام کیا تھا، پھر لازم تھا کہ وہ اپنا کام کرتے جس میں وہ ماہر تھے۔ قائد اعظم یا دیگر مسلم لیگی زعماء نے کب کہا کہ علماء حضرات کو عربی نہیں آتی، یا وہ قرآن و حدیث کی عبارات کے معنی نہیں بیان کر سکتے، ہاں! وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ حضرات! جس کام کو آپ کو تجربہ نہیں، اس میں آپ ماہرانہ رائے نہ دیں، ہم آپ کے حلقہ علم مداخلت نہیں کرتے، ہم فتوے نہیں دیتے، ہم درسِ حدیث کا دورہ نہیں کراتے، اس کے اسلوب نہیں بتاتے، یہ اس لئے کہ کسی کو بھی سارے کام نہیں کرنا ہوتے۔،، جس کا کام اسی کو ساجھے،،۔ لیکن علماء نے پھر بھی ہندوستان کے ہندو مسلم مسئلے کا حق ان افراد کے سپرد نہیں کیا جو تجارت کے میدان میں، بلدیات کے میدان میں، قانون سازی کے میدان میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصابی اور علمی و تحقیقی میدان میں اور سیاست کے ہر میدان میں ہندو کے ساتھ کام کر رہے تھے اور بخوبی جان رہے تھے کہ ہندو جہاں انگریزی استعمار سے نجات کا خواہاں ہے وہیں ساتھ ہی ساتھ کوشاں ہے کہ مسلمانوں کا بہر طریق اس طرح کچومر نکال دے کہ جب انگریز سے آزادی حاصل ہو تو مسلمان من حیث الامت ان کیلئے دردِ سر نہ بن سکیں۔ یہ امر بالکل واضح تھا لیکن مسجد اور مدرسے کے باہر جھانک کر جنہوں نے دیکھا ہی نہ تھا اور جن کا نصاب انہیں برادرانِ وطن کی تاریخ و تہذیب سے آگاہ ہونے ہی نہ دیتا تھا، وہ ہندو قوم کی اجتماعی نفسیات اور مسلمانوں کے بارے میں ان کی نیتوں کو کیا جانتے؟

وہ مسلمان جو ہندو کو ہر میدان میں کارفرما دیکھ رہے تھے وہ بخوبی جان گئے کہ ہندو اپنے معاشرے میں کسی غیر ہندو معاشرے یا سوسائٹی کو ایک متحرک عنصر کی طرح موجود نہیں دیکھ سکتے۔ انہوں نے ہندوستان میں آکر یہاں کے اصلی باشندوں کو تہس نہس کر دیا، قطعاً اچھوت بلکہ چنڈال بنا کر رکھ دیا، بدھ مت اور جین مت کے پیروؤں کو نابود کر دیا، بدھ مت والوں نے تقریباً آٹھ سو سال بھارت کے کبھی بیشتر اور کبھی کمتر حصے پر حکومت کی مگر جب برہمنی نظام دوبارہ مسلط ہوا تو بدھ مت والوں کو ختم کر دیا گیا، وہ کروڑوں تھے مگر محو محض ہو کر رہ گئے۔ وہ آج بھی چین میں ہیں، جاپان میں ہیں، ویت نام، کمبوڈیا، سری لنکا اور برما میں ہیں مگر وہاں نہیں ہیں جو ان کا اصلی وطن تھا، جہاں انہوں نے صدیوں حکومت کی تھی، جہاں کا عوامی مذہب بدھ دھرم بن گیا تھا، لیکن ہمارے علماء کی اکثریت کو اس بات کا علم نہ تھا اور نہ ہی اس سے غرض۔ وہ کہتے تھے پہلے انگریز کو نکالو، بعد میں ہندو سے نمٹ لیں گے لیکن ہندو شناس اہلِ نظر اور امت کے مستقبل کو ہندو ذہن کے آئینے میں دیکھ لینے والے اہلِ اخلاص نے رفتہ رفتہ یہ طے کر لیا کہ ہندو اگر دو محاذوں پر لڑ رہا ہے، یعنی انگریزوں کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف تو ہمیں بھی دونوں محاذوں پر یعنی انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف لڑنا ہو گا۔ ہندو بھی اتنا دشمن ہے جتنا انگریز، لہٰذا یہ اہتمام ابھی سے شروع ہو جانا چاہئے کہ جب انگریز جائے تو ہندو قوم مسلمانوں کو من حیث الامت مغلوب نہ کر لے۔ چنانچہ علامہ اقبال اور مولانا حسرت موہانی نے بہت پہلے یہ امر واضح کر دیا، پھر مولانا محمد علی جوہر کانگرس سے جدا ہو گئے۔ شوکت علی بھی مولانا ظفر علی بھی، مولوی تمیز الدین بھی، سردار عبد الرب نشتر بھی، خان عبد القیوم بھی، اور مولانا محمد اکرم بھی۔ وعلیٰ ہذا القیاس، قائد اعظم تو 1923 میں کانگرس کو پہچان کر الگ ہو گئے تھے۔

علمائے دین کی بھاری اکثریت اتنی سی بات کو نہ سمجھ سکی، چلیں یونہی سہی، البتہ آج کے پاکستانی عوام یہ پوچھنے کا حق ضرور رکھتے ہیں کہ ہندو کی ہاں میں

ہاں ملانے والے، لہٰذا انگریزی جمہوریت کے متوالے علمائے دین نے جب یہ دیکھا کہ امت کی بھاری اکثریت نے تحریکِ پاکستان کو اپنالیا ہے تو کیا اپنی جمہوریت پسندی کے اصول کی روشنی میں ان کو مسلمانانِ بر عظیم کی مرضی قبول کر لینی چاہئے تھی یا نہیں؟ آج بھی ان علماء کا وہی گروہ پر شکوہ اور اسی طرح دیوبند کے باہر کے دین پسند حلقوں کے وابستگان، جو ہر نظام پر خواہ وہ نظام شوریٰ ہی کیوں نہ ہو، مغربی جمہوریت کو ترجیح دیتے ہیں، مسلمانانِ بر عظیم کے اس واضح جمہوری فیصلے کو قبول کرنے پر کیوں تیار نہیں.....! اگر علماء کی سیاست ہارتی ہے تو پھر ان کو ہرانے والی جمہوریت مردود..... امریکہ کو ہر جمہوریت پسند ہے ماسوائے اس جمہوریت کے جس کے ذریعے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے برسرِ اقتدار آنے کا خدشہ ہو یعنی اپنی اپنی اصول پسندی اور اس کے معیار..... الجزائر اور مصر میں ہم یہ سب کچھ دیکھ چکے ہیں۔

مسلمانانِ برصغیر نے بہ خلوص خاطر دینی جہاد کیا تھا۔ مسلمانوں کیلئے ایک وطن حاصل کرنے کی خاطر اور الحمدللہ کہ مسلمان عوام کی اکثریت کثیرہ کا پاکستان پر ایمان قائم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سیکولر علماء یعنی گاندھی اور نہرو کے پیروکار ہندو ناشناس حضرات اور ان جیسے دیگر متکبر علماء نے اس تحریک کو فراڈ قرار دیا تھا اور قائداعظم کو فراڈِ اعظم کا خطاب دیا تھا اور ان بزرگوں کی عالی قدر اولاد بھی یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتی کہ ہم پاکستان کے بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے، مصداق من صادر کو الدہ فما ظلم (جو اپنے باپ پر گیا اس نے کوئی زیادتی نہیں کی) مگر کیا وہ مسلمانانِ بر عظیم کی جدوجہد کو جمہوری نقطہ نظر سے بھی سر آنکھوں پر نہیں رکھتے؟ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ہندو کا جمہوری فیصلہ قبول مگر مسلمانوں کا جمہوری فیصلہ مردود!

خود کو دین کا پاسبان اور اسلام کے محافظ اور داعی جاننے والوں نے 1945ء اور 1946ء کے انتخابات میں کیا رویہ اختیار کیا تھا؟ یہی ناں کہ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ مسلم لیگ جیتے یا کوئی اور پارٹی، پاکستان معرض وجود میں آتا ہے یا کہ نہیں، ہم کو تو خدمتِ اسلام سے غرض ہے۔ ہم خدمتِ اسلام کے مؤقف پر قائم ہیں، وہ لوگ بری طرح ناکام رہے۔ آج بھی ان عالیشان حضرات اہلِ ایمان کا مؤقف یہی ہے کہ مسلم لیگ جیتے یا ہارے، ہمیں غرض نہیں کسی وطن دشمن سیاسی پارٹی کو فتح حاصل ہو، ہماری بلا سے، یہودی اور برہمن اور امریکن مقاصد کو تقویت نصیب ہو، بیشک ہوتی رہے، ہم خدمتِ اسلام کے مؤقف پر قائم ہیں۔ ہمارا مؤقف درست ہے اور وہ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے اس رویے نے پاکستان پر یہودی، قادیانی اور برہمنی گرفت مضبوط تر کر دی ہے۔

صاحبِ گنبدِ خضریٰ میں فریادی بن کر آیا ہوں
تاج و تخت ختمِ نبوت بیچ دیا دیندا روں نے

یہ ہیں وہ لوگ جو یہ منحوس استفسار کرتے ہیں کہ پاکستان نہ بنتا تو کس طرح کا واضح فائدہ میسر آسکتا تھا۔ دینی، اخلاقی، سیاسی اور معاشی وغیرہ وغیرہ اعتبارات سے۔ ایسے لوگوں کو اب اہلِ قادیان کی جماعت بھی بطور معاون مل گئی ہے، کراچی کی ایک لسانی جماعت کا خود ساختہ قائد بھارتی اور اسرائیلی ایجنٹ جو بھارت جا کر قائداعظم اور علامہ اقبال کو پاکستان کی دھرتی کو مطعون کرتا رہا اور ہر صاحبِ اقتدار پارٹی کے ساتھ حکومت کے مزے بھی لیتا رہا اور آج کل یہاں موجود ہے۔ اس جماعت کا ہر فرد تاویل کا بادشاہ ہے اور آج ایسی جماعتوں کے سب ہی افراد چھوٹے بڑے، مذکر و مونث، پاکستان کے

خلاف عقلی دلیلوں کے انبار لگا رہے ہیں۔ وہ بڑی جلدی میں ہیں شائد ایسی موافق حکومت پھر میسر نہ آئے یا شائد ایسی مہربان اور ہمنوا حکومت تادیر نہ رہے۔

ہندو نے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ ہندو سربراہوں کے چیلوں نے بھی اس مملکِ خداداد کو تسلیم نہیں کیا۔ یورپی اور مسیحی قومیں خصوصاً انگریز اس برعظیم میں اسلام کے نام پر کسی مملکت کا ظہور قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کے پروردہ قادیانی حضرات اور روحانی صاحب بہادران کا تاحال یہی حال ہے۔ کیا جس طرح تحریکِ پاکستان کے دوران میں علماء کبار ہندو اور انگریز کا خصوصاً ماؤنٹ بیٹن اور ایٹلی کی حکومت کا رویہ نہ سمجھ سکے، آج بھی اسی طرح غافل ہیں یا دانستہ سیکولرازم کے پرستار ہیں، یہ منحوس سوال کہ "اگر پاکستان نہ بنتا تو آیا ہم اس اعتبار سے اچھے رہتے" اٹھا ہی کیوں؟ پاکستانی عوام اس سوال کو ان کے ایمان کے خلاف آوازۂ مبارزت سمجھتے ہیں، ایسے سوال کو وہ اپنی توہین گردانتے ہیں، لہٰذا انہوں نے ایسے سیکولر عناصر کو جو محراب و منبر اور کرسی و دفاتر کی زینت ہیں، پائے استحقار سے ٹھکرا دیا ہے۔ اہلِ پاکستان کی اکثریت کثیرہ کا پاکستان پر بھرپور ایمان تھا اور وہ ایمان قائم ہے اور قیامت تک یہ ایمان قائم رہے گا انشاء اللہ۔ علمائے سوء نے اور دین کے ان علم برداروں نے تحریکِ پاکستان کے دوران بھی مسلمانوں کا دل دکھایا تھا اور آج بھی انہوں نے وہی اذیت کاری دہرائی ہے۔

خدا توفیق کیش کفر بخشد دیں پناہاں را

ہاں اس وقت اور اس وقت میں فرق ہے، تحریکِ پاکستان کے دوران میں امت کو ایک قد آور قائد میسر تھا، جس کی بصیرت، اخلاص، ذہانت اور سب سے بڑھ کر امانت داری پر مسلمانانِ ہند کو بھرپور اعتماد تھا اور آج ایسا کوئی مرکزی فرد جو نظر گاہِ اعتماد بن سکے موجود نہیں۔

پروفیسر بینی پرشاد نے لکھا تھا کہ مسلمان ابھی تک اپنی انفرادی ہستی قائم رکھے ہوئے ہیں، ان سے پہلے یہاں آنے والے گروہ اور قومیں ہندو معاشرے میں مدغم ہو گئے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ مسلمانوں پر عیاں ہے کہ وہ بھارت کو ترکی، ایران اور مصر کی طرح اسلامی رنگ نہیں دے سکے جس کی سب سے بڑی وجہ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر تھا جس نے ہندومت کو ہندوستان سے مٹنے سے بچایا وگرنہ اس وقت اورنگزیب کی حکومت ہوتی تو آج ہندوستان کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا۔ سرل مودک نے کہا کہ مسلمان بھی دیگر غیر ہندو اقوام کی طرح ہندوؤں کی محبت کے باعث ہندوؤں میں ضم ہو جائیں گے، یعنی نابود ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر رادھا کشنن نے کہا (وہ ڈاکٹر رادھا کشنن جو بھارت کے فیلسوف صدر رہے تھے) کہ ہندو دھرم نے بدھ مت کو بھائیوں کی طرح بغل گیر ہو کر ختم کر دیا، سوامی دھرم تیرتھ جی مہاراج نے ارشاد کیا: ڈاکٹر رادھا کشنن کچھ بھی ارشاد فرمائیں، حقیقت یہ ہے کہ برہمنی ہندوؤں نے بدھوں کو قتل کیا، ان کے گھر گرائے، ان کے جانور ہلاک کئے، ان کی فصلوں کو آگ لگا دی، ان کی اکثریت کو علاقہ بدر کر دیا۔ شیام پرشاد مکرجی نے قراردادِ پاکستان کے پیش اور پاس ہونے سے تقریباً ایک برس بعد دیا کھیان دیا کہ "تقسیم کے آوازے ادھر ادھر سے سن رہا ہوں، اگر پاکستان بن گیا تو ہم اسے باقی نہیں رہنے دیں گے۔

سوامی دیانند جی نے فرمایا کہ بھارت وید دھرم کا وطن ہے اور بھارت کو واپس ویدوں کی طرف جانا ہے اور یہاں بسنے والوں کو ویدی دھرم کے رنگ میں خود کو رنگنا ہو گا۔ آر ایس ایس کے بل راج مدھوک نے اظہارِ افسوس کیا کہ ہندو قوم نے ایک ہزار سال پہلے محمد (ﷺ) کا بت بنا کر مسجد مندر منڈی بازار وغیرہ میں کیوں نہ سجا دیا۔ مسلمان اپنے پیغمبر کو پوجنے آتے تو ان کے دلوں سے ہمارے بتوں کی نفرت بھی نکل جاتی اور رفتہ رفتہ وہ ہمیں میں گم ہو جاتے جس طرح بدھ مت والے ہو گئے۔ ہم نے بدھ مت جی کو اوتار مان لیا اور ان کا بت اپنے بتوں میں شامل کر لیا۔ ہمارے سینکڑوں ہزاروں بتوں

میں ایک بت کا اضافہ ہو گیا مگر بدھ کہیں کے نہ رہے (حالانکہ بدھوں کو جبراً قہراً ختم کیا گیا تھا جیسا سابقہ سطور میں سوامی دھرم تیرتھ جی کی زبانی بیان ہوا)۔ گاندھی جی فرمایا کہ مجھے اردو زبان کے حروف قرآن کے حروف سے مشترک نظر آتے ہیں، لہٰذا ہندوستانی زبان اختیار کی جائے اور وہ بھی دیوناگری اکھروں میں۔ پنڈت جواہر لال نہرو بڑے روشن خیال انٹیلکچوئل ہونے کے مدعی تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ "ہندوستان میں ایک ہی قوم ہے اور وہ ہے ہندوستانی، دو قومی نظریہ مٹھی بھر افراد کا پیدا کردہ شاخسانہ ہے، میں نے غور سے دیکھا ہے، میں نے خوردبین لگا کر غور سے دیکھا ہے مگر دوسری قوم مجھے تو نظر نہیں آئی"۔

دو قومی مسئلہ کہاں ہے یعنی مسلمانوں کے جداگانہ وجود سے یکسر انکار! 1937ء میں جب کانگریسی وزارتوں کا قیام عمل میں آیا تو چھ صوبوں میں ودیا مندر اسکیم نافذ کر دی گئی۔ وہ تعلیمی منصوبہ تھا کہ غیر بھارتی عناصر کو بھارتی زندگی میں سے نکال باہر کیا جائے، بھارتی ہیرو اور وہ بھی ہندو سامنے لائے جائیں۔ ہندی زبان نافذ کی جائے، گیت بندے ماترم مدرسوں میں گایا جائے، اس بندے ماترم کو قائداعظم نے مشرکانہ گیت قرار دیا تھا۔ بندے ماترم جس ناول آنند مٹھ سے لیا گیا تھا اس کی ساری کہانی مسلم دشمنی کے زہر سے لبریز ہے۔ مسلمان عوام اور مسلم لیگی قائدین ہندوؤں کے اس صریح مسلم کش رویئے پر چیخ اٹھے، ہاں گاندھی جی کی مورتی بھی مدرسوں میں سجادی گئی تھی جس کے روبرو ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونا اور پرنام عرض کرنا شامل درس و تربیت قرار دیا گیا، مسلمان بچیوں اور بچوں کو بھی اس کارِ شرک پر مجبور کیا جانے لگا، چنانچہ مسلمانوں کو باقاعدہ کمیشن بٹھانے پڑے اور ان کمیشنوں نے تحقیقی رپورٹس شائع کیں، شریف رپورٹ اور اے کے فضل الحق رپورٹ کا تعلق اسی رودادِ ستم و جور سے تھا، لیکن مسلمانوں کے صاحب بہادر، کیمونسٹ وغیرہ طبقے تو ایک رہے، عملدارانِ دین متین نے مسلمان عوام اور ان کے ہر دلعزیز قائدین کی ایک نہ سنی۔ علماء کے نمائندے مسلسل کہتے رہے کہ بندے ماترم قومی گیت ہے ہم گاتے رہیں گے، حضرت ابوالکلام آزاد جیسے بزرگوں نے اوپر بیان کردہ تحقیقاتی رپورٹ کی تردید کی اور جب مسلمانوں نے کانگرسی وزارتوں کے خاتمے پر دسمبر 1939ء میں یومِ نجات منایا تو ہندو جاتی کو دکھ ہونا ہی تھا۔ علماء حضرات نے بھی مسلم عوام اور مسلم لیگ کے اس عمل کو متحدہ قومیت کی روح پر فتوح کے خلاف عناد و فساد قرار دیا۔ یاد رہے کہ یومِ نجات میں اچھوتوں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا جیسا کہ ڈاکٹر لنکا سندرام نے اپنی کتاب "اے سیکولر سٹیٹ فار انڈیا" میں ذکر کیا ہے۔

قارئین! بھارتی ہندو جاتی اور اس کی قیادت پاکستان اور اہلِ اسلام کا وجود اس برعظیم سے مٹانے کے درپے تھی اور 78 سال گزرنے کے بعد اب بھی درپے ہے۔ کیا اس حالت میں وہاں مسلمانوں کیلئے کوئی بہتری عمل میں آسکتی تھی؟ کیا وہ مسلمان جو وہاں ہیں ان کی صورتِ حال خود ٹھوس شہادت نہیں اس امر کی، کہ ان کو مٹانے کی اب بھی کوششیں جاری و ساری ہیں۔ ہمارے قوم پرست ملا یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ ہندو قوم مسلمانوں کو نہیں مٹا سکتی، 13 سو سال ہو گئے ہیں اکھٹے رہتے ہوئے۔ خدا جانے ہمارے قوم پرست ملا کی دانش کیوں غائب رہتی ہے؟ ہم ہندو کے ساتھ اکٹھے کب رہے ہیں؟ ہم حاکم تھے اور ہندو محکوم تھے۔ صدیوں یہ حال رہا، ایسی صورت میں وہ مسلمانوں کو کس طرح نقب لگاتے، الٹا ان کو نقب لگتی رہی، مسلمان اور ہندو دونوں انگریز کے غلام ہو گئے، ایسے عالم میں ہندو بھی بے بس اور مسلمان بھی محکوم۔

ویسے ہندو مسلمان ایک ہی برعظیم میں آباد ہونے کے باوجود اکٹھے کبھی نہیں رہے۔ حق یہ کہ امتحان اور آزمائش کا وقت اب آیا ہے، جب بھارت میں ہندو حاکم کی طرح مسلط ہو گیا ہے۔ بھارتی مسلمانوں کو نقب لگ رہی ہے، کشمیریوں پر بے پناہ مظالم توڑے جا رہے ہیں، ایک لاکھ سے زیادہ ان کے معصوم بچے، بے گناہ عورتیں، جوان اور بوڑھے شہید کئے جا چکے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہی ہے کہ ساری دنیا کے سامنے اقوام متحدہ کے روبرو بھارت

کے پہلے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے ان کشمیریوں کے ساتھ جو حق خود ارادیت کا وعدہ کیا تھا، وہ اس کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ بھارت میں اسکولوں اور مدرسوں میں وہ نصاب پڑھایا جا رہا ہے کہ مسلمان بچہ اپنی قوم کے ماضی سے یا بے خبر رہے یا ان سے نفرت کرے اور ہندو اکابر کا معتقد ہوتا چلا جائے۔ چند روز ہوئے ٹی وی لگایا تو ہندوستان کے ایک چینل پر ایک لڑکا بات کر رہا تھا، میرے پتا کا نام گپتا جی ہے اور میری ماتا کا نام نسیمہ بیگم ہے، میں ہندو ہوں اور میری بہن مسلمان ہے، ہم چاروں بڑے امن اور چین سے اپنے گھر میں رہ رہے ہیں۔

قرآنِ کریم میں قومِ یہود سے اللہ نے ایک سے زیادہ بار کہا ہے کہ وہ دن یاد کرو جب تم فرعون کی رسوا کن غلامی میں مبتلا تھے۔ فرعون تمہارے مردوں کو قتل کرا دیتا تھا اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر مرد واقعی قتل ہو جاتے تو اولاد کیسے پیدا ہوتی، عورتیں کیسے وجود میں آتیں۔ یہاں مار دینا مجازاً کہا ہے، مراد ہے کہ یہودی مردوں کو پامال اور مسکین و عاجز بنا کر رکھا جاتا تھا اور یہودی عورتوں کو اچھی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی تاکہ وہ قومِ فرعون کی عیاشی کا سامان بنیں۔ یہی حال اب ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ مسلمان بچیوں کو تعلیمی وظائف سے، مسلم نوازی کے طور پر تعلیم و تربیت دی جاتی ہے، جب وہ گریجوایٹ یا پوسٹ گریجوایٹ ہو جاتی ہیں، طبی تعلیم یا کوئی اور ایسی فنی تعلیم مکمل کر لیتی ہیں تو شادی کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ جس ماحول میں تعلیم عمل میں آتی ہے وہ سیکولر ہے اور گھر اور رشتہ داروں میں موافق بر نہیں ملتا۔ چپیر ابھائی رکشہ چلا رہا ہے، ماموں کا بیٹا سائیکل کو پنکچر لگا رہا ہے، خالہ زاد مستری ہے، اور دور کا بھی کوئی پڑھا لکھا رشتہ میسر نہیں، لہٰذا بڑے آرام سے مسلمان بچی غیر مسلموں میں بیاہ دی جاتی ہے اور مشہور کر دیا جاتا ہے کہ داماد نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ہمارے ناشکر گزار مسلمان، وہ جن کی اکثریت علماء اور صاحب بہادروں پر مشتمل ہے اب اس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کو خدا نے قائد اعظم کی جوتیوں کے طفیل کروڑپتی بنا دیا ہے اور منصب عزت سے نوازا ہے۔ کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے یہودیوں سے اس خطاب کا معنی بالکل نہیں سمجھتے؟

کچھ عرصہ ہوا رام پور یوپی (بھارت) سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے جو پاکستان کے ایک اہم ادارے میں انگریزی ادبیات کے استاد تھے اور آج کل انگریزی اخبارات میں لکھتے لکھاتے ہیں، مجھ سے رازدارانہ سوز و ساز کے ساتھ کہا،، ملک صاحب! ذرا ہم ٹھنڈے دل سے سوچیں تو سہی 1935ء کے ایکٹ نے صوبائی اختیارات کتنے وسیع کر دیئے تھے کہ گویا پورا پنجاب اور بنگال باقی دو تین چھوٹے یونٹوں سمیت اپنا تھا۔ آزادی کے بعد صوبائی حقوق میں اور بھی اضافہ ہو جاتا تو پھر ہم نے علیحدگی کا دردِ سر کیوں مول لیا؟ ایسی ہی فلاسفی کو لسانی جماعت کا بھتہ خور بھی دہراتا رہتا ہے۔ انگریزی کے پروفیسروں میں اور بھی کئی ایسے متعقل اور صاحب بہادر ہیں۔ میں نے عرض کیا،، حضور! قوت مرکز کے پاس ہوتی ہے، قومی پالیسی مرکز نافذ کرتا ہے، مرکز جب چاہے، جس صوبے کا چاہے گلا دبوچ لے، اس کے علاوہ آپ یہ دیکھیں کہ اصل متحدہ پنجاب کے نصف سے کچھ کم پنجاب بھارت کو ملا تھا۔ سکھوں کے باعث بھارت نے اس پنجاب کے تین ٹکڑے کر دیئے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ لالہ آپ کے پاس پنجاب اور بنگال اس صورت میں رہنے دیتا کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت رہتی؟ وہ بنگال کا بھی تیاپانچا کر دیتا اور پنجاب کا بھی۔ بنگال کے کچھ حصے اور بہار کے کچھ حصے ملا کر نیا نقشہ بنا دیتا اسی طرح پنجاب کے ساتھ یوپی کا کچھ حصہ ملا کر اور کچھ حصہ انبالہ ڈویژن کے ساتھ ملحق کر کے تین صوبے بنا دیتا اور جب مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کا تیاپانچا کیا جاتا تو اسے انتظامی ضرورت قرار دیا جاتا۔ کیا وہ لوگ جو امت کے مفاد کو سمجھتے نہیں یا مکر کا شکار ہو جاتے ہیں یا پیٹ کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں، ہندو حکومت کی اس مسلم کش حکمتِ عملی کی تائید نہ کرتے؟ بے شک مسلمان عوام چیختے رہتے۔ پروفیسر صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا، آخر پاکستان میں رہتے ہوئے آپ پاکستان کی بہتری کے بارے میں کوئی تجویز پیش کرنے یا سوچنے کی بجائے الٹا پاکستان کو ختم کر دینے

کے ضمن میں کیوں ذہن کو تیار کرتے رہتے ہیں؟ اور قراردادِ لاہور کو منسوخ کرنے کے درپے کیوں رہتے ہیں؟ میں نے وضاحتاً کہا کہ مسلم لیگ نے ۱۹۲۱ء میں اور پھر چودہ نکات میں شامل چھٹے نکتے کی رو سے انگریز حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ مسلم اکثریتی صوبوں کی حد بندی کو ہرگز یوں نہ چھیڑا جائے کہ وہاں کے مسلمانوں کی اکثریتی حیثیت متاثر ہو، لیکن متحدہ ہندوستان میں چھٹا نکتہ کیوں ملحوظ رہتا! میں نے مزید عرض کیا کہ اگر آپ جیسا متعقل مجھ جیسے متعصب پاکستانی مسلمان سے بھی یہ راز و نیاز کرنے کی جرآت کر سکتا ہے تو نجانے دیگر کس کس سے آپ نے یہ قول لقمانی عرض نہیں فرمایا ہو گا۔،، فی قلو بھم مرض فزادھم اللہ مرضا،،۔ قائدِ اعظم کو فاجر قائد کہنے والے سوچیں تو ذرا کہ امتِ مسلمہ کے باب میں اتنا بیدار ذہن خدائے رحمان و رحیم فاجروں کا عطا کرتا ہے؟

پھر آپ اس معجزے سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں کہ نزولِ قرآن اور لیلتہ القدر کی بابرکت ساعتوں میں 27 رمضان المبارک 1366ھ بمطابق 14 اگست 1947ء کو پاکستان کا عالمِ وجود میں آنا اللہ تبارک و تعالیٰ کا مسلمانانِ برِ عظیم کیلئے ایک عظیم تحفہ ہے۔ یوں یہ مملکتِ خداداد کہلائی۔ ریاست مدینہ کے بعد یہ دوسری اسلامی نظریاتی مملکت معرضِ وجود میں آئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن کی سیرت کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ،، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شر انگیزی کیوں کی جارہی ہے اور یہ پروپیگنڈہ کیوں ہو رہا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت پر مبنی نہیں ہو گا۔ پاکستان میں اسلامی اصول اس طرح نافذ العمل ہیں جیسے 1300 سال قبل نافذ ہوئے تھے۔،، بانی پاکستان کا اشارہ واضح طور پر ریاستِ مدینہ کی طرف ہے۔

قیامِ پاکستان کا پس منظر ہندو کانگریس اور برطانوی سامراج کی مسلم دشمنی کا برِ عظیم میں ایک ناپاک گٹھ جوڑ اور بھیانک و سیاہ باب پر مبنی ہے۔ 1946ء میں لندن کانفرنس کے دوران ہی ایک بڑی سازش کے تحت جواہر لال نہرو کے دیرینہ دوست لارڈ مونٹ بیٹن کا گورنر جنرل مقرر ہونا، اس سازش میں شریک کرشنا مینن ایک شدت پسند کیمونسٹ لیڈر جس نے بستر مرگ سے اس سازش کا انکشاف کیا۔ اس نے "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" کے ایک مصنف کے سامنے یہ راز بھی افشاء کیا کہ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل مقرر کرانے کی جو کامیاب کاوش ہوئی، اس میں یہ بھی طے پایا تھا کہ یہ راز مسلمانانِ برِ عظیم کو معلوم نہ ہونے پائے، ورنہ ماؤنٹ بیٹن کی افادیت ختم ہو جائے گی۔ واقعی راز فاش نہ ہوا، قائداعظم اور لیاقت علی خان کانفرنس کے سلسلے میں وہاں موجود تھے، انہیں بھی اس ناپاک سازش کی بھنک تک نہ پڑی۔

ماؤنٹ بیٹن نے ایٹلی وزیر اعظم کی ہدائت کے مطابق پہلے سر توڑ کوشش کی کہ برِ عظیم تقسیم نہ ہونے پائے۔ مسلم لیگ کا سربراہ اور مسلمانانِ برِ عظیم کا قائداعظم محمد علی جناح متحدہ برِ عظیم کے فلسفے کے خلاف ہمت، شجاعت، حوصلہ اور عزم کی چٹان بن گیا اور دونوں مسلم دشمن سامراجیوں کو جھکنا پڑا۔ تقسیم کا فیصلہ ہوا لیکن اس کے پردے میں وہ سب کچھ کیا جو بقول قائداعظم محمد علی جناح،، دشمن چاہتا ہے کہ پاکستان بنتے ہی گائب (غائب) ہو جائے،،۔ قائداعظم محمد علی جناح کے اس وجدان کا ثبوت راقم نے لندن میں دارلعوام کی ڈیبیٹ رجسٹر میں دیکھا جس میں وزیر اعظم برطانیہ ایٹلی نے ،،انڈیا انڈیپینڈنٹ بل پر تقریر میں یوں کہا کہ،، برِ عظیم کو دو ممالک میں تقسیم کرنا ایک عارضی عمل ہے، بہت جلد دونوں،، دو نیشن،، ایک بڑی ڈومینئن میں متحد ہو کر،، کامن ویلتھ،، میں شریک ہو جائیں گی۔،، (کالم 1246)۔ اس وقت کے حزبِ اختلاف کے رہنما میکڈونلڈ نے بھی غیر معمولی طور پر وزیر اعظم سے متفق ہو کر کہا کہ،، انڈیا انڈی پینڈنٹ بل،، علیحدہ نہ رہیں گے،، کالم 1242

برِ عظیم کی آزادی کیلئے دار لعوام میں 30 جون 1948ء تک کی مدت طے پائی تھی، ماؤنٹ بیٹن نے اس مدت کو مختصر کر کے جلد از جلد آزادی دینے کا فیصلہ کیا۔ برِ عظیم کی تقسیم کی خفت کی وجہ سے جلد بازی اس لئے کی کہ پاکستان سنبھل نہ پائے۔ قائد اعظم نے اس جلد بازی کی سخت ترین مخالفت کی اور دار لعوام کے فیصلے کی مدت پر قائم رہنے کیلئے زور دیا۔ کسے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ برِ عظیم کے مسلمانوں کیلئے کیا عظیم تحفہ دینا چاہتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی ذاتی خوشی کیلئے برطانوی اور برِ عظیم کے لیڈروں سے بغیر صلاح و مشورہ کے 15 اگست 1947ء کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ یہ تاریخ وائسرے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی زندگی میں بڑی خوشی کا دن تھا جب وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن جنگِ عظیم دوم کے دوران برما محاذ کا کمانڈر تھا، اسی تاریخ کو جاپان نے ہتھیار ڈالے تھے۔

برِ عظیم کی آزادی اس سرنڈر کی دوسری سالگرہ کے موقع پر دینا ایک اور تاریخی کامیابی قرار دے کر تاریخ میں خوش قسمتوں میں اپنا نام لکھوانا مقصود تھا۔ اسے کیا معلوم کہ قائد اعظم محمد علی جناح کی مخالفت کی تو پرواہ نہ کی لیکن ہندو راشٹر کے اصل حکمراں جوتشی اور ستارہ شناسوں کی مخالفت کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑیں گے۔ جوتشیوں نے 15 اگست کو "منحوس" قرار دے دیا۔ ہندو رہنما تو خاموش رہے لیکن اس طاقتور طبقہ نے طوفان برپا کر دیا اور بزدل اور مکار وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس مخالف مہم سے بوکھلا گیا۔ اس کی بوکھلاہٹ تب کم ہوئی جب جوتشیوں نے 14 اگست کو،، مبارک،، قرار دیا۔ بزدل اور مکار وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سیلاب کو روکنے کیلئے اپنی خواہش کو برقرار رکھتے ہوئے اور جوتشیوں کو بھی تسلی بخش طریقہ بتا کر بڑی چالاکی سے نئی تاریخ یوں پیش کی کہ آزادی کی تاریخ "منحوس" کو "مبارک" دن کے قریب ترین آدھی رات 14 اور 15 کی درمیانی شب بارہ بجے متعین کر دیا۔ ہندو جوتشیوں نے ٹھیک بارہ بجے پوجا پاٹ کے دوران بجانے والا "سنکھ" بجا کر آزادی کے حصول کا مضحکہ طریقہ اپنایا، حالانکہ قانون ساز اسمبلی کو اقتدار 15 اگست کو ہی منتقل کیا گیا اور دوسری طرف پاکستان کو پہلے ہی 14 اگست کو اقتدار اسمبلی کو منتقل کر دیا گیا تھا۔

یہی انسانی مشقیں ہوئیں اور مسلم دشمن، بزدل اور مکار بزدل اور مکار وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن خود ہی اس ساعت کی طرف کھنچ کر آ گیا جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ یوں 14 اور 15 / اگست کی درمیانی رات 27 رمضان المبارک کا آغاز 14 اگست کو مغرب غروبِ آفتاب سے شروع ہوا۔ اسی رات نزولِ قرآن اور لیلتہ القدر کی مبارک ساعتیں آن پہنچیں، اور وہی ہوا جو منظورِ خدا تھا۔ انہی بابرکت ساعتوں میں پاکستان عالمِ وجود میں آ گیا اور مملکتِ خداداد کہلایا۔ 14 / اگست 1947ء قیامِ پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ اسی کے مطابق ہے جو ہجری سال 1366 میں 27 رمضان المبارک کو ظہور پذیر ہوا۔ اس کی دینی فضیلت تو عالمِ اسلام میں نمایاں ہے اور اس کی ملی اہمیت بھی بہت اہم ہے۔ 27 رمضان المبارک کے حوالے سے قیامِ پاکستان کی اہمیت کو نئی نسل تک روشناس کرانے اور اس پر عمل کرنے کیلئے قومی سطح پر جنگی بنیادوں پر لائحہ عمل تیار کرنے کی جو اشد ضرورت تھی، قائد اعظم محمد علی جناح کے جلد انتقال کے بعد ہمارے بے عمل اور لالچی حکمرانوں نے اس پر بھرپور توجہ نہیں دی لیکن میرا وجدان اب بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اب بھی اگر قدرت کی طرف سے عنائت کردہ اس معجزہ نما ریاست کیلئے ایسی منصوبہ بندی کی جائے جس کا ہم نے اپنے پروردگار سے وعدہ کیا تھا تو ہم یقیناً اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔

بقول قائد اعظم محمد علی جناح "پاکستان منزل نہیں بلکہ منزلِ مقصود کا وسیلہ ہے"۔ "پاکستان اسلام کا قلعہ ہے" اور یہ قلعہ اس وقت اسلام دشمن قوتوں کی گولہ باری کی شدید زد میں ہے۔ اسے محفوظ کرنے کیلئے عوام جو طاقت کا سرچشمہ ہیں انہیں واپس انہی اصولوں کی طرف لوٹنا پڑے گا جس کا ربِ کریم نے حکم دے رکھا ہے۔ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں دینا ہو گا اور اس کیلئے قرآن و سنت کے سرچشمے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

جس دن ہم نے واقعی قرآن و سنت کو اپنی زندگی میں نافذ کر لیا اور محمد عربی ﷺ کو اپنا رہبر مان لیا تو یہ قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار کی طرح کامیابی و کامرانی کے تمام مدارج طے کر لے گی۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو! ثم آمین

اب بھی وقت ہے، دوست دشمن کی تمیز میں فرق کرنا ہو گا۔ کچھ نہیں بچے گا، صرف میرے رب کا نام جو حی القیوم ہے اور جس نے اس دنیا کے نقشے پر پاکستان جیسی مملکت کو معجزاتی طور پر ظہور پذیر کیا ہے۔

اک سوال کے اندر ہم نے کاٹی نصف صدی
باندھے لاکھوں حساب
غلط ہی نکلا ہر اک حل کا لیکن انت جواب
ضرب جمع تفریق کے سارے کلئے برت لئے
ازروئے تحقیق
ہر کوشش میں ہو جاتا ہے کچھ نہ کچھ تفریق
دیکھ تو کتنا اونچا ہے یہ ردی کا انبار
تو ہی اب کچھ رحمت کر اے ربِ غفار

بروز سوموار یکم صفر الحرام 1446ھ 5/ اگست 2024ء

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

قوم ہر سال 14 / اگست کو پاکستان کا یومِ آزادی بڑے جوش و جذبے اور عقیدت و احترام سے مناتے ہیں۔ میڈیا میں اس دن کے حوالے سے بہت سیر جرات مند اور بے داغ کردار کے مالک قائد اعظم نے قیامِ حاصل معلومات پڑھنے اور سننے کو ملتی ہیں اور اسی حوالے سے اسلامیانِ برصغیر کے متفقہ، اس پر خراجِ تحسین پیش کرنے کیلئے تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بی بی سی کے زیرِ اہتمام پاکستان کی صورت میں جو عظیم اور تاریخی کارنامہ انجام دیا، ایک عالمی سروے میں قائد اعظم کو جنوبی ایشیا کا عظیم ترین رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی عظمت کے کئی پہلو ہیں، جن کا اعتراف دنیا کے تمام انصاف پسند حلقوں نے کیا ہے حتیٰ کہ منصف مزاج ہندو مصنفین اور دانشوروں نے بھی ان کی جرات و استقامت، بالغ نظری، دور اندیشی، جمہوریت و قانون پسندی اور دیانت و امانت کو خراجِ تحسین پیش کیا اور بعض ہندو رہنماں نے یہ تک کہا کہ کانگرس میں ایک قائد اعظم ہوتا تو برصغیر کی تقسیم نہ ہوتی۔

قائد اعظم نے علیحدہ وطن کا مطالبہ اس وقت کیا جب سفیر اتحاد کی حیثیت سے برصغیر کی دونوں قوموں کو اکٹھا رکھنے اور ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت کے سیاسی و اقتصادی حقوق جمہوری اصولوں کے مطابق تسلیم کرنے کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور انتہا پسند، تنگ نظر اور مسلم دشمن کانگریسی قیادت نے ثابت کر دیا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں ماضی کی حکمران مسلمان قوم کا وجود برداشت کرنے اور آزادی کے بعد اسے عزت و احترام کے ساتھ اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں۔ قائد اعظم نے ایک گولی چلائے بغیر اپنی باعزم قیادت اور اسلامیانِ برصغیر کی جمہوری جدوجہد کے ذریعے آزاد خود مختار ریاست حاصل کی جس کے بارے میں وہ بار بار یقین دلا چکے تھے کہ نئی ریاست اسلام کا قلعہ ہو گی اور اس کے سنہری اصولوں کا احیا کرے گی، جمہوری پارلیمانی نظام کے تحت کام کرے گی اور جدید تقاضوں کے مطابق صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست ہو گی۔

اقبال نے دو قومی نظریہ کے تحت ایک آزاد مسلم ریاست کو جو تصور پیش کیا اور جسے قائد اعظم نے حاصل کرنے کیلئے مردانہ وار جدوجہد کی، اس کے بارے میں بانی پاکستان نے بار بار واضح کیا کہ وہ مسلمانوں کے معاش اور روزگار کا مسئلہ حل کرے گی۔ ایک موقع پر انہوں نے کھل کر یہ کہا کہ مجھے ایسے پاکستان میں کوئی دلچسپی نہیں جو جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کے حقوق کا محافظ ہو۔ قائد اعظم نے اپنی زندگی میں پاکستان کیلئے اسلامی جمہوری پارلیمانی نظام پسند کیا، آئین کے بارے میں واضح طور پر کہا کہ اسلام کے جمہوری اصولوں کے مطابق مدون ہو گا۔ نئی ریاست میں اقلیتوں کو مکمل حقوق حاصل ہونگے جو اسلام نے انہیں عطا کئے ہیں اور فوج کا کردار منتخب جمہوری حکومت کے ایک ماتحت ادارے کا ہو گا۔
یہ بد قسمتی کی بات ہے کہ قائد کی زندگی ہی میں فوج کے انگریز کمانڈر انچیف نے حکم عدولی کی اور قائد اعظم کے احکامات کے تحت پاکستان کی شہ رگ کشمیر میں فوجی دستے بھیجنے سے انکار کیا جب کہ بھارت کے فوجی کمانڈر انچیف نے جواہر لال نہرو کے احکام کی مکمل اطاعت کی اور سرینگر ائیر پورٹ پر قبضہ کر کے مجاہدین کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔

قائد اعظم کی وفات کے صرف دس سال بعد جنرل ایوب خان نے جمہوری نظام کی بساط لپیٹ کر ملک میں فوج کی حکمرانی کا اصول متعارف کرایا جو کسی نہ کسی شکل میں مروج ہے اور آج زرداری صاحب بھی جمہوریت کی آڑ میں سترھویں ترمیم کے تحت فوجی ڈکٹیٹر کے تمام اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ موجودہ صدر نے فوجی یونیفارم نہیں پہنا ہوا بلکہ جمہوریت کا لبادہ اوڑھے ڈکٹیٹر کے سارے اختیارات کے ساتھ قوم پر حکمرانی کر رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ ملک اقبال اور قائد اعظم کی تعلیمات کے مطابق نہ تو جدید جمہوری پارلیمانی ریاست بن سکا اور نہ

اسلامی فلاحی معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکی ہے البتہ فوجی حکمرانی اور ہمارے سیاسی لیڈروں کی غلط حکمت عملی کے نتیجے میں پاکستان کا اکثریتی حصہ جدا ہو گیا اور باقی ماندہ ملک میں لسانی، نسلی فرقہ واریت، صوبائی تعصبات اور اس خطے میں امریکی مداخلت نے ملک کو ایسے خطرات سے دوچار کر رکھا ہے کہ ملک کی سلامتی کی ہر وقت فکر رہتی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان نسل کو تاریخ کے حوالے سے بتایا جائے کہ کن مشکل حالات میں پاکستان کو حاصل کیا گیا اس کا اندازہ ہمیں قائد اعظم کے اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۵۲ ستمبر ۱۹۴۴ کو یعنی ملاقاتوں کے آخری دنوں میں گاندھی جی کو لکھا۔ قائد اعظم لکھتے ہیں،، کہ آپ پہلے ہی قرارداد لاہور کے بنیادی اصولوں کو مسترد کر چکے ہیں، آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمان ایک قوم ہیں، آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمانوں کو حقِ خود اختیاری ہے اور وہی اسے استعمال کر سکتے ہیں، آپ یہ نہیں مانتے کہ پاکستان دو خطوں اور چھ صوبوں پر مشتمل ہے..... آپ سے خط و کتابت اور بحث کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انڈیا کی پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کی آواز صرف آپ کے لبوں پر ہے، یہ آپ کے دل کی آواز نہیں۔،، گاندھی کے اس رویے سے ناکامی اس بات چیت کا مقدر بن گئی۔

۹۲ ستمبر ۱۹۴۴ کو ویول نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ مجھے (اس گفت و شنید سے) بہتر نتیجے کی توقع تھی۔ اس سے ایک لیڈر کے طور پر گاندھی کی شہرت کو شدید دھچکا لگا ہے۔ جناح کا کام بہت آسان تھا، انہیں گاندھی جی سے صرف یہ کہتے رہنا تھا کہ تم بکواس کر رہے ہو اور یہ بات ٹھیک بھی تھی لیکن انہوں نے یہ بات گستاخانہ انداز میں کی..... میرے خیال میں اس سے اپنے پیروکاروں میں جناح کی عزت تو شائد بڑھ گئی ہو لیکن اس معقول آدمیوں کے درمیان ان کی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا....."ویول اور دیگر انگریز حکمرانوں کی نظر میں معقول آدمی وہ ہے جو ان ہی کے دماغ سے سوچے اور اس پر عمل کرے۔ ان کی معقولیت کی ڈکشنری میں آزادانہ فکر و عمل کی کوئی گنجائش نہیں!

مذاکرات کی ناکامی کے بعد قائد اعظم نے 14 / اکتوبر 1944 کو ایک پریس کانفرنس میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی۔ ایک اخباری نمائندہ نے ان سے پوچھا کہ کیا مستقبل قریب میں گاندھی جی سے آپ کی ملاقات کا کوئی امکان ہے؟ قائد اعظم نے مزاحاً کہا کہ مسٹر گاندھی جی کہتے ہیں کہ اس کا انحصار ان کے دل کی آواز پر ہے، چونکہ میری وہاں تک رسائی نہیں، اس لئے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی کی نیت معاملات کو طے کرنے کی تھی ہی نہیں۔ قائد اعظم سے گفت و شنید کے دوران ہی انہوں نے راج گوپال اچاریہ سے کہا تھا کہ اس بات چیت سے میرا اصل مقصد جناح کے منہ سے یہ کہلوانا ہے کہ پاکستان کا تصور ہی غلط اور لغو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو قائد اعظم کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ نہیں تھا اس لئے ان کی تمام تدابیر غیر مؤثر رہیں۔

1945 میں قائد اعظم کو نظر آرہا تھا کہ اب برطانوی حکومت کو ہندوستان میں الیکشن کرانے ہی پڑیں گے چنانچہ انہوں نے اپنی مہم کا آغاز کرتے ہوئے 16 / اگست 1945 کو بمبئی سے ایک بیان میں کہا کہ مسٹر گاندھی جی جب مناسب سمجھیں وہ کسی کے بھی نمائندے نہیں ہوتے، وہ ذاتی حیثیت میں بات کرتے ہیں، وہ کانگرس کے چار آنے کے بھی رکن نہیں۔ وہ اپنے آپ کو صفر کر لیتے ہیں اور اپنی اندرونی آواز سے مشورہ کرتے ہیں، تاہم جب ضرورت پڑے تو وہ کانگرس کے سپریم آمر بن جاتے ہیں اور اپنے آپ کو سارے ہندوستان کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ مسٹر گاندھی ایک معمہ ہیں..... مسلمانوں اور مسلم لیگ کے خلاف کانگرس میں اتنا زہر اور تلخی ہے کہ انہیں نیچا دکھانے کیلئے وہ ہر سطح سے نیچے گر سکتی ہے اور تمام اصولوں کو ترک کر سکتی ہے۔

10/اکتوبر 1945 کو کوئٹہ مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام میں انہوں نے گاندھی جی کی سیاست کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ: لیڈری حاصل کرنا، پولیس لاٹھی چارج کے موقع پر بکری کی طرح بیٹھ جانا، پھر جیل چلے جانا، پھر وزن کم ہونے کی شکائت کرنا اور پھر اس طرح رہائی حاصل کر لینا، میں اس قسم کی جدوجہد پر یقین نہیں رکھتا لیکن جب آزمائش کا وقت آئے تو سب سے پہلے میں اپنے سینے پر گولی کھاؤں گا"۔ 21 نومبر 1945 کو پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کانگرس کو پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنا ہو گا یا مسلمانوں کو کچلنا ہو گا لیکن اب کوئی طاقت دس کروڑ مسلمانوں کو کچل نہیں سکتی۔ 24 نومبر کو انہوں نے اسی شہر میں کہا کہ "جب تک میں زندہ ہوں مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ بھی بے فائدہ نہیں بہنے دوں گا، میں مسلمانوں کو کبھی بھی ہندوؤں کا غلام نہیں بننے دوں گا..... انگریز اور ہندو دونوں مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بالکل واضح ہے کہ ہمیں ان دونوں سے لڑنا ہے..... ہم ان کی متحدہ طاقت سے لڑیں گے اور انشااللہ کامیاب ہوں گے"۔

سے ملاقات ہوئی تو گاندھی جی نے ان سے کہا کہ "جناح ایک جاہ پسند آدمی ہیں اور ان (Casey) 3 دسمبر 1945 کو گاندھی جی کی بنگال کے گورنر،، کیسی کی سوچ یہ ہے کہ وہ ہندوستان، مشرقِ وسطیٰ اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کے درمیان رابطہ قائم کریں، میں نہیں سمجھتا کہ جناح اپنے ان خوابوں سے باہر آسکتے ہیں"۔ دراصل گاندھی جی الیکشن کے نتائج اور اس کے متوقع اثرات کا اندازہ ہو رہا تھا اس لئے قیامِ پاکستان سے پہلے ہی انہیں اسلامی یکجہتی کی فکر پریشان کر رہی تھی، واضح رہے کہ یہ وہی گاندھی جی ہیں جو مسلمانوں میں بھی اپنی لیڈر شپ قائم کرنے کیلئے تحریکِ خلافت کی قیادت سنبھالے ہوئے تھے، اب وہ بنگال کے پاکستان مخالف گورنر کے ذہن کو مزید زہر آلود کرنے کیلئے اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کر رہے تھے۔

23 مارچ 1946 کو کیبنٹ مشن ہندوستان آیا۔ 3/اپریل 1946 کو گاندھی جی کی مشن سے گفتگو ہوئی، انہوں نے صرف ایک دھوتی باندھی ہوئی تھی اور بہت صحت مند دکھائی دے رہے تھے۔ گاندھی جی نے مشن سے کہا کہ جناح کو ملک کی پہلی) عبوری (حکومت بنانے دیں، وزارا ملک کے منتخب نمائندوں میں سے ہوں، جناح جس کو چاہیں لیں لیکن وزارا کو اپنی اپنی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لینا پڑے گا۔ اگر جناح حکومت بنانے سے انکار کر دیں تو پھر کانگرس کو یہی پیشکش کی جائے۔ آپ نے گاندھی جی کا انداز دیکھا کہ وزیر اعظم جناح صرف ان لوگوں کو چن سکیں گے جن پر ان کی اسمبلیاں اعتماد کا اظہار کریں۔ اپنی آبادی کی وجہ سے مسلم اقلیتی صوبوں کی اسمبلیوں میں ہندوؤں کی بڑی بھاری اکثریت تھی، ادھر عوام میں انتہائی مقبولیت کے باوجود، مسلم اکثریتی صوبوں کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے نشستیں نہ ملنے پر مسلم لیگ کو قطعی اکثریت حاصل نہ تھی اس لئے مجبوراً اسے تقریباً سارے کے سارے کانگریسی ہندو یا غیر لیگی مسلمان وزیر رکھنے پڑتے۔ ایسی پیشکش کو قائداعظم کیوں قبول کرتے اور اس کے بعد حکومت خود بخود کانگرس کے پاس چلی جاتی۔ یہ تھی گاندھی جی کی پیشکش قائداعظم کیلئے!

بروایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

پیتھک لارنس نے گاندھی جی سے کہا کہ اس طرح تو جناح کے زیادہ تر وزارا غیر لیگی ہی ہونگے، گاندھی جی نے کہا کہ اس سے تو گریز نہیں، ایسی بات کو کون آگے بڑھاتا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے متحدہ ہندوستان کے آخری وائسرائے کے طور پر 24 مارچ کو حلف اٹھایا اور فوراً بعد سیاسی لیڈروں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ گاندھی جی نے 31 مارچ سے 14 پریل 1947 تک ہر روز لارد ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ یکم اپریل کی ملاقات میں گاندھی جی نے تجویز کیا کہ مسٹر جناح کو متحدہ ہندوستان کا وزیر اعظم بنادیا جائے..... اور جب تک وہ ہندوستانی عوام کے مفاد میں کام کرتے رہیں گے، کانگرس ان کے ساتھ پورے خلوص کے ساتھ تعاون کرے گی..... اس بات کا فیصلہ کہ وہ عوام کے مفاد میں کام کر رہے ہیں یا نہیں، صرف اور صرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کریں گے، اگر جناح یہ تجویز نہ مانیں تو پھر کانگرس کو یہی پیشکش کی جائے۔

ماؤنٹ بیٹن تسلیم کرتے ہیں کہ میں گاندھی کی یہ تجویز سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ انہوں نے گاندھی جی سے پوچھا کہ اس تجویز کے بارے میں مسٹر جناح کا کیا تاثر ہو گا؟ گاندھی جی نے جواب دیا: اگر آپ انہیں یہ کہیں گے کہ یہ تجویز گاندھی کی طرف سے آئی ہے تو جناح کہیں گے "مکار گاندھی"۔

ماؤنٹ بیٹن نے مزے لے لے کر پوچھا "غالباً یہ بات درست ہو گی"۔ اس پر گاندھی جی بڑے جوش سے کہا "نہیں نہیں میں یہ تجویز پورے خلوص سے پیش کر رہا ہوں"۔

قائداعظم سے بات کرنے سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے اسی دن یہ بات نہرو کو بتائی تو یہ سن کر ان کے مہاتما (گاندھی) ان کی جگہ قائدِ اعظم کو وزیر اعظم بنانے کی پیشکش کر رہے ہیں، نہرو کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ نہرو نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ: گزشتہ برس گاندھی جی کیبنٹ مشن کے سامنے بھی ایسی ہی تجویز پیش کی تھی لیکن یہ مسئلے کا ایک غیر حقیقی حل ہے۔ گاندھی جی کو دہلی میں چند دن اور رہنا چاہئے کیونکہ چار مہینے تک مرکز سے دور رہنے کی وجہ سے وہ تیزی سے معاملات سے بے خبر ہوتے جا رہے ہیں۔ نہرو کی رائے سننے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اگر ماؤنٹ بیٹن قائداعظم سے یہ بات کر بھی لیتے کیا ہوتا؟ کیونکہ ماؤنٹ بیٹھ بخوبی جانتا تھا کہ وہ اپنی ذات کیلئے قوم کو داؤ پر لگا دینے والے ہرگز نہیں تھے، اس قسم کی پیشکش کو وہ بغیر کسی تامل کے ٹھکرا دیتے۔

ان چند واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی نیت اور طریقِ کار کو قائداعظم خوب سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کا ہر لحاظ سے مناسب جواب دیا!

رہے نام میرے رب کا جس نے پاکستان کو ایک خاص مبارک رات کو ایک بہت بڑے مقصد کیلئے بنایا!

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

بروز اتوار 7 صفر المظفر 1446ھ 11 / اگست 2024

پاکستان کی فریاد

کل میرے پاکستان کی 78 ویں سالگرہ ہے، مجھے اس کی دوستی پر فخر ہے۔ جب میں اس کے ہمراہ ہوتا ہوں تو مجھے ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے۔ پاکستان کی ایک بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ اس کو قائد اور اس کے رفقاء کے بعد جو ساتھی ملے، اس کے خلوص، اس کی محبت، اس کی ہمدردی، اس کی وسیع القلبی کا بے جا استعمال کرتے رہے۔ پاکستان یہ سب چکر سمجھتا تھا مگر اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے اس نے یہ سارے معاملات اللہ پر چھوڑ رکھے تھے۔ جب میں رطب اپنے گھر سے باہر نکلا تو میں نے جگہ جگہ اجتماعات دیکھے، جس میں مقرر حضرات پاکستان سے اپنی دوستی اور محبت میں ایک دوسرے سے بڑھ کر اللسان تھے۔ میں ایک جلسے سے دوسرے پھر دوسرے سے تیسرے میں پاکستان کو تلاش کرتا رہا، ہر کوئی ایک دوسرے پر الزامات کے طعنوں اور تیروں کی بارش کرتا نظر آیا جبکہ قوم جانتی ہے کہ ان سب کا کردار ایک جیسا ہے، مجھے یوں واضح نظر آرہا تھا کہ پاکستان اپنی اس 78 ویں سالگرہ کی تیاریوں میں نہ تو شریک ہونا چاہتا ہے اور نہ ان تمام اجتماعات کرنے والوں کے ساتھ کوئی بات بھی کرنا چاہتا ہے کہ اس کو دشمن نے اتنے گھاؤ نہیں لگائے جس قدر ان کے ہاتھوں زخم کھائے ہیں۔

ان پریشان کن خیالات کو لیکر میں نے گلی گلی اس کو ڈھونڈنا شروع کیا، جیسے جیسے میری تلاش بڑھتی گئی، میری امید کمزور پڑتی گئی اور وقت بھی تنگ ہوتا چلا گیا۔ مجھے یہ بھی فکر لاحق تھی کہ شام کو بچوں سمیت پوتے پوتیوں نے بھی پاکستان سے مل کر مبارکباد دینا تھی، اگر مجھے پاکستان نہ ملا تو میں اپنے بچوں بتاؤں کو کیا جواب دوں گا، ویسے بھی بچے پاکستان سے میری دوستی کو ایک خواب ہی سمجھتے تھے اور میں نے بڑے وثوق سے ان کو یقین دلایا تھا کہ میں تم کو گا کہ میں اور پاکستان کتنے اچھے دوست اور ساتھی ہیں۔ اچانک خیال آیا کہ پاکستان جب گھبراتا ہے یا کسی بات پر اس کو صدمہ ہوتا ہے تو وہ ایک ہی جگہ ملتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں الٹے پاؤں بھاگتا ہوا گھر آیا اور اپنے بچوں، پوتوں کو ساتھ لیکر قائداعظم کے مزار کی طرف روانہ ہو گیا۔ بابائے قوم کے مزار کے احاطے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پاکستان بابا کی قبر سے لپٹا ہچکیاں لے رہا ہے۔

قدموں کی آہٹ پر پاکستان نے اپنا آنسوؤں بھرا چہرہ قبر سے الگ کیا اور اپنی سوجھی ہوئی آنکھوں سے میری طرف لپکا۔ میں نے بے اختیاری میں اپنے ہاتھ پھیلائے، بغل گیر ہوتے ہی ہم دونوں ایک دوسرے کو بتائے بغیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئے اور میرے بچے یہ مناظر دیکھ کر حیران و پریشاں تھے۔ میں نے اپنی نظریں جھکا کر پوچھا کہ پاکستان تم اپنی سالگرہ کے جلسوں میں کیوں نہیں تھے؟ اس نے مجھے فوراً اپنے سے الگ کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے میرا کندھا پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا کہ تم بھی مجھے یہی کہنے کیلئے آئے ہو؟ کیا کوئی اپنی سالگرہ اس منافقت سے منا سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ میں تمہاری بات نہیں سمجھا، اس پر پاکستان نے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے یہ کہا کہ کیا مجھے میرے باپ نے اسی لئے جنم دیا تھا کہ یہاں قتل و غارتگری ہو، عبادت گاہوں میں خون خرابہ ہو، رشوت، چور بازاری ہو، امتحانوں میں نقل اور غنڈہ گردی ہو، صدر، وزیراعظم، وزرائے اعلیٰ، ججز، اسپیکرز اور دیگر اشرافیہ عالمی مالیاتی اداروں کے قرض میں ڈوبے ہوئے پاکستان میں اس شاہانہ پروٹوکول کے ساتھ سالانہ اربوں روپے اڑادیں اور قوم مہنگائی اور بلوں کے ہاتھوں خودکشیاں کر رہی ہو۔

قوم کے اربوں نہیں کھربوں روپے لوٹ کر اغیار کے بینکوں میں محفوظ کر رکھے ہوں اور رہائش کیلئے اپنے محلات تعمیر کر رکھے ہوں اور جبکہ قوم کے افراد جھونپڑیوں میں سسک رہی ہو۔ ایف بی آر کا ادارہ جس کام محصولات وصول کر کے کارِ حکومت کے قوانین کی پابندی کرنا ہو مگر وہاں اربوں روپے

کی رشوت کی تقسیم میں ایک دوسرے پر بندوقیں تان لی جائیں اور جب سرکاری تحقیقاتی ادارہ اس کی تفتیش کیلئے تمام دستاویزات طلب کر کے تفتیش کا آغاز کرنا چاہے تو یہی راشی حضرات لاہور ہائی کورٹس سے اس تفتیش کے خلاف احکام لے آئیں۔ کیا میرے باپ نے اس کھلم کھلا کرپشن اور لاقانونیت کیلئے اپنی صحت کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور کھلی سڑک پر ایک سرکاری ایمبولنس میں اپنی لاچار زندگی کے آخری سانس لئے تھے۔ کیا پاکستان اس لئے بنایا تھا کہ ہزاروں میل دور سے وہی استعمار آکر تم پر حکم چلائیں جن سے میں تمہیں باوقار انداز میں آزاد کروا کے گیا تھا، میری تصویر کو اپنی پشت پر لٹکا کر میرے سامنے میری غیرت کو سرِعام نیلام کیا جائے اور تم سب منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر کسی مصلحت کی بناء پر اف تک نہ کرو، حتیٰ کہ دنیا کی تمام برائیوں کو اپنے ہاں رائج کر کے خود کو ترقی یافتہ سمجھو؟؟؟؟؟

میں جب ایک سال اور کچھ دن کا تھا تو مجھ سے میرے بابا بچھڑ گئے، اس یتیم کو پالنے کیلئے میرے چچاؤں نے بھرپور کردار ادا کیا اور آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی مجھ سے بچھڑ گئے۔ ایک پھوپھی تھی جو میری غمخوار اور ہمدرد تھی، باپ کی کمی جب مجھے محسوس ہوتی تو میں ان کی گود میں سر رکھ دیتا اور بے انتہا سکون پاتا۔ افسوس وہ بھی مجھ سے جدا ہو گئیں، میں غیروں کے رحم و کرم پر آ گیا، جو چچا اور رشتہ دار کروڑ پتی تھے، نواب تھے، صاحبِ حیثیت تھے، انہوں نے اپنا تمام دھن مجھ پر لٹا دیا اور مرتے وقت ان کی زبان سے میرے لئے دعائے خیر کے کلمات ہی نکلے کہ اے اللہ! پاکستان کی حفاظت کرنا (آمین)۔ اب تم خود ہی بتاؤ کیا وہ لوگ عظیم تھے جنہوں نے ایک یتیم کی پرورش کیلئے اپنی جان و مال داؤ پر لگا دیئے یا وہ لوگ عظیم ہیں جو میری جائیداد ، میری دولت کو لوٹتے رہے اور اپنے ناموں اور اپنی اولادوں کے نام منتقل کرتے رہے اور پھر ڈھٹائی دیکھو کہ اس یتیم کو بجائے سنوارنے اور بنانے کے ایک بازو سے بھی محروم کر دیا اور پھر بھی میری محبت کا جھوٹا دم بھرتے ہیں۔ اب تم خود ہی بتاؤ کیا میں ان کی محفلوں میں شریک ہو سکتا ہوں؟

میں نے کہا دیکھو میرے ساتھ میرے بچے اور میرے پوتے بھی آئے ہیں اور میں بڑے فخر سے اپنی اور تمہاری دوستی کے متعلق بتاتا ہوں تو یہ مانتے نہیں ۔ پاکستان نے اپنے بازو میرے بچوں اور پوتوں پر رکھے اور کہا اے بچو! تمہارے اور تمہارے ابو جیسے لوگ مجھ سے بے غرض محبت کرتے ہیں اور انہی جیسے لوگوں کی وجہ سے میں اب تک مملکتِ خداداد ہوں ورنہ اپنوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب تمہارا باپ میرا ایک بازو کٹ جانے کی خبر سن کر زمین پر گر گیا تھا تو اس کے سر پر ایک چوٹ آئی تھی تو میرے ہی دوسرے سلامت مگر زخمی ہاتھ نے اس کو سہارا دیکر زمین سے اٹھایا اور اس کے زخم پر اپنی محبت کا مرہم رکھا اور یہ احساس اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی کیلئے زندگی جیسی قیمتی چیز بھی قربان کر دی جائے۔ وہ لوگ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں جو ایمانداری، وفاداری اور خلوص کے ساتھ میری خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور کسی قسم کا صلہ نہیں چاہتے۔

تمہیں یاد ہے کہ ایسا ہی سپوت جو سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے صدمے کے بعد ہالینڈ میں دنیا کی تمام مادی آسائشوں کو ترک کر کے صرف میرے زخمی جسد پر آنے والے زخموں کے علاج کیلئے چلا آیا اور بالآخر اس نے نہ صرف میرے ان زخموں کو علاج کیا بلکہ اس کو ایسا مضبوط اور ایٹمی قوت بنا دیا کہ کسی دشمن کو اس کی طرف ناپاک نگاہ سے محفوظ بنا دیا لیکن یہاں کے ڈکٹیٹر حکمران نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا، ساری قوم کے سامنے آبدیدہ اور نمناک آنکھوں سے معافی کے خواستگار الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے لیکن مجھ سے محبت کرنے والوں کے دلوں پر نشتر چل رہے تھے۔ ہم نے اس سے یہ سلوک کیا کہ اس کو عالمِ تنہائی جیسے عذاب میں مبتلا کر دیا تاوقتیکہ وہ اسی فریاد کناں حالت میں اللہ کے ہاں حاضر ہو گیا۔ وہ مردِ مجاہد ڈاکٹر عبدالقدیر خان یقیناً اپنے رب کے ہاں بڑے اعزاز کے ساتھ ہو گا لیکن ہمارے ان ڈکٹیٹروں نے سیاستدانوں سے مل کر میرے باقی ماندہ جسم کو بھی بھنبھوڑ کر رکھ دیا ہے

۔اب عالمی ادارے خاکم بدہن ایک خاص سازش کے تحت مجھے اسے ایٹمی قوت سے محروم کرنے کے درپے ہیں اور اقتدار کے بھوکے بھیڑیے ایک دوسرے پر دشنام طرازی میں مصروف ہیں۔

میں نے پاکستان سے ایک مرتبہ پھر درخواست کی کہ میرے بچوں کو نصیحت فرمائیں کہ اس خطرناک سیاسی ابتری وانارکی کے ماحول میں ان کو کیا کرنا چاہئے تو پاکستان نے ان کو مسرت سے دیکھتے ہوئے کہا کہ بچو! میری خدمت یا مجھ سے محبت کے اور بھی بے شمار انداز ہیں جو میں تم کو بتانا چاہتا ہوں۔ لال بتی پر رکنا، قانون کی پاسداری کرنا، اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کرنا اور مظلوموں کے حقوق دلانا، یہ بھی مجھ سے محبت کے انداز ہیں۔ اپنے کام کو تندہی سے کرنا، میرے بابا کے فرمان "ایمان، اتحاد، تنظیم" کی پاسداری کرنا اور جس منصب پر فائز ہو، اس کو ایمانداری سے انجام دینا بھی میری محبت ہے۔ میری پوتے نے کہا کہ پاکستان! میں نے آج صبح اسکول میں آپ اور ہم سب کے بابا کے احسانات پر تقریر کی تھی اور مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ میں جب تقریر کر رہا تھا تو اسٹیج پر بیٹھے بزرگ بجائے میری بات سننے کے باتوں میں مشغول ہو گئے اور میری تقریر کے بعد جب یہ اعلان ہوا کہ اب ان کی خدمت میں ایک گانا اور رقص پیش کیا جائے گا تو وہ خوشی کے مارے اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور مسلسل تالیوں کے ساتھ وہ زمین پر پاؤں مارنے لگے بلکہ کچھ مرد و خواتین تو اس گیت پر رقص بھی کرنے لگ گئے۔

پاکستان نے سرد آہ بھری اور میری پوتے کے سر پر اپنا کانپتا ہاتھ رکھ کر کہا بیٹی! تم صحیح کہہ رہی ہو، ہمارے بڑوں نے اپنے مقصدِ حیات کا رخ صحیح راہ پر نہیں ڈالا جس کے نتیجے میں ہم اپنا تمدن اور ثقافت، آداب واطوار فراموش کر بیٹھے، پھر پاکستان نے کہا بیٹا! یہ میرے بابا کی عظمت ہے کہ آزادی کی جنگ میں جہاں لاکھوں افراد قربان ہوتے ہیں انہوں نے ایک گولی چلائے بغیر اور ایک قطرہ خوں بہائے بغیر اتنی بڑی اسلامی مملکت وجود میں لے آئے، یہ الگ بات ہے کہ فرنگی اور ہندو بنئے کی سازشوں نے میرے ہزاروں بچوں کو ہجرت کرتے ہوئے کاٹ دیا لیکن اس کے باوجود وہ جب مجھ سے ملے تو ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ پھر پاکستان نے میرے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا بیٹا! تم استاد ہو مگر تمہارا یہ علم اور پیشہ تمہارے لئے دولت کمانے کا ذریعہ نہ بنے بلکہ تمہارے ساتھیوں اور دوسرے شہریوں کیلئے باعثِ خدمت ہو، یہی تمہاری محبت کا اظہار ہو گا۔ پھر ننھے معصوم پوتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ یہ عمر معصومیت کی ہے اور اس کی معصومیت کو بچانا اور اس کی حفاظت کرنا یہ تم بڑوں کا کام ہے۔ یہ ابن الوقت لوگ جو اس وقت میرے نام کی بیساکھی لیکر سیاسی میدان میں اونچا اڑنا چاہتے ہیں، میرے زخموں سے چور جسد کا علاج کرنے کی بجائے مجھے نیا لباس پہنا کر تمہیں دھوکہ دینے کی کوشش کریں گے، وہ زیادہ عرصے تک پنپ نہیں پائیں گے۔

بچو! میں تمہیں آج ایک راز کی بات بتاتا ہوں کہ تمہارے ابو اور دادا کی محبت جو وہ مجھ سے کرتے ہیں، ایک عجیب سی محبت ہے۔ یہ دنیا میں جہاں جہاں بھی گئے میرے نام کو بلند ہی کرتے رہے! ایک بات اور بتادوں کہ آج صبح تمہارے ابو نے اپنے تمام ساتھیوں کو کانفرنس روم میں جمع کیا اور میرے بھائی اقبال کی لکھی ایک نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" سب نے مل کر پڑھی، پھر ہر ایک نے باری باری میری تاریخ آزادی اور لوگوں کی مجھ سے عقیدت اور محبت کے اوپر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محبت کا یہ اظہار کسی کے زور، کسی زبردستی، کسی لالچ کے بغیر تھا، سب ساتھیوں کے چہروں پر جذبات

کی حرارت، آنکھوں میں فرطِ محبت سے امڈے ہوئے آنسو اور کپکپاتے ہوئے لب اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ یہ اوران جیسے بے شمار لوگ اب بھی مجھ سے بے غرض محبت کرتے ہیں تو بچو! تم بھی اپنے ابو اوران کے ساتھیوں جیسے بنو کیونکہ تم ہی سے ان کی کل اور میری نئی صبح وابستہ ہے۔ پاکستان کی آواز گلوگیر تھی اور وہ خاموش کھڑا اپنے باپ سے کہہ رہا تھا!

"بابا! تم نے میرا ایک تشخص بنایا، تمہارے ساتھیوں نے اس میں رنگ بھرا اور کچھ نادانوں نے اس رنگ کو اپنی حماقتوں سے مٹانے کی کوشش کی۔ اچانک رات کے وقت شب خون مار کر ایک طالع آزما جو اپنے آپ کو ایک کمانڈو جنرل بھی کہتا تھا، تمہاری کرسی پر قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ مسلسل آٹھ سال سے کچھ اوپر اس نے مجھ پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ میرے بچوں اور بچیوں کو اس نے ایک استعماری طاقت کے ہاتھوں ڈالروں کے عوض فروخت کر دیا، میری بیٹی عافیہ کو اس کے معصوم بچوں سمیت ان درندوں کے حوالے کر دیا جو آج بھی آسمان کی طرف منہ کر کے کسی محمد بن قاسم کو بلا رہی ہے لیکن اس ظالم فاسق کمانڈو نے بڑے فخر سے اپنے اس اقبالِ جرم کو اپنی کتاب میں تحریر کر کے خود اپنے ان تمام گناہوں کو ریکارڈ کر کے اب خود تیری عدالت میں پہنچ گیا ہے، بلکہ میری غیرت و حمیت کو اس نے تار تار کر دیا اور جاتے ہوئے اپنی کھال کو بچانے کیلئے ایک رسوائے زمانہ قانون این آر او کے تحت تمہاری کرسی اور میری تقدیر و قسمت کو انہی کے سپرد کر گیا جن پر اس ملک کے لوٹنے کے بے شمار الزامات تھے اور اس کے بعد بد قسمتی کا یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔

متنازعہ کشمیر جس کو تم نے میری شہ رگ قرار دیا تھا اس کو بھی خاموشی سے ہندو بنئے کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ خود کو کشمیر کا وکیل کہنے والے نے ڈیڑھ لاکھ سے زائد کشمیریوں کی جانی قربانیوں سے غداری کرتے ہوئے تھالی میں رکھ کر کشمیر کو مودی کی جھولی میں ڈال دیا۔ میری ہی بہادر فوج کا سربراہ میر صادق اور میر جعفر در در جن صافیوں کو بلا کر اپنی بزدلی اور بے بسی کا رونا روتا رہا۔ ہماری عدلیہ جس کا کام ایسے تمام بہروپیوں کا احتساب کرنا ہوتا ہے، وہ بھی اپنے فیصلوں سے میرے جسم پر چھید کرتے رہے اور ان کا کارکردگی کا نام عالمی انڈیکس میں سب سے نچلی سطروں میں پہنچ گیا ہے۔ بابا! مگر اب بھی بہت سے لوگ میری محبت میں تن من دھن کی بازی لگانے کیلئے تیار ہیں اور مجھے امید ہے میرا نام، میری شناخت انشاءاللہ ختم نہیں ہو سکتی!

پھر پاکستان نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا، میرا اور میرے بچوں کا ہاتھ پکڑا، ہم نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پاکستان پائندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے پرجوش نعرے لگائے، قومی ترانہ پڑھ کر مزار سے باہر آئے۔ سب نے باری باری پاکستان کے ساتھ ہاتھ ملایا اور تجدیدِ عہد کر کے ہم لوگ اپنے گھر کو واپس ہوئے (پاکستان پائندہ باد)

بروز منگل 9 صفر المظفر 1446ھ 13 / اگست 2024ء

یومِ آزادی.....تجدیدِ عہد

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پہلا گورنر جنرل بنانے سے اس لئے انکار نہیں کیا تھا کہ وہ خود اس عہدے کے خواہاں تھے، بلکہ اس لئے کہ اپنی قوم اور اقوام عالم کو یہ باور کروایا جائے کہ اب برطانوی راج ختم ہو گیا اور سلطانی جمہور کا زمانہ آگیا ہے اور ملک کے فیصلے ملک کے اندر ہوں گے۔ یہ سیاسی آزادی کی علامت تھی۔ اس کے ایک سال بعد جب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ آیا پاکستان کے طے شدہ تمام اثاثے پہلے کی طرح "ریزرو بینک آف انڈیا" میں جمع رہیں یا اس کا اپنا بینک ہو، قائداعظم نے فیصلہ کیا کہ آزاد ملک پاکستان کا اپنا آزاد بینک ہونا چاہئے، اس طرح انہوں نے اقتصادی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے قیام کا اعلان کیا اور کراچی میں بولٹن مارکیٹ میں واقع تاریخی عمارت میں پاکستان کے پہلے اسٹیٹ بینک کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ایسا معاشی نظام نہیں چاہتا جس میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہو جائے۔ انہوں نے سودی نظام کو استحصالی نظام قرار دیتے ہوئے ماہرین اقتصادیات اور علمائے دین کو تلقین کی کہ وہ اسلام کے اصولوں پر مبنی بینکاری کے قیام کیلئے تحقیق اور غور و خوض کریں۔ اسی طرح انہوں نے سابقہ مشرقی پاکستان کی بندرگاہ چٹاگانگ میں استحصال کے خاتمے اور فلاحی مملکت کے قیام پر زور دیا۔

انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں رہنما اصول متعین کئے اور کہا کہ پاکستان دنیا کے ہر ملک سے برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات کا خواہاں ہے لیکن ساتھ ہی مظلوم قوموں کی حمائت بھی جاری رکھے گا۔ یہ صرف سیاسی بیان نہیں تھا جیسا کہ ایوانِ اقتدار پہنچتے ہی ہر طالع آزما اپنے بیرونی آقاؤں کی خوشنودی کیلئے اختیار کر لیتے ہیں بلکہ قائداعظم نے فلسطین، جنوبی افریقا اور انڈونیشیا کے عوام کی جدوجہد آزادی کی کھل کر برملا حمائت کی، نسلی امتیاز اور نوآبادیات کے خاتمے کیلئے قرارواقعی اقدامات بھی کئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صرف مسلم ممالک کی آزادی کے حامی تھے تو جنوبی افریقا کی اکثریت تو غیر مسلم تھی تو پھر انہوں نے اس کی حمائت کیوں کی؟

قائداعظم نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں سلطنت برطانیہ کے زمانے سے تعینات فوج کو ان کی چوکیوں سے واپس بلا لیا اور کہا کہ اب ہمارے قبائلی بھائی ہماری شمال مغربی سرحد کی حفاظت کریں گے۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ ساٹھ سال بعد کوئی خود ساختہ محافظ پاکستان امریکی قصر سفید میں بیٹھے فرعون کے حکم پر ان ویران چوکیوں پر جو اب کھنڈر بن گئیں تھیں، پھر فوج تعینات کر دے گا جیسے برصغیر کے برطانوی آقاؤں نے حریت پسندوں کی بستیوں پر سامراج کی گرفت مضبوط کرنے کیلئے کر رکھا تھا۔ جہاں سیاسی ایجنٹ چیدہ چیدہ قبائلی سرداروں کو رشوت دیکر ان کی وفاداریاں خرید لیتے تھے۔ اس ڈکٹیٹر کے دور میں یہ کاروبار اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا کیونکہ اس ڈکٹیٹر نے اپنے غاصبانہ اقتدار کو طول دینے کیلئے چند ڈالروں کے عوض قبائلی عوام کو کچلنے کیلئے امریکی سی آئی اے کو وہاں اڈے بنانے کی اجازت دے کر قائد اور ملک و ملت کے ساتھ غداری کی۔

لیکن یہ بدنصیبی تو اس ڈکٹیٹر کے آنے سے پہلے سے جاری تھی جب امریکی خفیہ پولیس ایف بی آئی کو پاکستان کی سرزمین پر تھانے قائم کرنے کی اجازت مل چکی تھی۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ بانی پاکستان قائداعظم تو انگریز گورنر جنرل گوارہ کرنے کو تیار نہیں تھے اور ایک ایک کر کے نوآبادیات کی باقیات کو مٹاتے جا رہے تھے، جبکہ ان کی وفات کے تقریباً نصف صدی کے بعد آنے والے حکمران استعمار کے غیر ملکی گماشتوں اور جاسوسوں کی میزبانی کر رہے تھے۔ اب نوبت بہ ایں جا رسید کہ کٹھ پتلی حکمران اپنے عوام سے خاص کر غیور قبائلیوں سے اس قدر خائف ہو گئے کہ اپنے غاصبانہ قبضے کو بچانے کی خاطر غیر ملکیوں اور صہیونی و صلیبی عناصر کی غلامی اختیار کر لی۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ کسی حکومت کو خود اپنے ہی عوم سے، اپنے دین سے، اپنے

اعتقادات سے، اپنے نظریات سے خطرہ محسوس ہو رہا ہو جس سے خود کو محفوظ رکھنے کیلئے انہیں غیر ملکی ایجنٹ اور غیر اسلامی نظریات درآمد کرنا پڑیں؟ بلیک واٹر کا درندہ دن دیہاڑے لاہور کی مشہور شاہراہ پر سینکڑوں لوگوں کے سامنے دو غریب پاکستانیوں کو گولیاں مار کر ہلاک کر دے اور اسے باعزت چھڑوانے کیلئے خود ریاستی اداروں کے سربراہ بشمول صدر آصف زرداری قومی خزانے سے وارثوں کو 24 کروڑ روپے خون بہا ادا کر کے اسے واپس امریکا روانہ کر دیں اور اسی ریمنڈ ڈیوس نے اپنی خود نوشتہ کتاب "دی کنٹریکٹر" میں پاکستانی اداروں کے ان افراد کی تحقیر میں اپنے کالے صفحات میں ان کا منہ کالا کر دیا۔

قائداعظم کی 11/اگست کی تقریر کا بعض لوگ اس طرح حوالہ دیتے ہیں کہ جیسے انہوں نے زندگی میں پہلی بار یہ تقریر کی ہے اور ان کی باقی تقاریر منسوخ ہو گئیں۔ یہ لوگ قائداعظم کے متعدد بیانات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں انہوں نے واضح طور پر تواتر اور تکرار کے ساتھ یہ واضح کر دیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست ہو گی، ساتھ ہی قوم کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسلام میں پاپائیت یا برہمنیت جیسا کوئی طبقہ نہیں ہے جسے ریاست کی اجارہ داری کا کوئی پیدائشی حق حاصل ہو۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظم ایک سیکولر ریاست چاہتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہوں نے پاکستان کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ برصغیر میں دو سیکولر ریاستیں ہوں، ایک پاکستان اور دوسری اس کے پڑوس میں ہندوستان؟ پھر دو ریاستوں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اگر پاکستان حق خودارادیت کے نتیجے میں وجود میں آیا تو اس میں اور بھارت میں اسلام کا عنصر انہیں ایک دوسرے سے ممیّز کرتا ہے۔

کون اس تاریخی حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ برصغیر کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے جذبہ یگانگت کے تحت مطالبہ پاکستان کی حمائت کی تھی ۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مطالبہ پاکستان کی عوامی حمائت کے محرکات معاشی تھے، قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو قیام پاکستان سے کون سے معاشی فوائد کی توقع تھی؟ وہ تو بیچارے ہندو اکثریت کے یرغمال بن گئے، البتہ میں ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی نیتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جنہوں نے راتوں رات یونینسٹ پارٹی چھوڑ کر حکمران مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تاکہ ان کی مراعات باقی رہیں۔ میں بھارت سے نقل مکانی کرنے والے ان مفاد پرستوں کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا جو حصول جائیداد، مال و دولت اور جاہ و حشم کے لالچ میں پاکستان آئے۔

بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان کی ایک لسانی جماعت کے اکثر رہنما ایسے بھی ہیں جو قیام پاکستان کے موقع پر ہندوستان میں ہی مقیم رہے لیکن یہ اپنی قلیل تعداد کے باوجود اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے یہاں مہاجر کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر کے اپنے سیاسی ایجنڈہ پر گامزن ہیں حالانکہ یہ فوری پاکستان آنے کی بجائے اس بات کا جائزہ لیتے رہے کہ پاکستان کے معاشی اور سیاسی حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اپنے کاروبار اور دوسری تمام املاک کو اچھے داموں فروخت کر کے پاکستان میں مہاجر کا لیبل لگا کر پاکستانی مایہ میں خوب ہاتھ رنگے۔ پاکستان کی بیوروکریسی کے توسط سے پاکستان کی نوکر شاہی اور دوسرے ملکی اہم اداروں میں کالے انگریزوں کی طرح بطور حکمران قابض ہو گئے اور آج کھلے عام ملک کی لوٹ کھسوٹ کے علاوہ پاکستان کیلئے اپنے بزرگوں کی قربانی کا ذکر بھی بڑی بے شرمی کے ساتھ کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مخلص مہاجرین کی اکثریت بھی ان سے شدید نالاں ہے۔ ان مذکورہ طبقات کے محرکات یقیناً معاشی تھے لیکن خود پاکستان میں بسنے والے کروڑہا عوام نے اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر جدوجہد پاکستان میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ ان میں کتنے کٹ مرے، کتنی عصمتیں لٹ گئیں، لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ لاکھ سے زائد مسلمان بچیاں ہندوؤں اور سکھوں نے اغوا کر لیں اور آج بھی یقیناً آسمان کی طرف منہ اٹھا کر نجانے کس حال میں پاکستان کی سلامتی کیلئے دعا گو ہوں گی۔ یہ جذبہ ایمانی

نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ اس کی پشت پر کربلا کی روایت تھی، اس کی آکسیجن تحریک خلافت کا نظریہ تھا۔

کیا مسلم عوام نے جس وطن کیلئے اتنی قربانیاں دیں، وہ اس لئے کہ ان کے ملک پر امریکا اور مغرب کا تسلط قائم ہو جائے، ان کو امریکی انتظامیہ کا ایک ادنیٰ سا اہلکار یہ بتائے کہ فلاں کو وزیر اعظم بناؤ، فلاں کو وزیر داخلہ، فلاں کو ملکی سلامتی کا مشیر، فلاں کو ہمارے ہاں سفیر مقرر کرو اور فلاں کو عدلیہ کا سربراہ بناؤ؟ کیا قائد اعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے اثاثے "ریزرو بینک آف انڈیا" سے نکال کر اس لئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں رکھے تھے کہ سٹی بینک کا ایک "کنٹری مینجر" درآمد کر کے اس کو ملک کا وزیر اعظم بنا دیا جائے جو پاکستان کے قومی اثاثوں کو اونے پونے داموں میں فروخت کر کے اپنا کمیشن کھرا کر کے رات کے اندھیرے میں گم ہو جائے؟ بات یہی تک موقوف نہیں بلکہ بعد ازاں آئی ایم ایف کے حاضر سروس نمائندے کو اسٹیٹ بینک کا گورنر بنا کر ملک کی ساری مالی سلامتی کی شہہ رگ ان کے حوالے کر دی جائے۔

کیا قائد اعظم نے کشمیر میں استصواب رائے عامہ کی حمایت اس لئے کی تھی کہ کوئی طالع آزما آ کر یہ کہے کہ اب رائے شماری سے متعلق سلامتی کونسل کی تمام قراردادیں غیر ضروری ہو گئی ہیں! جیسا کہ میں نے شروع میں یہ عرض کیا کہ قائد اعظم نے قبائلی بستیوں سے فوج ہٹائی لیکن کمانڈو مشرف نے نہ صرف فوج کشی کر دی بلکہ ایک لاکھ دس ہزار فوج پاک بھارت سرحد سے ہٹا کر قبائلی علاقوں اور افغان سرحد پر لگا دی اور وہ بھی قصر سفید کے فرعون کے حکم پر! پاکستان کو بیرونی حملے سے بچانے کیلئے نہیں بلکہ افغانستان میں امریکی پٹھو حکومت کو افغان عوام پر مسلط کرنے کیلئے، تاکہ افغانستان پر امریکا کا قبضہ برقرار رہے۔ اس وقت بھی ہم جیسے افراد چیخ چیخ کر شور مچاتے رہے کہ اب اگر بھارت جو کنٹرول لائن کی بار بار خلاف ورزیاں بھی کر رہا تھا، پاکستان پر حملہ کر دے کون لڑے تو کیا ہو گا؟ ہماری دفاعی لائن جو ڈیونڈر لائن تک پھیل جائے گی تو مشرقی محاذ پر

پاکستان کے جنرل پاک افغان اور پاک بھارت سرحدوں کی حفاظت کر سکیں گا؟..... امریکا؟ کیا جب نپولین، ہٹلر، برژنیف دو محاذوں پر نہیں لڑ سکے تو گے؟ لیکن جواب میں پاکستانی میڈیا کو حکم دے دیا گیا اور میری تمام تحریروں پر مکمل پابندی لگا دی گئی لیکن اللہ بڑے کریم ہیں کہ پابندی لگانے والا بزدل ملک سے فرار ہو گیا اور اس کی میت ہی واپس آ سکی۔ فَاعْتَبِرُوا يَاأُولِي الْأَبْصَارِ

شنید یہ ہے کہ امریکا بہادر کی یقین دہانی پر بھارت سے تمام متنازعہ امور پر خفیہ مفاہمت کا اشارہ دیا گیا تھا جس کے بعد ہی حکومت نے ایک لاکھ دس ہزار فوج پاک بھارت سرحد سے ہٹا کر پاک افغان سرحد پر لگا دی تھی۔ قائد اعظم کی وفات کے چھ سال بعد ہی نوکر شاہی نے اپنی سرزمین پر امریکا کو فوجی اڈے دے دیئے جہاں سے سوویت یونین کے خلاف جاسوسی پروازیں جاری رہیں جس کے باعث روس پاکستان کو اپنا دشمن سمجھنے لگا اور کشمیر میں رائے شماری کی قرارداد کے خلاف حق تنسیخ استعمال کر کے اسے کالعدم بنا دیا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان سے فوجوں کی واپسی کی قرارداد کو بھی منسوخ کر کے بھارتی فوج کو مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے کا بھرپور موقع فراہم کر دیا۔ لیکن صدمے کی بات تو یہ ہے اور ہماری تاریخ کے سیاہ اوراق میں یہ بھی درج ہو گیا ہے کہ کس طرح قصر سفید کے فرعون کے حکم پر تھالی میں رکھ کر کشمیر کو مودی کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کربناک داستان کو میں کئی مرتبہ اپنے کالمز میں تحریر بھی کر چکا ہوں۔

قائداعظم نے فرمایا تھا کہ ملک میں جمہوریت ہو گی اور ہر صوبے کو اندرونی خود مختاری حاصل ہو گی، جبکہ ان کے جانشینوں نے مشرقی پاکستان کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دینے سے انکار کر دیا اور مغربی پاکستان کے صوبوں کا وجود ختم کر کے ایک اکائی بنا دیا۔ جب صوبے ہی نہ رہے تو پھر صوبائی خود مختاری کیسی؟ ہماری انہی آمرانہ حکومتوں کی غلطیوں سے دشمنوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اب تو مودی کو دعالمی میڈیا پر بھی یہ بارہا تسلیم کر رہا ہے کہ کس طرح اس نے مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کیلئے کام کیا۔ کیونکہ اندر ہی اندر علیحدگی پسندی کی آگ سلگتی رہی جس پر انڈیا تیل پھینکتا رہا جو مشرقی پاکستان میں آتش فشاں بن کر پھٹ پڑی اور صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان تک پھیل گئی۔ مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش کے تکلیف دہ سفر پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن میرے رب نے ان تمام کرداروں سے جو انتقام لیا، وہ بھی باعثِ عبرت تو ہے لیکن ان تمام متکبر شیطانی دماغ تو 5 / اگست 2024ء کو یقیناً ششدر رہ گئے جب ان کی ایجنٹ خونی حسینہ ڈائن پناہ کیلئے ان کے پاس پہنچ گئی اور چشم فلک نے اسی ڈھاکہ، چٹاگانگ، جیسور کی سڑکوں پر نوجوانوں کو "پاکستان سے رشتہ کیا، لا الہٰ الا اللہ" کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے دیکھا جبکہ ان تمام بچوں کی عمریں تو بنگلہ دیش کی عمر سے کہیں کم ہیں۔

لیکن ہمارے ہاں اب بھی سیاسی ابتری، انارکی اور خلفشار پاکستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہے اور استعمار کے گماشتے ماضی کی طرح اب بھی خاکم بدہن اس کے ٹوٹنے کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اب بھی اپنے شیطانی دماغوں سے اس کے نقشے شائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ خبیث پاکستان کی نفرت میں اتنے اندھے ہو گئے کہ ابھی تک اس لنگڑے گھوڑے بھارت پر شرطیں لگا رہے ہیں جہاں خود دنیا کی سب سے زیادہ علیحدگی کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ خود بھارتی تجزیہ نگار تسلیم کرتے ہیں کہ 14 بھارتی ریاستوں میں 21 بڑی اور 53 چھوٹی مگر مؤثر آزادی کی تحریکیں اپنی آزادی کیلئے لڑ رہی ہیں بالخصوص ماؤ تحریک سے بھارتی سلامتی کو شدید خطرات کا اعتراف بھی کیا جا رہا ہے۔ ناگالینڈ، میزوران، منی پورہ، آسام، مغربی بنگال بہار، اتر پردیش میں بھی علیحدگی پسندوں نے بھارت کو بہت خوفزدہ کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نکسل باڑی کے ساتھ تین دیگر صوبوں میں بھی بھارتی حکومت بے بس نظر آ رہی ہے۔

بھارتی تجزیہ نگاروں کے مطابق موجودہ بھارتی گورنمنٹ کی انتہاپسندانہ سوچ کی وجہ سے آئے دن ان تحریکوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور خود یہ اعتراف منظر عام پر آ چکا ہے کہ اس وقت بھارت کے 174 ڈسٹرکٹس انتہاپسند اور عسکریت پسندوں کے کنٹرول میں ہیں۔ ان ریاستوں کو عکسریت پسند اور انتہاپسند تنظیمیں چلا رہی ہیں۔ صوبے آسام میں اس وقت علیحدگی پسند گردوں کی 34 تنظیمیں موجود ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کا انتظام وانتصرام چلا رہی ہیں۔ اسی طرح ناگالینڈ کی آزادی کی جدوجہد کرنے والی تنظیموں نے نہ صرف بھارت میں جنگی تربیت کے کیمپ لگا رکھے ہیں بلکہ ان کیمپوں میں یہ اپنے نوجوانوں کو روزانہ ٹریننگ بھی دیتے ہیں اور ایک اطلاع کے مطابق ان کے پاس جنگی پیمانے پر ہتھیار، توپ، ٹینک اور چھوٹے میزائلوں سمیت درجنوں ہتھیار موجود ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں میں ان تمام تنظیموں کا نہ صرف غلبہ ہے بلکہ ان تنظیموں کی اپنی فوج پولیس، آئین، قانون، عدالتیں، کرنسی، جھنڈے اور بڑے سرکاری دفاتر میں ان کے اپنے لیڈروں کی تصاویر آویزاں ہیں۔ یہ لیڈر بڑے پروٹوکول کے ساتھ اپنے سرکاری دفاتر میں آ کر بیٹھتے اور کام کرتے ہیں۔ مودی حکومت ان کے علاقوں سے ٹرینوں کے گزرنے کا باقاعدہ خراج بھی ادا کرتی ہے جبکہ منافقت کا یہ عالم ہے کہ بھارتی حکومتیں کئی بار ان پر پابندیاں بھی عائد کر چکی ہیں، ان تنظیموں کے خلاف کئی بار فوجی آپریشن بھی کئے گئے لیکن بھارتی افواج کے دستے ان ریاستوں میں گم ہو کر رہ گئے جن کا آج تک کوئی سراغ نہیں مل سکا لیکن اپنی کامیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے پاکستان میں اب تک دہشتگردی کی تحریکوں کی سرپرستی کر رہا ہے اور کبھی کبھار اپنے لوگوں کو بیوقوف بنانے کیلئے پاکستان پر سرجیکل اسٹرائیک کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے جبکہ وہ خوب جانتا ہے کہ سرجیکل سٹرائیک کا جواب فی الفور اس کی ندامت اور رسوائی کی شکل میں ساری دنیا تک دیکھ لیتی ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے ملک کو استعماری قوتوں کے نرغے سے نکالنے کیلئے اپنا وہ کردار ادا کریں جس کا عہد ہم نے اپنے رب سے کیا تھا کہ اے بارِ الٰہ: ہمیں زمین پر ایسا خطہ عنائت فرما جہاں ہم قرآن وسنت کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔ ہمارے کریم ورحیم رب نے تو ہمیں ماہِ رمضان کی انتہائی مبارک شب "لیلتہ القدر" کو یہ معجزاتی ریاست عطا فرمادی، ایک گولی چلائے بغیر ہمارے قائد نے اپنے تمام وفادار ساتھیوں کی شب وروز محنت کے ساتھ علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر ہمارے حوالے کر دی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ہم نے اپنے رب سے کیا گیا عہد پورا کیا؟ جس کا جواب نفی میں ہے۔ آیئے ہمیں سب سے پہلے اپنے رب کے حضور پوری ندامت کے ساتھ سجدہ ریز ہو کر اجتماعی توبہ کرنا ہو گی اور تجدید عہد کی توفیق طلب کرتے ہوئے اس راستے کی طرف گامزن ہوں جس کیلئے یہ ریاست وجود میں آئی۔ ہمیں آج اپنے رب سے یہ عہد بھی کرنا ہو گا کہ ہم اپنے اس ملک میں قرآن وسنت کے نفاذ کیلئے اپنی ساری توانائیاں اخلاص کے ساتھ صرف کریں گے اور ان تمام عہد شکنوں کو ان کے بیرونی آقاؤں کے ساتھ ان کے حتمی انجام تک پہنچائیں گے۔۔۔ ان شاء اللہ۔۔۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔۔ آمین

بروز جمعرات 11 صفر المظفر 1446ھ 15 / اگست 2024

ضمیر کی خودکُشی

گاڑی میرے گھر کے سامنے رکی، پہلے باوردی شوفر اترا، پچھلے دروازے کی طرف بھاگا اور سرعت سے ہینڈل کھینچ دیا۔ اندر سے آسامی نیلے سوٹ میں ملبوس ایک خوبصورت نوجوان نکلا، اس کے ہاتھوں میں گلدستہ تھا۔ میں یہ سب کچھ اپنے گھر کے فرنٹ روم کی سامنے والی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے عینک کے گہرے سیاہ شیشوں کے پیچھے سے ماحول کا جائزہ لیا اور آگے بڑھ کر میری دہلیز پر قدم رکھ دیا۔ اس نے جونہی گھر کے دروازے پر نصب گھنٹی بجائی تو مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی اور پریشانی بھی کہ یہ اجنبی کون ہے اور میرے ہی گھر کا اس نے انتخاب کیوں کیا ہے؟

اگلے دو منٹوں میں وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ ایک خوشحال، وجیہہ اور مہذب آدمی دکھائی دے رہا تھا لیکن اسے اپنے سامنے پا کر مجھے کوئی مسرت نہیں ہو رہی تھی۔ میں دراصل گزشتہ چند برس سے شدید ڈپریشن کا شکار ہوں اور علاوہ ازیں خداداد پاکستان کی اوپر تلے کی ناکامیاں، سنگین معاشی بحرانوں، مہنگائی میں تڑپتے عوام اور حالات کے بے مہر تھپیڑوں سیاسی انارکی اور ابتری نے میری جڑیں تک ہلا دی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں ان دنوں چڑچڑا، سنکی اور بیزار سا رہتا ہوں۔ میل ملاقات سے مجھے چِڑ سی ہو گئی تھی اور میں اپنی روزانہ کے معمولات کیلئے گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ کتنے غلط وقت پر بغیر اطلاع دیئے میرے پاس آیا ہے۔ اس کے پھول میرے سامنے میز پر دھرے تھے جو دروازہ کھولتے ہی اس نے اپنی مسکراہٹ اور انتہائی نیاز مندی کے ساتھ میرے ہاتھوں میں تھما دیئے تھے۔

اس نے دھوپ کا انتہائی قیمتی چشمہ اتارا، ایک زندگی سے بھرپور مسکراہٹ میری طرف پھینک کر بولا "آپ نے مجھے پہچانا؟" میں نے غور سے اسے دیکھا، چہرہ تو شناسا تھا لیکن وقت اور دوری کی دھند میں ملفوف تھا۔ اس نے میری کشمکش بھانپ لی "آپ پہچان بھی کیسے سکتے ہیں، 15 سال تھوڑا عرصہ نہیں ہوتا؟ "میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ "آپ میرے محسن ہیں، میری خواہش تھی، میں جب کامیاب بزنس مین بن جاؤں، میرے پاس بے پناہ دولت آ جائے ،لوگ میرے اوپر رشک کریں، تو میں ایک بار آپ کے قدموں میں حاضری دوں"۔

میری وحشت حیرت میں تبدیل ہو گئی اور میں سکتے کے مریض کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ وہ تھوڑا سا جذباتی ہو گیا "میری آپ سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی، میں پچھلے چند برسوں میں کئی مرتبہ کاروباری سلسلے میں یورپ میں آیا لیکن لندن آنے کا پہلی مرتبہ اتفاق ہوا کہ مجھے آپ کی یاد بھی بہت ستا رہی تھی ۔ سر! میں ایک ناکام شخص تھا، غریب تھا، جذباتی تھا، جس سونے کو ہاتھ لگاتا، مٹّی ہو جاتا، جس نوکری کیلئے درخواست دیتا، وہاں سے انکار ہو جاتا۔ میں نے سوچا اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں مر جاتا، ایک دوست مجھے آپ کے پاس چھوڑ گیا۔ آپ نے میری ساری کہانی سن کر مجھے خود کشی کا ایک انوکھا طریقہ بتایا۔ آپ نے کہا اس معاشرے میں زندہ رہنے سے بڑی کوئی خودکشی نہیں، تم اپنے اردگرد موجود لوگوں جیسے ہو کر ان سب سے انتقام لے سکتے ہو۔ آپ نے کہا کامیابی اور ناکامی، اچھائی اور برائی فقط "اسٹیٹ آف مائنڈ" ہوتی ہے۔ جیب تراشی ایک شخص کی ناکامی اور دوسرے کیلئے کامیابی ہوتی ہے۔ اسے ایک برائی کہتا ہے اور دوسرے کے نزدیک وہ حصولِ رزق کا ذریعہ ہوتی ہے جس سے وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پال رہا ہوتا ہے اور ان کے علاج معالجے پر بھی اسی دھندے سے کمائی ہوئی رقم صرف کرتا ہے۔ جیب تراش اپنے اس عمل سے اس قدر وفادار ہوتا ہے کہ کسی غریب کی جیب کاٹتے ہوئے ایک لمحے کیلئے بھی اس کے ہاتھ نہیں کانپے کیونکہ وہ "ضمیر" نام کی کسی چیز سے واقف نہیں ہوتا۔ گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کر لے تو وہ پھر کھائے گا کیا؟

وہ سانس لینے کیلئے رکا، وہ مجھے اب ہلکا ہلکا یاد آنے لگا۔ دس سال پہلے وہ ایک کمزور سا زرد رولڑکا تھا لیکن اب وہ سڈول جسم کا خوبصورت نوجوان تھا۔ وہ گویا ہوا" آپ نے کہا تھا کہ اصل قصوروار ضمیر ہوتا ہے، یہ جو تم بہت خوشحال قسم کے لوگ دیکھتے ہو جن کی لوگ مثالیں دیتے ہیں کہ یہ برسوں میں ارب پتی بن گیا یہ بھی کبھی تم جیسے لوگ تھے، بس انہوں نے خود کو مارنے کی بجائے اپنے اپنے ضمیر کو قتل کر دیا اور بس ایک ہی رات میں خوشحالی کے سفر پر گامزن ہو گئے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ اس ملک میں ضمیر کی کوئی ضرورت نہیں، اس سوسائٹی میں ضمیر اپینڈکس کی طرح ہے، اگر ہے تو کوئی فائدہ نہیں، موجود نہیں تو کوئی نقصان نہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ اپنے اردگرد دیکھو" کتنے سیاستدان ہیں، کتنے مذہبی رہنما، بزنس مین، دانشور، ادیب اور صحافی ہیں، یہ سب اخبار، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر کتنا جھوٹ بولتے ہیں کہ عرش تک ہل جاتا ہے۔ کتنے دھڑلے کے ساتھ قائداعظم، علامہ اقبال اور دیگر قومی مشاہیر پر کیچڑ اچھالتے ہیں تاکہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کی نمک حلالی ہو سکے حالانکہ یہ جب کہتے ہیں تو جانتے ہیں ہم غلط کہہ رہے ہیں لیکن تم ان کا اعتماد دیکھو، ان کے لہجے کی کھنک، ان کی آنکھوں کی چمک اور ان کے چہرے کی دمک ملاحظہ کرو تمہیں کسی جگہ کشمکش، پریشانی اور شرمندگی نظر آتی ہے، نہیں دکھائی دیتی، کیوں؟ کیونکہ ان لوگوں کے اندر ضمیر جیسی چیز ہی نہیں۔ آپ نے کہا تھا یہ ضمیر ہی ہوتا ہے جو انسان کو شرمندگی، پریشانی اور کشمکش سے دوچار کرتا ہے، جو آپ کے اعتماد میں دراڑ ڈالتا ہے، اگر ضمیر نہیں تو سکھ ہی سکھ، اطمینان ہی اطمینان اور سکون وچین ہی چین!

وہ رکا، اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور لمبا سا سانس لیکر بولا" سر! اس کے بعد آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ضمیر کے ساتھ زندہ رہو گے تو میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ کامیاب تو تم پھر بھی ہو جاؤ گے لیکن یہاں نہیں بلکہ وہاں، جہاں ہم سب کا انتظار ہو رہا ہے۔ سر! میں نے آپ کی پہلی نصیحت پر عمل کیا، میں نے اپنے ضمیر کا گلہ دبا دیا، میں نے اسے گہرے گڑھے کی مٹی میں دفن کر دیا جہاں سے اس کی ہلکی سے بھی آواز سنائی نہ دے۔ آپ کی پیشین گوئی یا تجربہ کی بات بالکل سچ ثابت ہوئی، میں واقعی کامیاب ہو گیا۔ مجھے لگا، میں آپ کے ساتھ ملاقات سے پہلے قطب شمالی پر برف کی دوکان کھول بیٹھا تھا یا چولستان کے باسیوں کو ریت بیچ رہا تھا۔ میں نے جب بازار میں درست سودا بیچنا شروع کیا تو دن دگنی رات چوگنی ترقی کی۔ میں آپ کا مشکور ہوں سر!" وہ خاموش ہو گیا۔

میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا، وہاں واقعی کوئی ملال، کوئی شرمندگی اور کشمکش نہیں تھی بالکل ہمارے اُن حکمرانوں کی طرح جو اپنے اقتدار کے نشے میں مجبور و مقہور بچیوں کو خودسوزی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ افشاں لطیف پچھلے کئی برسوں سے انصاف کی صلیب اٹھائے ہر مقتدر سے خود سے ہونی والی ناانصافی کی روداد سناتے ہوئے اس کے اعضا شل ہو گئے ہیں اور بالآخر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے سامنے خود کو ان ظالم حکمرانوں کے ناروا سلوک کے روز روز اپنے اندر بھڑکتی آگ میں جھلسنے کی بجائے ایوان اقتدار کے سامنے خودسوزی کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، اب تک میں کئی کالمز اور آرٹیکلز لکھ چکا ہوں، کئی حکومتی افراد نے اس معاملے پر مکمل مدد کا اعلان کرتے ہوئے تسلی و تشفی کی یقین دہانیاں بھی کروائی لیکن صد افسوس کہ معاملہ تو پہلے سے بھی زیادہ گھمبیر ہو گیا ہے۔

پتہ چلا ہے کہ اس نے مقتدر افراد کے سامنے سارے شرمناک واقعہ سے آگاہ کرتے ہوئے انصاف کی دہائی بھی دی کہ کس طرح چائلڈ ایبوز مافیا کی جانب سے افسران کو ترقیاں دے کر فلاحی اداروں اور یتیم خانوں میں انچارج لگایا جاتا ہے۔ بطور سپرنٹنڈنٹ کاشانہ اس کو بھی گھناونے کاروبار کا حصہ بننے پر مجبور کیا گیا لیکن اس کے انکار کے بعد اس خداداد اسلامی مملکت میں بہادری کو سراہنے کی بجائے اسے عبرت بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے اور آج وہ دربدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ افشاں کے بقول ان سے پہلے کاشانہ ممیں محکمہ سوشل ویلفیئر کے افسران اپنی ترقیوں اور پیسوں کیلئے عرصہ دراز سے چائلڈ

ابیوز کا کاروبار کر رہے تھے۔ جس کیلئے یتیم لاواث بچیوں کے کاشانہ میں داخلے اور اخراج کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔ کئی لڑکیاں کاشانہ کے ریکارڈ میں رجسٹر اور حاضر دکھائی جاتی تھیں لیکن ادارہ سے غائب تھیں۔ کاشانہ کی ہر بچی کیلئے کھانے پینے، میڈیکل، تعلیم، بنیادی ضروریات، سرکاری ضروری اخراجات کے ملازمین کی تنخواہیں اور ادارے کے تمام اخراجات سرکاری بجٹ آنے کے باوجود خطیر رقم عطیات کی صورت میں وصول ہوتی ہیں لیکن بد قسمتی سے تمام رقوم کی بندر بانٹ کی جاتی ہے۔ عطیات کے نام پر معصوم یتیم اور لاوارث بچیوں کا جنسی کاروبار کیا جاتا ہے۔ جعلی شادیاں کروا کر بچیوں کو با اثر افراد کو فروخت کیا جاتا ہے۔ کئی بچیوں کو بیرون ملک بیچا گیا۔ افشاں کے مطابق ان سے پہلے کاشانہ میں تعینات سپرنٹنڈنٹ نے 2013 سے 2018 تک یتیم لاوارث لڑکیوں کی جعلی شادیاں کروائیں جن کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ یتیم بچیوں کو عیاش ڈونرز کے ساتھ کئی روز تک ادارے سے باہر ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز میں بھیجا جاتا تھا اور جب بچیاں واپس لائی جاتی تھیں تو ان کی جسمانی حالت انتہائی خراب ہوتی تھی اور ان کے جسم کے کئی حصے بری طرح زخمی ہوتے تھے۔ اپنے ان گھناؤنے جرائم پر پردہ ڈالنے کیلئے پرائیویٹ ڈاکٹرز کو بلوا کر ان کی سرجریاں تک کروائی جاتی تھیں۔

افشاں کا محض قصور یہ ہے کہ کاشانہ میں متاثرہ بچیوں کی جانب سے جنسی درندگیوں کے ان ظالمانہ سلوک پر بحیثیت ایک ماں اور عورت اس کی روح تک لرز گئی۔ جس کے بعد اس نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے بڑی دلیری کے ساتھ محکمہ ویلفیئر کے ایسے تمام غیر قانونی اور شرمناک احکامات ماننے سے اس وقت انکار کر دیا جب محکمے کی جانب سے عنایات کی بارش کی جا رہی تھی۔ مورخہ 12 جولائی 2019 کو سیکریٹری سوشل ویلفیئر عنبرین رضا کو تحریری درخواست کے ساتھ کاشانہ کی ان تمام متاثرہ یتیم بچیوں کے محکمانہ انکوائریز میں بیانات بھی ریکارڈ کروائے جن میں ان بچیوں نے جنسی کاروبار میں استعمال ہونے سے متعلق تمام روح فرسا تفصیلات بھی بتائیں۔

قارئین! یقین کریں کہ اس کے بعد ہونے والے واقعات کو تحریر کرنے کیلئے میرے قلم اور ضمیر میں ایک خاص جنگ شروع ہو گئی ہے اور دونوں نے ایکا کر کے میرے ہاتھوں میں رعشہ طاری کر دیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میری یہ حالت کیوں ہو گئی ہے؟ وہ اس لئے کہ کاشانہ سکینڈل منظر عام پر آنے کے بعد جہاں دو لاوارث لڑکیوں اقرا کائنات اور ساجدہ کو قتل کر دیا گیا وہاں دیگر گواہ لڑکیوں کو بھی کاشانہ سے غائب کروا دیا گیا، جن کے بیانات تمام محکمانہ انکوائریز میں ریکارڈ تھے اور میڈیا پر بھی وائرل ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب ذاتی طور پر میں نے اپنے کئی احباب سے ذاتی دلچسپی لینے کی استدعا بھی کی اور مجھے امید ہو چلی تھی کہ اب ان تمام حقائق کی روشنی میں نہ صرف افشاں اور متاثرہ یتیم بچیوں کو انصاف ملے گا بلکہ متعلقہ اوباش افراد کو انجام تک پہنچایا جائے گا لیکن صد افسوس کہ نمک کی کان میں سب ہی زہریلے نمک کی مانند عذاب الٰہی کو دعوت دینے پر تلے ہوئے تھے۔

12 جولائی 2019 کو دی گئی تحریری درخواست کے بعد افشاں اور کاشانہ کی یتیم بچیوں پر زندگی تنگ کر دی گئی۔ سرکاری افسران اور عمران خان کے وزرا اپنے دفاتر میں بلا کر افشاں کے سر کی چادر کھینچتے تھے بلکہ جنسی طور پر ہراساں کرتے رہے یہاں تک کہ یتیم بچیوں کے کھانے پینے کا بجٹ بھی بند کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ ناکردہ گناہ میں قتل کی گئی کائنات اور ساجدہ کی چیخیں ہی اس ملک پر آنے والے عذاب کیلئے کافی تھیں کہ اس پر مستزاد درجنوں بچیاں بھی اسی انجام سے دوچار کر دی گئیں جن کا ریکارڈ بھی تلف کر دیا گیا ہے جو کاشانہ ویلفیئر ہوم میں جنسی کاروبار میں استعمال کی گئیں، جن کو بیچ دیا گیا یا مار دیا گیا۔ یہ معاملہ صرف کاشانہ ہوم

کا نہیں بلکہ محکمہ سوشل ویلفیئر کے دوسرے فلاحی اداروں، دارالامانوں اور بچوں کے یتیم خانوں میں بھی جنسی کاروبار کا یہ بااثر مافیا اب بھی پوری طرح سرگرم ہے جس میں محکمہ ویلفیئر کے افسران ملوث ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے پسندیدہ افراد کو تو 10 سال سے بھی زائد انچارج بنا کر اپنا مذموم اور مکروہ دھندہ جاری رکھا جاتا ہے اور اگر کوئی افشاں جیسا کردار سامنے آجائے تو اس کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا جاتا ہے کہ ہر آنے والا ان کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اسی مکروہ دھندے کا ایک پرزہ بن جائے۔

اس ظلم کی داستان یہی ختم نہیں ہوتی بلکہ کائنات الیاس اور اس کے دو بہن بھائی مہک الیاس اور علی الیاس کو اغوا کر کے چائلڈ پروٹیکشن بیورو میں لایا گیا اور والدین اور رشتہ دار ہونے کے باوجود انہیں لاوارث قرار دے کر چائلڈ پروٹیکشن بیورو لاہور میں رکھا گیا جہاں ان تینوں کا بدترین جنسی استحصال کیا گیا۔ کائنات الیاس کو قتل کر دیا گیا جبکہ مہک اور علی الیاس تاحال لاپتہ ہیں۔ ممکنہ طور پر وہ بھی مارے جا چکے ہیں۔

آپ ہمیشہ یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر اس پاک وطن پر مصائب اور عذاب کے بادل کب ختم ہوں گے۔ آپ خود ہی سوچیں کہ جہاں درخواست گزار افشاں کو انصاف دینے کی بجائے اس کا منہ بند کرنے کیلئے عمران خان کی حکومت میں سرکش، ظالم اور فاسق سرکاری افسران افشاں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اس کے شوہر پر متعدد جھوٹے اور بے بنیاد مقدمات درج کروا کر کوٹ لکھپت جیل میں ڈیتھ سیلز میں قید کر دیا گیا۔ اس کا گھر جلا دیا گیا اور غیر قانونی طور پر اس کو سرکاری نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کے معصوم اور بے گناہ بچوں کو دربدر کر دیا گیا، اور آج وہ تعلیم اور بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اگر آج ایک ایٹمی قوت کے حامل پاکستان کو دنیا بھر میں جس طرح کی رسوائیوں کا سامنا ہے، اندرونِ ملک جس سیاسی انارکی اور ابتری کا سامنا ہے، بے یقین کے ایک عالم نے ہر پاکستانی کو تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے، خود کل کے فرعون مکافاتِ عمل کا شکار ہو گئے ہیں تو اس کے باوجود آج کے حکمران آخر کس عذاب کے منتظر ہیں کہ کوئی اور اقرا کائنات اور ساجدہ ایسے ہی ظلم سے دوچار ہو، کوئی اور افشاں سچ کی صلیب اٹھا کر خودسوزی کیلئے چل پڑے؟ میں مقتدر حضرات سے بڑی دلسوزی کے ساتھ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایسا ہی حادثہ (خدانہ کرے کہ کسی دشمن کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑے) آپ کے اپنے گھر کی کسی بچی سے ہو جائے تو کیا آپ اب بھی اسی طرح کی مجرمانہ خاموشی اختیار کریں گے؟ اگر ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کی وزیر اعلیٰ ایک عورت اور ماں ہونے کے ناطے مریم نواز بھی افشاں کو انصاف دینے سے قاصر ہیں تو پھر اس وقت کا انتظار ہے کہ کب قدرت کا کوڑہ اپنے انتقام کیلئے برسنا شروع کر دے گا۔ نجانے میرا وجدان یہ گواہی دیتا ہے کہ افشاں! تمہیں خودسوزی کی قطعاً ضرورت نہیں، عرشِ بریں کے فیصلے کا انتظار کرو، ان تمام ظالموں کے خلاف درج کروائی گئی ایف آئی آر کا فیصلہ جلد سامنے آنے والا ہے جو نہ صرف شرمناک بلکہ عبرتناک بھی ہو گا۔

شرمندہ انہیں اور بھی اے میرے خدا کر
دستار جنہیں دی ہے انہیں سر بھی عطا کر

میرے بن بلائے مہمان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے آگے پیچھے دیکھا اور بڑے اعتماد سے بولا "سر! آپ مجھے کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں، کوئی مسئلہ آن پڑا ہے؟ اینی پرابلم سر؟" میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور تھکی مرجھائی آواز میں کہا "ہاں میں پریشان ہوں، میں بھی اپنے ضمیر کے ہاتھوں تنگ آچکا ہوں" اس نے قہقہہ لگایا اور چمک کر بولا "آپ بھی میری طرح اپنی ہی نصیحت پر عمل کریں، مطمئن اور خوشحال ہو جائیں"۔ میں نے بھی زوردار قہقہہ لگایا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا "بڑی کوشش کرتا ہوں لیکن اللہ نے میرے اندر ایک عجیب نسل کا ضمیر فٹ کر دیا ہے، میں جہاں چھوڑ کر آتا

ہوں، یہ بلی کی طرح واپس آجاتا ہے، میرے گھر پہنچنے سے پہلے دہلیز پر کھڑا ہوتا ہے اور پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوتا ہے اور بالآخر مجھے شکست سے دوچار کر دیتا ہے۔

"سر! پھر آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے مقدر میں ناکامی لکھوا کر آئے ہیں جو کبھی کامیاب نہیں کہلوا سکتے البتہ یہاں نہیں بلکہ وہاں بھی آپ کامیاب ٹھہریں گے، مجھے معلوم نہیں؟ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو یہ میرا کارڈ رکھ لیں، کبھی یاد فرمائیں!" اب میز پر پڑے پھولوں کے ساتھ یہ کارڈ بھی مجھے دیکھ کر طنزیہ ہنسی کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے!

نئے خداؤں سے مشروط دوستی کر لی
فقیہہ شہر نے تجدیدِ بندگی کر لی
وہ بدنصیب جسے سب ضمیر کہتے تھے
سنا ہے اس نے کہیں چھپ کے خودکشی کر لی
اسے خلوص کہوں یا اپنی نادانی
جو کوئی ہنس کے ملا اس سے دوستی کر لی
بہارِ صحنِ چمن تک نجانے کب پہنچے
خزاں سے ہم نے سرِ دست دوستی کر لی

بروز ہفتہ 13 صفر المظفر 1446ھ 17 / اگست 2024ء

قائد! ہم شرمندہ ہیں

قائداعظم کی قیادت کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان کا قیام ہے لیکن پاکستان کے قیام کی حقیقت کیا ہے؟ یہ برصغیر کی سیاسی صورتحال کا اتفاق ہے، کوئی تاریخی حادثہ ہے، برطانوی ہند کی وحدت کو ختم کرنے کی سازش ہے یا انسانی معاشرت کیلئے اللہ تعالیٰ کے قوانین کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان دورِ حاضرہ میں عالمگیر امت مسلمہ کی بازیافت کا اعلان ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم۔۔۔۔۔۔!

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی

1924ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ وہ برائے نام مرکزیت جو مسلمانوں کو حاصل تھی وہ بھی ختم ہوگئی اور اس پر مسلمانوں سے دائمی بغض اور عناد رکھنے والی طاقتوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن اس واقعے کے 16 برس بعد یعنی 1940ء میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے عالمگیر ملی تشخص کا اعلان کرتے ہوئے پاکستان کا مطالبہ کر دیا۔ غور کیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کر کے اجتماعی سطح پر اصولی اعتبار سے اتباعِ سنتِ نبوی ﷺ کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ ہمارے ہادی برحق رسولِ اکرم ﷺ نے ایمانی رشتے کی بنیاد پر ایک عالمگیر امتِ مسلمہ کی تشکیل فرمائی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے دورِ حاضر میں اسی تشخص کی تجدید فرمائی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے یثرب کی سرزمین کو پہلی اسلامی ریاست کیلئے منتخب فرمایا، برصغیر کے مسلمانوں نے اعلان کیا کہ یہاں اپنے اکثریتی علاقوں کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی شکل دیکر وہ اسے دورِ حاضر میں "عمل پذیر اسلام کی تجربہ گاہ" بنائیں گے۔ یثرب مدینتہ النبی ﷺ بنا، یہ خطہ پاکستان بنا۔

ایک اور حیرت انگیز بات یہ کہ دنیا کے دیگر تمام علاقوں کے مقابلے میں برصغیر کے مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور جب پاکستان کا مطالبہ کیا اس وقت یہاں مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ کے لگ بھگ تھی لیکن ہندو اکثریت کے مقابلے میں وہ تعداد بہت کم تھی، یعنی ایک چوتھائی تھی۔
تعداد کی وہ کمی پیشِ نظر رکھئے اور قرآنِ پاک میں سورۃ الانفال کی 26ویں آیت مبارکہ پر غور کیجئے جس میں ارشاد ہوا ہے: وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۔۔یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

آں کتاب زندہ، قرآن حکیم
حکمت ولایزال است و قدیم

پاکستان دورِ حاضر میں اس ارشادِ قرآنی کی تشریح اور اسلام کی نشاطِ ثانیہ کی علامت کے طور پر وجود میں آیا ہے اور اس تاریخ ساز عمل میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت نے اساسی اور کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہ بہت بلند رتبہ ہے اور اسی زاویہ نظر سے قائداعظم محمد علی جناح کے شخصی کردار پر بھی غور و فکر کی ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی اور رسول اکرم محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس سے قلبی وابستگی نے ان کی شخصی اور سیاسی دونوں

زندگیوں کو کس طرح باہم مربوط اور منظم کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے برطانیہ میں "لنکن ان" میں داخلہ لیا کیونکہ وہاں دنیا کی قانون ساز شخصیات میں سرِفہرست ہمارے رسولِ اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی تحریر تھا اور پھر نصف صدی بعد قیامِ پاکستان کے وقت اقتدار کی منتقلی کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو ہم پر طنز کیا تھا، یہ کہہ کر "مجھے امید ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا وہی سلوک کیا جائے گا جیسا اکبرِ اعظم کے دور میں کیا گیا تھا" تو قائداعظم محمد علی جناح نے فوری جواب میں کہا تھا کہ "مسلمانوں کی رواداری اکبرِ اعظم تک محدود نہیں ہے بلکہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ہمارے پیارے رسول اکرم ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو فتح کر کے ان سے نہ صرف منصفانہ بلکہ فیاضانہ سلوک کیا تھا"۔

نوجوان محمد علی جناح کے قلب میں رسول اکرم ﷺ سے وابستگی کی جو ایک روشن کرن تھی، اسی کرن کی روشنی ان کیلئے سیاست کی راہ کے انتہائی صبر آزما سفر میں بھی زادِ راہ بنی رہی۔ شخصی اعتبار سے قائداعظم میں خامیاں بھی رہی ہوں گی لیکن ان خامیوں کے اثرات ان کی ذات پر یا اس سے متعلق افراد تک رہے جبکہ ان کی خوبیوں کے اثرات ان کی قیادت میں نمایاں ہوئے جس کی توانائی نے برِصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر دیرپا اور تاریخ ساز اثرات مرتب کئے۔

قائداعظم نے قیامِ پاکستان کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اس اعتماد کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا تھا جو پورے برِصغیر کے آباد مسلمانوں نے ان کی قیادت پر کیا۔ انہوں نے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو کبھی کسی غلط فہمی میں نہیں رکھا بلکہ بالکل واضح طور پر بار بار اعلان کیا کہ پاکستان اکثریتی صوبوں میں بنے گا اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو اس عظیم مقصد کیلئے قربانیاں دینی ہوں گی۔ سرزمین پاکستان کی آزادی کی یہ انفرادیت ہے کہ اس سرزمین کی آزادی کیلئے ان مسلمانوں نے بھی سوچ سمجھ کر قربانیاں دیں جن کا اس سرزمین سے کوئی براہِ راست کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن یہاں آباد مسلمانوں سے ایمانی رشتے کے تقاضے کا ان کو پورا شعور تھا، تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے۔ یہ قائداعظم کی قیادت کی سحر انگیزی تھی اور وہ سحر انگیزی سچائی کی تھی، امانت و دیانت کی تھی۔ انہوں نے جذباتی نعرے بازیاں کبھی اختیار نہیں کیں۔ ان کو دو بہت بڑی طاقتوں کا سامنا تھا، ایک ہندو کانگریسی قیادت اور دوسری برطانوی حکومت۔ مادی اعتبار سے صورتحال بے سروسامانی کی تھی، مسلمان منتشر تھے، بکھرے ہوئے تھے لیکن ایمانی توانائی مسلمانوں کو بہرحال حاصل تھی۔ قائداعظم کی قیادت کی صداقت نے اسی ایمانی توانائی کا شعور مسلمانوں میں بیدار کر دیا۔ اصل توانائی ان دیکھی طاقتوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ ایمان ان دیکھی توانائی ہے لیکن ساری نظر آنے والی طاقتوں پر غالب آجاتی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

قیامِ پاکستان کی راہ کی رکاوٹیں سامنے لایئے، مخالفین کی بھرپور سازشی منصوبہ بندیاں پیشِ نظر رکھئے، اس قتل و غارت گری کا تصور کیجئے جو صرف اس لئے برپا کی گئیں کہ پاکستان مستحکم بنیادوں پر قائم نہ ہو سکے اور وہ پھر جذبہ، وہ عزم اور تعمیر کا فیصلہ کن انداز جس سے جو کچھ بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا، اسے ممکن بنا دیا۔ پاکستان کا قیام دورِ حاضر میں اسلام کے احیاء کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا ہے "وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے"۔ اور سورۃ ابراہیم میں ارشاد ہے وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۭ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (46) کافروں نے اپنی ساری چالیں چل دیکھیں لیکن ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا، حالانکہ ان کی چالیں ایسی غضب کی تھیں کہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ سچی بات یہ ہے کہ:

جہاں ہوں سعی بشر کی تمام راہیں بند
دیار دوست کا رستہ وہیں سے کھلتا ہے

ارشاداتِ قرآنی پیش نظر رکھئے اور پاکستان کے قیام سے لیکر پاکستان کے ایٹمی طاقت بن جانے تک کے واقعات پر غور کیجئے، انسانی معاشرت کیلئے قدرت کی منصوبہ بندی کی کارفرمائیاں واضح ہوتی چلی جائیں گی۔ قیامِ پاکستان کی ایک وجہ ہمارے مخالفوں کا شدید تعصب اور سیاسی ریشہ دوانیاں بھی بنیں۔ قیامِ پاکستان کو متزلزل کرنے کی ہر ممکن کوششیں کی گئیں اور ہر کوشش ناکام ہوئی اور ایٹمی طاقت کی حیثیت سے نمایاں ہونے میں جس عمل نے ہمارے لئے سب سے بہتر دلیل فراہم کی وہ بھارت کا ایٹمی دھماکہ تھا۔ پاکستان کی داخلی صورتحال اور اس کے وجود کے علاقائی اور عالمی اثرات پر مسلسل تدبر اور تفکر کی ضرورت ہے۔ جہاں ہم داخلی سطح پر سماجی تطہیر کے مرحلوں سے گزر رہے ہیں، وہاں نائن الیون کے بعد اس خطے کی صورتحال بالکل بدل چکی ہے۔

پاکستان دشمن قوتیں بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑی ہیں اور ایک فاسق و فاجر جنرل ہمیں جن خطرات کے بھنور میں پھینک کر پہلے ملک سے فرار ہو گیا اور اب عالمِ برزخ میں اپنے اعمال کے حساب و کتاب بھگت رہا ہو گا وہاں ہمارے تمام نابالغ سیاستدانوں نے اس معجزاتی اور عطیہ خداوندی انعام سے بدترین سلوک کے باوجود جہاں معاشی اور دیگر دشواریاں پہاڑوں جیسی معلوم ہوتی ہیں، کے باوجود قیامِ پاکستان کا علاقائی اثر یہ ہوا کہ بھارت اس سارے علاقے پر اپنا تسلط قائم نہیں کر سکا اور عالمی اثر یہ ہوا کہ اسلام عالمی سطح پر نمایاں سے نمایاں تر ہوتا چلا گیا اور آج دفاعی نقطہ نظر سے 100 / اندرا گاندھی، من موہن سنگھ، باجپائی اور ہزار مودی آنکھ ٹیڑھی کر کے بھی دیکھنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ اب تک عالمی استعمار اور ٹرائیکا کے ساتھ سازش کر کے یہ کوشش کر چکے لیکن اس کے عملی جواب سے تھرا کر رہ گئے کہ خود عالمی سطح کے دفاعی نگاروں اور تجزیہ نگاروں کی آراء کے مطابق یہ عمل ساری دنیا کو ہزاروں سال تک تاریک کر دے گا اور ممکن ہے کہ وہی لمحہ قیامت کا ہو۔

وقت کے دو پیمانے ہیں، شب و روز اور ماہ و سال۔ ایک پیمانہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے کاموں کیلئے مقرر کیا ہے، دوسرا پیمانہ اللہ تعالیٰ کے اپنے حساب کا ہے جس کا ایک "یوم" ہمارے ایک ہزار سال کے برابر یا اس سے بھی زیادہ کا ہے۔ دورِ رسالت مآب ﷺ میں انسانی معاشرت کیلئے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین اور انسانی اعمال میں مکمل ہم آہنگی، مثالی ہم آہنگی ہو گئی تھی لہٰذا تاریخ کی مکمل روشنی میں ایک مثالی معاشرہ، ایک مثالی مملکت وجود میں آ گئی۔ اس مثالی معاشرے کی روشنی جہاں تک پہنچائی جا سکتی تھی مسلمانوں نے پہنچائی۔ زمانے کا، انسانی معاشرہ کا، سفر تو اب بھی اسی سمت ہے لیکن اس راہ پر ہم مسلمانوں کو اپنے ایمان و عمل سے جو روشنی پھیلانی چاہئے تھی کہ سفر میں تیزی آ جائے، ہم صدیوں سے اپنا وہ فریضہ بھلا بیٹھے ہیں۔ قیامِ پاکستان نے ہمیں دورِ حاضر میں اپنے ایمانی کردار کی ادائیگی کا ایک اور موقع فراہم کیا ہے۔ پاکستان میں ہم گزشتہ 77 سالوں میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے یا اس کے شعور سے محروم ہو کر جو وقت ضائع کر چکے ہیں اور اس سے نسلِ انسانی کا جو خسارہ ہوا ہے ہم سب کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کے اعتبار سے اللہ کے سامنے اس کی جوابدہی کرنی ہو گی۔ کیا واقعی ہمارا ایمان ہے کہ جوابدہی ہو گی؟ کیا ہم کو اس حقیقت کا شعور بھی ہے کہ وہ جوابدہی ہونی ہے اور ضرور ہونی ہے؟ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ہم نے بہت بڑی ذمہ داری قبول کر لی ہے:

بے خبر تو جوہرِ آئینہ پیام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

لیکن سنئے! سورۃ محمد کی آخری آیاتِ مبارکہ کے اختتامی الفاظ بھی کیا کہہ رہے ہیں:
تم ہی اس کے محتاج وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ: اللہ تو غنی ہے، ہو۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔
اس وقت ہمارا سب سے بڑا امتحان یہی ہے۔ کاش! ہمیں اس سچائی کا ادراک ہو جائے کہ اللہ کے خوف سے محرومی سب سے بڑی محرومی، سب سے تباہ کن محرومی ہے جس کا کوئی ازالہ کسی بھی صورت ممکن نہیں ہے!

یاد رکھیں! دنیا میں تبدیلی ہمیشہ ایک آدمی لاتا ہے جسے ہم "لیڈر" کہتے ہیں، جو لوگوں کو ہر قسم کے مصائب سے نجات، خودداری کی منزل کے حصول کے خوابوں کی تعبیر اور غلامی کی زندگی سے نجات اور جینے کے وژن اور قوم کی مستور قوت کو استعمال کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ وہ اس قدر باصلاحیت، بہادر اور بے لوث ہوتا ہے کہ اس کی قوم اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ پر ایمان کی حد تک یقین کرتی ہے۔ قدرت نے ان تمام اوصاف سے مرصع ہمارا قائد محمد علی جناح صحیح معنوں میں جب عطا کیا تو تاریخ نے دیکھا کہ انہوں مسلمانانِ ہند کے حقوق کیلئے ایسی جدوجہد کی رہنمائی کی اپنی خطرناک بیماری کے باوجود اس کو اس لئے چھپا کر رکھا کہ کہیں مخالف قوتیں قیامِ پاکستان میں رخنہ نہ ڈال سکیں۔ انہوں نے اپنی ذات سے متعلق تمام رنجشیں بھلا کر اپنے مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ مضبوط دلائل کے ساتھ پاکستان کا مقدمہ لڑا، مسلمانوں کی توانائی کو صحیح سمت گامزن کر کے دنیا کے نقشے میں ایک نیا ملک پاکستان قائم کر کے دکھا دیا، جس نے مسلمانانِ برصغیر کی غلامی کو خودداری میں تبدیل کر کے ایسی تاریخ رقم کر دی جس کو اس کے بعد دہرایا نہ جا سکا اور اس کے باوجود کہ ہمارے قائد کے جلد رخصت ہونے کے باوجود، ہر قسم کے کرپٹ حکمرانوں کی طویل فہرست کے باوجود بھی آج وہ ایک ایٹمی قوت بن کر دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر کھڑا ہے۔

گزشتہ ہفتے عالمی میڈیا پر اینکر نے مجھ سے پاکستان میں ہونے والی کرپشن، سیاسی نارکی اور ابتری کے ذمہ داروں کے تعین اور ان کے احتساب کے متعلق کئی سوال جب پوچھے جو یقیناً زمینی حقائق کے مطابق بالکل کڑوے سچ کی طرح دل میں چھید کرتے چلے گئے لیکن اس کا ممکنہ جواب مزید تلخ ہو گا کہ میں یہ کیسے مان لوں کی ہم زمین میں بیج تو لیموں کا بوئیں اور امید میٹھے آم یا دیگر پھل کی لگا لیں۔ آپ اپنے گھر کے آنگن میں ایک پودا لگاتے ہیں، پانی دیتے ہیں اور اپنے ساتھ دیگر اردگرد کے افراد کو اس کی دیکھ بھال کی نصیحت بھی کرتے ہیں۔ میرے آقا نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: المؤمن مراۃ المؤمن ۔۔۔ کہ ایک مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے۔ بس اس آئینے میں دیکھ کر خود سے سوال کریں تو یقیناً جواب مل جائے گا کیونکہ آئینہ کی پہلی صفت تو یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا اور دیکھنے والے کو اس کے چہرے پر لگے سب داغ دھبوں کے متعلق سچ بتا دیتا ہے اور دعوت دیتا ہے کہ اپنے چہرے پر لگے ہوئے تمام داغ دھبوں کی صفائی کی نصیحت کرتا ہے اور دوسری صفت یہ ہے کہ بعد میں دیکھنے والے کو پہلے چہرہ کے متعلق کچھ نہیں بتاتا یعنی غیبت سے پاک ہوتا ہے۔ آج بطور پاکستانی اس آئینے میں دیکھ کر ایمانداری سے بتائیں کہ آپ نے قائد کے لگائے ہوئے پودے کے ساتھ کیا سلوک کیا ۔ یہ سوال پاکستان کے ہر شہری سے ہے کہ کہ اس باغ کے مالی قائداعظم موجود ہوتے تو کیا وہ افسردہ ہو کر اس مجرمانہ غفلت کی باز پرس نہ کرتے۔

قائد نے تو ہمیں یہ یقین دلایا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوری ملک ہو گا جس کا بنیادی مقصد ہر شہری کو اسلامی اصولوں کے مطابق انصاف ملے گا لیکن ورلڈ جسٹس پراجیکٹ کی رپورٹ میں پاکستانی عدالتی نظام کو قانون کی حکمرانی کی پابندی کرنے والے ممالک میں سب سے نچلے نمبر 139 ممالک میں 130 ویں نمبر پر کیوں ہے؟ ملک کے دولخت ہونے پر، طبقاتی منافرت پر، سیاسی منافقت پر، نام نہاد سیاسی مفاہمت پر، بڑھتی ہوئی لسانیت پر، معاشی تباہی پر، معاشرتی اقدار کی تباہی پر، اسلامی احیاء کی نفی پر، جمہوری انحطاط پر، سستے اور سہل انصاف کی عدم دستیابی پر، قول و فعل میں تضاد پر، ملکی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے پر، آئی پی پیز کے نام پر ملکی خزانے کے کھربوں روپے ڈکار جانے پر اور ان تمام لوٹ کھسوٹ اور ملک میں جاری ان افعال کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ان کو دوبارہ ایوان اقتدار تک پہنچانے پر اپنے کردار پر شرمندہ ہونے کی بجائے خاموش رہتے؟ اے روحِ قائد! ہم شرمندہ ہیں کیونکہ ہم سب ان افعال میں شریک ہیں۔

یقین کریں اگر قائد کچھ عرصہ مزید زندہ رہ جاتے تو وطن عزیز کو پہلا آئین بہت جلد مل جاتا، جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو جاتا، وڈیرے، سرمایہ دار اور فوجی ڈکٹیٹر اس ملک پر قابض نہ ہو پاتے، مافیاز کیلئے یہ زمین تنگ ہو جاتی، کرپشن کے دروازے کبھی نہ کھلتے، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم نہ ہو پاتا، خاندانی اور نسل در نسل سیاست پروان نہ چڑھتی، سفارش، رشوت اور اقرباء پروری کی لعنت جنم نہ لیتی، سرکاری ادارے سیاست زدہ نہ ہوتے، اشرافیہ اور مراعات یافتگان کا وجود بھی نہ ہوتا، پروٹوکول کے نام پر ملکی خزانے کو لوٹنے کا سلسلہ ختم ہو جاتا، اس بیدردی سے وطن عزیز کو لوٹنے والوں کو عبرت کا نشانہ بنا دیا جاتا اور بینکوں سے لئے گئے کھربوں روپے کے قرضے معاف نہ کروائے جاتے۔

ملک عالمی منظر نامے پر ایک بھکاری ملک کی بجائے مضبوط اور مستحکم ملک کے طور پر پہچانا جاتا۔ صد افسوس کہ آج ہم ایک بدترین دور سے گزر رہے ہیں ، ہم نے اس ملک کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، لالچ اور بددیانتی نے اس ملک کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے، من حیث القوم ہم سبھی اس ملک اور قوم کے مجرم ہیں ، ہم نے قائد اور اقبال کے ملک کی قدر نہیں کی۔ کیا ہم برصغیر پاک و ہند میں مغل حکمرانوں کے زوال کے اسباب سے واقف نہیں ہیں کہ آج ہم میں وہ تمام عادات اور طور طریقے پائے جاتے ہیں جن کی بناء پر برِصغیر کے مسلمان حکمران تباہ و برباد ہوئے تھے۔

معروف امریکی اسکالر پروفیسر والپرٹ ہندوستان کی تاریخ پر دسترس رکھنے والے ماہرین میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ پروفیسر والپرٹ نے 1984ء میں جناح کی سوانح حیات میں تحریر کرتے ہیں: "کچھ لوگ تاریخ کے دھارے کو تبدیل کر دیتے ہیں، جبکہ ان میں سے بھی کچھ دنیا کے نقشے کو بدل دیتے ہیں۔ ان میں بہت کم لوگ ہی نئی قومیت پر ملک تعمیر کرتے ہیں، اور جناح نے یہ تینوں کام کر دکھائے۔ قائد اعظم نے تن تنہا مخالفین کا سامنا کیا، علالت کی بھنک بھی نہ پڑنے دی، تاکہ حصولِ منزل کے سفر میں کوئی رکاوٹ نہ پیش آئے"۔

قائد نے اپنے حصے کا چراغ جلا دیا، اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم قائد کے اصول ایمان، اتحاد اور تنظیمِ محکم کو اپنی زندگی میں داخل کریں اور قائد کے ایک معتدل اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کے خواب کو شرمندہ تعبیر کریں۔ اگر اس فانی زندگی میں کامیابی چاہتے ہیں تو بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکالنے کیلئے اللہ کی غلامی اختیار کر لیں۔

بروز سوموار 15 صفر المظفر 1446ھ 19 / اگست 2024ء

پھندہ منتظر ہے!

اگر آپ کو یاد ہو تو ماضی قریب میں سیاست کے میدان میں قدم رکھنے والی مقتدر شخصیات کے چند ہونہار، نونہال آج نہ صرف ارب پتی ہیں بلکہ کھلے بندوں اپنی بیش بہا دولت کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کتنے ہی اعلیٰ عہدوں پر فائز سرکاری افسر، سیاستدان اور ٹیکنو کریٹ بیرونی ممالک میں دادِ عیش دے رہے ہیں حالانکہ ان میں سے کئی ایک کے خلاف بھاری رشوت اور سنگین بدعنوانی کے مقدمات زیرِ التوا تھے، جن کی پہلے این آر او کے تحت گلو خلاصی ہوئی، بعد ازاں سیاسی جوڑ توڑ کے قوم کی تقدیر سنوارنے کا نعرہ لیکر حکومت میں آئے تو سب سے پہلے قانون سازی کر کے اپنے مقدمات سے گلو خلاصی کروا کے دودھ میں دھلے بن کر ایک مرتبہ پھر قوم کے نہ صرف خادم بن گئے بلکہ جن پر قومی دولت کے کھربوں روپے لوٹنے کا الزام روپے لوٹنے کا الزام تھا، ان کو باقاعدہ ایوان صدر بلا کر عزت کی خلعت پہنا کر اور گلے میں پاکستان کی اعلیٰ خدمت کا میڈل پہنا کر قوم کے ساتھ کھلواڑ کرنے میں بھی شرم محسوس نہیں کی۔ یہ وہ مقدر کے سکندر بھیڑئے ہیں جو بھیڑ کی کھال پہن کر دوبارہ مملکتِ خداداد کی قسمت کے مالک بن گئے ہیں۔

کے ان میں کچھ تو ایسے تھے جو مملکتِ خداداد پاکستان کے مالیاتی شعبے کے نگران بھی تھے اور پالیسی ساز بھی، جب تک ہوا کا رخ موافق رہا وہ سیاہ و سفید بیٹھے، ملک مالک بنے رہے۔ ان کو اپنا اور ان مہربانوں کا مفاد، جن کے وہ ممنونِ احسان تھے، اس قدر عزیز تھا کہ ستم رسیدہ عوام کی بھلائی کا خیال تک بھلا تو کیا، آنے والی نسلوں تک کو گروی رکھتے گئے۔ اشرافیہ کو عیش و عشرت کی لت ڈال گئے۔ ہمارے عظیم دوست چین کے عظیم ترین انقلابی قائد ماؤزے تنگ اور چو این لائی نے سادگی کو اپنایا، وہ اور ان کے ساتھی سختیاں جھیلتے رہے، جن اصولوں پر قائدین خود کاربند ہوں، عوام کیلئے ان کو دل و جان سے قبول کرنا اور ان پر بخوشی عمل کرنا نہائت آسان ہو جاتا ہے۔ انقلاب کے بعد پہلی نسل کی قربانیاں رنگ لائیں اور چین اب دنیا کا ایک عظیم ترین ملک بن گیا ہے اور ہم ہاتھ میں کشکول لئے پھرتے ہیں کوئی پوچھتا نہیں۔

امریکا کی بارگاہ میں سربسجود ہیں، جس کے منشی اور کارندے حکم چلاتے ہیں اور ہم بلاچوں چرا ان حکم بجالاتے ہیں۔ ستم بالائے ستم ان کارندوں میں سے بہت سے ہمارا ہی کھاتے ہیں اور خوب کھاتے ہیں مانگ تانگ کے۔ کئی دفعہ ناک کی لکیریں کھینچ کر، جو قرضہ ہم غیر ممالک یا مالیاتی اداروں سے لیتے ہیں، اس میں سے یہ "فرشتے" مشاورت اور خدمات کے نام پر بہت کچھ ہتھیا لے جاتے ہیں۔ "مالِ غنیمت" میں سے کچھ سکے وہ "مقامی ہم جولیوں" کی جھولی میں بھی ڈال دیتے ہیں تاکہ نہ صرف اصل کھیل پردوں کے پیچھے چھپا رہے بلکہ سنہری کلغیوں والے مرغانِ چمن بہار کے گیت اس وقت تک گاتے رہیں جب تک حکومت نہ بدل جائے۔

راگ حکومت بدلتے ہی یہ موسمی مینڈک تھوڑی دیر کیلئے اس طرح خاموش ہو جائیں گے جیسے دلدل میں گھس گئے ہوں مگر جلد ہی پھر نکل آئیں گے۔ پھر شروع ہو گا مگر سُر تال پہلے سے مختلف۔ اب خانہ بربادی کا ذکر ہو گا، ستیاناس اور بربادی کے ایسے قصے سنائیں جائیں گے کہ سننے والا توبہ توبہ کا ورد کرتے کانوں کو ہاتھ لگائے اور سوچے کہ یہ حسین ملک کتنا بدقسمت ہے کہ اس میں بھیڑیئے نہ صرف دندناتے پھرتے ہیں بلکہ ان میں سے کئی ایک اعلیٰ مقامات تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ طالع آزما ایسی چکنی مٹی سے بنے ہوتے ہیں کہ عوام کے اعتماد کی مقدس امانت بھی ان کی گھٹی میں پڑے حرص و ہوس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، نہ صرف پوری ڈھٹائی سے وہ موقع ملتے ہی کھیل کھیلتے ہیں بلکہ اپنی "جرأت و بہادری" پر فخر کرتے ہیں۔ بعد میں پکڑے جائیں تو بھی اپنے کئے پر نادم ہونے کی بجائے یوں سینہ تان کر اپنا دفاع کرتے ہیں کہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کو بھی یہ کہنا پڑ جاتا ہے کہ "کرپٹ عناصر شرمندہ نہیں بلکہ وہ

اکڑ کر بڑے فخر کے ساتھ چلتے ہیں..... ان سے کئی کئی ملین ڈالر عدالتوں کے حکم پر حکومت نے وصول بھی کئے، اس کے باوجود وہ گالف کھیل رہے ہیں ، معاشرہ کو ان سے الگ تھلگ رہنا چاہئے اور ان کا بائیکاٹ کرنا چاہئے۔ "لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ کرپشن کی یہ موذی بیماری تو ان طبیبوں کے گھروں میں بھی ڈیرہ بسائے بیٹھی ہے جو اس کا علاج تجویز کر رہے ہیں۔

خطا تو معاشرہ کی بھی ہے۔ اچھائی برائی میں تمیز کمزور پڑ جائے، عجز وانکسار کمزوری کی علامت تصور ہونے لگے، برائی سے بچنا بزدلی ٹھہرے اور چور ڈاکو رہزن کیلئے دلوں سے نفرت مٹ جائے تو کیوں نہ بھیڑیئے بھیڑوں کے گلے کے نگہبان کا کردار ادا کریں۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ انسان کی سرشت میں مضمر ہے کہ ہر انسان دل کی گہرائیوں میں نہ صرف نیکی اور بدی کا واضح احساس رکھتا ہے بلکہ وہ برائی کے خلاف جدوجہد کے جذبہ سے بھی عاری نہیں۔ حالات کا جبر البتہ اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ روزمرہ مشاہدہ اسے واضح اشارے دیتا ہے کہ خواہ مخواہ "پنگا" لینا سراسر حماقت ہے۔ جو سر پھرے پرائی آگ میں کود پڑتے ہیں ان کے نہ صرف پاؤں جھلس جاتے ہیں، بعض اوقات یہ تن سوزی انہیں عالمِ نزع سے عدم کی منزل تک لے جاتی ہے۔

عقلمندی، انہیں ناانصافی، ظلم اور بے رحمی سے نبرد آزما ہونے کی بجائے خاموش رہنے اور بہت کچھ "پی جانے" کی ترغیب دیتی ہے، یوں ان کی قوتِ برداشت کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے جس سے برخود غلط ظالموں کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ وہ چنگیز خان کے لشکریوں کی طرح ہر مرغزار پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے طوفان کے سامنے نہ صرف نہتے اور بے بس عوام کی طاقت جواب دے جاتی ہے بلکہ انسانیت کی روح تک ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ آٹھوں پہر گردش کرنے والا آسمان پھر عجیب و غریب منظر دیکھتا ہے۔ مفتوحہ شہر میں ایک ممتاز شہری کسی غیر مسلح تاتاری کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، اسے وہی لیٹ جانے کا حکم ہوتا ہے جس کی بلاچوں چراں تعمیل ہوتی ہے۔ تاتاری یہ کہہ کر "یہیں لیٹے رہنا جب تک میں کیمپ سے تلوار لا کر تمہارا گلہ نہ کاٹ دوں" چلا جاتا ہے۔ معزز شہری بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے، نہ اسے فرار کا خیال آتا ہے، نہ جان بچانے کی سوجھتی ہے۔ کافی دیر کے بعد تاتاری آتا ہے، اس کا گلہ کاٹ دیتا ہے۔

حد سے بڑھ جانے والی سفاکی غلامی کو جنم دیتی ہے۔ کوئی بھی خواہ مخواہ گردن کٹوانا نہیں چاہتا۔ نہتے انسانوں کا جمِ غفیر توپ و تفنگ سے مسلح لشکر کے سامنے کیسے ٹھہر سکتا ہے، خصوصاً جب قتلِ عام کا اذن ہو چکا ہو یا ہو سکتا ہو۔ ہلاکو خان نے اہلِ بغداد کو تہ تیغ کیا تو دریا کا پانی گلرنگ ہو گیا، نادر شاہ نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ گلیوں میں انسانی خون بارش کے پانی کی طرح بہنے لگا۔ 1857ء میں بار بار اجڑنے والی دلی کو پھر ویسا ہی المیہ پیش آیا۔ شہزادگان کی لاشیں کئی دن درختوں سے لٹکتی رہیں، ناز و نعمت میں پلے بڑھے کتنے ہی اہلِ ثروت خون کی ہولی کی بھینٹ چڑھ گئے، جو بچ رہے وہ فاتحین کی قدم بوسی کو بڑھے۔ اپنی وفاداری کا یقین دلانے کیلئے ایڑھی چوٹی کا زور لگایا، تابعداری کو شرطِ استواری سے یوں سنوارا کہ وہ اصل ایمان ٹھہری۔

جسٹس مرحوم رستم کیانی نے 1959ء میں دیئے گئے خطبہ یومِ اقبال میں ایک شوریدہ سر شاعر کے اس شعر کا حوالہ دیا تھا:

دیکھتا کیا ہے میرے منہ کی طرف

قائداعظم کا پاکستان دیکھ

جسٹس مرحوم رستم کیانی اس وقت حکومت کے قانونی مشیر تھے۔ ان سے رائے طلب کی گئی تھی کہ اس پر کون سی دفعہ لگتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ "خدا کے بندو! وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتے ہو، پاکستان کی طرف دیکھو، کیا یہ وہی ملک ہے جو قائداعظم نے تراشا تھا".....اب تو غالباً روحِ پاکستان بھی اپنے "جانثاروں" سے یہ سوال کرتی ہو گی۔ کیا ہم سے کوئی جواب بن پاتا ہے؟ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے زندگی کے کسی لمحے میں بھی یہ سوچنے یا معلوم کرنے کی زحمت بھی گوارہ کی کہ مملکتِ خداداد پاکستان کیونکر صفحہ ہستی پر نمودار ہوا؟ بانیانِ پاکستان کے خواب کیا تھے؟ آرزوئیں، تمنائیں اور آدرش کیا تھے؟ بابائے قوم نے کیا سوچا تھا، کیا چاہا تھا، کون سی منزل متعین کی تھی؟ کیسے وہاں تک پہنچنا تھا؟ وہ منزل کن اندھیروں میں کھو گئی، نشانِ منزل بھی کوئی دکھائی پڑتا ہے یا نہیں؟ تاریخ گواہ ہے کہ آزادی تو کبھی بھی التجاؤں اور درخواستوں سے نہیں ملی۔

صحرائے سینا میں 40 سال تک بھٹکنے کے بعد حضرت موسیٰ کی قوم کو بھی بالآخر منزل مل گئی تھی۔ احساسِ زیاں اگر دامن گیر ہو جائے تو کیا خبر ہم بھی گم گشتہ راہوں کو از سرِ نو پالیں۔ اپنی اپنی ذات کی قید سے آزاد ہو جائیں۔ ذاتی مفاد کو ہی زندگی کا واحد مقصد سمجھنا ترک کر دیں۔ ملک و قوم کی فلاح و بہبود کو نہ صرف اپنا فرض سمجھیں بلکہ اس کیلئے تھوڑی بہت قربانی دینے کیلئے تیار ہو جائیں۔ کیا وہ ایک نئی صبح نہیں ہو گی جب ہم میں سے کئی ایک دیوانے سچ کو برملا سچ کہنے سے نہیں ہچکچائیں گے۔ کتنا ہی خوشگوار اجالا ہو گا جب جماعتی وفاداریوں سے بالاتر ہو کر، یاری دوست اور برادری کی زنجیروں سے آزاد ہو کر ہمارے اربابِ اختیار حق و انصاف کے تقاضے پورے کریں گے، قائد کے حسین چہرہ پر جمی گرد جھڑنے لگے گی۔ پہلی مرتبہ ایسا احتساب شروع ہوا ہے۔ ایک کڑا امتحان ہے اور قوم بھی ہاتھوں میں پھندہ لئے منتظر ہے۔ دیکھیں کون کون جھولتا ہے!

بروز جمعرات 18 صفر المظفر 1446ھ 22/ اگست 2024ء

پاکستان منزل یا نشانِ منزل

ہم اس معجزے سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں کہ پاکستان، نزولِ قرآن، لیلتہ القدر کی بابرکت ساعتوں میں 27 رمضان المبارک 1366ھ بمطابق 14 / اگست 1947ء کو وجود میں آیا اور یقیناً یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا مسلمانانِ برِعظیم کیلئے ایک عظیم تحفہ سے کم نہیں، یوں یہ معجزاتی مملکتِ خداداد کہلائی۔ ریاستِ مدینہ کے بعد یہ دوسری اسلامی نظریاتی مملکت معرضِ وجود میں آئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن کی سیرت کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شر انگیزی کیوں کی جارہی ہے اور یہ پروپیگنڈہ کیوں ہورہا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت پر مبنی نہیں ہوگا۔ پاکستان میں اسلامی اصول اس طرح نافذ العمل ہیں جیسے 1300 سال قبل نافذ ہوئے تھے۔" بانی پاکستان کا اشارہ واضح طور پر ریاستِ مدینہ کی طرف ہے۔

میں قیامِ پاکستان کا پس منظر ہندو کانگریس اور برطانوی سامراج کی مسلم دشمنی کا برِعظیم میں ایک ناپاک گٹھ جوڑ اور بھیانک و سیاہ باب پر مبنی ہے۔ 1946ء لندن کانفرنس کے دوران ہی ایک بڑی سازش کے تحت جواہر لال نہرو کے دیرینہ دوست لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا گورنر جنرل مقرر ہونا، اس سازش میں شریک کرشنا مینن ایک شدت پسند کمیونسٹ لیڈر جس نے بستر مرگ سے اس سازش کا انکشاف کیا۔ اس نے "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" کے مصنف ابوالکالم آزاد کے سامنے یہ راز بھی افشاء کیا کہ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل مقرر کرانے کی جو کامیاب کاوش ہوئی، اس میں یہ بھی طے پایا تھا کہ یہ راز مسلمانانِ ہند کو معلوم نہ ہونے پائے، ورنہ ماؤنٹ بیٹن کی افادیت ختم ہو جائے گی۔ واقعی راز فاش نہ ہوا، قائداعظم اور لیاقت علی خان کانفرنس کے سلسلے میں برِعظیم کو وہاں موجود تھے، انہیں بھی اس ناپاک سازش کی بھنک تک نہ پڑی۔

ماؤنٹ بیٹن نے برطانوی وزیراعظم ایٹلی کی ہدائت کے مطابق پہلے سر توڑ کوشش کی کہ برِعظیم تقسیم نہ ہونے پائے۔ مسلم لیگ کا سربراہ اور مسلمانانِ برِعظیم کا قائداعظم محمد علی جناح متحدہ برِعظیم کے فلسفے کے خلاف ہمت، شجاعت، حوصلہ اور عزم کی چٹان بن گیا اور دونوں مسلم دشمن سامراجیوں کو جھکنا پڑا۔ تقسیم کا فیصلہ ہوا لیکن اس کے پردے میں وہ سب کچھ کیا جو بقول قائداعظم "دشمن چاہتا ہے کہ پاکستان بنتے ہی گائب (غائب) ہو جائے"۔ قائداعظم کے اس وجدان کا ثبوت راقم نے لندن میں دارلعوام کی ڈیبٹ رجسٹر میں دیکھا جس میں وزیراعظم برطانیہ ایٹلی نے "انڈیا انڈیپینڈنٹ بل" پر تقریر میں یوں کہا کہ "برِعظیم کو دو ممالک میں تقسیم کرنا ایک عارضی عمل ہے، بہت جلد دونوں "دونیشن" ایک بڑی ڈومینئن میں متحد ہو کر "کامن ویلتھ" میں شریک ہو جائیں گی۔" (کالم 1246)۔ اس وقت کے حزبِ اختلاف کے رہنماء میکڈونلڈ نے بھی غیر معمولی طور پر وزیراعظم سے متفق ہو کر کہا کہ "انڈیا انڈیپینڈنٹ بل میں ایسے جراثیم پائے جاتے ہیں کہ یہ دونوں ممالک زیادہ دیر تک علیحدہ نہ رہیں گے۔" (کالم 1242)"

برِعظیم کی آزادی کیلئے دارلعوام میں 30 جون 1948ء تک کی مدت طے پائی تھی، ماؤنٹ بیٹن نے اس مدت کو مختصر کر کے جلد از جلد آزادی دینے کا فیصلہ کیا۔ برِعظیم کی تقسیم کی خفت کی وجہ سے جلد بازی اس لئے کی کہ پاکستان سنبھل نہ پائے۔ قائداعظم نے اس جلد بازی کی سخت ترین مخالفت کی اور دارلعوام کے فیصلے کی مدت پر قائم رہنے کیلئے زور دیا۔ کسے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ برِعظیم کے مسلمانوں کیلئے کیا عظیم تحفہ دینا چاہتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی ذاتی خوشی کیلئے برطانوی اور برِعظیم کے لیڈروں سے بغیر صلاح و مشورہ کے 15 / اگست 1947ء کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ یہ تاریخ وائسرے ہند لارڈ

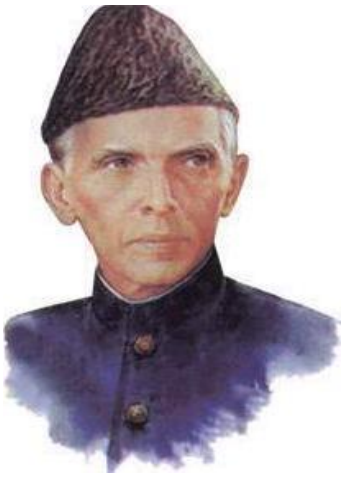

ماؤنٹ بیٹن کی زندگی میں بڑی خوشی کا دن تھا جب وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن جنگِ عظیم دوم کے دوران برما محاذ کا کمانڈر تھا' اسی تاریخ کو جاپان نے ہتھیار ڈالے تھے۔

برعظیم کی آزادی اس سرنڈر کی دوسری سالگرہ کے موقع پر دینا ایک اور تاریخی کامیابی قرار دے کر تاریخ میں خوش قسمتوں میں اپنا نام لکھوانا مقصود تھا۔ اسے کیا معلوم کہ قائداعظم کی مخالفت کی تو پرواہ نہ کی لیکن ہندو راشٹر کے اصل حکمراں جوتشی اور ستارہ شناسوں کی مخالفت کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑیں گے۔ جوتشیوں نے 15/اگست کو "منحوس" قرار دیدیا۔ ہندو رہنما تو خاموش رہے لیکن اس طاقتور طبقہ نے طوفان برپا کر دیا اور بزدل اور مکار وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس مخالف مہم سے بوکھلا گیا۔ اس کی بوکھلاہٹ تب کم ہوئی جب جوتشیوں نے 14/اگست کو "مبارک" قرار دیا۔ بزدل اور مکار وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سیلاب کو روکنے کیلئے اپنی خواہش کو برقرار رکھتے ہوئے اور جوتشیوں کو بھی تسلی بخش طریقہ بتا کر بڑی چالاکی سے نئی تاریخ یوں پیش کی کہ آزادی کی تاریخ "منحوس" کو "مبارک" دن کے قریب ترین آدھی رات 14 اور 15 کی درمیانی شب بارہ بجے متعین کر دیا۔ ہندو جوتشیوں نے ٹھیک 12 بجے پوجا پاٹ کے دوران بجانے والا "سنکھ" بجا کر آزادی کے حصول کا مضحکہ طریقہ اپنایا حالانکہ قانون ساز اسمبلی کو اقتدار 15/اگست کو ہی منتقل کیا گیا اور دوسری طرف پاکستان کو پہلے ہی 14/اگست کو اقتدار اسمبلی کو منتقل کر دیا گیا تھا۔

یہی انسانی مشقیں ہوئیں اور مسلم دشمن بزدل اور مکار وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن خود ہی اس ساعت کی طرف کھنچ کر آگیا جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ یوں 14 اور 15 اگست کی درمیانی رات 27 رمضان المبارک کا آغاز 14 اگست کو مغرب غروبِ آفتاب سے شروع ہوا۔ اسی رات نزولِ قرآن اور لیلتہ القدر کی مبارک ساعتیں آن پہنچیں اور وہی ہوا جو منظورِ خدا تھا۔ انہی بابرکت ساعتوں میں پاکستان عالمِ وجود میں آگیا اور مملکتِ خداداد کہلایا۔ 14/1947ء قیامِ پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ اسی کے مطابق ہے جو ہجری سال 1366 میں 27 رمضان المبارک کو ظہور پذیر ہوا۔ اس کی دینی فضیلت تو عالمِ اسلام میں نمایاں ہے اور اس کی ملی اہمیت بھی بہت اہم ہے۔ 27 رمضان المبارک کے حوالے سے قیامِ پاکستان کی اہمیت کو نئی نسل تک روشناس کرانے اور اس پر عمل کرنے کیلئے قومی سطح پر جنگی بنیادوں پر لائحہ عمل تیار کرنے کی جو اشد ضرورت تھی، قائداعظم کے جلد انتقال کے بعد ہمارے بے عمل اور لالچی حکمرانوں نے اس پر بھرپور توجہ نہیں دی لیکن میرا وجدان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اب بھی اگر قدرت کی طرف سے عنائت کردہ اس معجزہ نما ریاست کیلئے ایسی منصوبہ بندی کی جائے جس کا ہم نے اپنے پروردگار سے وعدہ کیا تھا تو ہم یقیناً اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔

بقول قائداعظم "پاکستان منزل نہیں بلکہ منزلِ مقصود کا وسیلہ ہے۔" پاکستان اسلام کا قلعہ ہے" اور یہ قلعہ اس وقت اسلام دشمن قوتوں کی گولہ باری کی شدید زد میں ہے۔ اسے محفوظ کرنے کیلئے عوام جو طاقت کا سرچشمہ ہیں انہیں واپس انہی اصولوں کی طرف لوٹنا پڑے گا جس کا ربِ کریم نے حکم دے رکھا ہے۔ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں دینا ہوگا اور اس کیلئے قرآن و سنت کے سرچشمے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ جس دن ہم اس مغربی جمہوریت کے فریب سے نکل کر صرف قرآن و سنت کو اپنا آئین مان کر اپنی زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کر لیا اور محمد عربی ﷺ کو اپنا رہبر مان لیا تو یہ قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار کی طرح کامیابی و کامرانی کے تمام مدارج طے کر لے گی۔ اب بھی وقت ہے، دوست دشمن کی تمیز میں فرق

کرنا ہو گا۔ کچھ نہیں بچے گا، صرف میرے رب کا نام جو حی القیوم ہے اور جس نے اس دنیا کے نقشے پر پاکستان کو حقیقت بنایا۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو آمین۔

اک سوال کے اندر ہم نے کاٹی نصف صدی
باندھے لاکھوں حساب
غلط ہی نکلا ہر اک حل کا لیکن انت جواب
ضرب جمع تفریق کے سارے کلئے برت لئے
از روئے تحقیق
ہر کوشش میں ہو جاتا ہے کچھ نہ کچھ تفریق
دیکھ تو کتنا اونچا ہے یہ ردّی کا انبار
تو ہی اب کچھ رحمت کر اے ربِّ غفار

بروز ہفتہ 20 صفر المظفر 1446ھ 24/ اگست 2024ء

مصور پاکستان اور ہم!

علامہ اقبال کا کلام انسانی فکر و عمل کی تاریخ کا نہائت دقیق تجزیہ ہے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی بصیرت کی بناء پر تاریخی حوادث سے متعدد دور س نتائج اخذ کئے، بعض وہ نتائج بھی جو ابھی رونما نہیں ہوئے تھے۔ ان کا یہ شعر مبنی بر حقیقت ہے:

حادثہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

عمل کی بر صغیر کے مسلمانوں کی تاریخ پر اقبال نے خصوصیت کے ساتھ توجہ دی، انہوں نے دیکھا کہ یہ وسیع و عریض خطہ مدت تک مسلمانوں کے فکر و عظیم جولانگاہ بنا رہا اور انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک عظیم الشان اسلامی معاشرہ تشکیل کیا جس کے برجستہ تمدنی نقوش ناقابلِ محو ہیں۔ مسلمان یہاں اگرچہ دوسری اقوام کی نسبت تعداد میں کم اور مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے لیکن عقیدۂ توحید نے انہیں ہمیشہ اسلام کے رشتہ وحدت میں منسلک رکھا۔ متعدد مسلمان خاندانوں نے یہاں ایک ہزار سال تک حکومت کی، ان میں غزنوی، غوری، خلجی، تغلقی، لودھی اور مغل خاندان زیادہ معروف ہیں۔ یہ حکومتیں اگرچہ مذکورہ خاندانوں کے نام سے منسوب تھیں لیکن چونکہ وہ اسلامی اصولوں کی اساس پر استوار کی گئیں اور اسلامی اقدار کی حفاظت اور نشر واشاعت کیلئے کوشاں رہیں، اس لئے انہیں اسلامی حکومتوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے حکمران مسلمان تھے اور دین اسلام کو اپنی حکومت کا تشخص اور طرۂ امتیاز قرار دیتے تھے۔ وہ اپنی قائم کردہ عدالتوں میں اسلامی قوانین رائج کرتے، مدرسوں اور مساجد کی تاسیس کرتے اور ان میں اسلامی تعلیمات و روایات اور مسلمانوں کی زبان وادب کو فروغ دیتے، اکثر سلاطینِ وقت صوفیاء اور علماء کی عزت و تکریم کرتے اور ان سے ہدایات حاصل کرتے، صوفیاء ہمیشہ سلاطین کو رعایا کے ساتھ عدل واحسان کی تلقین فرماتے۔

محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی نے مسلمانوں کیلئے ہندوستان کے دروازے کھول دیئے، محمود غزنوی نے دہلی کو مسلم حکومت کا دارلسلطنت قرار دیا۔ تمام مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنی حکومت کی شناخت دین اسلام کو قرار دیا اور ہر ایک نے اپنے آپ کو دین کے مبلغ و محافظ اور اس کی عظمت کے مظاہر و موید کے طور پر ملقب کیا، اس حوالے سے اکثر سلاطین کے القاب قابل ملاحظہ ہوں مثلاً معزالدین غوری، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، رکن الدین فیروز شاہ، غیاث الدین بلبن، علاؤالدین محمد شاہ، ظہیر الدین بابر، نصیر الدین ہمایوں، جلال الدین اکبر، نورالدین جہانگیر، شہاب الدین شاہجہان اور محی الدین اورنگزیب عالمگیر وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین تخت نشینی کے وقت یہ اصرار کرتے تھے کہ وہ دین سلام کے تحفظ اور ترویج میں ہمیشہ کوشاں رہیں گے۔ اگر احیاناً کوئی بادشاہ دینی امور کی اشاعت میں کچھ کوتاہی کرتا تو صوفیاء اور علماء اسے متنبہ کرتے اور اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش کرتے۔ صوفیاء میں نظام الدین اولیائ، بہاؤالدین ذکریا، شرف الدین بو علی قلندر، جلال الدین بخاری، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ سلاطین وقت کو اسلامی احکام کی تعمیل کی تاکید فرماتے رہے۔

بر صغیر کی تاریخ سے متعلق جن عظیم حکمرانوں کو علامہ اقبال نے خراجِ تحسین ادا کیا ان میں محمود غزنوی، اورنگ زیب عالمگیر، احمد شاہ ابدالی اور ٹیپو سلطان خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ اشخاص ہیں جنہوں نے پرچم توحید کو ہمیشہ بلند رکھا اور باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اٹھارویں صدی

میں جب مسلمانوں کا عظیم الشان معاشرہ بادشاہوں اور امیروں کی اخلاقی بے راہروی کی بناء پر فتنہ و فساد اور انتشار کا شکار ہوا تو اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی بیداری میں سر سید احمد خاں، شبلی نعمانی، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی اور سب سے بڑھ کر علامہ اقبال نے نہائت اہم کردار ادا کیا۔ علامہ اقبال نے ہندو قوم کے تاریخی کردار اور اس کے عصری خطرناک عزائم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے دین و مذہب، جان و مال اور تہذیب و تمدن کی حفاظت کیلئے اپنی فکری اور عملی توانائیاں وقف کر دیں، انہوں نے فرمایا:

"آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے، ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک مین فنا ہو جائے"۔ علامہ اقبال نے برصغیر میں مسلمانوں کیلئے ایک آزاد مملکت کا تصور ہزار سالہ اسلامی تمدن کی حفاظت اور بقاء کیلئے پیش کیا، ان کے نزدیک مذہب قوت کے بغیر محض ایک فلسفہ ہے۔ انہوں نے فرمایا "اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام ایک تمدنی قوت کے طور پر زندہ رہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرے"۔

علامہ اقبال اسلام کے بغیر مسلمان کی زندگی کا تصور بھی نہیں کرتے تھے، وہ مسلمانوں کی آزادی کی حفاظت صرف نفاذِ اسلام کیلئے چاہتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاست سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں جیسا کہ آج کے قوم پرستوں کے رویئے سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی بھی کامیاب نہ ہونگے"۔ ہماری تاریخِ ادب میں علامہ اقبال آزادیٔ وطن کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اس حوالے سے ان کے سازِ سخن کے نغمات حریت و استقلال ہیں لیکن وہ اسلام کے بغیر آزادیٔ وطن کا تصور بھی نہ کرتے تھے۔ انہوں نے بڑے غیورانہ لہجے میں فرمایا:

"اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا دار لکفر ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بھی بدترین ہو جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے"۔ علامہ اقبال نے برصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کی تشکیل کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ شریعت اسلامی کا نفاذ ہو سکے تاکہ اس کے نتیجے میں ہر شخص کو معاش کی ضمانت مل سکے۔ اس بارے میں انہوں نے قائداعظم کے نام خط میں لکھا..... "شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک آزاد اسلامی ریاست یا چند ایسی ریاستوں کی عدم موجودگی میں اسلامی شریعت اسلامیہ کا نفاذ اس ملک میں محال ہے"۔

انہوں نے مسلمانوں پر واضح کیا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو ترک کر کے اسلامی قومیت کو اپنی شناخت بنائیں کیونکہ اسلام ہی انہیں موجودہ تباہ کن حالات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں پر اسلام کے احساناتِ عظیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق اور منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیّز اور معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے"۔

حکیم الامت کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا، یہ ہے کہ انہوں نے ہندی قومیت کے تصور کی مکمل نفی کی اور مسلمانوں میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا۔ اقبالجغرافیائی وطن پرستی کے سخت مخالف تھے کیونکہ یہ ان کے نزدیک وحدتِ ملی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، انہوں

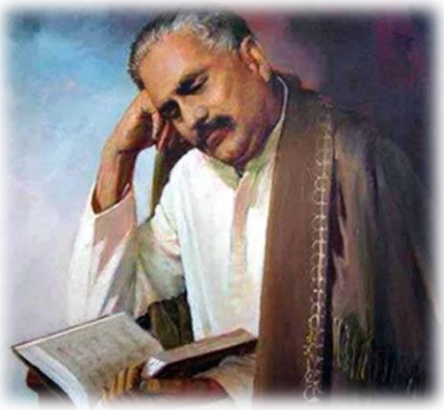

نے اسلام کو زندگی بخش قوت قرار دیتے ہوئے فرمایا "اسلام ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی حیثیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے"۔ اسلام بحیثیت مذہب کے دین و سیاست کا جامع ہے، یہاں تک کہ ایک پہلو سے دوسرا پہلو کا جدا کرنا حقائق اسلامیہ کا خون کرنا ہے۔

اقبال کیلئے اسلام ہی مسلمان کی زندگی ہے، کوئی مسلمان اسلام سے باہر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ انہوں نے فرمایا: "اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے"۔ رسالتِ محمدیہ کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "ہمارے عقیدے کے مطابق بحیثیت مذہب کے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بذریعہ وحی نازل کیا لیکن ایک معاشرت یا ملت کے طور پر اسلام کا وجود کلیتاً رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کا رہینِ منت ہے"۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

۱۹۱۹ء میں ایک خط میں لکھا: "خدا کی راہ میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہئے تھا اور زندگی تمام و مکمل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بسر ہونی چاہئے تھی"۔

اقبال اسلام کے ابدی حقائق پر محکم ایمان رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اسلام کی تفسیر و توضیح میں صرف کی تاکہ مسلمان عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس کی لامتناہی برکات سے مستفیض ہوں۔ حضرت علامہ کے نزدیک اسلام ہی مسلمانوں کا بہترین مدافع اور محافظ ہے۔ اسلام مسلمانوں سے اپنے تحفظ کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ انہیں تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ مسلمانوں کے ملک و ملت اور جان و مال کی حفاظت صرف اسلام سے وابستگی میں ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ آڑے وقت میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی"۔ اس دین کی حقانیت اور اہمیت کے بارے میں رقمطراز ہیں: "میری طلب و جستجو صرف اس بات پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات مٹا دینا ہے"۔

اسلام تمام نوعِ انسانی کے حقوق کا احترام کرتا ہے۔ اس دین میں اسود و احمر، عربی اور عجم اور بندہ و آقا کی تمیز کچھ حکم نہیں رکھتی۔ اقبال اس جاہلانہ تصور

کو سختی سے مسترد کرتے ہیں کہ اسلام کو معاشرتی حیثیت سے نکال کر شخصی ضابطہ بنادیا جائے۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء کے تاریخی خطبے میں فرمایا: "کیا آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم عجمی اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کے بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہ رہتا ہو..... اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے الگ نہیں، دونوں ایک

☆ اسلام بحیثیت دین، مذہب اور سیاست کا مجموعہ ہے دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کو ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کیلئے بھی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کیلئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصولی اتحاد کے منافی ہو"۔

حضرتِ علامہ کے نزدیک اسلام ہی عالمِ انسانیت کیلئے فلاح اور امن کا دستور ہے، اسلام ایک سوشل نظام ہے جو حریت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے اور اس وقت احترامِ انسانی کیلئے سب سے بڑی نعمت ہے۔ اسلام کا مطالبہ وفاداری صرف خدا کیلئے ہے، تخت و تاج کیلئے نہیں اور چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ تمام زندگی کی روحانی اساس ہے اس لئے اس کی اطاعت کا دراصل مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ہی فطرتِ صحیحہ کی اطاعت کرتا ہے۔

حضرتِ اقبال کے نزدیک "اسلام" ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہو گی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ حضرتِ علامہ نے مسلمانوں کے تاریک ترین ایام میں اپنی قوتِ ایمانی سے فرمایا:

"دنیا میں کارفرما قوتیں اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں لیکن "لیظہرہ علی الدین کلہ" کے دعویٰ پر میرا ایمان ہے کہ انجام کار اسلام کی قوتیں" کامیاب اور فائز ہوں گی"۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ وطن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

حضرتِ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کیلئے جو راستہ دکھایا، قائداعظم مسلمانوں کے قافلے کو لیکر اس پر چل پڑے اور بہت قلیل عرصے میں منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے یعنی پاکستان..... اسلام کا پاکستان، ہمیشہ زندہ رہنے والا پاکستان۔ قائداعظم نے علامہ اقبال کو خراجِ تحسین ادا

کرتے ہوئے فرمایا: "اقبال سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا، میں نے ان سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی کسی کو نہیں دیکھا۔ اقبال اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ ہے" اور بلاشبہ اسلام ہمیشہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

بروز سوموار 22 صفر المظفر 1446ھ 26/ اگست 2024ء

مدبر اقبال کا تدبر

برصغیر کی تقسیم جیسی زمینی حقیقت کے بعد اب تاریخ کو جھٹلانے یا ان حقیقی خاکوں میں جھوٹ و بدنیتی کا رنگ بھر کر تاریخی واقعات کی شکل بگاڑ کر نئی نسل کو گمراہ کر کے اقبال سے بدظن کرنے کی کوشش ایسے ہی ہے جیسے چاند پر تھوکا واپس اپنے منہ پر گرتا ہے۔ 8 دہائیوں کے گزرنے کے بعد اقبال پر پنڈت نہرو کے اس بے جا الزام کو کیوں دہرایا جا رہا ہے کہ "اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں سوشلزم کے زیرِ اثر تصورِ پاکستان سے دستبردار ہو گئے اکھنڈ بھارت قائم ہو جائے جہاں ہر روز کشمیر اور گجرات جیسی قیامتیں مسلمانوں پر ڈھائی تھے۔ کیا ان الزامات سے زمینی حقائق بدل سکتے ہیں کہ دوبارہ ایسا جائیں! اقبال جنہوں نے پاکستان جیسی ریاست کا خواب دیکھا، ان کو اس الزام میں آخر کیوں ملوث کیا جا رہا ہے؟ اور ایک ہی وقت میں بھارت اور پاکستان میں ایسا بے ڈھنگا راگ کیوں سنائی دے رہا ہے؟ آیئے تاریخ کے جھروکوں سے حقائق کی دنیا میں جھانکتے ہیں:

پنڈت جی اپنی کتاب "دی ڈسکوری آف انڈیا" جو انہوں نے 1944ء میں قلعہ احمد نگر کے زنداں میں بیٹھ کر تحریر کی تھی، اس کتاب میں انہوں نے بطور شاعر اور مفکر اقبال کے فیضان کی تحسین فرمائی ہے مگر اقبال کو خراجِ تحسین کرتے وقت وہ یہ بھی کہہ گزرے ہیں کہ اقبال "ایک شاعر، عالم اور فلسفی تھے اور پرانے جاگیرداری نظام سے وابستہ تھے"۔ پنڈت جی مزید لکھتے ہیں کہ: اقبال پاکستان کے اوّلین حامیوں میں سے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تجویز کی لغویت اور ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا جو اس تجویز میں مضمر ہیں۔ برطانوی مصنف ایڈورڈ تھامس نے لکھا ہے کہ "ایک ملاقات کے دوران اقبال نے ان سے یہ کہا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں صدر کی حیثیت سے پاکستان کی حمائت کی تھی مگر ان کو یقین تھا کہ یہ تجویز مجموعی طور پر ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کیلئے مضر ہے۔ شائد انہوں نے اپنا خیال بدل دیا تھا یا پہلے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت تک اس نے کوئی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ ان کا عام نظریہ زندگی پاکستان یا تقسیمِ ہند کے اس تصور کے ساتھ جو بعد میں پیدا ہوا، ہم آہنگ نہیں تھا۔ آخری عمر میں اقبال کا رجحان اشتراکیت کی طرف بڑھتا گیا۔ سوویت یونین کی زبردست کامیابی نے ان کو بہت متاثر کیا اور ان کی شاعری کا رخ بدل گیا"۔

پنڈت نہرو کا یہ الزام سراسر غلط ہے، ان کا یہ الزام لاعلمی پر نہیں بلکہ بدنیتی پر مبنی ہے جن لوگوں نے اقبال کی شاعری، فلسفہ اور سیاست کا سرسری سے بھی کم مطالعہ کیا ہے وہ بھی اس صداقت کی گواہی دیں گے کہ جاگیرداری نظام کا اقبال سے بڑا دشمن ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ پنڈت جی سے سب سے بڑا تاریخی سہو یہ ہوا کہ وہ بھول گئے کہ ان کی کتاب سے 3 برس قبل قائداعظم کے دیباچہ کے ساتھ قائداعظم کے نام اقبال کے خطوط شائع ہو چکے تھے، یہ انگریزی کتاب یقیناً پنڈت جی کی نظر سے گزر چکی ہو گی، اس کتاب میں شامل 28 مئی 1937ء کا وہ طویل خط بھی شامل ہے جس میں پنڈت جی کی "بے خدا سوشلزم" کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان تو رہے ایک طرف، خود ہندو معاشرہ بھی "بے خدا سوشلزم" کو ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ پنڈت جی کی سوشلزم کو رد کرتے وقت اقبال نے قائداعظم کو بتایا ہے کہ اگر اسلامی شریعت کی دورِ حاضر کے معاشی نظریات کی روشنی میں از سرِ نو تفسیر کی جائے تو مسلمان عوام کی روٹی روزگار کا مسئلہ بہتر طور پر حل ہو سکتا ہے۔ مسلمان کو غربت کے عذاب سے نجات دلانے کیلئے بھی یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی الگ قانون ساز اسمبلی ہو اور یہ اسمبلی متحدہ ہندوستان کی بجائے ایک الگ خود مختار مملکت میں ہی قائم کی جا سکتی ہے۔ اس خط کے مندرجات زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ:

اوّل: اقبال جواہر لال نہرو کی "بے خدا سوشلزم" پر اسلام کے اقتصادی نظام کو ترجیح دیتے ہیں۔
دوم: اسلام کے اقتصادی نظام کو عہدِ جدید کے سیاق وسباق میں نافذ کرنے کیلئے جداگانہ مسلمان مملکت کا قیام ضروری ہے۔
سوم: اپنی وفات سے فقط چند ماہ پہلے وہ قائداعظم کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ وہ قیامِ پاکستان کو کل ہند مسلم لیگ کا سیاسی پروگرام بنالیں۔
چہارم: اس خط کے آخر میں وہ قائداعظم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا وہ وقت نہیں آپہنچا جب ہمیں کھل کر قیامِ پاکستان کو اپنی منزل قرار دے دینا چاہئے؟

پنڈت جی دانستہ طور پر اقبال کی وفات سے تین ماہ پیشتر میاں افتخارالدین کے ہمراہ جاوید منزل میں علامہ اقبال سے جو ملاقات کی تھی، اس ملاقات کی خوشگوار یادوں کا یہ واقعہ بیان کرنا کیوں مناسب نہیں سمجھا لیکن اسے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں بیان کر دیا ہے۔ محترم بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:
پنڈت نہرو اس زمانے میں زور شور سے سوشلزم کا پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے، انڈین نیشنل کانگرس کے دو اجلاسوں کے وہ صدر رہ چکے تھے اور دونوں مرتبہ اپنے خطباتِ صدارت میں انہوں نے کہا تھا کہ ہندوستان کے تمام مصائب کا علاج سوشلزم ہے لیکن کانگرس کے بڑے بڑے لیڈروں میں کوئی شخص بھی اس بارے میں پنڈت نہرو کا معاون یا ہم خیال نہیں تھا بلکہ سردار پٹیل، راج گوپال اچاریہ اور ستیہ مورتی نے تو علی الاعلان پنڈت نہرو کے اس عقیدے سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔ دورانِ ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے پنڈت نہرو سے پوچھا کہ سوشلزم کے بارے میں کانگرس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں؟ پنڈت جی نے جواب دیا کہ، نصف درجن کے قریب۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا" تعجب ہے، خود آپ کی جماعت میں آپ کے ہم خیالوں کی تعداد صرف نصف درجن ہے، ادھر آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے کا مشورہ دوں، تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں؟ اس پر پنڈت جی خاموش ہو گئے۔

اسی ملاقات میں ایک اور ناگوار واقعہ بھی پیش آیا تھا اور پنڈت جی نے اس کو بھی قوم کو بتانا مناسب نہیں سمجھا، ہاں البتہ بٹالوی صاحب نے بیان کر دیا ہے:
ابھی ان دو عظیم المرتبت انسانوں کے ساتھ گفتگو جاری تھی کہ یکایک میاں افتخارالدین بیچ میں بول اٹھے کہ "ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے؟ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں، اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے،

Well, the trick is that you want to pit me against Mr. Jinnah, I want to tell you that Mr. Jinnah is the real leader of the Muslims, and I am his ordinary soldier.

تو اچھا، یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں، میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا معمولی سپاہی ہوں"۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ میاں افتخارالدین کے دخل در معقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے چنانچہ وہ اجازت لیکر رخصت ہو گئے۔

حیرت یہ ہے کہ انہوں نے ان ناقابلِ فراموش یادوں کو تو آسانی سے فراموش کر دیا مگر ایڈورڈ تھامسن کی گپ شپ کو ناقابلِ تردید تاریخی صداقت

کا درجہ دے دیا۔ ایڈورڈ تھامسن آکسفورڈ یونیورسٹی میں بنگالی زبان کے استاد تھے اور تاریخ ہند سے بھی علمی شغف رکھتے تھے۔ وہ دو مرتبہ برطانیہ کے اخبار مانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار کے روپ میں بھی برٹش انڈیا تشریف لائے تھے۔ گاندھی، رابندر ناتھ ٹیگور، راج گوپال اچاری، سردار پٹیل اور جواہر لال نہرو کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے جہاں وہ ہمیشہ مسلم لیگ کی مخالفت میں سرگرم رہتے تھے، وہاں کانگرس کی پرجوش وکالت کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ جس روایت کا سہارا لیکر پنڈت جی نے اقبال پر الزام تراشی کی ہے وہ ایڈورڈ تھامسن اور علامہ اقبال کی زبانی گفتگو پر مبنی ہے۔ ایڈورڈ تھامسن موصوف کا یہ بیان قائداعظم کے نام اقبال کے متذکرہ بالا خطوط کی دستاویزی شہادت کے ساتھ ساتھ اقبال نہرو ملاقات کے مندرجہ بالا احوال و مقامات کی بنیاد پر جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اقبال آخر دم تک اپنے تصورِ پاکستان کو قیامِ پاکستان کی صورت میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنا میں سرشار رہے۔ قائداعظم کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت میں سرگرمِ عمل رہے اور اسلامیانِ ہند کو یہ مشورہ دیتے رہے کہ میری زندگی کی دعائیں مانگنے کی بجائے محمد علی جناح کی طویل زندگی کی دعائیں مانگو، صرف جناح ہی قوم کی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نہ معلوم یہ باتیں پنڈت جی کے ذہن سے کیوں محو ہو گئی تھیں یا انہوں نے ان باتوں کو ناخوشگوار اور اپنی سیاسی آئیڈیالوجی کی تردید سمجھ کر اپنی کتاب میں درج کرنا کیوں مناسب نہیں سمجھا؟

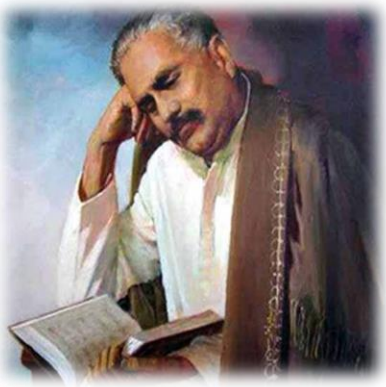

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے

اس کی وجہ صرف اور صرف یہی تھی کہ علامہ اقبال ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ میرے نبی ﷺ کا یہ مبارک فرمان ہے کہ تم میں بہتر وہ شخص ہے جس کے اخلاق بہترین ہیں۔ اسی لیے نظریاتی اختلاف کے باوجود علامہ اقبال اور پنڈت نہرو کے درمیان ہمیشہ باہمی احترام کے تعلقات قائم رہے۔ پنڈت نہرو نے 1933ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں مسلمان مندوبین کے طرزِ فکر و عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ گاندھی کے اس رویہ کی حمائت میں نہرو کی لب کشائی پر اقبال حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ اقبال اس کانفرنس میں شریک تھے مگر نہرو شریک نہیں تھے۔ کانگرس کی نمائندگی گاندھی نے کی تھی۔ گاندھی نے واپسی پر کہا کہ انہوں نے ذاتی طور پر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو قبول کر لیا تھا مگر سیاسی رجعت پسندی کی بناء پر مسلمانوں نے کانفرنس کو ناکام بنا دیا۔ نہرو نے گاندھی کی باتوں میں آکر مسلمان مندوبین کے خلاف ایک انتہائی سخت سیاسی بیان داغ دیا چنانچہ علامہ اقبال نے گاندھی کے اس الزام کی تردید میں جواہر لال نہرو کو جو خط تحریر کیا اس میں علامہ کا اخلاق ملاحظہ فرمائیں:

میں پنڈت جواہر لال نہرو کے خلوص اور صاف گوئی کی ہمیشہ سے قدر کرتا رہا ہوں۔ مہاسبھائی معترضین کے جواب میں جو تازہ ترین بیان انہوں نے دیا ہے اس سے خلوص ٹپکتا ہے اور یہ چیز آج کل کے ہندوستانیوں میں کم یاب ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے تین سالوں میں جو گول میز کانفرنسیں لندن میں منعقد ہوئی ہیں ان میں شریک ہونے والے مندوبین کے رویہ کے متعلق پنڈت جی کی تحقیق کی بنیاد کسی تعصب پر مبنی ہے"۔ اس خوش گمانی کے اظہار کے بعد علامہ اقبال نے اصل حالات کو بے نقاب کرتے ہوئے بتایا کہ "گاندھی جی نے مسلمانوں کے مطالبات کو ذاتی طور پر ماننے کا عندیہ تو دیا تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اس بات کی حتمی ضمانت نہیں دے سکتے کہ کانگرس کی مجلسِ انتظامیہ بھی ان مطالبات کو تسلیم کر لے گی، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کانگرس انہیں ان مطالبات کے سلسلے میں مکمل اختیار دینے کیلئے کبھی بھی رضامند نہیں ہو گی، گویا عملاً گاندھی جی

نے مسلمانوں کے تمام مطالبات کو رد کر دیا تھا، مسٹر گاندھی جی کی دوسری غیر منصفانہ شرط یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے مخصوص مطالبات کی حمائت ترک کر دیں مگر مسلمانوں نے اچھوتوں کی حمائت سے دستبرداری سے انکار کر کے گاندھی جی کو ناراض کر دیا تھا"۔ چنانچہ اپنے اس خط میں انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ اپنے زدِعام سوشلسٹ خیالات کے پیشِ نظر پنڈت جواہر لال نہرو اس انسانیت کش شرط کی کیسے حمائت کریں گے؟ کم از کم انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں رجعت پسندی کا الزام دیں۔ اس صورت میں میں وہ لوگ جو ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ مقاصد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ پنڈت جی فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف ہندو مہاسبھا کی جاری کردہ مہم میں ایک سرگرم رکن ہیں"۔

مسلمانوں کے خلاف پنڈت جواہر لال نہرو کا دوسرا الزام یہ تھا کہ مسلمان ہندوستانی قومیت کے مخالف ہیں۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے فرمایا:

اگر قومیت سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذہبی جماعتوں کو حیاتاتی معنوں میں ملا جلا کر ایک کر دیا جائے تو پھر میں ہی اس نظریہ قومیت سے انکار کا مجرم ہوں۔ میں پنڈت نہرو سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں، جب تک اکثریت والی قوم دس کروڑ کی اقلیت کے کم سے کم تحفظات کو جنہیں وہ اپنی بقاء کیلئے ضروری سمجھتی ہے، نہ مان لے اور نہ ہی ثالث کا فیصلہ تسلیم کرے بلکہ واحد قومیت کی ایسے رٹ لگاتی رہے جس میں صرف اس کا اپنا ہی فائدہ ہے، ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ اس سے صرف دو صورتیں نکلتی ہیں، یا تو اکثریت والی ہندوستانی قوم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مشرق میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے برٹش سامراج کی ایجنٹ بنی رہے گی یا پھر ملک کو مذہبی، تاریخی اور تمدنی حالات کے پیشِ نظر اس طرح تقسیم کرنا ہو گا کہ موجودہ شکل میں انتخابات اور فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال ہی نہ رہے"۔

پنڈت نہرو کے جواب میں دیا گیا علامہ اقبال کا یہ بیان یقینی طور پر پنڈت جی کی نظروں سے گزرا ہو گا، اس بیان میں روزِ اوّل تا آخر اقبال کا ترقی پسند، وسیع النظر اور انسان دوست مسلک نمایاں ہے۔ یہ بیان تصورِ پاکستان کی نفی سے نہیں بلکہ اثبات سے عبارت ہے۔ ایسے میں پنڈت جی کا یہ کہنا کہ 1930ء کے بعد اقبال اپنے تصورِ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے، دیانت داری پر مبنی نظر نہیں آتا بلکہ تاریخی حقیقت پر تعصب کی چادر ڈالنے کے مترادف ہے۔ آیئے مستند تاریخی حوالوں سے کچھ اور پوچھتے ہیں:

جب پنڈت نہرو نے "ماڈرن ریویو" (کلکتہ) میں دنیائے اسلام کی صورتحال پر تین مضامین میں وطنیت اور لادینیت کے فروغ کا خیر مقدم کیا تھا تو اس کے جواب میں اقبال نے بھی "ماڈرن ریویو" (کلکتہ) ہی میں پنڈت جی کی فکری گمراہی کو راست فکری میں بدلنے کا سامان کیا۔ اپنے طویل مضمون کے آغاز میں اقبال نے برملا کہا:

"میں اس بات کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ جس انداز میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایک ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ وہ اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے، اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو"۔

قارئین! ذرا غور فرمائیں کہ اقبال کا یہ تجزیہ کہ "پنڈت جی کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے" وقت نے بہت جلد سچ ثابت کر دکھایا، جب پنڈت جی کے دل میں برصغیر کی زندگی کے ٹھوس حقائق کا احساس جاگ اٹھا تو مولانا ابوالکلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں بھی ٹھوس "حقائق یعنی قیامِ پاکستان کی حقیقت کو قبول کرنے کا مشورہ دینے لگے۔ مولانا آزاد نے اپنی تصنیف "انڈیا ونز فریڈم میں اس بات کا ذکر یوں فرمایا ہے:

"After a few days Jawaharlal came to see me again. He began with a long Preamble in which he emphasized that we should not indulge into wishful thinking, but face reality. Ultimately he came to the point and asked me to give up opposition to partition."

"کچھ دنوں کے بعد جواہر لال دوبارہ مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے ایک طویل تمہید کے ساتھ آغاز کیا جس میں اس نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں خواہش مندانہ سوچ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے بلکہ حقیقت کا سامنا کرنا چاہئے۔ بالآخر وہ اس بات پر پہنچے اور مجھ سے تقسیم کی مخالفت ترک کرنے کو کہا"۔

اسلامیانِ ہند نے 1944ء کے انتخابات میں اپنے ووٹ کے ذریعے نہرو اور گاندھی کے سیاسی خواب پرستوں کو زندگی کے جن حقائق کا احساس دلایا تھا، اقبال نے برسوں پہلے نہرو کو ان حقائق کی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "سیاسی تدبر کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کے حقائق سے فرار کرنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے پنجہ آزما ہوا جائے"۔ اپنے زیرِ نظر مضمون میں بھی علامہ اقبال نے جداگانہ مسلمان قومیت کے سوال پر دوٹوک انداز میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ اقبال نے اسلامیانِ ہند کے سیاسی مسلک پر ان الفاظ پر روشنی ڈالی تھی:

اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے، جداگانہ مسلمان قومیت کا سوال صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں، اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامیانِ ہند کسی ایسی سیاسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی، اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے"۔

علامہ اقبال کا یقینِ کامل بالکل درست نکلا، اسلامیانِ ہند نے بالآخر متحدہ ہندوستانی قومیت کے سیاسی تصور کو غلط ثابت کرتے ہوئے جمہوری عمل کے ذریعے پاکستان قائم کر لیا۔ ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو گئی اور یوں پاکستان میں اسلام سے عشق اور وطن سے محبت میں کوئی تضاد باقی نہ رہا۔ اب ہمارا دین اسلام ہے اور ہمارا وطن دار لسلام ہے اور دوسری طرف آپ نہرو کی صداقت کا اس بات سے اندازہ لگالیں کہ ساری دنیا کے سامنے انہوں نے تحریری طور پر اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دیں گے لیکن خود ہی اپنی تحریر سے منحرف ہو گئے اور اس وعدہ خلافی نے ان کی ساری شخصیت کا بھرم طشت از بام کر دیا ہے۔ علامہ کا یہ شعر کتنا حسبِ حال ہے

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

رہے نام میرے رب کا جو حق سچ ہے!

بروز بدھ 24 صفر المظفر 1446ھ 28/ اگست 2024ء

اگر منظر بدل جائے.....!!!

اگر سننے والے مزاج آشنا ہوں تو گفتگو کرنے کا مزا آتا ہے اور ان سب کی سننے کی خواہش بھی مزا دیتی ہے لیکن پتہ نہیں ان دنوں طبیعت کیوں بوجھل سی سب رہتی ہے۔ ارد گرد سناٹا سا محسوس ہوتا ہے اور جذبات کی شائیں شائیں نے کپکپی طاری کر رکھی ہے۔ اسی لئے گزشتہ چند نوں سے ٹیلیفون کا گلہ دبا کر کے ساتھ رابطہ منقطع کئے خاموش بیٹھا ہوں۔ اچانک کل صبح ایک بچی نے گھر کا دروازہ زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ دروازہ کھولا تو شکائت شروع کر دی کہ اتنی دیر سے ٹیلیفون کر رہی تھی لیکن کسی نے اٹھانے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی تو سوچا خود ہی دیکھ آؤں۔ منافقت بھری مسکراہٹ سے آنے کا مقصد دریافت کیا تو بولی: مجھے پاکستان کے یومِ آزادی پر تقریر کرنی ہے لکھ دیں۔ میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یومِ آزادی تو گزر چکا تو اس نے فوری جواب میں کہا کہ "کیا یومِ آزادی صرف ایک ہی دن کیلئے ہوتا ہے؟"۔ مجھے یقیناً ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔

میں نے مختلف انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بضد تھی کہ ہمارے اسکول والوں نے ایک علامتی پاکستانی پارلیمنٹ کا سٹیج سجایا ہے اور وہاں مختلف مہمانان کو بطور اسمبلی ممبران اور ان میں سے ایک سنئیر ترین بزرگ نے بطور اسپیکر شرکت کرنی ہے اس لئے اس پروگرام کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے آپ کی مدد درکار ہے۔ جب اس کا اصرار بڑھا تو میری مجبوریوں نے اس کے منہ کا مزا کرکرا کر دیا۔ اچھا خود لکھ لوں گی لیکن..... لیکن کیا؟ آپ اسے دیکھ تو لیں گے ناں۔ میں نے جان چھڑاتے ہوئے حامی بھر لی کہ ہاں ضرور دیکھ لوں گا۔ اب یہ میرے سامنے ہے.....یوم آزادی جمہوریت پر ایک مباحثہ..... ہنسی آتی ہے اب تو۔ خیر ایک بچی کے خیالات پڑھ لیجیے۔ اس سے متفق ہونا کیا ضروری ہے، معلوم نہیں۔

جناب اسپیکر! ایوان میں موجود افراد کی تقاریر آپ نے سنیں جن میں انہوں نے آزاد ملک کے آزاد شہریوں کی پر کیف زندگی کے بڑے سہانے مناظر دکھائے ہیں۔ ان تمام حضرات کی تقاریر سے میں محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یقین ہو گیا ہے کہ بینائی اس حد تک کمزور ہو سکتی ہے، معلومات کا اس قدر فقدان ہو سکتا ہے یا ہم حقائق سے نظریں چراتے ہیں! ہماری خود میں مصروف زندگیاں ہمیں اجازت نہیں دیتیں کہ ہم عوام کی اس دھندلائی ہوئی تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ سکیں جہاں صرف دکھ ہے، درد ہے، محرومی ہے، احساسِ غلامی ہے، اپنے تمام اور مکمل وجود کے ساتھ بھی بے دست و پائی ہے، آزاد ملک کے شہری ہونے کے باوجود احساسات تک پہرے میں ہیں، زندگی کی ہر سانس مقروض، ہر فکر پہ پہرہ ہر جنبش پر چیک ہر بات کی نگرانی۔ یہ تو ایک مڈل کلاس اور کچھ سوچنے سمجھنے والے کا حشر ہے اور یہ بھی عوام کی زندگی کا ایک رخ ہے۔

آپ کو سن کر بہت اچھا لگے گا میرے قابل احترام ساتھیوں کو بہت خوشی ہو گی سن کر، یہاں ہر ایک آزاد ہے۔ دال کھائے، چٹنی کھائے، کھا سکے تو کھائے ورنہ آزاد ہے کہ رات کو بھوکا ہی سو جائے۔ اگر اس کا معصوم بچہ بیمار ہے اور اس کو دوا کی ضرورت ہے تو وہ بالکل آزاد ہے چاہے اس کو بخار سے سلگ کر مرنے دے، چاہے پانچ روپے کی میٹھی گولیاں لا دے..... جس طرح چاہے مرنے دے اس پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ کسی کی ذمہ داری نہیں ہے، اس کی موت کسی کا بوجھ نہیں ہے۔ اگر اس وطن کے شہری کو بڑھاپے یا ادھیڑ عمری نے آلیا ہے، اس کو کوئی تکلیف ہے تو وہ بالکل آزاد ہے چاہے اپنی کھولی میں دم توڑے، سڑک کے کنارے کھانس کھانس کر مر جائے یا چلتی ہوئی کسی منی بس سے اترتے ہوئے اس کے پہیوں تلے کچلا جائے اور ہاں اگر کوئی مقروض ہے، اولادوں کا بوجھ ہے، ذمہ داریاں ہیں، قرض اتارنا ہے تو وہ بالکل آزاد ہے گردہ بیچ ڈالے، اپنا لہو فروخت کر دے، اپنی ایک آنکھ بیچ دے۔ اگر عورت ہے تو اپنا جسم بیچ دے، عزت و آبرو سرِ بازار نیلام کر دے کیونکہ وہ آزاد وطن کی آزاد شہری ہے۔

اگر کوئی نوجوان اپنی ڈگریاں ہاتھوں میں اٹھائے شہر میں دن بھر آوارہ گردی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اسے مکمل آزادی ہے۔ وہ جب تک اور جتنا چاہے سڑکیں ناپ لے اور جب چاہے جس طرح چاہے خودکشی کر لے۔ ریل کی پٹڑی پر لیٹ جائے، گھر میں پنکھے سے لٹک جائے، زہر پی لے..... اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کی اپنی زندگی تھی، اپنی موت ہے، وہ آزاد ہے جس طرح چاہے مر جائے۔ ایک اور دلچسپ بات ہے جو میرے تمام فیوڈل ساتھیوں کو پسند آئے گی کیونکہ ہمارا ایوان زیادہ تر فیوڈلز سے ہی بھرا ہوا ہے ناں۔ ان کی خوشی کیلیے یہ پہلو بھی اجاگر کرنا مناسب سمجھتی ہوں کہ ہمارے ہاں ہر طرح کی آزادی ہے، ہم جس کی بہن بیٹی بیوی کو جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں اٹھالیں اور اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کریں..... اور پھر جس طرح چاہیں کہانی ختم کرادیں۔ خواہ ہم اسے کاری کہہ دیں اس کو زندہ دفن کر دیں، چاہیں تو اس کو ختم کرنے سے پہلے کتوں سے نچوا بھی سکتے ہیں۔ اگر ان کے اس ظالمانہ سلوک کے خلاف حکومت سے کاروائی کیلئے کہیں تو اسمبلی میں بیٹھے ان سرداروں کی طرف سے ایک تنبیہ سب پر لرزہ طاری کر دیتی ہے کہ خبردار! یہ ہماری روایات ہیں، اس میں مخل ہونے کی کسی کو اجازت نہیں۔۔۔ اور کسی کی مجال نہیں کہ ان درندوں کے خلاف کوئی کاروائی کر سکے کیونکہ انہیں علم ہے کہ ہمیں کوئی کچھ نہیں کہے گا، ہم آزاد ہیں۔

لوگوں کی یہ بات قطعی غلط ہے کہ ہم پر کوئی چیک لگا سکتا ہے اور جو ہمارا سماج ہے ناں، اس میں تو مزید آزادی یہ بھی ہے کہ جب جس کا بس چلے وہ دوسری خاتون کو جلادے۔ یہ نہیں کر سکتا تو کم از کم اس پر تیزاب تو پھینک سکتا ہے ناں۔ ہمارا قانون ہماری پولیس بھی بالکل آزاد ہیں، ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، نہ ہاتھ پکڑ سکتا ہے نہ پوچھ سکتا ہے، وہ جس کو چاہیں مجرم بنادیں اور جس کو چاہیں معصوم۔ اسی آزادی کی وجہ سے آج یہ ایوان وجود میں آیا ہے جس میں صرف مراعات یافتہ لوگ ہی براجمان ہو سکتے ہیں۔ مگر جناب اسپیکر! میرے معزز اراکین یقیناً اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ آزادی اور جمہوریت کے راگ الاپنے والے تمام لوگ کس طرح ایوان تک پہنچتے ہیں۔ حالت جب یہ ہو کہ عوام کے نمائندگان کو نمائندگی دینے کا فیصلہ بھی ایسے ہو کہ پہلی مرتبہ ایک آزاد الیکشن کمشنر کی تعیناتی پر سب نے سکھ کا سانس لیا تھا لیکن اس انتخابات میں ہونے والی دھاندلیوں پر ہر جماعت کو شدید تحفظات ہیں اور کچھ تو ان کے خلاف باقاعدہ تحریک چلانے کا عندیہ بھی دے رہی ہیں جبکہ یہ تقرری انہی کے قلم سے منظور ہو کر اس معراج تک پہنچی تھی۔

جناب اسپیکر! میں پوچھتی ہوں جس ملک میں صابن اور ڈٹرجنٹ سے لے کر تمام کی تمام اشیا صرف غیر ملکی کمپنیاں بناتی ہوں اور ملک میں روٹی سے لے کر پٹرول اور تیل و گیس کی قیمتیں تک آئی ایم اور ورلڈ بینک طے کرتے ہوں اس ملک کو کیا آپ آزاد کہہ سکتے ہیں؟ آزادی کسی دیوی پری یا کسی مجسمہ کا نام تو نہیں ہے کہ وہ آپ نے نصب کر دیا اور سب نے تالیاں بجادیں۔ اس کے بعد زندگی پہروں میں رہے سانس بھی قید میں ہو..... ہم نے صرف لفظ جمہوریت کا لالی پاپ عوام کو پکڑا دیا کہ خوش ہو جائے۔ آزادی تو اپنی سرزمین پر اپنے عقیدے نظریے کے ساتھ اپنے وسائل کو خود استعمال کر کے اپنی مٹی پر آزادی سے چل کر پیٹ بھر کر روٹی کھانے اور نیند بھر کر سونے کا نام ہے۔ آزادی میں اپنے حال اور مستقبل کے فیصلے خود کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ آزاد وطن میں ہر ایک اپنا نقطہ نظر بیان کرنے اور اپنی مرضی سے جینے میں آزاد ہوتا ہے۔

جمہوری وطن کے لوگوں اور بچہ جمہورا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کاش یہ ہمارے مظلوم اور پسے ہوئے عوام کو پتا ہوتا۔ اگر وہ یہ جان جائیں تو جو منظر آج ہے وہ نہ ہو۔ جس آزادی کے راگ ہم اور آپ الاپتے رہتے ہیں وہ اگر حقیقتاً عوام کو نصیب ہوتی تو ہماری اور آپ کی بڑی مشکل ہو جاتی۔ ہماری یہ پر تعیش زندگی جس کا ہر ہر پل غریب عوام کے خون سے نچڑ کر بنا ہے، مجھے ان بڑے بڑے ایوانوں لمبی لمبی ائیر کنڈیشنڈ گاڑیوں بلند و بالا سیمینار ہالوں سے غریب عوام کے جلے ہوئے خون اور بھنے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔ میرا دل لرزتا ہے کہ جن کے ٹیکسوں سے ہم نے عیاشی کی، جنہیں مہنگائی کے عذاب نے پیس

ڈالا، غریب عوام کی کھال تو کیا ان کی چربی اور گوشت کی تہہ کو بھی جلا کر یہ سارا کاروبار ہم نے سجالیا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن ہم سب اس میں دفن ہو جائیں۔

خالقِ ارض و سما ان کا بھی رب ہے، آزادی کے نعروں میں جس دن اس نے چاہا رنگ بھر دیا تو ہم اور آپ عوام سے بچ کر کہاں جائیں گے ؟اس لیے کہ جس کا خون، جس کا پسینہ جس کا ووٹ اور جس کا نوٹ ہے، اس کا کوئی اختیار نہیں۔ آپ چاہے بجلی دیں، چاہے نہ دیں اور خود ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر ان کو صبر اور اولوالعزمی کا درس دیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سب کچھ ہم پر عوام کا قرض ہے جو انہوں نے اپنی کمر توڑ کر ہمیں دیا ہے، ہمیں یہ لوٹانا ہو گا۔
ہمارے اکابرین نے اپنی انتھک محنت اور دیانتداری کے ساتھ جس آزادی کو حاصل کیا تھا یقیناً اس خواب سے ہم اب بھی کوسوں دور ہیں!

جناب سپیکر! آزادی اور غلامی میں کیا فرق ہے، اس کا اندازہ ہر آئے دن شہید ہونے والے نہتے فلسطینیوں سے پوچھ لیں یا پھر ان کشمیریوں سے پوچھ لیں جن کا وکیل ہونے کا ہم دعویٰ کرتے ہیں۔ کشمیریوں پر ہونے والے ظلم و ستم کا اندازہ آپ کیا لگائیں گے کہ جس کشمیر کو قائد نے پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا، اس کو تو ہم نے ایک پلیٹ میں رکھ کر مسلم دشمن موذی مودی کو پیش کر دیا ہے۔ ان ڈیڑھ لاکھ کشمیری شہداء کا خون کیا رائیگاں چلا جائے گا، ہزاروں عصمت مآب بیٹیوں پر ہونے والے مظالم کا کوئی مداوا نہیں ہو گا، ہزاروں نوجوانوں کو برسوں سے گھروں سے اغوا کر کے غائب کر دیا گیا ہے جن کے منتظر ماں باپ اب بھی ہر عید اور تہوار پر اپنے گھر کے دروازے پر نگاہیں جمائے پتھر ہو گئے ہیں، جن کا قرض اب بھی ہم پاکستانیوں پر واجب ہے جو ابھی تک پاکستان کی دیوانہ وار محبت میں اس قدر سرشار ہیں کہ پاکستان کی تکمیل کیلئے اب بھی اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر لئے بیٹھے ہیں لیکن ہمارے مقتدر سربراہ قصرِ سفید کے فرعون کے حضور سربسجود ہو کر اپنی اطاعت پر مہر ثبت کر کے کشمیریوں کی پشت میں خنجر گھونپ کر آ گئے ہیں۔

آپ ان کشمیریوں کو کیا جواب دیں گے جو آج بھی باوجود نامساعد حالات کے عید الفطر بھی پاکستان کے جھنڈے لہراتے ہوئے مناتے جس کی وجہ سے بھارتی فورسز بہیمانہ ظلم کرتے ہوئے کرفیو نافذ کر کے گولیوں کی بوچھاڑ میں آزادی کے متوالوں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور یہی عمل وہ 14 / اگست کو دہراتے ہیں تاکہ پاکستان کا یومِ آزادی نہ منا سکیں اور بھارتی یوم آزادی کے دن سیاہ جھنڈے اٹھا کر اپنی نفرت کا اظہار نہ کر سکیں۔ کیا ہم وہ مناظر فراموش کر سکتے ہیں جب ضعیف العمری اور علالت کے باوجود جناب سید علی گیلانی کشمیریوں کے ایک جم غفیر میں یہ پرعزم نعرے "ہم ہیں پاکستانی، پاکستان ہمارا ہے" کہہ کر اپنی قوم کا پیغام ہم تک پہنچاتے رہیں ہیں لیکن ہم نے جواب میں ان کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اپنے عشاق کے ساتھ کوئی ایسا سفاک سلوک بھی کرتا ہے جو ہم نے ان کے ساتھ کیا؟ اس ظلم کا جواب نہ صرف ہم پر فرض بلکہ قرض ہے جسے چکانے کیلئے شائد خون کے دریا عبور کرنے پڑیں۔

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کیلئے

جبکہ ہمارے ایک حکمران نے خود سینے پر ہاتھ رکھ کر کشمیر کا وکیل ہونے کا دعویٰ کیا اور ہندوستان کے اس عمل کے خلاف ہر ہفتے ایک گھنٹے کے احتجاج کا اعلان کرتے ہوئے صرف پہلے دن فقط دس منٹ کیلئے فوٹو سیشن کیا اور اس کے بعد آج تک اس کو کشمیر یاد تک نہیں آیا اور دوسرا مجرم جو درجن صحافیوں کی موجودگی میں اپنی بزدلی کا اعلان کر رہا تھا، آج یہ دونوں کردار کہاں ہیں؟

کیا مجھے دوبارہ یاد کروانا پڑے گا کہ ایک متکبر عورت اندرا گاندھی نے سقوطِ کشمیر کے موقع پر ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا تھا کہ آج ہم نے دو قومی نظریہ کو خلیج بنگال میں ڈبو دیا ہے لیکن پاکستان کو توڑنے والوں سے قدرت کا انتقام دیکھیں کہ سب سے پہلے اس کا جواں سال بیٹا سنجے ہیلی کاپٹر کے حادثے میں جل کر راکھ ہو گیا، خود اندرا کو اس کے ذاتی محافظوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا اور بعد ازاں اس کے بیٹے راجیو کو ایک تامل خاتون نے خود کش حملے میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

دوسرے کردار مجیب کو ٹھیک بھارتی یوم آزادی کے دن فوج کے افسروں نے پورے خاندان سمیت گولیوں سے بھون دیا اور ایک بھارتی مشہور صحافی کے مطابق تین دن تک سیڑھیوں میں پڑی مجیب کی لاش کو آوارہ بلیاں اور کتے نوچ رہے تھے جن کو ہٹانے کیلئے باقاعدہ گولی چلانی پڑی۔ اس وقت حسینہ واجد بھارت میں مقیم تھی اس لئے بچ گئی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ قدرت نے اس کو 5 / اگست 2024ء کو عبرت کیلئے محفوظ کیا تھا کہ خود مودی بھی دیکھ لے کہ دو قومی نظریہ نے کس طرح اسی خلیج بنگال سے ابھر کر خود کو منوایا ہے کہ وہاں کی گلیوں میں وہ نوجوان بچے جن کی عمریں بھی سقوط ڈھاکہ سے کم ہیں، سڑکوں پر "پاکستان سے رشتہ کیا" "لا الہٰ الا اللہ" کے فلک شگاف نعرے لگا رہے ہیں اور اور دنیا کا کوئی ملک حسینہ کو سیاسی پناہ دینے کیلئے بھی تیار نہیں جبکہ حسینہ کو دوبارہ اپنے مکار ہندو مودی کے ہاں پناہ لینی پڑ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی بھٹو خاندان سمیت اس کی اولاد میں ایک بیٹی کے سوا سب غیر فطری موت میں مارے گئے اور یحییٰ خان بھی باقی ساری عمر بستر پر ایڑیاں رگڑتے اپنے انجام کو پہنچ گیا گویا پاکستان کو توڑنے والے سارے کرداروں سے کسی نے عبرت حاصل نہیں کی۔ کیا کشمیر کے شہداء سے ظلم کرنے والے بچ سکیں گے ؟

جنابِ اسپیکر! ارضِ پاکستان کے غداروں سے سبق حاصل کرنے کی بجائے ایک مرتبہ پھر 9 مئی کو پاکستان میں ایک خونی انقلاب لانے کی کوشش کی گئی، خود اعلیٰ فوجی دفاعی تجزیہ نگار انگشت بدنداں ہیں کہ سارے ملک کے اہم اور مخصوص علاقوں کو ٹارگٹ کرنے کیلئے ایسی منظم پلاننگ تو خود فوج نہیں کر سکتی جبکہ ایک خاص پلاننگ کے تحت بلوائیوں کو وہاں بھیج کر ملک کو توڑنے کی سازش کی گئی۔ تاکہ اس ایٹمی ملک کے اثاثوں پر قبضہ کرنے کیلئے ٹرائیکا کیلئے کام اسان کر دیا جائے۔ کیا ہم نے ان شیطانی قوتوں کا بروقت محاسبہ کیا جن کے شر سے رب کریم نے اس معجزاتی ریاست کو تو بچا لیا لیکن وہ ابھی تک ریاست کے سینے پر بھاری بوجھ پتھر بن کر سانس روکنے کی ہر تدبیر کرنے میں ازاد ہیں۔

جنابِ اسپیکر! 9 مئی ہماری قومی تاریخ کا وہ سیاہ دن ہے کہ وہ کام جو دشمن پچھلے 75 برسوں سے کرنے کی جرات نہ کر سکا وہ یہاں سیاست کی چلمن میں چھپ کر اقتدار کی ہوس میں چند بھیڑیوں نے سرانجام دینے کی ناکام کوشش کی۔ اس جماعت کے رہنماؤں نے بلوائیوں اور فسادیوں کے برملا حملہ آوروں کی پشت پر کھڑے ہو کر اپنے لیڈر کے اگ اور شعلے اگلتے ہوئے احکام پر اشتعال انگیز تیل چھڑکے کا کردار ادا کیا جس کی ویڈیوز تک ریکارڈ کا حصہ بن چکی ہیں لیکن اس کے باوجود ریاست نے جو نا قابلِ سست روی کا اظہار کیا ہے، اس کی تلافی کیسے ہو گی ؟

اس سازش کی کڑیاں تو اسی دن شروع ہو گئی تھیں جب موجودہ فوجی سربراہ نے بطور آئی ایس آئی کے سربراہ کے اس وقت کے وزیر اعظم عمران خان کو اطلاع دی کہ ملک میں ہونی والی اربوں روپے کی کرپشن خود ان کے اپنے گھر سے ہو

رہی ہے جس کی سرپرستی ان کی اہلیہ کر رہی ہیں۔ اس سے پیشتر کہ عمران خان اپنے مزاج کے مطابق کوئی بیان دیتے، ان کے سامنے سارے دستاویزی ثبوت رکھ دیئے گئے تاکہ وہ اپنے گھر کی خبر لیتے ہوئے اس کی تصدیق کر کے اس کا تدارک کریں لیکن انہوں نے فوری طور پر جنرل باجوہ کو جنرل عاصم کو نہ صرف اس عہدے سے ہٹانے کیلئے کہا بلکہ اسے فوج سے نکالنے اور مقدمہ دائر کرنے کا کہا جبکہ اس وقت جنرل باجوہ اپنے غیر ملکی دورے سے واپسی پر جہاز میں محو سفر تھا اور اس نے احکام کی تحقیق کا وعدہ کیا لیکن خود وزیر اعظم اس قدر بے تاب تھے کہ خود ائیر پورٹ پہنچ گئے اور فوری طور پر کاروائی کا مطالبہ دہرانے لگے۔ جنرل باجوہ کے اس غلط اقدام کی حمائت نے ملک کو کس قدر نقصان پہنچایا، اس کا محاسبہ کون کرے گا جنابِ اسپیکر!

وزیر اعظم نے اپنی نیم کامیابی پر دوسرا مجرمانہ قدم یہ اٹھایا کہ پلان کے مطابق جنرل فیض کو اس عہدے پر متعین کر کے ایک لمبا پلان بنایا کہ چین کی طرح آئندہ بیس سال تک اس ملک پر کیسے حکومت کی جائے جس کیلئے ضروری تھا کہ آئندہ کیلئے جنرل فیض کو آرمی کا چیف بنایا جائے لیکن فوجی ضابطے اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے جس کیلئے سنئیر ترین جنرلز نے سر جوڑ کر اس سازش کا مقابلہ کرنے کیلئے معاملے کی سنجیدگی سے وزیر اعظم کو آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن اقتدار کی ہوس نے انہیں اس قدر اندھا کر دیا کہ وہ اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل میں ہر قانون اور ضابطے کو یکسر تباہ کرنے کیلئے تل گئے۔

یہی وہ موقع تھا کہ ملک بچانے کیلئے آئینی راستہ اختیار کرتے ہوئے عدم اعتماد کی تحریک لائی گئی لیکن اب نئے چیف کی تقرری کو روکنے اور اپنے من پسند جنرل فیض کو نیا چیف بنوانے کیلئے عمران خان اپنی زخمی ٹانگ سمیت عوامی طاقت کا مظاہرہ کرنے کیلئے سڑکوں پر آ گئے اور لوگوں کو ترکی ماڈل کی طرح فوج کے خلاف انقلاب لانے کی دعوت دینے کا اعلان کر دیا لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے کہ کروڑوں افراد کو جمع کر کے اسلام آباد پر دھاوا بولنے والا عوام کی عدم شرکت کی وجہ سے لاہور کا راوی پل بھی عبور نہ کر سکا اور دل شکستہ ہو کر واپس لوٹ گیا، جس کے بعد باقاعدہ 9 مئی کا منظم واقع ترتیب دیا گیا جس کے تمام خوفناک مناظر ہم سب کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اور قوم اب اس خوفناک سازش کے عبرتناک اور شرمناک انجام کی منتظر ہے۔

جناب اسپیکر! آزادی عوام کے لحاظ سے یہ چند پہلو تھے جو مختصراً میں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے۔ وقت کی کمی کے باعث اختصار برتا ہے۔ آزادی کیا ہوتی ہے، کیسی ہونی چاہیے؟ آپ تھوڑی دیر کیلئے خود کو عوام یا کشمیری سمجھ کر محسوس کیجئے پھر ہم میں سے کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ عوام آزاد ہیں یا نہیں۔ میں آزادی او غلامی کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں!

ستم گر وقت کا تیور بدل جائے تو کیا ہو گا
مرا سر ترا پتھر بدل جائے تو کیا ہو گا
امیروں کچھ نہ دو، طعنے تو مت دو ان فقیروں کو
ذرا سوچو اگر منظر بدل جائے تو کیا ہو گا

بروز جمعۃ المبارک 26 صفر المظفر 1446ھ 30/ اگست 2024ء

قلب وروح کی جان.... سید علی گیلانی

زندگی کی متاعِ عزیز کیا ہے؟ روپیہ پیسہ، زر وجواہر، زمینیں اور جائداد، منصب، جاہ وجلال، ناموری، واہ واہ، داد وتحسین، صلہ وستائش، بیوی، یار دوست کیا یہی ہے زندگی کی متاعِ عزیز! تو پھر نظریہ کیا ہے، اصول کیا ہے، حق وصداقت کیا ہے، دار ورسن کیا ہے، شہادت۔ بچے عزیز واقرباء، محبت کیا ہے، عشق کیا ہے، بے غرضی کیا ہے، جاں نثاری کیا ہے، مرمٹنا کیا ہے؟؟؟ بتایئے پھر یہ سب کیا ہیں؟ کسے کہتے ہیں متاعِ عزیز؟ کیا انکار متاعِ عزیز نہیں ہے؟ جبر کے سامنے انکار، فرعونیت کا انکار، صلہ کا انکار، سودے بازی سے انکار، دولتِ بے بہا کا انکار، باطل کا انکار، سر جھکانے سے انکار، ظلم وجبر کا انکار، رب کی حاکمیت کے سوا سب کا انکار..... انکار متاعِ عزیز نہیں ہے تو پھر کیا ہے انکار؟ انکار اور یکسر انکار، پورے شعور کے ساتھ انکار۔ کوئی مصالحت نہیں، بالکل بھی نہیں..... مجسم انکار..... باطل کے سامنے، طاغوت کے سامنے، رب کے باغیوں کے سامنے، نفس پرستوں کے سامنے، دنیائے حرص وتحریص کے سامنے، دھوکے کے سامنے، بے وفائی کے سامنے، خدائی لہجے میں بات کرنے والوں کے سامنے..... انکار اور یکسر انکار..... پورے شعور اور پورے وجود کے ساتھ انکار۔ بس انکار۔

دلیل چاہے کتنی بھی مضبوط ہو، رب کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے! بس انکار، لیکن انکار اپنے نفس کو خوش کرنے کیلئے نہیں، نفس کو خوش کرنے کیلئے انکار انکارِ ابلیس ہے۔ اپنے رب کیلئے انکار..... یہی ہے اصل اور کچھ نہیں۔ نہیں مانیں گے کسی کی بھی۔ کسی طاقت کی، کسی بھی نظام باطل کی..... میرا دین ... نہیں مانیں گے چاہے لاکھ دلیلیں دو۔ بس مانیں گے تو صرف رب اعلی کی، بس اسی کی اور کسی کی بھی نہیں۔ یہی توحید ہے اور ہے کیا توحید! تو شروع ہی انکار سے ہوتا ہے یعنی لا سے۔ پہلے انکار کی منزل ہے پھر تسلیم کی۔ میں انکار کیے بغیر تسلیم کیسے کر سکتا ہوں! اگر میں انکار نہ کروں اور تسلیم بھی کروں تو یہ منافقت ہے، کھلا تضاد ہے جو قابلِ قبول نہیں۔ ملاوٹ نہیں خالص درکار ہے بالکل خالص..... چاہے ذرہ ہی ہو۔ ملاوٹ شدہ پہاڑ درکار نہیں ہے۔ یہی ہے اخلاص اور کیا ہے!

توحید تو یہ ہے کہ خدا خود حشر میں کہہ دے
یہ بندۂ دوعالم سے خفا میرے لئے ہے

انکار روحِ اسلام ہے۔ انکار روحِ حسینیت ہے۔ انکار..... جا، نہیں مانیں گے۔ تمہارے دھوکے تمہیں مبارک، ہمارا سچ ہمیں۔ انکار لکھنے میں بہت آسان ہے۔ پنج حرفی لفظ بہت آسان ہے لکھنا، کرنا بہت مشکل ہے۔ جان لیوا ہے، بہت نقصان دہ، بہت قربانی چاہتا ہے۔ خود سے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ ساتھ اپنا انکار بھی، نہیں اپنی بھی نہیں مانوں گا۔ بہت مشکل ہے یہ بہت کٹھن منزل۔ معرکۂ خیر وشر کیا ہے؟ معرکہ حق وباطل کیا ہے؟ یہی تو ہے، حق کا دینا خیر، باطل کا ساتھ دینا شر۔ رب کے سامنے تسلیم خیر اور ابلیس کا پیروکار بننا شر۔ معرکۂ خیر وشر یہی ہے۔ بس یہی ہے۔ پورے عالم میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ نہیں رکے گا یہ معرکہ۔ کربلا کا درس کیا ہے؟ جنگِ بدر کیا ہے؟ معرکہ احد میں دندانِ مبارک شہید ہوگئے، چچا حمزہ کے ٹکڑے کر دیئے گئے، بلک بلک کر رو دیئے لیکن سر تشکر سے جھک گئے کہ یہی اللہ کی مرضی، جہاد کیا ہے؟ یہی ہے بس۔ سب کا درس ایک ہے: بس انکار۔

انکار کرو تو جان سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاندان نثار کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آگ وخون میں نہانا پڑتا ہے۔ خاک آلود ہونا پڑتا ہے۔ اپنی خواہشات کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ تیز دھار پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ لاشے اٹھانے پڑتے ہیں۔ جب شعور کے ساتھ انکار ہو تو ہر لاشہ اٹھاتے ہوئے یقین بڑھتا

ہے۔ پختگی آتی ہے۔ ربِّ اعلیٰ کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

انکار جتنی شدت اختیار کرتا چلا جائے انقلاب اسی شدت سے نمودار ہوتا ہے اور پھر ہمارا مسئلہ نتائج نہیں کارزارِ خیر وشر میں اپنا کام سر انجام دینا ہے۔ ایسے ویسے چونکہ چنانچہ لیکن ویکن نہیں، یکسر انکار۔ رب پر کامل یقین کے ساتھ باطل کا انکار۔ طاغوت کا انکار۔ خون رنگ لاتا ہے، پھر انقلاب آتا ہے۔ کب رکا تھا معرکہ حق وباطل! نہیں رکے گا یہ معرکۂ خیر وشر۔ بس غالب وہی رہیں گے جو اپنے رب کے ساتھ جڑے رہیں گے۔ پورے یقین کے ساتھ، پوری سرشاری کے ساتھ۔ انکار روحِ دین ہے، باطل کا انکار۔ طاغوت کی ہر شکل کا انکار، یکسر انکار کوئی مصالحت نہیں، بالکل بھی نہیں۔ قربانی ہی قربانی، سرشاری ہی سرشاری!

سرشاری اسے ہی کہتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے لاشے اٹھانا اور پھر آوازِ بلند سے رب کی کبریائی بیان کرنا۔ یہی ہے دین، اور ہے ہی کیا! اسے کہتے ہیں اپنی نذر پوری کرنا۔ اپنے دعوے کی صداقت کو مجسم کر دینا لیکن یہ ہے بہت مشکل، توفیق پر ہے یہ۔ جانوں کا نذرانہ پیش کرنا اور رب سے التجا کرنا کہ قبول کر لیجیے ہماری قربانی اور پھر یقین کی منزل پر پہنچ کر پکارنا: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیِ وَنُسُکِي وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِيِ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن، کہہ دو بے شک میری نمازاور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے"۔ رب کیلئے خالص۔ باطل ہمیشہ سے گھمنڈ کا شکار ہوتا ہے۔

میں کس منہ سے اس بزرگ سید صاحب کا شکریہ ادا کروں جو ہمیشہ مشکل وقت میں بھولا ہوا سبق یاد دلا دیتے تھے۔ جب بھی دل بہت بے چین ہوتا تو فوری طور پر ان سے فون پر رابطہ پر ہمیشہ کی طرح دانش وحکمت کے ایسے موتی جھڑتے کہ اداس روح تک سرشار ہو جاتی اور ہر مرتبہ تنگ دامنی کا معاملہ آن کھڑا ہوتا لیکن اب منوں مٹی میں پاکستانی جھنڈے میں ملبوس اللہ کے ہاں اپنی دائمی منزل پر اپنی وفاداریوں کے صلے میں یقیناً جنت میں بیٹھے اپنی جاودانی کامیابی پر مسرور ہوں گے۔ ان کے فراق میں ان کے موصول پیغامات سے دل کی پیاس بجھاتا رہتا ہوں۔ تین دن قبل ایک اہم کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا جہاں آزادی کے نامور ہیروز اور ان کی جدوجہد آزادی کی جب بات ہوئی تو میرے حصے کا تفاخر مردِ مجاہد سید علی گیلانی کا تذکرہ آیا تو ایک عرصے کے بعد پھوٹتی سحر اچھی لگی، صبح نور کی تازگی دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی، اور سجدہ شکر ادا کیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ روح کا سارا آلام ڈھل گیا ہے اور روٹھے ہوئے الفاظ ایک دفعہ پھر ایک قطار میں مسکراتے کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں، پھر سے ہمدم، ہمدرد اور غمگسار، بڑھ کر گلے ملنے کیلئے متمنی، جونہی میرے بیانئے نے محبت سے بازو پھیلائے فوراً بغیر کسی تاخیر کے برچھی کی طرح سینے میں اتر گئے۔

یہ سب ایک بوڑھے، بیمار وعلیل اور ایک سفید ریش کے حامل بزرگ کی وجہ سے ہوا جن سے برسوں پہلے حرم میں نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ تین ہفتے ان کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس کے بعد ملاقات کی آرزو برسوں سے دل کو بے چین کئے رہی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ دل کی مراد اب اس زندگی میں تو پوری نہیں ہو سکتی اور اس بات سے بھی واقف تھا کہ کبھی نہ تو ان سے پہلے کی طرح بات ہو سکے گی اور نہ ہی ان کو دیکھ سکوں گا لیکن اس کے باوجود فون پر یا بلاواسطہ ان سے عمر بھر رابطہ رہا۔ سید علی گیلانی مرحوم جنہوں نے اس کارزار میں قدم رکھنے سے قبل اپنے رب سے یہ عہد کیا:
قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔(انعام:162)

اپنی زندگی کے بیشتر قیمتی سال بھارتی مکار ہندو بنئے کی بنائی ہوئی جیلوں میں گزار دیئے اور برسوں گھر میں نظر بندی کی حالت میں ہی ان تمام ظالموں کی خواہشات کے منہ پر تھوک کر اپنے اس رب کے ہاں حاضر ہو گئے جس نے قرآن میں اپنے ایسے بندوں کو یہ بشارت دی کہ:
یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾ اے نفسِ مطمئن، چل اپنے رب کی طرف اِس حال میں کہ تو اپنے انجامِ نیک سے خوش اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ (الفجر:27-30)

زندگی کی آخری دہائی میں جہاں رابطے کے تمام ذرائع پر مکمل پابندی کے ظلم و ستم برداشت کئے وہاں ان کی اولاد پر بھی زندگی تنگ کر دی گئی۔ درجنوں مرتبہ جس کے مکان پر راکٹ برسائے گئے، جسے خلقِ خدا کے قلب و دماغ سے اتارنے کی ان گنت سازشیں کی گئیں لیکن وہ اتنا ہی زیادہ قلب و روح کی جان بنتا چلا گیا۔ جسے تھکا ڈالنے، دھمکانے اور خریدنے کا ہر حربہ آزمایا گیا لیکن وہ ہر دفعہ تازہ دم، کسی خوف سے عاری اور کسی بھی خطرے کی پرواہ کئے بغیر مایوسی کو دھتکارتے ہوئے منزل کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا. اور بالآخر اس مظلوم نے اسی بے بس شہر سرینگر میں نظر بندی کی حالت میں اپنے رب سے ملاقات کیلئے رخصت ہو گیا جہاں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعوی کرنے والے اس بزرگ سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ کرفیو کا اعلان کر کے اس کے نماز جنازہ پر بھی پابندی لگا دی گئی اور کفن کے طور پر پاکستانی پرچم کو اتارنے کا حکم دیتے ہوئے مردِ مجاہد کی وصیت کے خلاف شہدا کے قبرستان میں دفن ہونے تک کی اجازت نہ دی گئی لیکن تاریخ نے دیکھا کہ دنیا بھر میں ان سے محبت کرنے والوں نے اپنے آنسوؤں کے ساتھ ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی اور میں نے سینکڑوں ایسے افراد کو بلک بلک رروتا ہوا دیکھا جنہوں نے کبھی ایک بار بھی ان کو نہ دیکھا اور نہ ہی براہ راست ان سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

پابندی سے قبل اس مردِ مجاہد کو کرفیو کی پابندیوں کی بنا پر برسوں مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے کی اجازت ملی، نہ ہی وہ اپنے کسی عزیز یا ہمدم کے ہاں کسی بھی خوشی یا غمی میں شریک ہونے دیا گیا، گویا اسے کشمیریوں سے دور رکھنے کی ایک سازش پر عمل جاری رہا لیکن اس تمام آلام و مصائب کے باوجود وہ اس شان اور عزم صمیم سے کھڑا رہا کہ عظمت اس پر ٹوٹ ٹوٹ کر برستی رہی اور اس کی ایک اپیل پر سارے کشمیر کے مرد و زن اور جوان دیوانہ وار گولیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونا اپنا ایمانی فرض سمجھتے رہے۔

دوسروں کا ذکر ہی کیا، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مقبوضہ کشمیر کی جماعت اسلامی نے بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور حریت کانفرنس سے مطالبہ کیا گیا کہ ان کو الگ کر کے جماعت کے کسی اور لیڈر کو نمائندگی کا اختیار دیا جائے۔ کمالِ جرات لیکن نہائت صبر و تحمل کے ساتھ وہ اپنی راہ پر گامزن رہا۔ سرینگر کے ایک مزدور کا بیٹا جس نے اپنی بھرپور جوانی میں اپنے لئے ایک راہ چن لی تھی اور پھر عمر بھر ناک کی سیدھ میں اس راہ پر چلتا رہا اور کبھی کسی موقع پر اس کے قدم نہیں ڈگمگائے، جسے دیکھ کر تو حیرت ہوتی تھی، جس کے بارے میں سنو تو دل سے بے اختیار اس کی درازی عمر کی دعائیں نکلتی رہیں اور غور کریں تو اھدنا الصراط المستقیم کا مفہوم سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ عمر بھر اس نے جھوٹ اور فریب کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور عمر بھر اس کو کوئی مشتعل بھی نہیں کر سکا۔

وہ جانتا تھا کہ راہ کٹھن بھی ہے اور طویل بھی لیکن وہ پھر بھی اپنی ترجیحات اور مقاصد پر یکسو رہا۔ وہ راز اس پر آشکار ہو گیا تھا کہ جس سے مسلم دنیا کے اکثر رہنما اب بھی بے خبر ہیں کہ عرصہ گیر امتحان میں اصل اہمیت کامیابی اور ناکامی کی نہیں، حسنِ نیت اور حسنِ عمل کی ہوتی ہے۔ آدمی نتائج کا نہیں

جدوجہد کا مکلف ہے، نتیجہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پہلے تو وہ خود اپنی پارٹی قیادت کے خلاف صف آراہوا، جدجہد کے طویل برس اوران گنت قربانیاں بھی اسے تھکانے میں ناکام رہیں۔ پارٹی کے کارکنوں کو آوازدی جو ہمیشہ کی طرح اس پر اعتماد اپنا نصب العین سمجھتے تھے کہ زندگی کی کتاب میں جاہ پسندی، ریااور مفاد کا کوئی باب نہیں۔ اپنا سارا اخلاقی دباڈال کر اس نے جماعت کی قیادت کو بدل ڈالا، پھر وہ حریت کانفرنس کی مصلحت کا شکار ہونے والی قیادت کے خلاف اٹھا.. ایک فرد، متعدد لیڈروں اور گروہوں کے خلاف جو پاکستان کو بھول کر بھارت سے مذاکرات پر آمادہ ہوگئے تھے، جانتے ہوئے بھی کہ کن لوگوں نے انہیں آمادہ کیا تھا۔

اندلس کا جلیل القدر حکمران درباریوں کے ساتھ نو تعمیر محل میں نمودار ہوا جس میں سونے کا قبہ جگمگا رہا تھا۔ جب دوسرے داد دے چکے تو قاضی سعید کی طرف متوجہ ہوا "بادشاہ تم پر شیطان سوار ہے قاضی نے کہا کہ سونے سے عمارتیں نہیں بنائی جاتی" آسمان اور زمین کے درمیان ایک سناٹا تھا اور دل تھے جو خوف اور اندیشوں سے دھڑک رہے تھے۔ جب بادشاہ کی آواز ابھری "سعید کو لوگ بے سبب ہسپانیہ کا ضمیر نہیں کہتے، قبہ گرادیا جائے"۔

کبھی کبھی ایک تنہا آدمی اٹھتا ہے اور منظر کو بدل ڈالتا ہے۔ علی گیلانی فرشتہ نہیں تھا۔ چند لمحوں کیلئے مان لیتے ہیں کہ ان کے اپنے تعصبات ہوسکتے تھے اور ناقص فیصلے بھی، ان کی ہر رائے اور ہر اقدام سے اتفاق ضروری نہیں، نہ اس سے اختلاف کرنے والوں کی نیت پر شبہ کرنے کا کوئی جواز ہے، ہوسکتا ہے ان کی عقلیں وہی کہتی ہوں جس پر وہ عمل پیرا ہیں؟ دنیا کے بدلے ہوئے ناساز گار حالات اور پہاڑ جیسی رکاوٹیں، لیکن بزرگ درویش ان سے مختلف ثابت ہوا۔ وہ ایک صاحبِ یقین تھا اور صاحبِ یقین کبھی مرجھاتا اور مایوس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات سے اوپر اٹھ جاتا ہے اور ایک برتر مقصد کیلئے ہر چیز کو تیاگ دیتا ہے۔ قوموں کو ایسے لوگ انعام کے طور پر عطا کئے جاتے ہیں اور کوئی الٹا لٹک جائے ان کی راہ کھوٹی نہیں کرسکتا، اسی لئے وہ جدوجہد آزادی کا کامیاب استعارہ بن گیا۔

سید علی گیلانی نے حریت کانفرنس کی درماندہ قیادت اور اس کے عقب میں سازشیں کرنے والے بھارتیوں اور شاطر امریکیوں کو بالآخر شکست سے دوچار کردیا جب استعمار سارا زور کشمیریوں کو تنہا کرنے کیلئے صرف کررہا تھا، جبکہ پاکستانی حکومت بھی تھک چکی اور دیگر ادارے بھی راستہ بھول چکے ہیں۔ شاہ محمود قریشی نے بطور وزیر خارجہ امریکی ایما پر کشمیر کی بندر بانٹ کرنے کیلئے کشمیری لیڈر میر واعظ کے ساتھ ساز باز شروع کرتے ہوئے خصوصی طور پر واشنگٹن میں آصف زرداری کے ساتھ اس کشمیری لیڈر کی ملاقات بھی کروائی تھی تو یہ مردِ مجاہد سید گیلانی ہی تھے جنہوں نے بروقت اس سازش کی دہائی دیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح کشمیریوں کی مدد سے اس مذموم منصوبے کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ان دنوں بھی ٹیلیفون پر میری جب ان سے بات ہوئی تو انہوں نے پاکستانی حکمرانوں کو بھارت کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھانے پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ ممبئی میں دہشتگردی کا شور مچانے والا بھارت اب بلوچستان، سرحد، کراچی اور پاکستان کے دیگر دوسرے بڑے شہروں میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مسلسل دہشتگردی کا ارتکاب کرتے ہوئے پاکستان کی سلامتی کیلئے ایک مستقل سنگین خطرات پیدا کررہا ہے اور پاکستانی حکومت ان کے ساتھ دوستی کیلئے مرتی جارہی ہے۔ میں ان کی

آواز کا کرب بڑی شدت اور ندامت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ سقوط کشمیر کا معاملہ بھی عمران خان کے اسی وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کے دور میں ہوا۔

اب ضرورت اس امر کی ہے سقوط کشمیر کے ذمہ داران کے خلاف کڑی تحقیق کیلئے انہیں احتساب کے کٹہرے میں کھڑا کر کے کشمیریوں کو یقین دلایا جائے کہ کشمیر کا وکیل آئندہ انہیں کبھی بھی مایوس نہیں کرے گا اور اس کے ساتھ ہی اقوام عالم کو یہ واضح طور پر بتائے کہ سفاک مودی کشمیر میں خونی کھیل کی آڑ میں کشمیر کی آبادی کا تناسب بدلنے کی جو کوششیں کر رہا ہے اس سے اگر خطے میں جنگ کا آتش فشاں پھٹ گیا تو نہ صرف جنوبی ایشیا میں تباہی وبربادی ہو گی بلکہ یہ عالمی جنگ کا بھی پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ دیگر مسلم ممالک میں بھی کشمیر کے حالات سے متعلق شدید تشویش اور غصہ پایا جاتا ہے بلکہ مودی کی فسطائیت کا کینیڈا میں خالصتانی سکھ کے قتل نے دنیا کے سامنے بھارت کا مکروہ چہرہ عیاں کر دیا ہے۔

5/اگست کو آرٹیکل 370 ختم کرنے کے بعد بھارت نے کشمیر کو اپنا حصہ بنانے کیلئے وہی حکمتِ عملی اپنائی ہے جو کبھی اسرائیل نے فلسطین پر قبضہ کرنے کیلئے بنائی تھی کہ سب سے پہلے کچھ اسرائیلی فلسطین جا کر آباد ہوئے پھر انہوں نے اپنی آبادی میں اضافہ شروع کیا اور مقامی فلسطینیوں سے منہ مانگی قیمتوں پر زمینیں اور جائدادیں حاصل کرنا شروع کی اس کے بعد انہیں لالچ دیا اور پھر تیزی سے منہ مانگی قیمت پر زیادہ سے زیادہ زمینیں خریدنے لگے اور زیادہ تر فلسطینی علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ بالکل یہی طریقہ اب بھارت نے آرٹیکل 370 کا خاتمہ کر کے مقبوضہ جموں کشمیر میں اپنایا ہے۔ انڈین آرمی بلا اجازت گھروں میں داخل ہو کر جسے چاہتی ہے اٹھا لیتی ہے۔ خاص طور پر جوان بچوں کو حریت پسند کہہ کر اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور پھر چند دن کے بعد ان کی تشدد شدہ لاشیں کسی اور علاقے سے ملتی ہیں اسی طرح مسلم عورتوں کو گھروں سے اٹھا لیا جاتا ہے اور عصمت دری کے بعد یا تو مار دیا جاتا ہے یا پھر انتہائی بری حالت میں مجبور خواتین کسی علاقے میں پھینک دی جاتی ہیں۔ یہی نہیں کسی بھی گھر کو آگ لگانا گھر سے سامان لیجانا اور توڑ پھوڑ کرنا تو روز کا معمول بن گیا ہے۔ بین الاقوامی میڈیا کو کشمیر سے دور رکھا جا رہا ہے۔ مودی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تحریک حریت کو بندوق کے زور پر کچل دیا جائے۔ مودی حکومت برہان وانی کی شہادت بعد نوجوانوں کے جذبہ آزادی دیکھ کر حواس باختہ ہو چکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ پندرہ ہزار سے زائد نوجوانوں کو پکڑ کر عقوبت خانوں میں پہنچا دیا گیا ہے جن میں دو ہزار سے زائد خواتین بھی شامل ہیں۔

ایک مختصر حدیث سن لیں: "اہل ہند کے مسلمان پہلے اہل کفر ہند سے جنگ کریں گے اور ان کے امرا اور روسا کو گرفتار کریں گے پھر شام میں مریم کے بیٹے کا ساتھ دیں گے"۔ گویا یہ پاکستان کی منزل یا تقدیر پہلے سے طے ہو چکی ہے۔ جو مرضی کر لیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ تندی باد مخالف کا ساتھ دینا ہے یا منافقین غم گسار کا۔ اب مخالفین جو کچھ مرضی کر لیں، جتنا مرضی زور لگا لیں، قدرت کے اٹل فیصلوں کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ خطے میں ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں کہ پاک وہند کا محاذ ایسا گرم ہو جس کے جواب میں مکمل جنگ ہو اور میرے آقا کا فرمان مکمل ہو کر رہے گا۔ حدیث کے دوسرے حصے کے مطابق شام میں جانے سے مراد اسرائیل کے ساتھ مکمل جنگ کی پیشگوئی ہے۔ یہ وقت اور موقع کب آئے گا، اس کیلئے فی الحال وقت کا تعین مشکل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسا ہو گا ضرور، چاہے ہمارے اپنے دور میں ہو، یا آنے والی نسل کو یہ معرکہ درپیش ہو کیونکہ کتاب لکھنے والے نے اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے اور لکھنے والے نے تو زمانے کی قسم کھا کر، وقت کو گواہ بنا کر خبردار کیا ہے اور زمانے میں پیش آنے والے سارے واقعات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ میرا رب اپنے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا: رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (العمران:9) پروردگار! "تُو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ تُو ہرگز اپنے

وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے"۔ اور اس کے احکام کی تکمیل میں کہا جانے والا "کن" فوری طور پر "فیکون" میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

سید علی گیلانی کی سوچ و فکر اور ان کے قافلے کو میرا، ایک عام پاکستانی کا سلام پہنچے۔ انہوں نے اپنے عمل سے ہماری ساری مایوسی دھو ڈالی ہے۔ ہمارے لئے انہوں نے ایک تابہ فلک ایک مشعل فروزاں کر دی ہے اور ہمیں یاد دلایا ہے کہ انسانیت کا مستقبل ابلیس اور مایوسی پھیلانے والے اس کے کارندوں کے پاس نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ جو امید کا رب ہے اور جس کی کتاب برملا یہ کہتی ہے کہ: اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ؕ وَیُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ہَادٍ،وَ مَنْ یَّہْدِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ:(اے نبیؐ) کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں حالانکہ اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں، اور جسے وہ ہدایت دے اسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں، کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے؟

ابھی میں یورپی یونین کے ہیومن رائٹس گروپ کے ساتھ ایک خصوصی ملاقات سے واپس لوٹ رہا ہوں۔ اس کانفرنس میں ایک خصوصی ملاقات میں انسانی بنیادی حقوق پر نگاہ رکھنے والی تنظیموں ایمنسٹی انٹرنیشنل، واچ ڈاگ، ہیومن رائٹس انٹرنیشنل، اینٹی سلیوری انٹرنیشنل اور گلوبل رائٹس کو کشمیریوں پر ہونے والی زیادتیوں سے جب آگاہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تمام ادارے بھی کشمیریوں کے انسانی حقوق اور دیگر حقوق تلفی کا نہ صرف اعتراف کرتے ہیں بلکہ ان کی ثابت قدمی پر بھی نازاں ہیں اور ایک بار پھر کشمیریوں کے حقوق کی بازیابی کیلئے سرگرم ہونے کا یقین دلایا ہے۔ جناب سید صاحب! آپ تو اپنے کردار اور عمل کے ساتھ جاوداں ہو گئے اور اپنے پیچھے نے والوں کو ایک ایسا راستہ دکھا گئے جہاں جان بھی چلی جائے تو یہ سودہ مہنگا نہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کا تذکرہ ہمیشہ ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلاتا رہے گا۔

برومنگل 30 صفر المظفر 1446ھ 3 ستمبر 2024ء

یادوں کی دہلیز

ماہِ ستمبر۔۔۔میری ماں کی 50ویں برسی کا مہینہ !اس دفعہ بھی یہ ماہ اور دن لندن میں خاموشی سے گزر گئے۔پہلے یہ دن اپنے آبائی شہر فیصل آباد میں گزارا تا تھا،گھر کے وسیع صحن میں جہاں میری ماں خیرات،نیاز کی دیگیں اور قربانی کا گوشت بانٹا کرتی تھی،اب وہاں پر اس کی برسی کی دیگیں محلہ میں برتائی جاتی ہیں۔سامنے برآمدہ میں محلہ کی عورتیں قرآن خوانی اور کھجور کی گٹھلیاں پڑھتی تھیں اور بعد میں دعا کے بعد کھانے کے دوران میری ماں کی بے شمار نیکیوں کے ذکر کے ساتھ ایک لمبی آہ بھر کر ایک اور سال گزر جانے کا اعلان ہو جاتا ہے۔میں صبح سویرے قبرستان میں اپنی والدہ محترمہ سے ملاقات کر کے دیگر دوسرے عزیز واقارب کی قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھا کر گویا اپنے دل کی تسلی کیلئے ہر سال یہ عمل دہراتا تھا اور واپس آنے سے پہلے اس خاموش مٹی کی ڈھیری کے پاس کچھ وقت کیلئے بیٹھ کر اپنی تمام دل کی باتیں کرنے بیٹھ جاتا تھا۔میں اسے اب بھی اپنے ارد گرد ڈھونڈتا ہوں،چپکے چپکے پکارتا ہوں مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔پیر وارث شاہ نے کیا سچ کہا ہے۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ آکھیں
کون رٹھرے یار مناوندائے
ایہا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی
جیہڑاں گیاں نوں موڑ لیاوندائے
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے
اینویں جھوٹڑا لوک دلاوندائے

پہلے نہیں مانتا تھا مگر آج چار دہائیوں کے بعد میں اس حقیقت کو مان چکا ہوں کہ موئے اور وچھڑے کبھی نہیں ملتے،ان کا انتظار فضول ہے،انہیں ڈھونڈنا اور ان کی ہمہ وقت آس رکھنا فضول ہے مگر عجیب بات کہ اس حقیقت کو دل آج بھی نہیں مانتا۔

یہی وجہ ہے کہ ہر سال ماہِ ستمبر کی پانچ تاریخ مجھے میرے تنہا اور بے دعا ہونے کا احساس دلاتی ہے۔مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ ہستی اور محترم شخصیت میری دنیا سے اٹھ گئی جس کے ہوتے ہوئے دنیا بھی میری تھی اور دنیا کے یقین بھی میرے تھے۔اب میری پشت خالی ہے جس پر مفادات اور لین دین سے بھرے رشتوں کے تازیانے برستے رہتے ہیں،میں گھبرا کر اسے یاد کرتا ہوں جس کے ہوتے ہوئے میں بھی سلامت تھا اور میری شناخت بھی!

میری ماں جس نے مجھے اپنی محبت کے مکتب میں اسباق زندگی اور رموزِ زندگی کی آگہی اور شعور دیا۔جس نے انسانوں سے محبت میری گھٹی میں ڈالی،خلقِ خدا میری تربیت کا حصہ بنائی،انسانوں کو جانچنے اور پرکھنے کا معیار جاہ وحشم نہیں اعلیٰ انسانی صفات کو ٹھہرایا۔حلال وحرام کے درمیان فرق کی وضاحت سمجھائی،رشتوں کی اہمیت اور تعلقات کو نبھانے کا طریق میری فطرت کا جزو بنایا جو قدم قدم پر میری رہبر ومعاون رہی۔تمام عمر میں اس کی انگلی تھام کر چلتا رہا اور وہ مجھے چلاتی رہی۔وہ جو غریب وپسماندہ رشتہ داروں بوڑھی میلی مائیوں اور حاجت مندوں کو ہتھیلی کا چھالہ بنائے رکھتی تھی،وہ جسے عزت کرنے اور کروانے کا سلیقہ آتا تھا،جس کی ہمدرد طبیعت ہمیشہ خدمتِ خلق کے بہانے ڈھونڈتی تھی،جب وہ دنیا سے رخصت ہوئی تو سرخ گلابوں کے رنگ میں مسکراتی ہوئی سب کو چھوڑ کر اپنی دائمی منزل کی طرف چل دیں،دعائیں ناتواں ہونے لگیں،حروف سہم سے گئے،رشتے بے وجود اور شرمندہ دکھائی

دینے لگے اور شناختیں نامعتبر ہونے لگیں۔ وہ در و دیوار جہاں قدم قدم پر اپنے ہونے کی گواہیاں ملا کرتی تھیں، اجنبی لگنے لگے اور شہر فیصل آباد جس کی گلیاں سڑکیں اور فضائیں زندگی کا ناگزیر حصہ تھیں، غیر ہونے لگیں۔ مجھے لگا کسی نے مجھے اچانک زور دار دھکا دیکر کسی سمندر میں اچھال دیا ہو! کسی ایسے منطقے پر..... جہاں ہر طرف دھوپ ہی دھوپ ہو کہیں سایہ نظر نہ آتا ہو، وہ میرا گھر جہاں میں اپنی ماں کی محبت کی اخلاص بھری دعاؤں کے نادر کھلونوں کے ساتھ اس کی بے لوث ممتا کی نرم چادریں اوڑھ کر بے فکری کی نیند سویا کرتا تھا، اس گھر کو یکایک آگ لگ گئی ،اس میں میرا بچپن میرے خواب گھروندے، میرا کھیل کا سارا سامان، مامتا بھری لوریاں سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا اور میں اس گھر کے آنگن میں کھڑا تنہا سوچتا رہا اب کیا ہو گا؟ اس کی تصویر اپنی مہربان شبنمی مسکراہٹ سے مجھے دیکھتی رہی!! وہ گھر جو مجھ سے 1976ء میں چھن گیا تھا اس کی راکھ اب بھی میرے دل کے پلو سے بندھی ہے جس سے اس کی مامتا کی بھینی بھینی مہک اڑتی ہے جو میرا یقین تھی۔

میری ماں! خدا اور اس کی کائناتوں میں چھپے محبت کے بھیدوں کو جاننے کا واحد ذریعہ تھی۔ خدا، ماں اور محبت کی تکون میں گم رہنے والا اپنی ماں کا یہ اداس بیٹا آج بھی اس تکون سے اس گمشدہ کڑی کو ڈھونڈنے کیلئے جان کو بیمار کئے رکھتا ہے جو پانچ دہائیوں قبل بد نصیبی کے ایک بھاری پل نے اس سے چھین لیا تھا۔ اس کی کائناتوں کا جغرافیہ درہم برہم کر دیا تھا، وہ جغرافیہ آج بھی درہم برہم ہے کائنات نامکمل اور ادھوری ہے حالانکہ محبت اور خدا کی موجودگی پر اس کا ایمان بھی کامل ہے مگر ماں کا نہ ہونا ایک ایسی مسلسل کمی ہے جو جان کو آزار کی طرح لگی ہوئی ہے۔ مائیں اپنی اولاد کیلئے بہت اہم ہوتی ہیں چاہے وہ جیسی بھی ہوں مگر مائیں اولاد کیلئے کتنی ضروری ہوتی ہیں اس کا اندازہ ان کے جانے کے بعد ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ماں تو آکسیجن کا نام ہے جس کے بغیر انسان حبس اور گھٹن کے مارے اندر سے مرنے لگتا ہے اور پھر مرتا ہی چلا جاتا ہے۔

میری سادہ دل خوبصورت نیک اور مہربان ماں، وہ سفید کے ٹی کی شلوار اور سفید ٹوپی والے برقعے والی محترم عورت جس کی شخصیت کا حسن اور پاکیزگی اس کے گرد نور کے ہالے کی طرح رہتی تھی جو تمام عمر بناوٹ تصنع اور دنیاوی آلائشوں سے دور رہی، جس نے خدا اور خلقِ خدا کو عجز انکساری، رحم محبت اور خدمت کے ذریعے پہچانا۔ جو تکبر ظلم، زیادتی اور "میں" سے یکسر انجان تھی اور ہمیں بھی ان فضولیات سے دور رہنے کا درس دیا کرتی تھی۔ جس نے اعلیٰ انسانی اقدار، نیکی محبت اور خدمت کا سبق ہمیں اٹھتے بیٹھتے دیا، جس نے برائی سے نفرت اور اچھائی سے محبت کا شعور ہماری فطرت کا حصہ بنا دیا۔ وہ عظیم الشان خاتون جب اس دنیا سے رخصت ہوئی تو اپنے پیچھے ایک ایسا بے انتہا خلاء چھوڑ گئی جو بعد میں کبھی بھی پُر نہیں ہوا اور اس امر کا علم بھی تجربہ سے ہوا کہ ماؤں اور محبتوں کا خلاء کبھی بھر انہیں کرتا، یہ ہماری غلط فہمیاں ہیں جو اس معاملے میں ہمیں دھوکے پر دھوکہ دیتے چلی جاتیں ہیں، سو ایسا ہی ہوا۔ ان گزرے سالوں میں ماں تو کیا کہیں ماں کی شبیہ کا بھی گمان نہ گزرا جہاں میں اپنی اداسی ڈھیر کرتا اور اس جدائی کا افسانہ رقم کرتا جس نے میرے اندر حشر اٹھا رکھا تھا!

سوائے میری پیاری ماں! مجھے بتائیں کیا کروں؟ آپ یاد آتی ہیں تو حُسن، نیکی اور محبت یاد آتی ہے اور وہ مسلسل کمی جس نے روح کو بے سکون کر رکھا ہے، ہر سال ماہِ ستمبر میری آنکھوں میں پانی اور دل میں نمی چھوڑتا ہے۔ ہر دن مجھے آپ کی یاد کی دہلیزوں پر ننگے پاؤں کھڑا ہونا پڑتا ہے... میں سوچتا ہوں آخر اس خوبصورت اور مہربان عورت کو میں بھول کیوں نہیں جاتا؟ جو آج سے 48 سال قبل زندگی کے رنگین چوکھٹے سے نکل کر مٹی کی ایک سونی ڈھیری میں

سما گئی تھی اور حقیقت سے واہمہ ہو گئی تھی۔ اس کی نرم روئی میرے دل کی روئی کی طرح کیوں دھنکتی رہتی ہے؟ اداسی مجھے ہمہ وقت اپنے دل میں بیٹھی کیوں نظر آتی ہے؟

یہ ایک عجیب سوال ہے جو مجھ سے اب تک حل نہیں ہوا اور 1976ء سے 2024ء آ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی جنتی ماں سے کہنا چاہتا ہوں.....

.....ماں! اب میں آپ کو اس قدر یاد نہیں کر سکتا، اس قدر اداس نہیں ہو سکتا کیونکہ مجھے زندگی میں اور بھی بہت سے کام کرنا ہیں۔ میرے پوتے پوتیاں اور صباء بھی مجھ سے آپ کے بارے میں بے شمار سوالات کرتی ہیں، شاید میرے جوابات کی روشنی میں خود کو آپ جیسا بننا چاہتے ہیں۔ ان سب کی شدید خواہش ہے کہ آپ ان کے خواب میں آئیں ان سے بے شمار باتیں کریں۔ ان کی اداسی دور کریں، وہ اپنے دل کی تمام باتیں حسرتیں صرف آپ سے شیئر کرنا چاہتے ہیں، اس روتی بسورتی دنیا میں ہنس کھیل کر جینا چاہتے ہیں اور میری پیاری ماں! مجھے زندگی میں اور بھی بہت سے کام کرنا ہیں، کچھ لکھنا پڑھنا ہے ، دنیاداری کرنی ہے اور سب سے بڑی بات کہ مجھے جینا ہے زندہ و نظر آنے والے دوسرے کامیاب لوگوں کی طرح... آپ کی یاد کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ مجھے ہنسنے کھیلنے نہیں دیتی، فضا کی حقیقت اور جدائی کی کہانی سنا کر ہر ایسے کام سے روکتی رہتی ہے جو دنیاداری اور کامیابی کیلئے از حد ضروری ہے۔ لہٰذا میری ماں ، میری اچھی ماں مجھے دعا دو، میں تمہیں بھول جاؤں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم مجھے یہ بد دعا کبھی نہیں دو گی!

کما کے دولت میں ماں کو اتنا بھی نہ دے پایا
جتنے پیسوں سے وہ میرا روز صدقہ اتارا کرتی تھی

بروز جمعرات 2 ربیع الاول 1446ھ 5 ستمبر 2024ء

یومِ دفاع کا پیغام

مزاحمتی قوت گرتے ہوؤں کو پیروں پر کھڑا کرتی ہے، ڈوبتے ہوؤں کو تیرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور ساحل پر لا پٹختی ہے۔ بیمار کو بیماری سے جنگ میں فتح یاب کرتی ہے (اللہ کے حکم سے) بجھتے دیئے کی لو بجھنے سے پہلے تیز ہو جاتی ہے، کیوں؟ شاید دیا دیر تک جلنا چاہتا ہے۔ یہ اس کی مزاحمت ہے۔ اندھیروں کے خلاف کبھی کوئی مسافر کسی جنگل میں درندوں کے درمیان گھر جائے تو تنہا ہی مقابلہ کرتا ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ایک ناتواں مریض جو بستر سے اٹھ کر پانی نہیں پی سکتا ناگہانی آفت کی صورت میں چھلانگ لگا کر بستر سے نیچے کود سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مریض میں وہ مزاحمتی قوت اس کو خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ خطرے کے احساس نے اس قوت کو بیدار کر دیا۔ یہی وہ قوت ہے جو کمزوروں کو طاقتور سے ٹکرا دیتی موجود تھی جس کا کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگرہ پیدا ہو جاتا ہے، چیونٹی ہاتھی کے مقابلے میں اتر آتی ہے، مظلوم کی آنکھیں قہر برساتی اور سلگتے انگارے شعلہ ہے، جوالہ بن جاتے ہیں۔

لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ دنیاوی کامیابی کے حصول کیلئے مزاحمت کمزور پڑ کر سرد ہو جاتی ہے لیکن اگر مزاحمت کے ساتھ "ایمان باللہ" شامل ہو جائے تو مزاحمت کبھی سرد نہیں پڑتی، راکھ میں کوئی نہ کوئی چنگاری سلگتی رہتی ہے جہاں مزاحمتی قوت بیدار ہو تو یہ چنگاری بھڑک اٹھتی ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ یہ مزاحمتی قوت اس وقت بیدار ہو جب خطرہ حقیقت بن کر سامنے آجائے، جب سر پر لٹکتی تلوار کی نوک شہ رگ کو چھونے لگے، جب سرحدوں پر کھڑے مہیب اور دیو ہیکل ٹینکوں اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ سڑکوں اور چھتوں پر سنائی دینے لگے۔ جب ڈیزی کٹر، کروز اور ٹام ہاک بم بارش کے قطروں کی طرح برسنے لگیں۔ جب بہت کچھ "گنوا کر" کچھ بچانے کیلئے ہم مزاحمت پر اتر آئیں گے؟

پاکستانی ذمہ داروں نے پہلی مرتبہ خطرہ کو در حقیقت "دوچار لب بام" سمجھنے کی بجائے انتہائی مناسب جواب دیکر ساری قوم کے دل جیت لئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی قوم لڑے بغیر ہی شکست تسلیم کر لیتی ہے تو یہ جسمانی نہیں ذہنی پسپائی ہوتی ہے۔ ایسی قوم کو جسمانی طور پر زیر کرنے کیلئے دشمن کو زیادہ مشکل نہیں اٹھانی پڑتی۔ ہلاکو خان کی فوجیں کھوپڑیوں کے میناریوں ہی نہیں تعمیر کر لیا کرتی تھیں۔ صلاح الدین ایوبی نے جب "ملت اسلامیہ" کا نام لیا تو ایک غدار فوجی افسر طنزیہ مسکرا اٹھا، کون سی ملت اسلامیہ؟ یہ ذہنی پسپائی کی سب سے گری ہوئی شکل تھی کہ ایک دیو ہیکل انسان اپنے ہی وجود سے انکاری تھا۔ لیکن صلاح الدین ایوبی نے مزاحمت کی قوت کے ساتھ ایمان کو جمع کر کے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے بعد بیت المقدس ناپاک ہاتھوں سے چھین لیا۔

آج ہمیں ثابت قدمی سے میدان میں کھڑا دیکھ کر ہمارا دشمن پہلے سے بڑھ کر مصیبت مول لے چکا ہے۔ ایک یقینی شکست کے امکان کے باوجود محض دنیا پر ظاہری غلبے کی خواہش نے اسے ایک ایسی دلدل میں اتار دیا ہے جہاں اگلا قدم اس کی ظاہری شان و شوکت اور مصنوعی ہیبت کا جنازہ نکال کر رکھ دے گا کیونکہ وہ ایسا ہوتا ہوا کئی مرتبہ دیکھ چکا ہے۔ اس نے بڑے تکبر سے لاہور کے جم خانہ میں چائے پینے کا دعویٰ کیا لیکن کھیم کرن کو بھی اپنے ہاتھوں سے کھو بیٹھا۔ اس نے چھمب جوڑیاں پر قبضہ کر کے آزاد کشمیر کو کاٹنے کا خواب دیکھا لیکن اس کی بھیانک تعبیر سے سامنا کرنا پڑا۔ سیالکوٹ پر قبضہ کر کے ہمارے پنجاب کو تقسیم کرنے کی پوری کوشش کی لیکن بزدلوں کی طرح اپنے جوانوں کی لاشیں اٹھانا بھی بھول گیا۔ بالآخر انتہائی طاقت کے تکبر کا اظہار کرتے ہوئے پانچ سو زائد ٹینکوں کا طوفان چونڈہ کے میدان میں لے آیا اور اپنے دوستوں کو فتح کا جشن منانے کیلئے جو کہہ کر آیا تھا، اسے معلوم نہیں تھا کہ

مقابلے میں وطن کی محبت اور جذبہ شہادت سے سرشار ایسے ناقابل شکست نوجوانوں سے ملاقات ہوگی کہ چشم فلک نے کبھی ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا کہ نوجوان دیوہیکل ٹینکوں کی طرف اس تیزی کے ساتھ لپکے کہ ٹینکے مارے خوف کے حملہ کرنے کی بجائے اپنے وجود کو بچانے کیلئے واپس بھاگ رہے ہیں اور آن کی آن میں دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلی مرتبہ چونڈہ کا میدان دنیا کا سب سے بڑا بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔ دنیا بھر کے جنگی اور دفاعی تجزیہ نگار دانتوں تلے انگلیاں دبائے آج تک حیراں و پریشاں ہیں کہ سرفروشی کی اس انتہا کو کیا نام دیں۔

کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ہمیں گھروں میں بیٹھے ہیبت زدہ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ سارے لاؤلشکر کے باوجود زیادہ خوفزدہ ہے۔ اس کی چڑھائی میں شیر جیسی بے جگری نہیں بلکہ لومڑی جیسی عیاری ہے۔ اب وہ ہمیں دیوار سے لگانے کیلئے پس پردہ دوسرے اقدامات کرنے سے باز نہیں آئے گا یعنی ہمیں سیاسی اور معاشی فتنوں میں مبتلا کرے گا پس آج ہمیں اپنی مزاحمتی قوت کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد "ایمان" ہے اور اس قوت کو مضبوط کرنے والی قوت "اللہ کی نصرت" ہے اور اللہ کی نصرت کیلئے اس کی مکمل حاکمیت کا عملی اعلان کرنا ہوگا۔ جب مومن اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے تو مزاحمت میں اللہ کی نصرت نازل ہو کر اس کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ تاریخ اسلام کے صفحات پر ایسی روشن مثالیں ان گنت تعداد میں جگمگا رہی ہیں جب نہتے مسلمانوں کی مزاحمت نے وقت کے فرعونوں کو زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ آج بھی دنیا بھر میں مزاحمتی تحریکیں پوری شان سے جاری ہیں۔ پتھر نے ٹینک سے شکست نہیں کھائی، دنیا دیکھ رہی ہے کہ معمولی ہتھیاروں سے جدید ٹیکنالوجی کا مقابلہ جاری ہے۔ جتنا ظلم بڑھتا جا رہا ہے اتنی ہی شدت سے مزاحمت بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ گزشتہ گیارہ ماہ سے چاروں طرف سے محاصرہ میں غزہ کے باسی ایسی تاریخ رقم کریں گے کہ دنیا بھر کے فراعین کی پوری قوت کے سامنے، اپنوں کی منافقت کے باوجود ایسی استقامت کا مظاہرہ کریں گے کہ آخرت کی کامیابیاں بھی بوسے لے رہی ہیں۔

لیکن کیا مزاحمت کی صرف ایک ہی صورت ہے؟ جب کوئی جابر وقت اپنے لشکروں کے زعم میں کسی قوم پر چڑھ دوڑتا ہے تو ہر مظلوم ہاتھ ہتھیار اٹھا لیتا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ ایسے وقت میں بغیر مزاحمت کے کشمیریوں کو نسل کشی سے نہیں بچایا جا سکتا جو ہماری مزاحمتی قوت کے شدت سے منتظر ہیں۔ یہ ڈوب رہے ہیں ان کو ساحل پر کھینچ لانے کیلئے بھرپور توانائیوں کی ضرورت ہے۔ آج وہ خطرناک مرحلہ آ چکا ہے جب نحیف و نزار مریض زندگی کی ڈور سلامت رکھنے کیلئے اس پوشیدہ قوت پر انحصار کرتا ہے جو اس کے جسم میں بجلی کی سی طاقت بھر دیتی ہے۔ گونگے، بہرے اور اندھے بھی اس نازک دور کی شدت سے کچھ کر گزرنے کو تیار ہو جائیں تو جن کو اللہ نے تمام تر توانائیوں سے نواز رکھا ہے ان کو اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے سے کس نے روک رکھا ہے؟

گزشتہ ایک ماہ سے سوشل میڈیا پر کچھ بیدار ذہن دوستوں نے ایک ایسی ہی محفل کو سجا رکھا ہے جہاں تاریخی تناظر میں قیام پاکستان کے مقاصد، انگریز اور ہندو استعمار سے ایک ہی وقت میں سیاسی جنگ میں استعمال کرنے والی حکمت و ذہانت، اپنوں کی منافقت، مشاہیر ان پاکستان کے کردار اور عزم اور پاکستان کی سرزمین کو بوسہ دینے، سجدہ کرنے والی پیشانیوں کا ہجرت کے خون آلود سمندر کو عبور کرنے کے لازوال سفر کا تذکرہ، اللہ سے اوفو بالعہد اور

عہد شکنی جیسے جُرمِ عظیم پر استغفار، تجدیدِ عہد کے قول واقرار کے منظر ناموں کو تشکیل دیا گیا، گویا سوشل میڈیا کے صحیح اور بروقت استعمال سے ایک نیا جہاں معرضِ وجود میں لانے کی پاکیزہ کوششوں کے آغاز سے اک نئی صبح کی نوید دکھائی دے رہی ہے

سوشل میڈیا پر پھیلائے گئے منافرت کے سمندر کو قابو کرنے کیلئے ایک اور مثبت کوشش یہ ہوئی کہ ملک کے ایک نامور محب وطن ریٹائرڈ جنرل برادرم خالد لودھی صاحب کو اس پلیٹ فارم پر مدعو کیا گیا کہ ملکی افواج کے بارے میں دشمن کی طرف سے پھیلائے گئے اس غلیظ اور جھوٹے پروپیگنڈے کی کیا توجیہ پیش کریں گے کہ "ہماری افواج نے آج تک کوئی جنگ نہیں جیتی جبکہ ملک کا کثیر بجٹ بھی ان کے کھاتے میں چلا جاتا ہے"۔ میں برادرم نعیم خالد لودھی صاحب کا انتہائی ممنون ہوں کہ کہ انہوں نے میری اس خواہش کو نہ صرف پذیرائی بخشی بلکہ مسلسل چار گھنٹے کی اس مجلس میں جہاں کئی ملکوں میں بسنے والے محب وطن بھی شریک تھے، ان تمام الزامات، خدشات اور سامعین کے تلخ وشیریں سوالات کا بھرپور دلائل سے نہ صرف جواب دیا بلکہ یہ ایک ایسا تاریخی پروگرام بن گیا ہے کہ اس کی ریکارڈنگ کی بھرپور تشہیر کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے لیکچر کا اہم نقطہ جو یقیناً آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے کہ "جس دن ہم نے خود اپنی عزت کرنا سیکھ لیا، اس دن ساری دنیا ہماری عزت کرے گی!

مسلمانانِ پاکستان نے آج اپنی اس طاقت کے اس راز کو پالیا اور اس کو پختہ کر لیا تو یہ وہ مورچہ ہے جس میں پناہ لینے والوں کیلئے دائمی فتح کی خوشخبریاں ہیں۔ مزاحمت ایمانی قوت سے مشروط ہے، اس کو کھو دیا تو سب کچھ چھن جائے گا!!" یاد رکھیں اللہ کو پا کر کبھی کسی نے کچھ نہیں کھویا اور اللہ کو کھو کر کبھی کسی نے کچھ نہیں پایا" یہی ہمارے یوم دفاع کا بہترین پیغام ہے۔

بروز جمعۃ المبارک 3 ربیع الاول 1446ھ 6 ستمبر 2024

عزم وہمت: اقبال کا مسلم نوجوانوں کے لیے پیغام

علامہ محمد اقبال بیسویں صدی عیسویں کی ابتدا میں ملتِ اسلامیہ کے اُفق پر اُبھرنے والے ایک ایسے درخشاں ستارے تھے جس کی روشنی نے زمان ومکاں کی حدبندیوں سے بالاتر ہو کر اُمت کیلئے راہ منزل کی نشاندہی کا فریضہ انجام دیا۔ آج علامہ اقبال کو رخصت ہوئے 80 برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے فیصد صحیح ثابت لیکن اقبال کی فکر اور گہری دوراندیش نظر نے حالات کا تجزیہ کر کے اُمت کو درپیش مسائل اور اُن کے جو حل پیش کیے وہ آج بھی 100 اُمت مسلمہ کی جڑیں ہورہے ہیں۔ حکیم الامت نے خبر دار کیا تھا کہ لادین قوتیں مغرب کی امامت میں ظلمت کا لشکر بن کر ہر محاذ پر سرگرم رہیں گی۔ کھودنے کیلئے انسانیت سوز ہتھکنڈے اپنائیں گی، ظالم کو مظلوم اور ظلم کو انصاف کا نام دیکر آزادی فراہم کرنے کا فخریہ نعرہ لگائیں گی۔ علامہ نے ان حالات کا نقشہ برسوں پہلے یوں کھینچا تھا۔

باطل کے فال وفر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

لیکن اقبال اس سب کے باوجود پُر امید تھے کہ نوجوان نسل محنت اور عملِ مسلسل سے حالات کو تبدیل کر سکتی ہے۔ اقبال نے اپنی بہت سی نظموں میں نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے مثلاً "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام، جاوید کے نام، جاوید سے خطاب۔ علی گڑھ کے طلبہ کے نام، عبد القادر کے نام، ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نام" اپنے اشعار میں نوجوانوں کیلئے والہانہ انداز میں دلی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جوانوں کو سُوز جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

امت مسلمہ کو عروج وترقی کی بلندیوں پر پہنچانے کیلئے نوجوانوں کے دلوں میں دل سوزی اور جذبہ صادق کی بیداری کیلئے اقبال نے اپنے اشعار میں تاریخ اسلام کے واقعات کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ سمویا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کی شاعری میں اسلامی تاریخ یوں سموئی ہوئی ہے جیسے پھول میں خوشبو ۔ اقبال نے اسلامی تاریخ کے بہت سے ناقابل فراموش واقعات کو شاعرانہ حسن کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو ادب عالیہ کے اُفق پر ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ اوپر پڑھنے والوں کے دلوں میں ایک جوش وولولہ پیدا کرتے رہیں گے۔ اپنی نظم "طارق کی دُعا" میں وہ مشہور مسلم جنرل طارق بن زیاد کے بارے میں کہتے ہیں:۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی

طارق بن زیاد بربر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور مسلم سپہ سالار موسیٰ بن نصیر نے اپنی سرپرستی میں اُن کی تربیت کی تھی۔ اندلس کے لوگوں نے شاہ ہسپانیہ کے ظلم وستم کے خلاف اپنی شکایات خلیفہ ولید بن عبد الملک کو پیش کیں۔ خلیفہ کے حکم پر ان کی دادرسی کیلئے طارق بن زیاد سات ہزار مجاہدین

کے ساتھ ہسپانیہ کے ساحل پر اُترا اور تمام جہاز جلاڈالنے کا حکم دیا تا کہ کسی کے دل میں واپسی کا خیال پیدا نہ ہو۔ شاہ راڈرک کی ایک لاکھ فوج کے مقابلے میں طارق کے پاس صرف 7 ہزار کی نفری تھی۔ اس موقع پر طارق نے ایک پر جوش خطبہ دیا اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضور فتح کیلئے دعا کی۔ "طارق کی دعا" کے عنوان سے اقبال نے نوجوانان اسلام میں اُن مجاہدین اسلام کے جذبہ جہاد اور شوق شہادت کو بیدار کرنے کی کوششیں کی ہیں، کہتے ہیں:

دلِ مردہ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرہ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اسی طرح 15ھ میں ہونے والے معرکہ یرموک کا ذکر اقبال نے اپنی نظم "جنگ یرموک کا ایک واقعہ" میں کیا ہے۔ یوں تو اسلامی تاریخ ایسے واقعات سے معمور ہے کہ جس میں ایک مختصر جمعیت نے اپنے سے کئی گنا بڑی فوج کو شکست سے دوچار کیا لیکن جنگ یرموک کے جس واقعے کا ذکر اقبال نے کیا ہے وہ نوجوانوں کے دل کو شوق شہادت سے لبریز کر دیتا ہے کہ جب ایک نوجوان فوجی ڈسپلن کی خلاف ورزی کرتا ہوا سیدنا ابوعبیدہؓ کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ "اُس میں اب مزید انتظار کی تاب نہیں ہے اور آپ مجھے اب جنگ کی اجازت دیجیے، ہاں اگر آپ کوئی پیغام بارگاہِ رسالت میں بھیجنا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں"۔ اقبال نوجوان مجاہد کے جذبہ شوق شہادت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

اے بوعبیدہ رخصتِ پیکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام
بے تاب ہو رہا ہوں فراقِ رسول میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورؐ رسالت پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام

امیر لشکر ابوعبیدہ اس سے کہتے ہیں:

بولا امیر فوج کہ وہ نواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام

اقبال اپنی ولولہ انگیز نظموں میں تاریخی واقعات کے ذریعے نوجوانوں کو اُن کا ماضی اور اسلاف کے کارناموں سے روشناس کراتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس گئے گزرے دورِ زوال میں بھی تمہارے سامنے ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جب مسلم افواج نے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود حق اور انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

"حاصرہ ادرنہ" کے عنوان سے اقبال 1912ء میں ہونے والے اس معرکہ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب بلقان کی ریاستوں بلغاریہ، سربیہ، رومانیہ اور یونان نے ترکی پر حملہ کیا اور اس کے ایک یورپی شہر ادرنہ کا محاصرہ کر لیا۔ اُس وقت ترک فوج کی قیادت اُن کے سپہ سالار غازی شکری پاشا کر رہے تھے۔ جنہوں نے انتہائی بے جگری سے ایک لاکھ سے زیادہ فوج کا مقابلہ کیا ہے وہ تقریباً 5 ماہ تک قلعہ بند ہو کر اُن کے سامنے ڈٹے رہے۔ اس دوران مسلمان افواج کی رسد اور خوراک ختم ہو گئی۔ شکری پاشا نے شہر میں عوام کے پاس موجود خوراک کے ذخائر قبضے میں لینے کا حکم صادر کیا۔ شہر میں غیر مسلم بھی آباد تھے۔ چوں کہ وہ جزیہ ادا کرتے تھے جس کے بدلے مسلم ریاست پر اُن کے جان و مال کا تحفظ لازم ٹھہرتا ہے، مفتی شہر نے سپہ سالار کے حکم کے خلاف غضب ناک ہو کر فتویٰ جاری کیا کہ ذمی کا مال مسلم حکومت اور فوج پر حرام ہے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ ایسے گئے گزرے دور میں بھی مسلم افواج نے خدا کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ زندگی و موت کے اس امتحان کے باوجود ذمیوں کے مال کو ہاتھ تک نہ لگایا گیا۔

چھوتی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
مسلم، خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

نوجوان خواتینِ اسلام کے جذبہ حریت کا اظہار اقبال اپنی نظم "فاطمہ بنتِ عبد اللہ" میں کرتے ہیں۔ یہ عرب لڑکی 1912ء میں ہونے والی طرابلس کی جنگ میں مجاہدین کو پانی پلاتے ہوئے میدان جنگ میں شہید ہوئی تھی۔ فاطمہ کے جذبہ جہاد کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر

نوجوانانِ امت کیلئے اپنی امیدوں کا اظہار کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں

وہ نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو دریافت کرو۔ تمہارا فرض منصبی ایک داعی اور ایک مبلغ کا ہے۔ تمہارا کام بدی کو مٹانا اور نیکی کو قائم کرنا ہے۔ تم ایک ایسے دین کے علمبردار ہو جو پوری دنیا پر غالب آنے اور پوری دنیا سے ظلم شرک اور بے انصافی کا خاتمہ کرنے اور انسانیت کو نجات دلانے کیلئے آیا ہے۔ ہر مسلمان کیلئے لازم ہے کہ اگر وہ اسلام سے وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے تو پھر اس دین کو اپنے آپ پر، اپنے گھر پر، اپنے گرد و پیش پر، اپنے معاشرے پر قائم کرنے کیلئے جدوجہد کرے، اس کے نظام حیات کو اجتماعی طور پر نافذ کرنے کیلئے مکمل کرنے کیلئے اپنی ہر صلاحیت اور قوت کو استعمال کرے۔ اقبال کہتے ہیں:

بندۂ حق وارثِ پیغمبراںؑ
او نہ گنجد در جہانِ دیگراں

بندہ حق پیغمبروں کا وارث ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنے دین کے مطابق اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ اگر گرد و پیش اس کے مطابق نہیں ہوتا تو وہ انقلاب لاتا ہے اور ایک نیا جہان بناتا ہے، جہاں وہ اللہ کے دین کو غالب کرنے اور اُس کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے آزاد ہوتا ہے۔

بروز ہفتہ 5 ربیع الاول 1446ھ 7 ستمبر 2024ء

"اقبال کا فلسفہ: صدیوں پر محیط بصیرت"

علامہ اقبال بلاشبہ ان مفکرین میں سے ہیں جو کہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فلسفے اور افکار کی بنیاد پر ان اذہان کی صفوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی فکر اور فلسفہ صدیوں پر محیط ہوتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کے بعد ایک مجدد پیدا ہوتا ہے جو اپنے افکار اور جستجو سے مسلم میں امہ میں روحِ عیسیٰ پھونکتا ہے، جس سے احیائے اسلام اور ملت اسلامی نئے جذبے اور عزم کے ساتھ عصری تقاضوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔ برصغیر مجدد الف ثانی کے بعد علامہ اقبال کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ اپنی سوچ و فکر کی بناء پر امہ کو درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ گو کہ اقبال بیسویں صدی کے شاعر تھے لیکن ان کا فکر و پیام آج بھی قوموں کی رہنمائی اور بلندیوں تک رسائی کیلئے کارگر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی ہماری دسترس میں ابلاغ کے بے پناہ ذرائع اور تحقیق کیلئے بے پناہ وسائل موجود ہیں، اس کے باوجود ہم اب تک افکارِ اقبال کے اصل اسرار ڈھونڈنے میں ناکام رہے ہیں ۔ان کی فکر و فلسفہ اس سمندر کی مانند ہے جس کی تہہ میں ایک پوری کائنات پوشیدہ ہے اور اس تہہ کی رسائی کیلئے ایک ذہن رسا اور عزمِ صمیم چاہئے۔

اقبال نے جس دور اور ماحول میں آنکھ کھولی، جن حالات میں پرورش پائی، اپنے آس پاس جن تہذیبی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ دیکھی، والدین کی تربیت کے بعد گھریلو معاشی حالات و واقعات نے ان کی شخصیت کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی، اگرچہ ان کی حکومت پورے ہندوستان پر کبھی بھی نہیں رہی لیکن اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کے کثیر علاقے پر وہ حکمران رہے، یہی وجہ ہے کہ انگریز کے دورِ غلامی میں بھی مسلمانوں میں ایک قسم کا احساسِ برتری تھا اور وہ اپنی زبوں حالی کا مداوا اپنے شاندار ماضی کو یاد کر کے کیا کرتے تھے حالانکہ اب حالات بہت بدل چکے تھے اور مسلمان معاشی طور پر بہت کمزور ہو گئے تھے اور نئے آقا انگریز عسکری اور علمی لحاظ سے ان سے برتر تھے اور اپنی حکمت عملی سے نہ صرف اپنی حکومت کو وسیع کر لیا تھا بلکہ اپنے مدمقابل حریف پرتگیزی اور فرانسیسیوں کو بھی پسپا کر کے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔
1857ء میں انگریزوں کے خلاف جن مقامی لوگوں نے مزاحمت کی، ان میں مسلمان پیش پیش تھے۔ ہندوستان کے لوگوں نے اسے "جنگِ آزادی" کا نام دیا اور انگریزوں نے "بغاوت" قرار دیا۔ انگریزوں نے اس بغاوت کیلئے مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور مشکوک مسلم زعماء کو چن چن کر قتل کیا اور معاشی لحاظ سے مسلمانوں کو غریب تر بنا دیا، اس جنگ کی ناکامی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں مایوسی اور بددلی انتہا کو پہنچ گئی۔

قطع نظر اس کے کہ یہ بغاوت تھی یا جنگِ آزادی، یہ مزاحمت یا خروج ناعاقبت اندیشی بے ثمر غم و غصہ پر مبنی تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں دو قسم کے نمایاں ردِ عمل پیدا ہوئے۔ ایک طبقہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ان کی اسلام سے دوری ہے۔ وہ نہ قرآن پر عمل پیرا ہیں، نہ اسلامی اساسی اقدار سے واقفیت رکھتے ہیں اور نہ اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہیں جبکہ دوسرے طبقے کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب جدید تعلیم سے عدم دلچسپی اور دوری ہے، وہ انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے سرکاری ملازمتیں حاصل نہیں کر پاتے، ان میں دنیاداری کی بھی فراست نہیں ہے اور وہ انگریزی حکومت سے اچھے تعلقات بھی نہیں رکھ رہے، اس طبقے کی نمائندگی سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کر رہے تھے۔

ان دو نظریات کے باعث برصغیر کے مسلمانوں پر دو اثرات مرتب ہوئے، ایک تو انہوں نے اپنے بچوں کو قرآنی تعلیم دلوانے اور اسلامی ثقافت پر عمل شروع کر دیا کہ وہ کہیں انگریزی ثقافت میں نہ رنگے جائیں، دوسرا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور کچھ لوگوں نے جدید علوم اور سائنس کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینا شروع کر دی کیونکہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ مقابلے کی سکت نہیں رکھتے، ان

کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ انگریزوں کی حکومت کو تسلیم کر لیں اور وہ علوم حاصل کریں جن کے ذریعے ان کو ملازمت مل سکے اور وہ معاشی طور پر خوشحال ہو جائیں۔ مثبت سوچ رکھنے والا اہلِ علم طبقہ جو تاریخ انسانی اور اسلامی ثقافت سے واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت صدیوں کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یورپ کئی صدیوں سے غور و فکر کی نئی راہوں پر چل کر ہی کامرانی کی اس منزل پر پہنچا ہے اور تحریکِ احیائے علوم سے جدید یورپ کا آغاز ہوا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب اقبال اپنے دورِ طالب علمی میں سر سید احمد خاں کی تحریک سے اپنے استاد میر حسن کے توسط سے واقف ہوئے تھے، چونکہ وہ شروع ہی سے مفکرانہ ذہن رکھتے تھے اس لئے نئے افکار پر توجہ دیتے تھے اور پھر وہ اپنے دور کے علمی اور معاشرتی ماحول کے علاوہ اس زمانے کے سیاسی اور معاشی حالات کے اثرات سے اقبال جیسا حساس نوجوان بے نیاز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اقبال کے سامنے معاشی ناہمواری کے مناظر تھے، یہی وجہ ہے کہ عوام الناس کی بہتر زندگی کے بارے میں سوچنے کے نتیجے میں ان کی جو سب سے پہلی کتاب طبع ہوئی، وہ اقتصادیات کے موضوع پر تھی "علم الاقتصاد" نام کی یہ کتاب 1903ء میں پیسہ اخبار لاہور کے دو سو صفحات پر مشتمل تھی۔

اقبال کی اس کتاب "پاورٹی آف ایلیویشن" کا مرکزی نقطہ یا انسدادِ مفلسی ہے۔ اقبال جیسے انسان دوست نے اس دور میں غربت کی سنگینی کو محسوس کیا اور وہ جانتے تھے کہ جن ملکوں میں غربت ہے، وہاں جرائم بڑھتے ہی جائیں گے۔ اس دور کا سوچئے جب یہ کتاب لکھی گئی اور پھر آج پر نظر دوڑائیے کہ غربت ختم کرنے کا یہ پروگرام تقریباً ہر غریب اور ترقی یافتہ ملک میں نافذ کیا جا رہا ہے، تمام مہذب انسانوں کی یہی خواہش ہے کہ دنیا سے مفلسی ختم ہو جائے۔ اقبال کے ذہن رسا اور نگاہِ دوررس کی داد دینی پڑتی ہے کہ حالات کے تغیرات کو دیکھ کر مستقبل کی تصویر کو واضح کرنے کی سعی کی۔

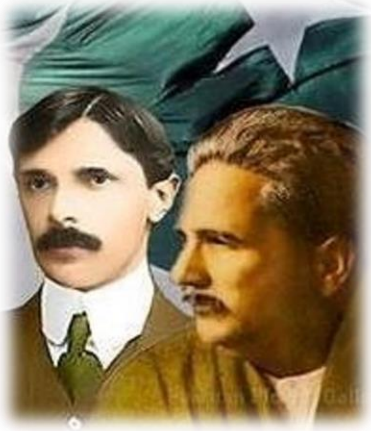

اقبال کی سوچوں کے دھاروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کیلئے ان کی شاعری اور مقالات، جو وہ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر لکھتے رہے، اس میں "الارضُ للہ" کی تفسیر، انسانیت، مردِ کامل کا تصور، نفس، تصوف، اشرف المخلوقات کا کردار، عظمتِ انسان اور انسان دوستی، وحدت الوجود، یورپ کی مادیت پرستی، مناظرِ فطرت، فلسفہ خودی، نظریہ خود آفاقیت، سماجی جمہوریت، غیر استحصالی معاشی نظام، سیاسی وطنیت، مسلم امہ کی حالتِ زار غرضیکہ نظریہ انسان دوستی کے تحت اقبال نے کتنے ہی ایسے تشکیلی عناصر گنوائے ہیں جو اس موضوع کو سمجھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ آج ہم اقبال کی شاعری اور افکار پر اظہارِ خیال کرنا چاہتے ہیں تو یہ کہتے ہوئے بالکل نہیں جھجکتے کہ بیسویں صدی تو اقبال کی صدی تھی ہی، اکیسویں صدی بھی علامہ اقبال کی معلوم ہوتی ہے۔ اس خطے کے کسی مفکر نے دنیائے اسلام پر اتنا اثر نہیں چھوڑا جتنا کہ علامہ اقبال کے فلسفہ، فکر اور شاعری نے چھوڑا ہے۔

مشرق اور مغرب کے علوم کا گہرائی سے مطالعہ کرنا، دنیا کے بڑے بڑے مذہبی مفکرین سے علامہ اقبال کی براہِ راست واقفیت، دورِ جدید کے مغربی افکار پر ان کی تنقیدی نظر، مغرب کی اعلیٰ درسگاہوں میں حصولِ علم اور اہلِ علم سے تبادلہ خیالات کی وجہ سے ان کو وہ وسعتِ نظری اور فکری گہرائی عطا ہوئی جس نے بلاشبہ ان کو بیسویں صدی کا سب سے نمایاں مسلم مفکر بنا دیا ہے:

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور دوسری جگہ یہ فرماتے ہیں:

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ تو غارت گرِ باطل بھی تُو

اقبال انسانوں کی بنائی ہوئی دنیا کے تاریخی حقائق اور زمینی حقائق کو حرفِ آخر نہیں مانتے بلکہ انسان کو انقلاب کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ شرفِ انسانیت اور مساواتِ انسانی کو انقلاب کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ شرفِ انسانیت اور مساواتِ انسانی کے قائل ہیں اور ایسے معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں جہاں ہر انسان کو احساسِ شخصیت ہو، جہاں ہر انسان باوقار ہو۔ وہ انسان کے ارتقاء کے لامحدود امکانات کے قائل ہیں، ایسے امکانات جس کے دروازے عمل سے وا ہوتے ہیں اور اسی بے عملی کو ایک اضطراب کی صورت میں نمودار دیکھنا چاہتے ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اگرچہ اقبال کے تصورِ خودی میں آفاقیت ہے اور ان کا پیغام تمام نوعِ انسان، ہر نسل، ہر خطے اور ہر مذہب کے انسانوں کیلئے ہے اور ان میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں لیکن مثنوی "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" میں انہوں نے ملت اسلامیہ کے مسائل بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشی بدحالی، معاشی ابتری اور سیاسی محکومی کو مدنظر رکھا لیکن دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک الگ ریاست کا خواب بھی دیکھا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے 27 رمضان المبارک کی تقدس بھری رات کو پاکستان جیسی ریاست کو معجزاتی طور پر نمودار کیا۔

یہ تھے ہمارے اقبال جن کی دوررس نگاہوں نے بروقت خواب دیکھا جس کی تعبیر محمد علی جناح کے ہاتھوں ہوئی۔
رہے نام میرے رب کا جس نے پاکستان جیسی نعمت سے نوازا!

بروز اتوار 6 ربیع الاول 1446ھ 8 ستمبر 2024ء

کھوئی منزل کا سراغ

بڑی شخصیات کو بھلانا آسان نہیں مگر ہم نے تو اس کام کو فن ہی بنا دیا ہے۔ یوم اقبال 25 دسمبر اور 14 / اگست کے حوالے سے ہم جو کچھ کرتے رہتے ہیں وہ ہماری انفرادی اور اجتماعی "فنی صلاحیتوں" کا بین ثبوت ہے۔ مگر ان ایام کے حوالے سے کیا کرتے ہیں؟ ہم ان دنوں پر اقبال اور قائد اعظم کی بہت تعریف کرتے ہیں اور پاکستان کی قدر و قیمت کا زور و شور سے ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ہماری تعریف اور ہمارا زور و شور ہماری لاتعلقی اور روحانی، نفسیاتی، جذباتی اور ذہنی کاہلی کا پردہ ہے۔ ہم اقبال اور قائد اعظم کی تعریف اس لیے نہیں کرتے کہ ہم انہیں سمجھتے ہیں بلکہ ہم ان کی تعریف اس لیے کرتے ہیں کہ ہم انہیں سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس کا مطلب واضح ہے: تعریف کرو اور جان چھڑاؤ۔ مگر بڑی شخصیات جان بھی تو نہیں چھوڑتیں، چنانچہ اقبال اور قائد اعظم کا یوم پیدائش اور یوم وفات ہر سال آجاتا ہے، ارضِ وطن کا یومِ آزادی اور قراردادِ پاکستان کی منظوری کا دن بھی ہم سے پوچھتا ہے: "آپ کی تعریف؟"

اور ہم اجتماعی طور پر اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں: "آپ کے کیا کہنے؟ آپ بہت بڑے اور بہت حسین و جمیل ہیں"۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اور 14 / اگست پر ہمارا زور و شور؟ اسے دیکھ کر ہمیں تو اسٹاک ایکسچینج کا زور شور یاد آجاتا ہے۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں، یہ اسٹاک ایکسچینج کی مذمت نہیں، تعریف ہے۔

مگر ہم بڑی شخصیات کو کیوں سمجھنا نہیں چاہتے؟ ماہِ اگست کی شروع میں عزیزم شاکر قریشی نے پرزور اصرار شروع کر دیا کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگست کا پورا مہینہ پاکستان کو شعوری طور پر سمجھنے کیلئے گزارنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخی حقیقت، اس کے معرضِ وجود کے حقائق، مشاہیرانِ پاکستان کے ساتھ بطور پاکستانی شہری اپنی ذمہ داریوں، کوتاہیوں اور آئندہ کے لائحہ عمل پر سیر حاصل گفتگو کرنا چاہتے ہیں بلکہ ایک ایسا تجدیدِ عہد کرنا چاہتے ہیں جہاں روشن اور ترقی یافتہ اسلامی پاکستان کی طرف ہمارا سفر نظر بھی آئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہر ہفتے دو لیکچرز کی ایک سیریز شروع کرنے کا مطالبہ رکھ دیا اور مجھے یہ تحریر کرتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اس مجلس میں مختلف ممالک سے تمام شریک افراد انتہائی بیدار ذہن اور کچھ الگ سے کرنے کے مصمم ارادے کے مالک نظر آئے اور سوالات کی روشنی میں یہ سلسلہ بالآخر اپنی منزل کا راستہ ڈھونڈتا ہوا ابھی تک رواں دواں ہے۔

دراصل شخصیات کا اپنا ہی "سلے سلائے" کا اصول رائج ہوتا ہے۔ دکان سے سلا سلایا سوٹ لیا اور پہن لیا۔ یہ سوٹ کہیں بہت ڈھیلا اور کہیں بہت چست ہوتا ہے۔ کسی کی آستین چھوٹی ہوتی ہے اور کسی کی بڑی مگر ہم ایسی چیزوں کا برا نہیں مانتے۔ آستین لمبی ہو تو ہم اسے موڑ لیتے ہیں اور چھوٹی ہو تو کاندھوں انہیں کو تھوڑا سا سکیڑ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ سوٹ ٹھیک ہمارے سائز کے مطابق ہے۔ مگر بڑی شخصیات سلے سلائے سوٹ کی طرح نہیں ہوتیں۔ سمجھنے کے لیے کپڑے کو پورا ادھیڑنا اور پھر سینا پڑتا ہے۔ یہ کام بھی آسان ہیں، مگر سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ایسا کرتے ہوئے ہم خود بھی ادھڑ جاتے ہیں اور پھر اچانک ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو بہت ناکافی ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر بڑی شخصیت ہم سے کہتی ہے: تمہاری نمو رک گئی ہے۔ آگے بڑھو اور نمو کی طرف چلو۔ یہ اتنا تکلیف دہ عمل ہے کہ اچھے اچھے اس کی تاب نہیں لاسکتے، چنانچہ ہم صرف تعریف پر اکتفا کرتے ہیں۔ بہت زیادہ تعریف پر۔ مثلاً "اقبال ہے اقبال ہے، اقبال ہمارا"، "اے قائد اعظم ترا احسان ہے احسان"۔ یہ سب اچھی باتیں ہیں ضروری باتیں ہیں۔ ان میں تھوڑی بہت محبت بھی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اقبال تو ہمارا ہے مگر

ہم بھی اقبال کے ہیں یا نہیں؟ اور قائد اعظم کے احسان میں جو حسن ہے وہ ہماری زندگی میں کہاں ہے؟ تو پھر ہمیں کیسے معلوم ہو کہ قائد اعظم کا احسان الفاظ کا کیا ہے، انہیں تو طوطے بھی رٹ لیتے ہیں۔ ہم میں اور طوطوں میں کوئی تو فرق ہونا چاہئے۔ آخر ہم انسان اور اشرف المخلوقات ہونے کیا ہے؟ کے دعویدار ہیں۔

انسانوں اور بالخصوص بڑی شخصیات کو سمجھنے کا ایک بہت آسان آلہ ہے۔ اس کے ذریعے انسان کو سمجھنے کیلئے بہت معلومات یا علم درکار نہیں ہوتا۔ اس اس کے ذریعے انسان کو سمجھنے کے لیے بہت معلومات یا علم درکار نہیں ہوتا۔ اس کیلئے کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی کی سند درکار نہیں۔ یہ آلہ معروف معنوں میں تقریباً مفت حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس آلے کو عرفِ عام میں محبت کہا جاتا ہے۔ یہ اتنا زبردست آلہ ہے کہ اس کے ذریعے صرف تصویر دیکھ کر بھی پوری شخصیت سمجھ میں آجاتی ہے۔ اقبال، قائد اعظم اور مولانا مودودی کی بعض تصاویر ایسی ہی ہیں جو تمام پردے اٹھا دیتی ہیں۔ البتہ اس تفہیم میں اجمال ہوتا ہے، تفصیل نہیں ہوتی۔ تاہم انسان غور کرتا رہے تو تفصیل بھی رفتہ رفتہ فراہم ہوتی جاتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ فی زمانہ اس آلے کا کال پڑ گیا ہے۔ ورنہ ساکت تصویریں بھی ہمیں بولتی ہوئی نظر آتیں۔ کیا قائد اعظم کی بعض تصویروں سے ان کی شخصیت کی اصل طاقت کا مرکز صاف جھلکتا نظر نہیں آتا؟ لیکن یہ مرکز کیا ہے؟ تنہائی اور گریز۔ ایسی تنہائی اور ایسا گریز جو محفلیں اور انجمنیں تخلیق کرتا ہے اور ان کے درمیان ہو کر بھی تنہا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بانجھ تنہائی نہیں ہے۔ یہ تعلق اور لاتعلقی کا "نقطہ اتصال" ہے۔ ایک نایاب شے۔ غالب نے کہا ہے:

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یہ تنہائی اور گریز کے سکے کا دوسرا رخ ہے انسان اور زندگی کو خیال کی سطح پر سمجھنا اہم ہے مگر اس سے بھی اہم انہیں تجربے کی سطح پر سمجھنا ہے۔ اس کے بغیر انسان، زندگی یہاں تک کہ بڑے تاریخی واقعات بھی پوری طرح ہماری گرفت میں نہیں آتے۔ ہم اقبال، قائد اعظم اور اپنی تاریخ کی اصل سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ ہم نے چھوڑا تو کسی چیز کو نہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں بھی کچھ نہیں، سوائے معلومات اور علم کے دفتر کے۔ یہ سب بہت اہم ہے، بہت قیمتی ہے۔ مگر اس سے بہت زیادہ اہم تعلق کا لمس ہے، محبت کی حرارت ہے، وہ حرارت جو معلومات کو علم اور علم کو محبت میں ڈھال کر اسے احساس بنا دیتی ہے۔ ماہِ اگست کے حوالے سے بھلا اور کیا کہا جائے؟ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ ممالک جو ہمارے ساتھ یا ہمارے بعد آزادی کی نعمت سے بہرہ یاب ہوئے، وہ کہاں ہیں اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ندامت کے گھڑوں پانی میں شرابور ہوں! اللہ سے دعا ہے کہ یہ جو تجدید عہد کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس میں سے کوئی مداوا کا رستہ پھوٹ نکلے اور ہم اپنی کھوئی منزل کا سراغ لگاتے ہوئے کم از کم اپنا صحیح رخ متعین کر لیں۔ آمین

پاگل ہو؟ کیوں ناحق کو سقراط بنو، خاموش رہو تم بھی کوئی منصور ہو جو سولی چڑھو؟ خاموش رہو
گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں اس بگیا کے بھید نہ کھولو، سیر کرو، خاموش رہو
آنکھیں موند کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ انشاء جی! لو دھاگہ لو اور لب سی لو، خاموش رہو

بروز سوموار 7 ربیع الاول 1446ھ 9 ستمبر 2024ء

یہ بھوک، افلاس تنگ دستی تمہارا ہی مقدر کیوں؟

یوں لگتا ہے کہ پاکستان میں تمام مسائل حل ہو گئے ہیں، غریبی کا نام و نشان باقی نہیں رہا، اب کوئی بھی مہنگائی کے ہاتھوں خودکشی کی واردات سننے یا پڑھنے کو نہیں رہی، کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہیں اور اب بلا تخصیص علاج معالجہ کی سہولتیں بھی سب کو دستیاب ہیں لیکن صرف اپنے لیڈر کو بغاوت اور برطانیہ سے واپس کی گئی منی لانڈرنگ کے مسائل باقی ہیں، جس کو حل کرنے کے بعد اس ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنا شروع ہو جائیں گی جس کیلئے موجودہ اپوزیشن شب و روز اپنی توانائیاں صرف کر کے عوام کے سامنے سرخرو ہونے کیلئے بے برے القابات سے پکارا گیا کہ جس کے جواب میں مولانا نے تاب ہیں۔ کبھی اُس مولانا فضل الرحمان کے در پر حاضری دی جاتی ہے جس کو برسوں ایسے بھی وہی انداز اپنایا اور لیکن آج دونوں طرف کے سیاستدان اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے ایک مرتبہ پھر قوم پر یہ احسان فرما رہے ہیں کہ ملک کے موجودہ نازک حالات اور قوم کی بہتر خدمت کیلئے یہ اقدام اٹھائے جا رہے ہیں لیکن بے یقینی اور بے اعتباری کا یہ عالم ہے کہ ادھر ملاقات ختم ہوتی ہے تو مولانا اپنا سیاسی قد بڑھانے کیلئے حکومتی سربراہوں سے بھی گلے مل رہے ہوتے ہیں۔ آج یہی عوام اس سیاسی قلابازی پر اپنے حافظے پر شک کر رہی ہے کہ آئندہ کس کا اعتبار کیا جائے۔

ہماری سیاسی جماعتوں کو اپنی سیاسی دوکان چمکانے کیلئے میڈیا کا بھی مکمل تعاون حاصل ہے کہ میڈیا کو بھی اپنے چینل کو چلانے کیلئے ایک معقول بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ سوشل میڈیا دن رات الگ سے جلتی آگ پر تیل پھینکنے کا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ کبھی در پردہ مزاکرات کا غلغلہ اور اگلے چند دن میں سوشل انقلاب کے احیاء کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں، جس کیلئے حال ہی میں ایک جلسہ منسوخ کرنے کیلئے علی الصبح جیل کے دروازے کھول کر مشاورت جاری ہو جاتی ہے اور اس سے اگلے دن ہی مخالفین کو "وقت کا شمر" قرار دیکر اپنے ماننے والوں کو حوصلہ دیا جاتا ہے۔ کبھی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی مدت ملازمت میں توسیع پر واویلا شروع ہو جاتا ہے اور ان دنوں ججز کی تعداد میں توسیع پر ایک دوسرے کو عوامی عدالت میں گھسیٹا جا رہا ہے۔

حیرت یہ ہے کہ حکومت اور اپوزیشن دونوں اس کو اپنی فتح قرار دے رہے ہیں۔ پارلیمنٹ میں میدان سجا ہوا ہے، ساری قوم یہ تماشہ دیکھ رہی ہے کہ سیاسی رہنماء کس طرح ایک دوسرے کے کپڑے تار تار کر رہے ہیں لیکن کیا اس ڈرامے کے بعد قوم کے حالات سنورنے کی کوئی امید ہے؟ یہ ایک عام شکایت ہے کہ سیاستدانوں کا طرز زندگی ان کے منتخب کرنے والے عوام سے بہت زیادہ مختلف ہوتا ہے لیکن کل کی بات ہے کہ دنیا کے ایک چھوٹے سے ملک یوراگوائے کے سابقہ صدر نے ایک ایسی مثال قائم کر دی ہے کہ اگر ہمارے حکمران اس سے کوئی سبق حاصل کرتے تو آج ان کا نام بھی بڑے فخر کے ساتھ دنیا میں لیا جاتا اور پاناما لیکس کے علاوہ دیگر کرپشن کے سمندر کی غلاظت سے محفوظ رہتے

یوراگوائے میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں کے سابق صدر سے ملئے یہ یوراگوائے کے سابق صدر ہوزے موہیکا کی رہائش گاہ ہے جن کا طرز زندگی دنیا کے دوسرے زیادہ تر رہنماؤں سے یکسر مختلف ہے۔ جو آج بھی ایک چھوٹے اور ٹوٹے پھوٹے گھر میں رہتے ہیں۔ اپنے دورِ صدارت میں اپنی تنخواہ کا زیادہ تر حصہ خیرات کر دیتے تھے۔ ان کے کپڑے دھونے کی جگہ ان کے گھر کے باہر ہے۔ پانی وہ گھر کے قریب موجود کنویں سے حاصل کرتے ہیں جہاں جنگلی پھول اگے ہوئے ہیں۔ دوران صدارت صرف دو پولیس اہلکار اور تین پالتو کتے ان کے گھر کے باہر رکھوالی کیلئے تعینات تھے جبکہ آج انہوں نے اقتدار سے ہٹتے ہی یہ سہولت بھی حکومت کو واپس کر دی ہے کہ اب ان کا یہ استحقاق نہیں اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ صدر موہیکا نے دورانِ

اقتدار یوراگوائے حکومت کی جانب سے مراعات سے بھرپور رہائش گاہ کو رد کر دیا اور دارالحکومت کی ایک سڑک کے کنارے اپنی بیوی کے گھر میں رہنا پسند کیا۔ وہ ان کی اہلیہ دورانِ اقتدار بھی خود کھیتوں میں کام کر کے پھول اگاتے میں فخر محسوس کرتے رہے۔

صدر موہیکا کا یہ طرزِ زندگی اور ان کی تنخواہ کا نوّے فیصد حصہ جو بارہ ہزار امریکی ڈالر کے برابر تھا، غریبوں میں بانٹ دیتے تھے اور اسی عمل نے انہیں دنیا کے سب سے غریب صدر کا اعزاز بخشا۔ اپنے باغیچے میں پڑی پرانی کرسی پر بیٹھے وہ میڈیا کو بتا رہے ہیں کہ میں نے اپنی زیادہ تر زندگی ایسے ہی گزاری ہے ۔جو کچھ میرے پاس ہے، میں اسی کے ساتھ اچھی طرح رہ سکتا ہوں۔ ان کی تنخواہ کا بڑا حصہ غریبوں اور چھوٹے تاجروں کی مدد کیلئے مختص ہونے کے بعد ان کی بقیہ تنخواہ ایک یوراگوائے کے ایک عام باشندے کے برابر رہ جاتی تھی جو 775 ڈالر ماہانہ تھی۔ ملکی قانون کے مطابق جب انہوں نے 2010ء میں اپنی سالانہ آمدنی ظاہر کی تو وہ 18 سو ڈالر تھی۔ یہ رقم ان کی 1987ء میں خریدی گئی گاڑی کی قیمت کے برابر تھی۔ اقتدار سنبھالنے سے قبل انہوں نے اپنی اہلیہ کے اثاثے بھی ظاہر کیے جن میں زمین، ٹریکٹر زاور ایک گھر شامل تھا اور ان سب کی قیمت دو لاکھ پندرہ ہزار ڈالر کے قریب تھی۔ یہ رقم بھی ملک کے نائب صدر کی ظاہر کی گئی دولت کا دسواں حصہ بنتی تھی۔

صدر موہیکا 2009ء میں یوراگوائے کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں یوراگوائے کی بائیں بازوں کے مسلح گروپ گوریلا ٹوپامسروس کا حصہ رہے۔ انہیں چھ مرتبہ گولی لگی اور وہ چودہ سال جیل میں رہے۔ ان کی سزا کا زیادہ تر وقت سخت حالات اور تنہائی میں گزرا۔ 1985ء میں جمہوریت کی بحالی کے بعد انہیں رہائی ملی۔ سابق صدر موہیکا کے مطابق قید کے انہی برسوں نے ان کی زندگی کی حالیہ شکل کو ترتیب دیا ہے۔ وہ بڑے مطمئن انداز میں کہتے ہیں کہ مجھے غریب ترین صدر کہا جاتا ہے لیکن مجھے تو غربت کا قطعی احساس نہیں ہوتا۔ غریب تو وہ ہوتے ہیں جو مہنگا طرزِ زندگی اپنانے کیلئے کام کرتے ہیں اور ہمیشہ مزید سے مزید کی خواہش کرتے ہیں۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ یہ آزادی کا معاملہ ہے۔ اگر آپ کے پاس بہت زیادہ املاک نہیں ہیں تو آپ کو اپنی تمام عمر انہیں قائم رکھنے کیلئے کام نہیں کرنا پڑتا اور اس طرح آپ کے پاس اپنے لیے زیادہ وقت ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہو سکتا ہے کہ میں ایک عجیب بوڑھا شخص لگتا ہوں لیکن یہ میرا آزادانہ انتخاب ہے۔ یوراگوائے کے رہنما نے ایسی ہی باتیں ری اوپلس ٹوئنٹی ممالک کے اجلاس میں کہی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا ہم ساری سہ پہر قابلِ تائید ترقی کی باتیں کرتے رہے ہیں، عوام کو غربت سے نکالنے کی باتیں، لیکن ہم کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا ہم امیر ممالک کی ترقی اور کھپت کو اپنانا چاہتے ہیں؟

میں آپ سے پوچھتا ہوں اگر تمام بھارتی باشندوں کے پاس بھی اتنی ہی گاڑیاں ہوں جتنی جرمن باشندوں کے پاس ہیں تو اس سیارے کا کیا ہو گا؟ ہمارے پاس کتنی آکسیجن رہ جائے گی؟ کیا اس سیارے پر اتنے وسائل ہیں کہ سات یا آٹھ ارب لوگوں کو یکساں کھپت اور اخراج ملے جیسا کے اس وقت امیر معاشروں میں دیکھا جا سکتا ہے؟ یہ کھپت کی زیادتی ہی ہے جو اس سیارے کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ یوراگوائے کے محقق لگنیسو زوینسر کا کہنا ہے کہ کئی لوگ صدر موہیکا سے ان کے اندازِ رہائش کے باعث ہمدردی کرتے ہیں لیکن اس کی وجہ سے ان کی حکومت کی کارکردگی پر تنقید بند نہیں ہوئی۔ 2009ء میں انتخاب کے بعد صدر موہیکا کی شہرت میں پچاس فیصد کمی واقع ہوئی اور یوراگوائے کے صدر دو متنازعہ اقدامات کے باعث تنقید کا نشانہ بھی بنے۔ یوراگوئے کی کانگرس نے ان کے دورِ اقتدار میں ایک قانون بھی منظور کیا جس کے مطابق 12 ہفتے کے حمل کو گرائے جانے کو قانونی قرار دیا گیا لیکن صدر موہیکا نے اس کیلئے ووٹ نہیں کیا تھا۔ کیا ہم اپنے ملک میں اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں؟

انہوں نے قنب کی کھپت سے متعلق ایک قانونی بحث کی بھی حمایت کی جس کے مطابق قنب کی تجارت میں حکومت کو اجارہ داری حاصل ہو گی۔ ان کا

کہنا تھا قنب کی کھپت زیادہ پریشان کن بات نہیں، اصل مسئلہ منشیات کی تجارت ہے۔ تاہم اپنی مقبولیت کی کمی کے باعث انہیں زیادہ پریشانی اس لیے نہیں ہوئی کیونکہ انہوں نے 2014ء کے انتخابات میں دوبارہ حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا جبکہ ان کے جیتنے کے امکانات 70 فیصد سے زائد تھے۔ وہ 77 سال کی عمر میں سیاست سے ریٹائر ہو گئے۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں ریاست کی جانب سے جو پنشن مل رہی ہے، اپنے محدود خرچ کے بعد انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں اور وہ اب بھی اپنے کچھ غریب دوستوں کی خاموشی سے مدد کر رہے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہمارے تمام سیاستدان بخوبی جانتے ہیں کہ ملک کی معاشی حالات کا کون ذمہ دار ہے اور ان کا اپنا کردار کیا ہے؟ بیرونِ ملک ان کے محلات اور آف شور کمپنیوں میں ان کے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے کاروبار کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔ پاناما میں آف شور کمپنیوں میں 249 دیگر پاکستانیوں کے نام شامل تھے لیکن مقدمہ صرف نواز شریف کے خلاف ہی سامنے آیا اور قوم تو باقی افراد کے ناموں سے بھی اب واقف نہیں۔ اس وقت بھی یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت اور اپوزیشن کا احتساب ایک ساتھ شروع کیا جائے لیکن اپوزیشن نے شدید مخالفت کی، آخر کیوں؟

پاناما لیکس کی تحقیقات کیلئے جوڈیشل کمیشن کا قیام اپوزیشن کا ہی متفقہ مطالبہ تھا، بالکل اسی طرح سب سے پہلے نواز شریف اور ان کے اہل خانہ کا احتساب بھی اپوزیشن کا متفقہ مطالبہ تھا جس کے بعد دوسروں کے خلاف تحقیقات کی جانی چاہئے تھی۔ اس سلسلے میں پارلیمنٹ میں حزبِ مخالف کی جماعتوں کے دو مئی کے مشترکہ اجلاس میں وزیر اعظم کے مستعفی ہونے پر تو اتفاق نہ ہو سکا لیکن اگلے دن ایک متفقہ ٹرمز آف ریفرنس میں تین ماہ میں وزیر اعظم اور ان کے تمام خاندان کے احتساب اور اپوزیشن کے افراد کیلئے ایک سال کا وقت کا مطالبہ کیا گیا جو کہ یقیناً عوام کو بھی ایک دھچکا لگا کہ آخر ملکی دولت کو لوٹنے والوں کیلئے دوہرا معیار کیوں؟

کوئی اعتزاز اور فاروق نائیک جیسے قانون دانوں سے یہ تو پوچھے کہ ان کی پارٹی کے سربراہ آصف علی زرداری کے پاس اٹھارہ بلین سے زائد کے اثاثے کیسے آئے؟ سرے پیلس سے مکمل لاتعلقی اور بعد ازاں برطانیہ کی عدالت میں اس کی فروخت کے موقع پر اس کی ملکیت کا دعویٰ، نیب کے مفرور واجد شمس الحسن کو برطانیہ میں سفیر مقرر کیا جس نے حق نمک ادا کرتے ہوئے سوئٹزرلینڈ سے زرداری کی کرپشن کا تمام ریکارڈ حکومت کے نمائندے کے طور پر موصول کر کے غائب کر دیا۔ ان مقدمات پر قومی خزانے سے کروڑوں روپے اٹھ گئے لیکن کیا کسی نے اس کا حساب پوچھا؟ کیا آج وہی ہمارے حکمران نہیں جو اربوں روپے کا قومی خزانے کو چانا لگانے کے الزامات میں مقدمات کا سامنا کر رہے تھے اور جونہی حکومت میں آئے تو سب سے پہلے نہ صرف اسمبلیوں سے وہ قانون منظور کروائے جس سے ان تمام مقدمات یکسر ختم ہو گئے بلکہ قومی خزانے سے کھربوں روپے لوٹنے والوں کو ایوانِ صدر بلا کر ہلال قائد اعظم جیسے میڈل پہنائے گئے۔ قوم کو بتایا گیا کہ تمام کابینہ کو ہر قسم کی مراعات ختم کر دی گئی ہیں لیکن اب بھی چار درجن گاڑیوں کے پروٹوکول میں اسی عوام کے درمیان سے گزرتے ہیں جن کی خدمت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ غربت، مہنگائی اور بجلی کے بلوں کے ہاتھوں لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں اور یہاں ایوانِ صدر سے منسلک چہل قدمی کے باغات کا بجٹ سالانہ 6 کروڑ روپے مختص کر دیا گیا ہے۔

بجٹ میں ایوان صدر اور صدر ہاؤس کیلئے 1 ارب 11 کروڑ 23 لاکھ 42 ہزار، وزیر اعظم ہاؤس اور پبلک سیکرٹریٹ کیلئے 31 کروڑ 32 لاکھ 51 ہزار روپے اضافہ کر دیا گیا۔ صدر کی تنخواہ میں اضافہ نہیں کیا گیا، وزیر اعظم کی سالانہ تنخواہ میں 5 لاکھ روپے اضافہ کیا گیا۔ پارلیمنٹ سے منظوری کے بعد وزیر اعظم

کی تنخواہ 2 لاکھ 46 ہزار 750 روپے ہو گئی ہے، اس مد میں 29 لاکھ 61 ہزار روپے بجٹ مختص کیا گیا۔ ایوان صدر و ہاؤس کیلئے کل 2 ارب 28 کروڑ 1 لاکھ 5 ہزار روپے، وزیر اعظم آفس و ہاؤس کیلئے 1 ارب 65 کروڑ 42 لاکھ 62 ہزار بجٹ مختص کیا گیا۔

پاناما لیکس کے بارے میں سب سے زیادہ احتجاج کرنے والے عمران خان کا خود برطانیہ میں ایک آف شور کمپنی کی ملکیت کا اعتراف اور زمان پارک میں اپنے آبائی وسیع و عریض گھر رکھنے کے باوجود 2 / اپریل 1987ء کو اسی نواز شریف سے اپنے ذاتی گھر کیلئے درخواست گزار ہو کر پلاٹ حاصل کیا، اپنی ہی پارٹی کے افراد کی آف شور کمپنیوں پر شور مچانے کی بجائے ستائش کی۔ کل کا ناقد عمران خان آج ملک کے سب سے بڑے پراپرٹی ٹائیکون ملک ریاض کی برطانیہ کی طرف سے منی لانڈرنگ کی مد میں 190 ملین پاؤنڈ کی وصولی کے جواب میں ملک ریاض سے عبد القادر ٹرسٹ کے نام پر زمین حاصل کرنے کے مقدمے کا سامنا ہے؟ اب سپریم کورٹ نے بھی عمران خان کی درخواست پر فیصلہ سنا دیا ہے کہ درخواست اور سپریم کورٹ کا فیصلہ آئین کے مطابق نہیں، موجودہ مقدمے میں بھی ترامیم غیر آئینی ہونے کے حوالے سے ہم قائل نہیں ہو سکے، ان ترامیم میں سے بہت سی ترامیم کے معمار عمران نیازی خود تھے، بانی پی ٹی آئی نے نیک نیتی سے درخواست دائر نہیں کی۔

یاد رکھیں کہ دنیا کے بڑے لوگ اور لیڈر اس لئے عظیم کہلائے کہ انہوں نے مواقع پانے کے باوجود دولت بنانے سے گریز کیا اور ذاتی مفادات کی بجائے عوامی مفادات کو ترجیح دی اور غربت کی زندگی گزار کر اپنی قوم کے مستقبل کو روشن کر دیا۔ آخر ہمارے موجودہ حکمران اور اپوزیشن یوراگوئے کے سابق صدر سے سبق حاصل کیوں نہیں کرتے کہ انہیں لیڈر بننا ہے یا ڈیلر؟

اے مرے دیس کے لوگو! شکائت کیوں نہیں کرتے؟
تم اتنے ظلم سہہ کر بھی بغاوت کیوں نہیں کرتے؟
یہ جاگیروں کے مالک اور لٹیرے کیوں چنے تم نے؟
تمہارے اوپر تم جیسے ہی، حکومت کیوں نہیں کرتے؟
یہ بھوک، افلاس تنگ دستی تمہارا ہی مقدر کیوں؟
مقدر کو بدلنے کی جسارت کیوں نہیں کرتے؟

بروز منگل 8 ربیع الاول 1446ھ 10 ستمبر 2024ء

پاکستان منزل یا نشانِ منزل

ہم اس معجزے سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں کہ پاکستان، نزولِ قرآن، لیلتہ القدر کی بابرکت ساعتوں میں 27 رمضان المبارک 1366ھ بمطابق 14 / اگست 1947ء کو وجود میں آیا اور یقیناً یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا مسلمانانِ برِعظیم کیلئے ایک عظیم تحفہ سے کم نہیں، یوں یہ معجزاتی مملکتِ خداداد کہلائی۔ ریاستِ مدینہ کے بعد یہ دوسری اسلامی نظریاتی مملکت معرضِ وجود میں آئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن کی سیرت کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شر انگیزی کیوں کی جارہی ہے اور یہ پروپیگنڈہ کیوں ہو رہا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت پر مبنی نہیں ہو گا۔ پاکستان میں اسلامی اصول اس طرح نافذ العمل ہیں جیسے 1300 سال قبل نافذ ہوئے تھے۔" بانی پاکستان کا اشارہ واضح طور پر ریاستِ مدینہ کی طرف ہے۔

میں قیامِ پاکستان کا پس منظر ہندو کانگریس اور برطانوی سامراج کی مسلم دشمنی کا برِعظیم میں ایک ناپاک گٹھ جوڑ اور بھیانک و سیاہ باب پر مبنی ہے۔ 1946ء لندن کانفرنس کے دوران ہی ایک بڑی سازش کے تحت جواہر لال نہرو کے دیرینہ دوست لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا گورنر جنرل مقرر ہونا، اس سازش میں شریک کرشنا مینن ایک شدت پسند کمیونسٹ لیڈر جس نے بسترِ مرگ سے اس سازش کا انکشاف کیا۔ اس نے "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" کے مصنف ابوالکلام آزاد کے سامنے یہ راز بھی افشاء کیا کہ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل مقرر کرانے کی جو کامیاب کاوش ہوئی، اس میں یہ بھی طے پایا تھا کہ یہ راز مسلمانانِ برِعظیم کو معلوم نہ ہونے پائے، ورنہ ماؤنٹ بیٹن کی افادیت ختم ہو جائے گی۔ واقعی راز فاش نہ ہوا، قائداعظم اور لیاقت علی خان کانفرنس کے سلسلے میں وہاں موجود تھے، انہیں بھی اس ناپاک سازش کی بھنک تک نہ پڑی۔

ماؤنٹ بیٹن نے برطانوی وزیراعظم ایٹلی کی ہدائت کے مطابق پہلے سر توڑ کوشش کی کہ برِعظیم تقسیم نہ ہونے پائے۔ مسلم لیگ کا سربراہ اور مسلمانانِ برِعظیم کا قائداعظم محمد علی جناح متحدہ برِعظیم کے فلسفے کے خلاف ہمت، شجاعت، حوصلہ اور عزم کی چٹان بن گیا اور دونوں مسلم دشمن سامراجیوں کو جھکنا پڑا۔ تقسیم کا فیصلہ ہوا لیکن اس کے پردے میں وہ سب کچھ کیا جو بقول قائداعظم "دشمن چاہتا ہے کہ پاکستان بنتے ہی گائب (غائب) ہو جائے"۔ قائداعظم کے اس وجدان کا ثبوت راقم نے لندن میں دارلعوام کی ڈیبٹ رجسٹر میں دیکھا جس میں وزیراعظم برطانیہ ایٹلی نے "انڈیا انڈیپینڈنٹ بل" پر تقریر میں یوں کہا کہ "برِعظیم کو دو ممالک میں تقسیم کرنا ایک عارضی عمل ہے، بہت جلد دونوں "دونیشن" ایک بڑی ڈومینئن میں متحد ہو کر "کامن ویلتھ" میں شریک ہو جائیں گی۔" (کالم 1246)۔ اس وقت کے حزبِ اختلاف کے رہنماء میکڈونلڈ نے بھی غیر معمولی طور پر وزیراعظم سے متفق ہو کر کہا کہ "انڈیا انڈیپینڈنٹ بل میں ایسے جراثیم پائے جاتے ہیں کہ یہ دونوں ممالک زیادہ دیر تک علیحدہ نہ رہیں گے۔" (کالم 1242)"

برِعظیم کی آزادی کیلئے دارلعوام میں 30 جون 1948ء تک کی مدت طے پائی تھی، ماؤنٹ بیٹن نے اس مدت کو مختصر کر کے جلد از جلد آزادی دینے کا فیصلہ کیا۔ برِعظیم کی تقسیم کی خفت کی وجہ سے جلد بازی اس لئے کی کہ پاکستان سنبھل نہ پائے۔ قائداعظم نے اس جلد بازی کی سخت ترین مخالفت کی اور دارلعوام کے فیصلے کی مدت پر قائم رہنے کیلئے زور دیا۔ کسے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ برِعظیم کے مسلمانوں کیلئے کیا عظیم تحفہ دینا چاہتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی ذاتی خوشی کیلئے برطانوی اور برِعظیم کے لیڈروں سے بغیر صلاح و مشورہ کے 15 / اگست 1947ء کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ یہ تاریخ وائسرے ہند لارڈ

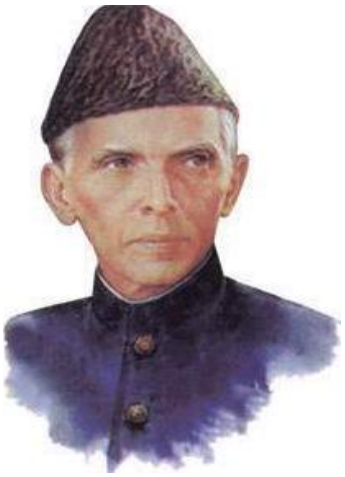

ماؤنٹ بیٹن کی زندگی میں بڑی خوشی کا دن تھا جب وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن جنگِ عظیم دوم کے دوران برما محاذ کا کمانڈر تھا' اسی تاریخ کو جاپان نے ہتھیار ڈالے تھے۔

برعظیم کی آزادی اس سرنڈر کی دوسری سالگرہ کے موقع پر دینا ایک اور تاریخی کامیابی قرار دے کر تاریخ میں خوش قسمتوں میں اپنا نام لکھوانا مقصود تھا۔ اسے کیا معلوم کہ قائداعظم کی مخالفت کی تو پرواہ نہ کی لیکن ہندو راشٹر کے اصل حکمراں جوتشی اور ستارہ شناسوں کی مخالفت کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑیں گے۔ جوتشیوں نے 15/اگست کو "منحوس" قرار دیدیا۔ ہندو رہنما تو خاموش رہے لیکن اس طاقتور طبقہ نے طوفان برپا کر دیا اور بزدل اور مکار وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس مخالف مہم سے بوکھلا گیا۔ اس کی بوکھلاہٹ تب کم ہوئی جب جوتشیوں نے 14/اگست کو "مبارک" قرار دیا۔ بزدل اور مکار وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سیلاب کو روکنے کیلئے اپنی خواہش کو برقرار رکھتے ہوئے اور جوتشیوں کو بھی تسلی بخش طریقہ بتا کر بڑی چالاکی سے نئی تاریخ یوں پیش کی کہ آزادی کی تاریخ "منحوس" کو "مبارک" دن کے قریب ترین آدھی رات 14 اور 15 کی درمیانی شب بارہ بجے متعین کر دیا۔ ہندو جوتشیوں نے ٹھیک 12 بجے پوجا پاٹ کے دوران بجانے والا "سنکھ" بجا کر آزادی کے حصول کا مضحکہ طریقہ اپنایا حالانکہ قانون ساز اسمبلی کو اقتدار 15/اگست کو ہی منتقل کیا گیا اور دوسری طرف پاکستان کو پہلے ہی 14/اگست کو اقتدار اسمبلی کو منتقل کر دیا گیا تھا۔

یہی انسانی مشقیں ہوئیں اور مسلم دشمن بزدل اور مکار وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن خود ہی اس ساعت کی طرف کھنچ کر آگیا جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ یوں 14 اور 15 اگست کی درمیانی رات 27 رمضان المبارک کا آغاز 14 اگست کو مغرب غروبِ آفتاب سے شروع ہوا۔ اسی رات نزولِ قرآن اور لیلتہ القدر کی مبارک ساعتیں آن پہنچیں اور وہی ہوا جو منظورِ خدا تھا۔ انہی بابرکت ساعتوں میں پاکستان عالمِ وجود میں آگیا اور مملکتِ خداداد کہلایا۔ 14/1947ء قیامِ پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ اسی کے مطابق ہے جو ہجری سال 1366 میں 27 رمضان المبارک کو ظہور پذیر ہوا۔ اس کی دینی فضیلت تو عالمِ اسلام میں نمایاں ہے اور اس کی ملی اہمیت بھی بہت اہم ہے۔ 27 رمضان المبارک کے حوالے سے قیامِ پاکستان کی اہمیت کو نئی نسل تک روشناس کرانے اور اس پر عمل کرنے کیلئے قومی سطح پر جنگی بنیادوں پر لائحہ عمل تیار کرنے کی جو اشد ضرورت تھی، قائداعظم کے جلد انتقال کے بعد ہمارے بے عمل اور لالچی حکمرانوں نے اس پر بھرپور توجہ نہیں دی لیکن میرا وجدان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اب بھی اگر قدرت کی طرف سے عنائت کردہ اس معجزہ نما ریاست کیلئے ایسی منصوبہ بندی کی جائے جس کا ہم نے اپنے پروردگار سے وعدہ کیا تھا تو ہم یقیناً اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔

بقول قائداعظم "پاکستان منزل نہیں بلکہ منزلِ مقصود کا وسیلہ ہے۔" پاکستان اسلام کا قلعہ ہے" اور یہ قلعہ اس وقت اسلام دشمن قوتوں کی گولہ باری کی شدید زد میں ہے۔ اسے محفوظ کرنے کیلئے عوام جو طاقت کا سرچشمہ ہیں انہیں واپس انہی اصولوں کی طرف لوٹنا پڑے گا جس کا ربِ کریم نے حکم دے رکھا ہے۔ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں دینا ہوگا اور اس کیلئے قرآن و سنت کے سرچشمے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ جس دن ہم اس مغربی جمہوریت کے فریب سے نکل کر صرف قرآن و سنت کو اپنا آئین مان کر اپنی زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کر لیا اور محمد عربی ﷺ کو اپنا رہبر مان لیا تو یہ قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار کی طرح کامیابی و کامرانی کے تمام مدارج طے کر لے گی۔ اب بھی وقت ہے، دوست دشمن کی تمیز میں فرق

کرنا ہو گا۔ کچھ نہیں بچے گا، صرف میرے رب کا نام جو حیی القیوم ہے اور جس نے اس دنیا کے نقشے پر پاکستان کو حقیقت بنایا۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو آمین۔

اک سوال کے اندر ہم نے کاٹی نصف صدی
باندھے لاکھوں حساب
غلط ہی نکلا ہر اک حل کا لیکن انت جواب
ضرب جمع تفریق کے سارے کلئے برت لئے
از روئے تحقیق
ہر کوشش میں ہو جاتا ہے کچھ نہ کچھ تفریق
دیکھ تو کتنا اونچا ہے یہ ردّی کا انبار
تو ہی اب کچھ رحمت کر اے ربِّ غفار

بروز جمعرات 01 ربیع الاول ھ 12 ستمبر 2024ء

قسمت کا ماتم

تاریخ کو خون آلود راہداریوں میں ایک محل اور قصر شاہی کے دربار میں پڑا ایک پتھر بدلتے دنوں میں انسانوں کی بربریت، ظلم و جور اور حیوانیت کی کہانی مدتوں بیان کرتا رہا۔ اس پتھر پر سب سے پہلے اعلائے کلمۃ الحق کے سالارِ قافلہ شہید کربلا سیدنا امام حسینؑ کا مقدس سر ابن زیاد کے سامنے رکھا گیا۔ پھر اسی پتھر پر ابن زیاد کا سر مختار بن ثقفی کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہی پتھر مختار بن ثقفی کے خون کی گواہی بنا جب اس کا سر عبداللہ بن زبیر کے سامنے پیش کیا گیا اور پھر اسی پتھر پر عبداللہ ابن زبیر کا سر حجاج بن یوسف کے روبرو تاریخ کی بربریت کی شہادت دیتا رہا۔ سر بریدہ لاشوں کی بے حرمتی، کٹے ہوئے سروں کی نمائش ان لوگوں کا فعل رہا جن میں بربریت، انسانی احترام پر غالب تھی یا پھر جن کے انتقام کی آگ نے انہیں ان لوگوں کی پیروی کرنے پر مجبور کر دیا جن کے خلاف وہ حق کی آواز بلند کرتے تھے۔

میں آج بھی جب تاریخ کی یہ کہانیاں پڑھتا ہوں تو انسانی شقاوت کی اس درندگی پر لرز جاتا ہوں اور حیرت میں ڈوب کر سوچتا ہوں کہ اگر میرے پوتے پوتیوں نے تاریخ اسلام پڑھتے ہوئے اپنے سوالوں کے تیروں کا رخ میری طرف موڑ دیا تو انہیں ایسا کیا جواب دوں کہ ان کا معصوم ذہن ظلم و ستم کی ان کثافتوں سے پاک رہے۔ احد کی وادیوں میں سیدنا حمزہ کی مقدس لاش کا مثلہ کرنے پر سید الانبیا ﷺ کا کرب اور دکھ میری آنکھوں میں گھوم جاتا ہے جب میرے آقا اپنے دودھ شریک چچا کی لاش کو دیکھ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے اور مدینے کے انصار اور مہاجرین اپنے شہداء کو چھوڑ کر فوراً نبی ﷺ کو پرسہ دینے کیلئے پہنچ گئے۔ وہ کیا منظر ہو گا جب رحمت العالمین ﷺ اپنے چچا کے چھوٹے بیٹے کو گود میں لیکر ان کی اہلیہ کو ان کے شوہر اور بچوں کو ان کے والد کی شہادت کی خبر دیتے ہوئے بار بار آبدیدہ ہوتے رہے، یہ تحریر کرتے ہوئے یہ دکھ میری آنکھوں میں گھوم جاتا ہے اور قلم بھی بال کھولے نوحہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔

مجھے وہ ہدایت یاد آجاتیں ہیں جو آپ ﷺ لشکر کو جہاد پر روانہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔ کسی فصل کو تباہ نہ کرنا، کسی لاش کا مثلہ نہ کرنا، کسی عورت اور بچے پر ہاتھ نہ اٹھانا لیکن ان سب ہدایات کا تمسخر تاریخ میں جس طرح اس امت مسلمہ نے اڑایا وہ میری روح پر بوجھ تو تھا ہی لیکن اپنی ہی زندگی میں اس تمسخر کی آنکھوں دیکھی گواہی کے مسلسل عذاب میں مجھے گرفتار ہونا پڑے گا اس کرب کا تجربہ میں گزشتہ چار دہائیوں سے کر رہا ہوں اور میرا المیہ یہ ہے کہ یہ سب وہ لوگ کر رہے ہیں جو اسی رحمۃ اللعالمین ﷺ کی سنت کے دعویدار اور اس کے دین مبین کے علمبردار ہیں اور جن کی زبان ان کے ساتھیوں اور ان کے گھرانے سے محبت میں رطب اللسان رہتی ہے۔

میں وہ دن کیسے بھول سکتا ہوں جب پانچ جولائی 1985ء میں کوئٹہ میں شریعت کے نفاذ کیلئے ایک جلوس نکلنا تھا۔ ضیاء الحق کا دور اسلام کے نفاذ کا علمبردار لیکن صرف اسی تعبیر پر قائم جو اس کے حواری اسے بتاتے تھے۔ دوسری جانب مخالفین۔ آمریت کا خاصہ ہے کہ آواز کو بزور طاقت سے دبایا جائے۔ پولیس کی بھاری نفری جلوس کے راستے کی رکاوٹ بنی کھڑی ہے۔ مذاکرات جاری تھے، اوپر سے احکامات تھے کہ جلوس کسی صورت میں نہیں نکلنا چاہئے ۔ اوپر بات ہوئی، ان سے دست بدستہ عرض کیا گیا کہ خون خرابے سے بچنے کیلئے یہ بہترین حل ہے لیکن آمریت کو انسانوں کی جان اور عزت و آبرو کے مقابلے میں حکومت کی رٹ کی پرواہوتی ہے۔ ایک مجسٹریٹ نے میگافون پر جلوس کے غیر قانونی ہونے کا اعلان کیا اور پھر وہ علاقہ میدان جنگ بن گیا۔ آنسو گیس، لاٹھی، گولی سب چلنے لگی۔ شام تک پورا علاقہ دھواں دھواں تھا اور اس کے درمیان کھمبوں پر پولیس والوں کے سر کاٹ کر لٹکائے ہوئے

تھے۔ کیا آمریت کا ظلم، جبر اور تشدد کسی کو انتقام کی اس سطح پر لے جاسکتا ہے کہ وہ اس فعل کی پیروی کرنے لگے جس کے خلاف صدیوں سے احتجاج کرتا رہا ہو۔

اب اور آگے بڑھتے ہیں، اگست 1989ء میں پشین کے شہر میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے دو کمانڈروں میں اختلاف ہوا، بندوقیں تن گئیں، روز لاشیں گرنے لگیں، ہر کوئی ایک دوسرے کو منافق، زندیق اور روس کا ایجنٹ کہنے لگا۔ سرخاب کا کیمپ میدان جنگ بن گیا۔ آخر ایک گروپ وہاں سے بھاگ کر افغانستان چلا گیا۔ فاتح افغان مجاہدین کے کمانڈر کی آتشِ انتقام سرد نہ ہوئی، اس نے "جہاد" سے سرشار ایک دستے کو قندھار روانہ کیا کہ ان کا قلع قمع کیا جائے۔ انتقام کی آگ کو جذبہ جہاد کہنے والے یہ سرفروش قندھار گئے، خوفناک اور خونریز لڑائیاں ہوئیں اور پھر اس گروپ کے دو کمانڈروں کو قتل کر دیا گیا۔ علامت کے طور پر ان کے سر کاٹ کر پیاز کی بوریوں میں چھپائے اور پاکستان کے شہر پشین کے سرخاب مہاجر کیمپ میں لا کر درختوں پر لٹکا دیئے۔ یہ نشان عبرت ایک ایسی انسانی تذلیل تھی کہ جس کی نہ ان اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں سے کوئی توقع رکھتا تھا اور نہ ہی کوئی برداشت۔

لوگ گنگ تھے، نہ کسی مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اس کی مذمت ہوئی اور نہ کسی منبر سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ سروں کی نمائش اور سر بریدہ لاشوں کی بے حرمتی کوئی منتقم مزاج بے دین اور بے راہ رو کرے تو اس کے نسلی تعصب پر ماتم کیا جاسکتا ہے۔ قاتل اور خاندانی انتقام میں اندھے ایسا اکثر کرتے ہیں۔ میں نے 8 سال کی عمر میں گجرات میں میاں اکبر کے قتل کی لرزہ خیز واردات دیکھی ہے۔ میں اپنے والد کے ساتھ جمعہ کی نماز پر جارہا تھا تو راستے میں قتل کی جگہ سے قبرستان تک لاشیں گھسیٹنے سے خون کی لکیریں بن گئیں تھیں کیونکہ قتل کرنے والے مقتولین کی لاشیں اپنے باپ کی قبر تک اس گواہی کیلئے لے گئے تھے کہ ہم نے قتل کر کے انتقام لے لیا لیکن وہ جن کی زندگیاں اسلام کے اصول جنگ، امن، صلح و آشتی کے پیغام سنا کے گزریں، جن کی اول روز سے تربیت رحمۃ اللعالمین ﷺ کی حدیثیں سنتے ہوئے ہوئی، ان کے جذبہ انتقام کے بپھرتی نفرت سے جب سوات کے بازاروں میں سر بریدہ لاشوں کی نمائش اور بے حرمتی کی خبریں سنیں تو پتا نہیں کیوں مجھے اپنی بدقسمتی پر رونا آیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ ہم پر جو امریکا کی غلامی، بدترین آمریت اور بے راہ رو قانون کا عذاب نازل ہوا ہے، یہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہی تو ہے۔

تھوڑا اور آگے چلتے ہیں کہ میرا قلم نجانے کیوں ایک اور قیامت کا تذکرہ کرنے کیلئے اکسا رہا ہے۔ آپ کو بھی دل دہلا دینے والا واقعہ تو ضرور یاد ہوگا جب پشاور کی سڑکوں پر اچانک چیختی چنگھاڑتی سائرن بجاتی ایمبولنسوں کا اژدہام جہاں قیامت صغری کا سماں پیش کر رہا تھا وہاں پوری قوم بلکہ پوری دنیا غم واندوہ اور شدید صدمے اور سکتے کی حالت میں گم صم اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر رحم و کرم کی فریاد کر رہی تھی۔ یہ دلدوز خبر سنتے ہی ننگے سر اور پاؤں ماں باپ اپنے پیاروں معصوموں کو دیوانوں کی طرح ڈھونڈنے کیلئے سڑکوں پر دوڑ رہے تھے کہ وہ آنے والی قیامت صغری کو اپنے سینے پر روک کر اپنے بچوں کو بچالیں

کیا خوب پسند ہے تیری اے فرشتہ اجل
پھول بھی وہ چنے جو گلشن کو ویران کر گئے

16 دسمبر کی دلخراش یادوں میں ایک اور اضافہ ہو گیا جب پھولوں کے شہر پشاور میں پھولوں کو مسل کر رکھ دیا گیا، وہ جو اپنے ہاتھوں میں قلم اور کتاب تھامے اپنے نبی ﷺ کے احکام کی تعمیل میں علم حاصل کر رہے تھے، ان کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ اپنی ماں سے یہ کہہ سکیں کہ دیکھ ماں! میرے لباس

پر اس لہو رنگ روشنائی ہم سب کی عقبیٰ و آخرت کی نجات کا وسیلہ بن گئی ہے۔ آج دل ایک مرتبہ پھر درد سے پھٹتا جارہا ہے بلکہ درد جیسا لفظ بھی ماتم کر رہا ہے، ایک ایسا زخم ہے جس کا مداوا ہوتا نظر نہیں آتا، جسم تھر تھرا رہا ہے، ہاتھوں کی لرزش اور کپکپاہٹ نے دماغ کو ماؤف کر دیا ہے۔ وہ تمام مناظر میرا تعاقب کر رہے ہیں کہ ملک میں دہشت گردی میں ملوث وہ افراد تھے جن کی برسوں میزبانی کا شرف ہمیں حاصل رہا اور آج بھی یہی مٹھی بھر افراد اسی سرزمین سے ہمیں لہولہان کر رہے ہیں جن کی حفاظت کیلئے ہم نے نہ صرف برابر کا خون بہایا بلکہ اگر پاکستان ہمسایہ نہ ہوتا تو آج ازادی کا تاج ان سے کوسوں دور ہوتا۔

میرے رب نے فرمایا جس طرح کے تم ہوگے ویسے ہی تمہارے حاکم۔ جہاں راست بازوں پر جذبہ انتقام غالب آجائے اور وہ اسلاف کی ہدایت ترک کر دیں وہاں قسمت کا ماتم کرنے کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے۔ شریعت کے نفاذ کی دھن میں مست لوگوں کو سیدنا علی کا وہ واقعہ شاید یاد ہو کہ آپ ایک کافر کو پچھاڑ کر سینے پر سوار ہوگئے، اس نے آپ کے چہرے پر تھوک دیا، آپ اس کا سر کاٹنے کی بجائے نیچے اتر آئے، کہا اب اگر میں نے تمہیں قتل کیا تو اس میں اللہ کے راستے میں جہاد کے ساتھ میرا انتقام بھی مل جائے گا۔ کاش ایسے میں مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے، کسی منبر سے، کسی عالم دین کی خطابت کے جوش سے ایک بات بلند ہو... ہم ظلم و جور، جبر و زیادتی، اور لادینیت کا مقابلہ صرف اللہ کیلئے کرتے ہیں، اس میں اگر انتقام کی ذرا سی کھوٹ یا ملاوٹ بھی آگئی تو اعمال تو ضائع ہوں گے ہی، دنیا بھی ہماری تعلیمات سے نفرت کرنے لگے گی۔

بروز جمعتہ المبارک 11 ربیع الاول 1446ھ 13 ستمبر 2024ء

پاکستان کیوں بنا؟

اکثر نوجوان پوچھتے ہیں کہ پاکستان کیوں بنا؟ ہندوستان کے سابقہ وزیر خارجہ اور بی جے پی کے لیڈر جسونت سنگھ کی متنازعہ کتاب "جناح پارٹیشن انڈی پینڈینٹ" جس میں قائداعظم کے بارے میں یہ تاثر کہ قائداعظم متحدہ ہندوستان کے حق میں تھے اور یہ پنڈت جواہت لال نہرو اور پٹیل کی ضد کی بناء پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا"۔ آج کوشش کروں گا کہ مختصراً ان دونوں سوالوں کا جواب تحریر کر سکوں۔

وہ جو اس کے افکار اور نوعیت سے ناواقف ہوتے ہیں، وہ جو اس وقت ایک مخصوص نوجوانوں کے گروہ کے دلوں میں اسلامی روح کی تڑپ کی بجائے ہندوستانی گانے، ہیجان انگیز فلمیں اور دلکش مناظر بسے ہوئے ہیں، انہیں معلوم نہیں کہ پاکستان کی قیادت نے ظہورِ پاکستان کیلئے اور دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک لانے میں کتنی مشکلات کو سر کیا ہو گا۔ ہندوستان کے مسلمان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، وہ ذہنی، جسمانی، معاشی اور اقتصادی افکار سے بے بہرہ تھے۔ ان کے اوپر ہندو اور انگریز کی قوت کا اثر تھا، لہٰذا مسلمان اپنی تخلیقی اہلیت اور ہیئت اجتماعیہ اور انسانیہ کے فروغ و فراغ کیلئے وہ مقام حاصل نہ کر سکے۔ تمام زندگی کا کاروبار، تعمیری قوت کا سرچشمہ ہندو کی تجارت تھی اور مسلمان ہندو کے مرہونِ منت تھے۔

انگریزوں خاص کر لارڈ کیمبل کے زمانے میں کوئی آسامی نکلتی تو اشتہار میں یہ بھی تحریر کر دیا جاتا کہ مسلمانوں کو درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ ہندو تہذیب ذات پات پر مبنی ہے، وہ مسلمانوں کو بھی شودر سمجھتے تھے۔ مسلمان مفلسی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی کہ مسلمانوں کی کشتی کا رخ یا سمندر کے پانی کے اس دھارے کو کس طرح بدلا جائے؟ مفکر پاکستان حکیم الامت علامہ اقبال نے کئی حیرت انگیز کارناموں کی بدولت ایک نئی سوچ سے روشناس کرایا۔ انہوں نے اپنے تعمیری فلسفے کی قوت سے خطبۂ الٰہ آباد میں مسلمانوں کو بیداری کی ایک نئی راہ دکھائی اور للکارا کہ مایوسی کی دلدل میں رہنے کی بجائے متحرک ہو کر غلامی کی زنجیروں کو توڑا جا سکتا ہے۔ قائداعظم جو اس وقت ہندوستان کے مقتدر کانگریسی لیڈروں کی صفوں میں ایک نمایاں مقام پیدا کر چکے تھے اور مسلم لیگ کے بھی شیدائی تھے، ان کو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے کماحقہ واقفیت تھی اور مستقبل پر ان کی نظر تھی۔ انہوں نے بھی ٹھان لی کہ مسلمانوں کو اندھیری راتوں سے روشن صبح کی طرف لایا جائے۔ قائداعظم اور ان کے رفقاء نے بڑی محنت کی کیونکہ قرآن کی تعلیم ان کی مشعلِ راہ تھی۔ ایک مرتبہ قائداعظم نے فرمایا "اگر ہم قرآن کریم سے ہدائت حاصل کرتے رہے تو آخر فتح ہماری ہو گی"۔ مزید فرمایا کہ "ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے ربِّ کریم نے ہمارے محبوب پیغمبر ﷺ کے ذریعے ہم تک پہنچایا۔

لہٰذا یہ دو نظریات تھے جس کی وجہ سے قائداعظم نے مسلمانوں میں مسلم لیگ کی تحریک کو ایک نئے ولولے کے ساتھ پیش کیا اور مسلمانوں میں جوش و خروش پیدا کیا اور 1937ء سے لیکر 1945ء تک ہندوستان میں ایک انقلاب آفرین تبدیلی آئی اور اسی لئے 1944ء کے الیکشن میں مسلمانوں نے تمام ہندوستان کی سیٹوں پر بھاری اکثریت حاصل کی۔ قائداعظم ایک عظیم ہستی تھے، وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے اور لوگ ان کی بات نہ صرف سنتے تھے بلکہ اس پر دل و جان سے عمل بھی کرتے تھے۔ انہوں نے مسلم قومیت کو ابھارا کہ تمام مسلمان ایک قوم ہیں اور اس قوم کیلئے اب ایک الگ ملک ہونا چاہئے۔ انہوں نے ایک فقرہ میں کہا: قومیت کی تعریف جس طرح بھی کی جائے، مسلمان ہر تعریف کی رو سے الگ قوم ہیں اور ساتھ انہوں نے واضح کر دیا کہ مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان کا تخیل ہرگز قبول نہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنی مسلمان قوم کو ایک زبردست تباہی کی طرف نہیں دھکیل سکتے۔

لہذا قائداعظم نے اپنی بصیرت سے وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اور مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے فروغ دینے کیلئے تقسیم ہند کو مسلمانوں کی بہتری کا ذریعہ قرار دیا کہ مسلمانوں کو اپنا الگ وطن چاہئے جہاں ہندوؤں کی طرح ذات پات کی کوئی تمیز نہ ہو۔ مسلمانوں کیلئے خود مختار معاشی فلاح و بہبود کے منصوبے ہوں جہاں مسلمان اپنی تہذیب و تمدن کی پرورش اور حفاظت کر سکیں، جہاں اخوت و مساوات اور خوشحال معاشرہ ہو۔

قائداعظم نے فرمایا: "ہم ایک خدا اور ایک رسول اور ایک امت پر یقین رکھتے ہیں"۔ لہذا انہوں نے قرار دیا کہ مسلمانوں کو ایک ایسا معاشرہ چاہئے جو حریت و عدل، مساوات ،اخوت، محبت اور باہمی احترام کے اصول پر قائم ہو، آقا اور بندے کے درمیان تمیز ہو، رنگ و نسل سے ہٹ کر بنی آدم یکساں ہوں اور وہ اللہ کی زمین پر مسلمانوں کیلئے ایک نئی راہ نکال سکیں۔ وہ اپنے ذہن میں ہندوستانی مسلمانوں کیلئے الگ وطن کا تصور پختہ کر چکے تھے، جہاں مسلمان عدل و انصاف اور آزادی سے رہیں اور اپنے جان و مال کی خود حفاظت کر سکیں۔

انہوں نے کہا "میں پاکستان کیلئے لڑ رہا ہوں کیونکہ ہمارے مسائل کا عملی حل ہی پاکستان ہے۔ میں نے اور میرے رفقاء نے کانگریس میں رہ کر دیکھا کہ کانگریسی قیادت مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں بالکل سنجیدہ نہیں، ان کا رخ ہندو اور ہندو کلچر کو فروغ دینا ہے، لہذا ان کے ساتھ زیادہ دیر رہنا نہ تو سود مند ہے اور نہ ہی ہماری نجات کا باعث ہے۔ آپ نے علی الاعلان کہا کہ ہندو اور انگریز دونوں متحد ہیں اور مسلمانوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں، ان کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بنا رہے ہیں اس لئے مسلمان مزید محکومی کے دن نہیں گزار سکتے۔ بنگال کے مسلمانوں کی حالت اتنی ناگفتہ بہ ہے کہ جب سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1753ء میں بنگال پر قبضہ کیا تو مسلمانوں کا مستقبل مکمل طور پر خطرے میں پڑ گیا، ان کی حالت خستہ و خوار ہو گئی۔ ایک وقت تھا کہ بنگال کے مسلمان اس خطہ پر قابض تھے اور اس وقت یہ مہذب ہندوستان کا خطہ تھا۔ جب سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے قبضہ کیا، مسلمانوں کو ان غیروں نے ذلیل زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ قائداعظم نے وارننگ دی: "ہندو اور انگریز دونوں متحد ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے، دو قومی نظریہ ایک صداقت ہے اور ہم آزادی کو اپنا دستور سمجھتے ہیں"۔

آپ نے کہا کہ: آل انڈیا مسلم لیگ کا سب سے بڑا اصول یہ بھی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کی شناخت برقرار رکھی جائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہا کہ "وہی قومیں آزادی کے قابل تصور کی جاتی ہیں جنہوں نے کامیابی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچایا"۔ قائداعظم نے 14 / اگست 1948ء کو اپنے تاریخی خطاب میں فرمایا "یاد رکھئے پاکستان کا قیام ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں مل سکتی، یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے، اگر ہم نے دیانتداری، تندہی اور بے غرضی کے ساتھ کام کیا تو یہ سال بہ سال ترقی کرتی رہے گی۔ مجھے اپنے عوام پر کامل بھروسہ اور یقین ہے کہ ہر موقع پر وہ اسلام کی نشاطِ ثانیہ اور روایات کے مطابق عمل پیرا ہوں گے"۔ بلکہ قائداعظم کا خطاب علامہ اقبال کے اس شعر کی ترجمانی معلوم ہوتا ہے:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

قائداعظم نے کہا تھا کہ ہماری تمنا ہے کہ ہماری قوم روحانی، اخلاقی، تمدنی، اقتصادی، معاشرتی، معاشی اور سماجی زندگی کو کامل نشوونما ملے، لہٰذا ہم نے قوم کی حیثیت سے ملک حاصل کیا، ہمیں ایک قوم ہی رہنا چاہئے، اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو آج ہم اقلیت میں ہوتے، محکوم ہوتے اور ہندو کے مظالم کے سامنے بے بس ہوتے"۔ قائداعظم نے مزید ایک موقع پر فرمایا "ہندوستان کے انتہائی پیچیدہ مسئلے کا حل قیامِ پاکستان ہے اور اب پاکستان ایک اٹل حقیقت ہے، کیونکہ متحدہ ہندوستان کا تخیل ہرگز قابل عمل نہیں تھا اور ہم کو متحدہ ہندوستان یقیناً ایک تباہی کی طرف لیجاتا، اب آپ کو دشمن کی ریشہ دوانیوں کو موزوں ترین جواب یہ دینا چاہئے کہ ہم اپنی مملکت کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر تعمیر کریں۔ اب ہم اپنے ملک کے مالک ہیں، ہم نظم وضبط خود چلا رہے ہیں اور تمام کامیابیاں ذاتی کوشش اور محنت سے حاصل کی جاتی ہیں"۔

قارئین! اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ قائداعظم اور علامہ اقبال متحدہ ہندوستان میں رہنا چاہتے تھے یا مسلمانوں کیلئے ایک الگ مملکت ان کی منزل تھی۔ ہندو ابھی تک قائداعظم کی فراست کو ماننے کیلئے تیار نہیں کہ کس طرح انہوں نے پاکستان کا کامیاب مقدمہ لڑا اور بالآخر ایک علیحدہ مملکت مسلمانوں کیلئے معرض وجود میں آئی۔

بروز ہفتہ 12 ربیع الاول 1446ھ 14 ستمبر 2024ء

حاصلِ حیات و کائنات ﷺ

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہیں تو ہو

اور جذبۂ عشق رسول اکرم ﷺ کا اصل تقاضہ یہی ہے کہ یہ کیفیت ہمارے فکر و عمل کا پوری طرح احاطہ کر لے۔ یہ بات ایمان کی ہے اور ایمان کا ثبوت اعمال صالح کی صورت ہی میں فراہم کیا جا سکتا ہے۔ سیرت پاک کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی ہمارا جزو ایمان ہونی چاہئے کہ دور رسالتِ مآب ﷺ تاریخ کا حصہ نہیں ہے بلکہ ساری نسلِ انسانی کیلئے قیامت تک ہدائت جاریہ ہے۔

ہمارے رسول کریم ﷺ نے اسلام کو ایک مکمل معاشرتی نظام بنا کر نسلِ انسانی کو عطا فرمایا ہے اور انسانی تاریخ کا حقیقی انقلاب وہی دور سعادت ہے۔ رسول کریم ﷺ کے وسیلے ہی سے انسانیت کو دنیا کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کی وسعتوں کا شعور اور نسلِ انسانی کی عالمگیر مساوات کا پیغام ملا۔ انسان انفرادی طور پر جس طرح مختلف مرحلوں سے گزر کر باشعور ہونے کی منزل تک پہنچتا ہے، نسلِ انسانی بھی مجموعی طور پر انہی مرحلوں سے گزری ہے۔ ختم نبوت کا اعلان پوری نسلِ انسانی کے باشعور ہونے کا اعلان بھی ہے، اسی لئے ہمارے حضور ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع میں ساری نسل انسانی کو مخاطب فرمایا۔

اس طرح پوری نسل انسانی کیلئے اللہ کی ہدائت حرفاً حرفاً محفوظ ہو گئی اور اس کے مطابق پوری معاشرتی زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل عملی نمونہ سامنے آ گیا۔ "آئیڈیل" کو معاشرتی زندگی کی حقیقت بنا کر پیش کر دیا گیا، زندگی عملی نمونے میں ڈھل گئی۔ انسان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کائنات کے نظام اور انسان کی انفرادی، اجتماعی زندگی اور سماجی زندگی سب اللہ کے قانون کی گرفت میں ہیں۔ کائنات کے نظام میں اللہ کی حاکمیت براہِ راست ہے لیکن کائنات کا نظام حیرت ارادے اور اختیار کی صفت کی وجہ سے انسانی زندگی پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نفاذ انسانی ایمان و اعمال کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ کائنات میں شرک ممکن نہیں انگیز نظم وضبط کے تحت چل رہا ہے۔ وہاں کسی نوعیت کا کوئی فساد ممکن ہی نہیں، کیونکہ فساد شرک سے پیدا ہوتا ہے اور سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوا ہے: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ(الانبیاء:22) اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں خدائے مالک عرش ان سے پاک ہے

فساد شرک سے پیدا ہوتا ہے، شرک ناقابل معافی گناہ اسی لئے ہے کہ اس سے احترام آدمیت کی نفی ہو جاتی ہے۔ انسان کے مشرکانہ افکار و اعمال سے اللہ انسانی عمل کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ساری دنیا کے انسان بھی اگر مشرک ہو جائیں تو اللہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ شرک سے انسانی فکر میں، میں اور انسانی معاشرے میں فساد پیدا ہو جاتا ہے اور جہاں فساد ہوتا ہے وہاں امن و انصاف برقرار نہیں رہ سکتا۔ انسانی معاشرے میں خیر و فلاح کیلئے اور ہمہ جہت ارتقاء کیلئے امن و انصاف قائم رہنا ضروری ہے۔ حریت، مساوات، اخوت، امانت، دیانت، صداقت اور عدالت، یہ صفات جنہیں ہم اخلاقی مہیا ہو جاتی ہے۔ جس فرد میں قدریں کہتے ہیں، یہ قدریں در حقیقت وہ قوانین قدرت ہیں جن کے نفاذ سے انسانی معاشرے میں امن و انصاف کی ضمانت جس حد تک یہ صفات زندہ و بیدار اور متحرک ہوں گی، وہ فرد اسی نسبت سے خیر و فلاح قائم کرنے کا باعث ہو گا اور جس معاشرے میں ایسے صالح اعمال والے افراد کی کثرت ہو گی وہ معاشرہ امن و سلامتی اور انصاف کا گہوارہ بن جائے گا۔

عالم بیج کو کھلی فضا ملے تو پوری طرح پھلتا پھولتا ہے۔ اس پر کوئی دباؤ آجائے یا وہ کسی پتھر کے نیچے آجائے تو وہ نشو ونما سے محروم ہو جاتا ہے۔ سرکار دو ﷺ اس اوّلین اسلامی معاشرے سے انسانی جذبات، مفادات، خواہشات اور تعصبات کے سارے پتھر سمیٹ لئے تھے چنانچہ انسانی معاشرت کا وہ باغ ایسا لہلہایا، ایسے پھل پھول لایا کہ انسانی تاریخ میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو سیرت سرکار دو عالم ﷺ کی مثال واقعی بے مثال ہے۔ حضور اکرم ﷺ سب سے زیادہ با اختیار تھے اور سب سے زیادہ قانون کے پابند تھے۔ حضور اکرم ﷺ کے تصرف میں ہر شئے آسکتی تھی لیکن حضور اکرم ﷺ نے سب سے زیادہ سادہ زندگی بسر فرمائی۔ حضور اکرم ﷺ کا ہر فرمان قانون تھا، حضور اکرم ﷺ نے سب سے زیادہ خود احتسابی کی زندگی بسر فرمائی۔ اس اعتبار سے اسلامی معاشرے کی خصوصیات بڑی منفرد ہیں۔ اسلامی معاشرے میں تکریم کا واحد معیار شخصی کردار ہے۔

اسلامی معاشرے میں دشمن اقوم کے افراد سے بھی انصاف کیا جائے گا۔ غلطی اور جرم کرنے والا سب سے پہلے خود ہی اپنے جرم کا اعتراف کرے گا۔ اسلامی نظام میں انسانوں کی انسانوں پر حکومت کا کوئی تصور نہیں بلکہ معاشرتی زندگی میں معاملات اور اشیاء کا انتظام کرنے والا ہر وقت ہر شخص کے سامنے اپنے اعمال اور طرزِ انتظام کیلئے جوابدہ رہے گا اور ایسے نظام کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ خود انسان کی اپنی خواہشات نفسانی بن جاتی ہیں۔ سورۃ فرقان میں ارشاد ہے "أَرَءَيْتَ مَنِ ٱتَّخَذَ إِلَـٰهَهُۥ هَوَىٰهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا: تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا الٰہ بنالیا ہے، اب ایسے شخص کو تم راہِ راست پر کیسے لاسکتے ہو۔ یہی خواہشاتِ نفسانی معاشرتی امن وانصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

معاشرتی زندگی میں انصاف سے محرومی سے فتنہ وفساد پیدا ہوتا ہے اور فتنہ وفساد کی کیفیت لوگوں کے جذبات اور تعصبات کو مسلسل ابھارتی رہتی ہے۔ جبر کے ذریعے لوگوں کو وقتی طور پر خاموش رکھا جاسکتا ہے لیکن جبر کی خاموشی پھر بغاوت کا طوفان بن کر نمایاں ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ وہ فانی نہیں ہے۔ انسانی وجود کو، انسانی ذات کو موت کے بعد بھی باقی رہنا ہے انسان کیلئے آنے والی زندگی ناگزیر ہے اور اس آنے والی دائمی زندگی میں کامیابی یا ناکامی کی بنیاد اس دنیا میں ایمانی شعور کے تحت اختیاری عمل ہوگے۔ آخرت پر ایمان انسان میں خود احتسابی کی صفت پیدا کرتا ہے۔ انسانی معاشرت کے تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو نسلوں، علاقوں یا ملکوں تک محدود نہیں رہتے۔

گزشتہ 14 صدیوں سے زائد عالمگیر سطح پر جتنی بھی مثبت تبدیلیاں ہوئی ہیں، انسانی حقوق کا جتنا شعور بھی بیدار ہوا ہے، قوموں کو اعلیٰ انسانی اقدار کے مطابق اپنا نظام مرتب کرنے پر راغب کرنے کیلئے بین الاقوامی تنظیموں کے قیام کی جو کوششیں بھی ہوئی ہیں، ان ساری کوششوں کا حقیقی محور مرکز سرکار دو عالم ﷺ کا دور سعادت آثار ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید پر ایمان سازی نسل انسانی کیلئے خیر وفلاح کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

لیکن نسل انسانی کی وحدت اور اس کی فلاح وخیر کی راہ میں رکاوٹیں بھی مسلسل آتی رہتی ہیں اور حق وباطل اور خیر وشر کے درمیان یہ آویزش انسانی معاشرے کی امتیازی صفت ہے چنانچہ امن وانصاف کی فضا کو فتنہ وفساد پیدا کرنے والی طاقتیں برابر مکدر کرتی رہتی ہیں اور طرفہ تماشہ یہ کہ فساد پھیلانے والے بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اصلاح کرنے والے ہیں۔ فتنہ وفساد کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ قرآن پاک میں فتنہ پردازی کو انسانی قتل سے بھی زیادہ بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔ فرعون کو مفسد کہا گیا ہے اور فساد کی شدت کو انسانی بداعمالیوں کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ تاریخ قوموں کا حافظہ اور واقعات کی

ریاضی ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے اور اس طرح ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی رہتی ہے کہ اللہ کا قانون بدلا نہیں کرتا۔ حیات و کائنات کا نظام انسانی معاشرے کے مختلف اجزاء پر مشتمل ہے، ان میں منقسم نہیں ہے، ہم نے عملاً اسے منقسم کر دیا ہے۔

عبادات الگ، معاملات زندگی الگ اور ہم اس ارشادِ قرآنی کو بھول جاتے ہیں کہ ایک سے زیادہ الٰہ ہوں گے تو فساد ہو گا۔ ہمارے ہادی برحق ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع میں ہم اہل ایمان پر یہ ذمہ داری ڈالی تھی کہ جو وہاں موجود تھے وہ اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو وہاں موجود نہیں تھے۔ یہ ایک عالمگیر ذمہ داری تھی۔ اس کے ساتھ قرآنِ کریم نے ہم پر اجتماعی طور پر "خیر امت" اور "امتِ وسط" ہونے کی ذمہ داری بھی ڈالی ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۔ حق کی منکر قوتیں ایک دوسرے کا ساتھ دعوت دیتی ہیں، تم اگر ایسا نہیں کرو گے تو بڑا فساد برپا ہو جائے گا"۔ (سورۃ انفال: 73)

"علامہ اقبال نے امت مسلمہ کو یہی ذمہ داری یاد دلائی ہے:

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ہے ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پر بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں پر بھروسہ
تقدیرِ امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

ایمان کی توانائی فرد میں اور قوم میں، دونوں میں خود احتسابی کی صفت پیدا کرتی ہے۔ ہم اس صفت سے ایک طویل عرصے سے عالمگیر سطح پر محروم ہیں اور اس محرومی نے ہمیں اس توانائی سے بھی محروم کر دیا ہے جسے اقبال نے مومن کی فراست کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے، اس کے باوجود عالمی سطح پر امن وانصاف کے قیام کیلئے ہمارا ملی کردار کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ جب تک وہ کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں گے، عالمگیر سطح پر امن وانصاف قائم نہیں ہو سکتا اور اپنی اس بے بسی کیلئے ہم اللہ کے حضور جوابدہ بھی ہوں گے اور اس کردار کی ادائیگی کی راہ جذبہ حب رسول ﷺ سے ہی منور ہو سکتی ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کی ذات ہی حاصلِ حیات و کائنات ہے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
نہ یہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی
نہ ہو بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
بزمِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

رہے نام میرے رب کا جس نے میرے نبی ﷺ کو سب جہانوں کیلئے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا!

بروز اتوار 13 ربیع الاول 1446ھ 15 ستمبر 2024ء

حضور اکرم ﷺ کی تریسٹھ سالہ حیاتِ طیبہ

پیدائش اور نشوونما

امام الانبیاء حضور اکرم ﷺ کی پیدائش یتیمی کی حالت میں واقعۂ فیل کے تقریباً پچاس دن بعد، مشہور قول کے مطابق ۱۲ / ربیع الاوّل مطابق ۲۰ / اپریل ۵۷۱ء بروز پیر موسم بہار میں ہوئی(۱)۔ آپ کے دادا عبد المطلب نے آپ کا نام محمد اور والدہ نے خواب میں ایک فرشتے سے بشارت پاکر احمد رکھا ۔ آپ کی والدہ حضرت آمنہ نے آپ ﷺ کو تین دن تک اپنا دودھ پلایا، اس کے بعد آپ کے چچا ابولہب کی باندی ثویبہ نے آپ کو چند دن دودھ پلایا، پھر حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دو سال پورے ہونے تک آپ کو دودھ پلایا، دو سال پورے ہونے پر آپ کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ آپ ﷺ کی عمر چھ سال تھی کہ آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا(۲) اور جب آپ کی عمر آٹھ سال ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب بھی دنیا سے پردہ فرما گئے۔(۳)

ملک شام کا سفر اور بحیرہ راہب سے ملاقات

بارہ سال دو ماہ کی عمر میں آپ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کی ہمراہی میں تجارت کی غرض سے ملک شام کی طرف پہلا سفر کیا۔ راستے میں یہودیوں کے ایک بڑے عالم بُحَیرہ راہب سے ملاقات کے بعد ابو طالب نے آپ کو واپس مکہ بھیج دیا، ۱۵ سال سات ماہ کی عمر میں آپ ﷺ نے اپنے قبیلہ قریش اور ایک دوسرے قبیلہ قیس کے درمیان ہونے والی جنگ (حرب الفجار) میں حصہ لیا(۴)، لیکن اس لڑائی میں آپ ﷺ نے کسی پر ہاتھ نہ اُٹھایا، اس جنگ کے بعد عرب کے چند قبائل نے ان جنگوں سے تنگ آکر یہ معاہدہ کیا کہ آئندہ قبائلی عصبیت سے بالاتر ہو کر صرف مظلوم کی مدد کی جائے گی، اس معاہدے کو "حلف الفضول" کہتے ہیں، آپ ﷺ نے اسے پسند فرماتے ہوئے اس میں شرکت فرمائی، اس وقت آپ ﷺ کی عمر ۱۵ سال آٹھ ماہ تھی۔ ۲۳ سال کی عمر میں آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامان کو تجارت کی غرض سے ملک شام لے کر گئے اور اس میں خوب نفع کما کر واپس ہوئے۔

حضرت خدیجہ سے نکاح اور اولاد:

پچیس سال دو ماہ کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ ﷺ کا نکاح ہوا، حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے آپ ﷺ کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں، آپ کی اولاد میں حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش سب سے پہلے ہوئی، یہ پاؤں پر چلنا سیکھ رہے تھے کہ ان کی وفات ہو گئی۔ دوسرے بیٹے حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، انہی کا لقب طیب و طاہر ہے، پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا، ان کی ولادت آپ ﷺ کو نبوت ملنے کے بعد ہوئی۔

جب آپ کی عمر ۳۰ سال ہوئی تو آپ ﷺ کے ہاں آپ کی بڑی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پیدائش ہوئی، ان کا نکاح مکہ میں ہی ان کے خالہ زاد بھائی ابو العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے ہوا، جب آپ کی عمر ۳۳ سال ہوئی تو آپ ﷺ کی دوسری بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پیدائش ہوئی، جن کا نکاح مکہ میں ہی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ سے ہوا، آپ کی تیسری بیٹی حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں، جن کا نکاح مدینہ میں آپ ﷺ نے حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد ۳ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ

تعالیٰ عنہ سے کیا تھا۔ نبوت ملنے کے بعد جب آپ کی عمر ۴۱ سال تھی تو آپ ﷺ کی چوتھی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پیدائش ہوئی، ان کا نکاح مدینہ میں غزوۂ بدر کے بعد ذوالحجہ سنہ ۲ھ میں ہوا، آپ ﷺ کے ایک تیسرے بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو حضرت ماریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، سترہ ماہ کی عمر پاکر ۱۰ھ میں ان کی وفات ہوگئی۔

تقریباً ۳۳ برس کی عمر میں آپ ﷺ پر غیبی اسرار کا ظہور شروع ہوا۔ ۳۵ سال کی عمر میں آپ نے قبائل کے سب منتخب افراد کے ساتھ کعبہ کی از سرنو تعمیر کے دوران حجر اسود کی اپنے ہاتھ سے تنصیب فرمائی۔

خلعت نبوت

۹/ ربیع الاوّل مطابق ۱۴/ فروری ۶۱۰/ کو جب آپ ﷺ کی عمر چالیس برس ایک دن تھی تو باضابطہ طور پر آپ کو اللہ رب العزت نے خلعتِ نبوت کے ساتھ ممتاز و مشرف فرمایا۔ بعثت نبوی (آپ ﷺ کو نبوت ملنے کے بعد سے شروع ہونے والا زمانہ) کے پہلے سال نمازیں فرض کر دی گئیں، اٹھارہ رمضان المبارک کو جب آپ کی عمر چالیس سال چھ ماہ چھ دن ہوئی تو آپ پر قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا۔

تبلیغ کی ابتداء اور مشکلات

نبوت ملنے کے تین سال بعد تک آپ خفیہ تبلیغ فرماتے رہے، جس کے نتیجے میں ۳۰ سے زائد افراد مسلمان ہوگئے، تین سال کے بعد آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ علی الاعلان شروع کر دی، جس کے نتیجے میں کفار مکہ جو اس وقت بیت اللہ میں رکھے بتوں کو پوجا کرتے تھے، آپ ﷺ کے جانی دشمن بن کر آپ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کو تکلیفیں پہنچانے لگے، ان کفار مکہ کے مظالم جب حد سے بڑھنے لگے تو آپ ﷺ نے بعثت کے پانچویں سال اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و دیگر اقارب کو جو تقریباً گیارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل پندرہ افراد تھے، ملک حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دیا(۵)۔ (تین ماہ بعد اس اطلاع پر کہ اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے، ان میں سے کچھ افراد مکہ واپس آگئے، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ اطلاع جھوٹی تھی) بعثت کے چھٹے سال حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسلام لے آئے(۶) تو لوگ اعلانیہ اسلام میں داخل ہونے لگے، اسلام کی روز بروز بڑھتی ہوئی شان سے خوفزدہ ہو کر کفار مکہ نے آپ ﷺ کے خاندان بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے مکمل مقاطعہ کے لیے ایک عہد نامہ(۷) لکھ کر بیت اللہ میں لٹکا دیا، اس طرح آپ ﷺ بعثت کے ساتویں سال ایک گھاٹی شعب ابی طالب میں اپنے تمام اقرباء و رفقاء سمیت مقید کر دیے گئے(۸)، ان سخت حالات میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ایک مرتبہ پھر ملکِ حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے فرمایا، جن میں تراسی مرد اور بارہ عورتیں شامل تھیں، تین سال بعد اس شدید محاصرے کا خاتمہ ہوا۔ جب آپ ﷺ کی عمر تقریباً ۴۹ سال سات ماہ ہوئی تو ماہ شوال میں آپ ﷺ کے چچا ابو طالب وفات پاگئے اور اس کے صرف تین دن بعد ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا؛ اسی لیے آپ...نے اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) فرمایا۔

سفر معراج

اسی سال ماہ رجب کی ستائیسویں شب آپ ﷺ معراج کے سفر پر تشریف لے گئے(۹) اور اسی سفر میں پانچوں نمازیں فرض کی گئیں(۱۰)۔ جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں اسلام کی اشاعت کا فیصلہ فرمالیا تو قبیلہ اوس کے چند آدمیوں کی آپ ﷺ سے مکہ میں ملاقات ہوگئی اور ان میں سے دو آدمی اسعد

بن زارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ذکوان بن عبد قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشرف باسلام ہوئے۔ بعثتِ نبوی کے گیارہویں سال کچھ اور آدمی مدینہ سے آکر آپ ﷺ کو ملے اور ان میں سے تقریباً آٹھ افراد مسلمان ہوئے(۱۱)۔ بعثت نبوی کے بارہویں سال جب آپ ﷺ کی عمر ۵۲ سال تھی، ماہ ذوالحجہ میں جمرہ عقبہ کے قریب مدینہ سے آئے ہوئے تقریباً بارہ افراد نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، جسے بیعت عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے(۱۲)، اگلے سال جب آپ ﷺ عمر کے ترپنوے سال میں تھے تو ماہ ذی الحجہ میں مدینہ طیبہ سے ایک بڑا قافلہ مکہ معظمہ پہنچا، جن میں ستر مرد اور دو عورتیں شامل تھیں(۱۳)۔ آپ ﷺ نے نصف شب کے وقت جمرۂ عقبہ کے قریب ان سے ملاقات کی، اس وقت آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ سے آئے ہوئے ان حضرات سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: یہ میرا بھتیجا ہے جو ہمیشہ اپنی قوم میں عزت و حفاظت کے ساتھ رہا ہے، تم ان کو مدینہ لے جانا چاہتے ہو۔ اگر ان کے مخالفین سے ان کی حفاظت کا ذمہ لے سکتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ان کو اپنے قبیلہ میں رہنے دو۔ اس مدنی قافلہ کے سردار نے کہا کہ ہم حضور ﷺ کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں، اے اللہ کے رسول اپنا دست مبارک دیجیے کہ ہم بیعت کریں، آپ ﷺ نے ہاتھ بڑھایا اور یہ سب لوگ بیعت نبوی سے مشرف ہوئے، اس بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں(۱۴)۔

ہجرت

پھر اسی سال آپ ﷺ نے ماہ صفر کی ستائیسویں شب کو مکہ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لیا اور روانہ ہو کر غار ثور پہنچے(۱۵) اور اس غار میں تین راتیں قیام کرنے کے بعد یکم ربیع الاوّل ایک ہجری (وہ زمانہ جو آپ ﷺ کے مدینہ کی طرف ہجرت سے شروع ہوا) بروز پیر (۱۶) جب آپ ﷺ کی عمر تقریباً باون سال گیارہ ماہ انیس دن تھی، مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے، سات دن کے سفر کے بعد ۸ / ربیع الاوّل سنہ ۱ھ مطابق ۲۳ / ستمبر ۶۲۲ء بروز پیر آپ ﷺ مدینہ کے علاقے قبا پہنچے اور یہاں مسجد قبا کی بنیاد رکھی(۱۷)۔ ۱۲ / ربیع الاوّل بروز جمعہ آپ ﷺ قبا سے سوار ہو کر بنی سالم کے گھروں تک پہنچے تھے کہ جمعہ کا وقت ہو گیا، یہاں تقریباً سو آدمیوں کے ساتھ آپ ﷺ نے اسلام کا پہلا جمعہ پڑھایا(۱۸)۔ جمعہ سے فارغ ہو کر آپ یہاں سے روانہ ہوئے، جہاں اب مسجد نبوی ہے اس سے متصل حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر تھا، یہاں آکر آپ ﷺ کی اونٹنی رک گئی، پھر آپ نے مستقل یہیں قیام فرمایا(۱۹)۔

مسجد، مدرسہ اور ازواجِ مطہرات کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد ماہ ربیع الاوّل میں ہی سب سے پہلے آپ نے مسجد نبوی(۲۰) اور ازواج(۲۱) مطہرات حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے گھر تعمیر کرائے۔ جب مسجد نبوی کی تعمیر تقریباً مکمل ہو گئی تو آپ ﷺ نے انصار کو بلایا اور مکہ سے ہجرت کر کے آنے والے ۴۵ مہاجرین اور ان انصار مدینہ کے مابین مواخات قائم کرتے ہوئے ایک انصاری اور ایک مہاجر کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی(۲۲) ہو، اور پھر آپ نے اسی سال اسلام کا پہلا مدرسہ صفہ قائم فرمایا۔ صفہ سائبان کو کہتے ہیں، یہ سائبان مسجد نبوی کے ایک کنارے پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا، آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو دن بھر آپ سے احادیث سنتے تھے، رات کو یہیں آرام فرماتے(۲۳)۔

اسی سال آپ نے ایک منشور تیار کیا جس میں مہاجرین و انصاری کے علاوہ ان یہود و مشرکین کو بھی شامل کیا گیا جو اس وقت مدینہ میں آباد تھے، جس کا مقصد بلا امتیاز مذہب و قوم کے اندرونی و بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے ایک اتحادی عمل کی ترویج تھی، اس معاہدہ کو میثاق مدینہ کہا جاتا ہے(۲۴)، اسی

سال ماہ شوال میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی (جن کا نکاح آپ سے پہلے ہو چکا تھا) رخصتی ہوئی(۲۵)۔ اس سال آپ نے دو سریّہ روانہ فرمائے، سریہ جہاد کے اس دستے کو کہا جاتا ہے جس میں آپ نے خود شرکت نہ فرمائی ہو، بلکہ اپنے کسی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس دستے کا امیر مقرر کر کے روانہ فرمایا ہو، خواہ جنگ کی نوبت آئی ہو یا نہیں، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ دستہ جنگ ہی کی نیت سے روانہ کیا گیا ہو۔

غزوات اور دعوتی خطوط

۲ھ میں پانچ غزات ہوئے، غزوہ اس چھوٹے یا بڑے لشکر کو کہتے ہیں جس میں آپ ﷺ بنفس نفیس شریک ہوئے ہوں، خواہ اس سفر میں جنگ کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو اور خواہ اس لشکر کے پیش نظر جنگ کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو، غزوہ ابو اُ جس کو غزوہ ودان بھی کہتے ہیں۔ غزہ بواط، غزوہ بدر کبریٰ، غزہ بنی قینقاع، غزہ سوید۔ اس سال کے غزوات میں سب سے اہم غزوۂ بدر ہے جو رمضان(۲۶) المبارک کی ۱۸ تاریخ کو بدر کے مقام پر (جو مدینہ سے ۸۰ میل دور ہے) وقوع پذیر ہوا(۲۷)۔ اب تک مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، حضور ﷺ کی خواہش پر پندرہ شعبان ۲ھ نماز ظہر کے دوران اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی طرف مسلمانوں کو منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم فرمایا(۲۸)۔ اسی سال(۲۹) یکم رمضان المبارک کو روزے فرض کیے گئے اور آپ نے یکم شوال کو نماز عید الفطر پڑھائی اور خطبہ عبد الفطر میں لوگوں کو صدقۃ الفطر (۳۰) کا حکم دیا۔

۳ھ میں تین غزوات ہوئے: غزوۂ غطفان، غزوۂ احد، غزہ حمرأ الاسد ا(۳۱) اور دو سریّہ روانہ ہوئے، غزوۂ احد اس سال کا سب سے اہم غزوہ ہے جو ماہ شوال(۳۲) میں وقوع پذیر ہوا۔ ماہ شعبان میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کے نکاح میں آئیں اور اسی سال ماہ رمضان میں حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی آپ کی منکوحہ(۳۳) بنیں۔ کعب بن اشرف یہودی کا خاتمہ(۳۴)، سود خوری کی حرمت کا ابتدائی حکم، شراب(۳۵) کی ابتدائی حرمت کا حکم، یتیموں اور زوجین کے حقوق سمیت وراثت کے مفصل قوانین کا نزول بھی اسی سال ہوا۔

۴ھ میں دو غزوات پیش آئے: غزوۂ بنی النضیر، غزوۂ بدر صغریٰ اور چار سریّہ روانہ کیے گئے(۳۶)۔ اس سال کے اوائل میں آپ ﷺ کی زوجہ حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (جو صرف چار ماہ قبل آپ ﷺ کے عقد میں آئی تھیں) انتقال فرما گئیں۔ یکم ذی القعدہ بروز جمعہ کو پردے کا حکم نازل ہوا، شراب کی قطعی حرمت کا حکم بھی اسی سال دیا گیا۔ نیز حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسی سال ماہ جمادی الثانیہ میں آپ کے عقد میں آئیں(۳۷)۔

۵ھ میں چار غزوات ہوئے: غزوہ ذات الرقاع، غزوہ دومۃ الجندل، غزوہ مریسیع(۳۸) جس کو غزوہ بنو المصطلق بھی کہا جاتا ہے اور غزوۂ خندق جو زیادہ مشہور اور اہم ہے۔ غزوۂ بنو المصطلق سے واپسی پر تیمم کا حکم نازل ہوا، اسی سال ماہ شعبان میں حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ کے عقد میں آئیں اور اسی سال حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ بھی آپ کی منکوحہ بنیں۔

۶ھ میں تین غزوات پیش آئے، غزوہ بنی الحیان، غزوہ غابہ جس کو ذی قرہ بھی کہا جاتا ہے، غزوہ حدیبیہ جس کو صلح حدیبیہ بھی کہا جاتا ہے اور گیارہ سریّے بھی روانہ کیے گئے۔ اسی سال کے وسط میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ کے عقد میں آئیں اور اسی سال کے اواخر میں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی آپ ﷺ نے نکاح فرمایا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی سال مسلمان ہوئے(۳۹) اور نیز اس سال آپ ﷺ نے بادشاہوں کو دعوتی خطوط لکھ کر اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ذریعے ان تک

پہنچائے(۴۰)۔ آپ نے وحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہرقل نامی بادشاہ روم کے پاس بھیجا، حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسریٰ خسرو پرویز کج کلاہ ایران کی طرف روانہ فرمایا اور حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ کو سلطان مصر واسکندریہ (مقوقس) کی طرف بھیجا اور عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بادشاہان عمان یعنی جیفر اور عبداللہ کے پاس بھیجا۔

۷ھ میں صرف ایک غزوۂ خیبر ہوا اور پانچ سرایا آپ ﷺ نے روانہ فرمائے، غزوۂ خیبر کے بعد اس سال کے اوائل میں آپ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح فرمایا(۴۱) اور اسی سال کے آخر میں حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی آپ ﷺ کے عقد میں آئیں، اسی سال آپ ﷺ نے اس عمرہ کی جو صلح حدیبیہ میں چھوڑ دیا گیا تھا، قضاء فرمائی۔

۸ھ میں چار اہم غزوات پیش آئے۔ غزوۂ موتہ، فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ طائف اور دس سرایا آپ ﷺ نے روانہ فرمائے، ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اب تک مسلمانوں کے دشمن تھے، اس سال اسلام لے آئے(۴۲)۔

۹ھ میں غزوۂ تبوک ہوا اور آپ نے تین سرایا روانہ کیے.... غزوۂ تبوک سے واپسی پر آپ ﷺ نے منافقین کی مسجد ضرار (جس میں جمع ہو کر وہ اسلام اور مسلمانون کے خلاف مشورہ کرتے تھے) کو آگ لگا دینے کا حکم دیا۔ اطراف عالم میں پھیلتی اسلام کی نشر واشاعت سے متاثر ہو کر اس سال درج ذیل وفود قبولِ اسلام کی غرض سے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوئے: وفد ثقیف، وفد بنی فزارہ، وفط بنی تمیم، وفد کندہ، وفد بنی عبد القیس، وفط بنی حنیفہ، وفد بنی قحطان، وفد بنی الحارث، نیز اسی سال عیسائیوں کا ایک وفد جو ساٹھ افراد پر مشتمل تھا، جسے وفد نجران کہا جاتا ہے، آپ ﷺ سے مدینہ میں ملا، یہ لوگ جب ایمان نہ لائے تو آپ ﷺ نے انہیں جزیہ ادا کرنے کا حکم دیتے ہوئے ان کے لیے ایک صلح نامہ تحریر فرمایا(۴۳)۔

۱۰ھ میں آپ ﷺ نے صرف دو سریّے روانہ فرمائے اور اسی سال ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع ادا فرمایا اور جو مسلمان اس سال حج میں نہیں تھے، ان کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی(۴۴)۔

حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات

۱۱ھ میں سفر حج کے بعد ۲۶ صفر ۱۱ھ بروز پیر آپ ﷺ نے ایک سریہ جہاد روم کے لیے تیار فرمایا، جس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اکابر شامل تھے؛ مگر اس کے امیر حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقرر ہوئے، یہ وہ آخری لشکر تھا، جس کا انتظام حضور ﷺ نے خود فرمایا، ابھی یہ لشکر روانہ نہ ہوا تھا کہ ۲۸/ صفر ۱۱ھ میں آپ ﷺ کو بخار شروع ہو گیا، جب آپ ﷺ کا مرض طویل اور سخت ہو گیا تو ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اجازت لے کر آخری ایام مرض میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر رہنے لگے، رفتہ رفتہ مرض اتنا بڑھ گیا کہ آپ ﷺ مسجد تک بھی تشریف نہ لاسکتے، ایسی صورت حال میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہو کہ نماز پڑھائیں، تقریباً تیرہ دن متواتر یہ بخار رہا اور ۱۲/ ربیع الاوّل بروز پیر بوقت چاشت آپ ﷺ نے ہاتھ کو بلند فرمایا: زبانِ قدسی سے **اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ** کہتے ہوئے جسمِ اطہر سے روح انور پرواز کر کے عالمِ قُدس میں جا پہنچی، قمری سال کے مطابق اس وقت آپ ﷺ کی عمر ۶۳ سال چار دن تھی(۴۵)۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**

* * * * * * * * *

حواشی:

(۱) الرحیق المختوم میں ۹ ربیع الاوّل کا قول اختیار کیا گیا ہے۔ ص ۸۳

(۲) مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام ابواد میں آپ ﷺ کا انتقال ہوا۔ الرحیق المختوم ص ۸۸

(۳) آٹھ سال دو مہینے دس سن کی عمر میں آپ ﷺ کے دادا کا انتقال ہوا۔ الرحیق المختوم ص ۸۸

(۴) اس وقت آپ ﷺ کی عمر پندرہ برس کی تھی۔

(۵) الرحقیق المختوم ص ۱۴۱

(۶) الرحیق المختوم ص ۱۵۸ بحوالہ تاریخ عمر بن الخطاب لابن الجوزی صحیح البخاری باب اسلام عمر بن الخطاب

(۷) لکھنے والا بعبض بن عامر بن ہاشم تھا۔ ص ۱۷۲، الرحیق المختوم، بحوالہ زاد المعاد

(۸) بائیکاٹ کی تفصیل صحیح بخاری باب اول النبی... ۱/۲۱۶ زاد امعاد ۲/۴۶ رحمۃ للعالمین ﷺ ۱/۷۹ وغیرہ سے لی گئی ہے۔

(۹) الرحیق المختوم ص ۲۱۹

(۱۰) ص ۳۲۱

(۱۱) بدایہ والنہایۃ ۳/۱۴۸

(۱۲) سیرۃ المصطفیٰ ﷺ ج ۲ ص ۳۳۴

(۱۳) الحیق المختوم ص ۳۳۷

(۱۴) ص ۳۴۱، ۳۴۲

(۱۵) ص ۳۶۱

(۱۶) الرحیق المختوم ۳۸۷

(۱۷) زرقانی ص ۳۵۱

(۱۸) سیرۃ الخاتم النبیین ﷺ ص ۴۰۱

(۱۹) زرقانی ص ۳۵۶، ۳۵۹

(۲۰) شرح زرقانی ج ۲/۴۲۵

(۲۱) شرح زرقانی ج: ۱ ص ۴۳۰

(۲۲) فتح الباری ج ۷ ص ۲۱۰

(۲۳) فتح الباری ج ۱ ص ۴۶۳ تا ۴۷۱

(۲۴) بدایۃ النہایہ ج ۳ ص ۲۳۴ وسیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۸

(۲۵) فتح الباری ج ۱ ص ۴۵۹ تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۵۷

(۲۶) ج ۲ ص ۵۵

(۲۷) تاریخ طبری ملخص از ص ۴۷ تاج ۲ ص ۱۷۲

(۲۸) ج ۱ ص ۴۶۲

(۲۹) تاریخ طبری ملخص ج ۱ ص ۴۷۱

(۳۰) ج ۱ ص ۴۷۱ و ۴۷۲

(۳۱) تاریخ طبری ملخص از ص ۱۷۳ تا ۲۵۶

(۳۲) بدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۹، ج ۲ ص ۱۸۵

(۳۳) فتح الباری ج ۲ ص ۲۵۶ وطبری ج ۳ ص ۲۹

(۳۴) طبری ج ۲ ص ۱۷۵ زرقانی ج ۲ ص ۹

(۳۵) فتح الباری ج ۲ ص ۲۵۶، زرقانی ج ۲ ص ۶

(۳۶) طبری ج ۲ ص ۲۵۷ تاج ۲۷۲

(۳۷) فتح الباری ج ۷ ص ۳۳۳، طبری ج ۳ ص ۴۲، ۴۳، ج ۲ ص ۲۷۸

(۳۸) الرحیق المختوم ص ۵۰۶

(۳۹) الرحیق المختوم ص ۵۴۴، تفصیلی ماخذ یہ ہیں فتح الباری ۷/۴۳۹، ابن ہشام ج ۲ ص ۳۰۸ وغیرہ

(۴۰) رحمۃ للعالمین ﷺ ج ۱ ص ۱۷۱

(۴۱) ابن ہشام ج ۲ ص ۳۴۰ صحیح بخاری باب غزوہ خیبر

(۴۲) سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۶۳۳، رحمۃ للعالمین ﷺ ج ۲ ص ۲۳۳

(۴۳) ابن ہشام ج ۲ ص ۵۴۳ اور کتب تفسیر ابتداء سورہ برأت

بروز اتوار 13 ربیع الاول 1446ھ 15 ستمبر 2024ء

اقبال: تصورِ وطنیت و قومیت

وطن کی محبت ایمان کا تقاضا ہے۔ انسان کا اپنی جائے ولادت اور مسکن کے ساتھ محبت و یگانگت کا تعلق ایک فطری عمل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی اَحادیثِ مبارکہ میں مکہ المکرمہ سے والہانہ محبت کا اظہار اسی حبّ الوطنی کا ثبوت ہے۔ کسی چیز کے ساتھ خالص محبت ترجیحات کے عملی تعین کی متقاضی ہوتی ہے ۔ اگر کسی مرغوب جگہ یا چیز کے ساتھ محبت والہانہ ہو تو فوقیات و ترجیحات اور ہو جاتی ہیں۔

اقبال کے اشعار سے ہی اس کا آغاز کرتا ہوں جہاں وہ فرماتے ہیں:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے اور جم اور
ساقی نے بنا کی رَوشِ لطف و ستم اَور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

موجودہ نظریۂ قوم پرستی کو مغربی طاقتیں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ وہ دیرینہ خواب جس کی تعبیر صلیبی جنگوں سے اُن کو حاصل نہیں ہو سکی، وہ قوم پرستی سے حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کو توڑنے میں استعماری قوتیں کافی حد تک کامیاب ہو گئی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں بہت سی ایسی قومیں گزری ہیں جن کی مادی شان و شوکت سے دوسری قومیں لرزتی تھیں، مگر بایں ہمہ گردشِ ایام انہیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ اس کی وجہ دین سے بیزاری اور نسلی و جغرافیائی طریقہ زندگی کو فوقیت دینا ہے۔ اس لیے کہ وطنیت، چاہے رنگ و نسل کی بنیاد پر ہو یا علاقائی حد بندی کی بنیاد پر، انسانوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کر کے ہوس پرست بنا دیتی ہے۔ علامہ اقبالؒ مسلمانوں کے ملّی تصور کو اجاگر کرتے فرماتے ہیں:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تُو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

قوم پرستی کا آغاز مغرب میں انقلابِ فرانس یعنی 1789ء کے بعد ہوا۔ مشہور قوم پرست جان جیک روسو اس بات پر مُصر تھا کہ انسان کو سب سے زیادہ تعلق اپنے گھر اور ملک سے ہونا چاہیے۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ فرد یا گروہ کی محبت اور وفاداری کا مرکز و محور اس کا وطن ہونا چاہیے۔ اُس نے نوعِ انسانی کی

اجتماعی، دینی اور سماجی نظام سے وابستگی کی شدید مخالفت کی۔ مغربی مصنفین کی تحریروں سے عیاں ہے کہ وہ قوم پرستی، زبان، ملک اور نسل کو وحدت کی بنیاد قرار دیتے تھے۔ اُن کا اصرار ہے کہ غیر کے مقابلے میں وطن کا دفاع کرنا زیادہ ضروری ہے، چاہے اس کا مؤقف صحیح ہو یا غلط۔ چنانچہ قوم پرستی عوام کے جذبات سے کھیلنے، فوجوں کو حرکت میں لانے، ہمسایہ ملکوں کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنانے، توسیع پسندی، قتل وغارت گری، بدعنوانی اور ظلم وجبر کا ایک ذریعہ بن گئی ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں اسلام اپنا ایک مستقل نظامِ فکر رکھتا ہے۔ وہ انسان کی عملی، سیاسی، اجتماعی اور روحانی زندگی پر محیط ہے۔ اسی وجہ سے قوم پرستی کا ملتِ اسلامیہ کے ساتھ ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ دونوں نظریات ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہیں۔ ملتِ اسلامی کی وحدت کی بنیاد ایک بین الاقوامی تصور پر مبنی ہے اور اس کی تشکیل عقیدے کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے علامہ اقبالؒ نے مذہب کو ریڑھ کی ہڈی قرار دیا ہے۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

پھر ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی
دِین زخمہ ہے، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

جب مختلف قومیں کسی خاص مقام یا کسی ایک مرکز میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب وترتیب کے ساتھ مل جاتی ہیں تو ایک اجتماعیت وجود میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جا بہ جا اجتماعیت کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور انسانوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بڑی رحمت ونعمت قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو، اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور اس کی نعمت سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ (آل عمران: 103)

دورِ جدید میں لوگوں نے قوم پرستی (یا وطن پرستی) سے متاثر ہو کر اخوت کے رشتے کو بری طرح پامال کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں بنی نوع انسان قبیلوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ علامہ اقبال نے جب اس تصور کو مسلمانوں میں پنپتا دیکھا تو انہوں نے وطنیت پر زبردست تنقید کی:

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے

میں یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ جدید مغربی افکار میں وطنیت اور قومیت قریب قریب ہم معنی ہیں۔ اقبال نے وطنیت کے سیاسی تصور کو جس بناء پر رد کیا تھا وہی وجہ مغربی نظریہ قومیت سے ان کی بد ظنی کی بنیاد بنی۔ ان کا خیال تھا کہ قومیت کی ایک سیاسی نظام کی حیثیت قطعاً غیر انسانی اقدار پر مشتمل ہے۔ اور اس کی بنیاد پر ایک انسانی گروہ دوسرے انسانی گروہ سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اور بلا وجہ تنازعات کی بنیاد پڑ جاتی ہے جو بعض اوقات قیمتی انسانی جانوں کے اتلاف اور بلا خیز تباہی پر منتج ہوتی ہے۔ اسی نظام کو انہوں نے دنیائے اسلام کیلئے خاص طور پر ایک نہایت مہلک مغربی حربے کی حیثیت سے دیکھا اور جب ترکوں کے خلاف عرب ممالک نے انگریزوں کی مدد کی تو انہیں یقین ہو گیا کہ وطنیت اور قومیت کے مغربی تصورات مسلمانوں کیلئے زہر قاتل سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں چنانچہ انہوں نے قومیت کے مغربی تصور کے مقابلہ میں ملت اسلامیہ کا تصور پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ مسلمانانِ عالم کیلئے بنیادی نظریات اور اعتقادات کی رو سے ایک وسیع تر ملت کا تصور ہی درست ہے اور قومیت کے مغربی نظریہ میں بحیثیت ملت ان کی تباہی کے بے شمار امکانات پوشیدہ ہیں۔ **اقبال قوم اور ملت کو مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں** اور مسلمان قوم سے ان کی مراد ہمیشہ ملت اسلامیہ ہوتی ہے۔

اس بارے میں وہ اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔ "میں نے لفظ "ملت" قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں شرع اور دین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن حال کی عربی، فارسی اور ترکی زبان میں بکثرت سندات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملت قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ان گزارشات سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں، قران کریم میں مسلمانوں کیلئے "امت" کے سوا کوئی لفظ نہیں آیا۔ "قوم" رجال کی جماعت کا نام ہے۔ یہ جماعت با اعتبار قبیلہ، نسل، رنگ، زبان، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن "ملت" سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی۔ گویا "ملت" یا "امت" جاذب ہے اقوام کی۔ خود ان میں جذب نہیں ہوتی۔

اقبال قومیت کے اس تصور کے خلاف ہیں جس کی بنیاد رنگ، نسل، زبان یا وطن پر ہو کیونکہ یہ حد بندیاں ایک وسیع انسانی برادری قائم کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ ان کی قومیت کے اجزائے ترکیبی وحدت مذہب، وحدت تمدن و تاریخ ماضی اور پر امید مستقبل ہیں۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اسلام اسی ملت کی اساس ہے اور اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی اصول توحید خدا ملی وحدت کا ضامن ہے۔ اس کا دوسرا رکن رسالت ہے اور یہی دونوں اساس ملت ہیں۔ نہ کہ وطن جو جنگ اور ملک گیری کی ہوس پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے اپنے ایک مضمون میں یوں لکھا ہے:

قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندوؤں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ جس سے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن "سٹیٹ" ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ

"دین" نہ قومی ہے نہ نسلی ہے، نہ انفرادی اور نہ پرائیویٹ، بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد اور منظم کرنا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اخوت کے قائل ہیں لیکن اس کی بنیاد اسلام پر رکھتے ہیں کیونکہ اسلام ضابطہ حیات ہے جس کے پاس وسیع انسانی مسائل کا حل موجود ہے وہ قومیت کو اسلام کے دائرہ میں اس لئے رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک صحیح انسانی معاشرہ صرف اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے وجود میں آسکتا ہے۔ اسلام نے عالمِ انسانیت میں ایک انقلابِ عظیم کو بپا کر کے انسان کو رنگ و نسل، نام و نسب اور ملک و قوم کے ظاہری اور مصنوعی امتیازات کے محدود دائروں سے نکال کر ایک وسیع تر ہیئت اجتماعیہ میں متشکل کیا۔ اقبال کے نزدیک یہ "ہیئت اجتماعیہ" قائم کرنا اسلام ہی کا نصب العین تھا مگر بدقسمتی سے یہ وحدت قائم نہ رہ سکی اور مسلمان مختلف فرقوں، گروہوں اور جماعتوں میں بٹتے چلے گئے۔ اقبال مسلمانوں کو پھر اسی اخوت اسلامی کی طرف لوٹنے کی تلقین کرتے ہیں اور ایک ملت میں گم ہو جانے کا سبق سکھاتے ہیں۔ وہ ایک عالمگیر ملت کے قیام کے خواہشمند ہیں جس کا خدا، رسول، کتاب، کعبہ، دین اور ایمان ایک ہو:

منفعت ایک ہے اسی قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ علامہ اقبالؒ اُمت اسلامیہ کے اتحاد میں مغربی تصورِ قومیت کو نہایت تباہ کن خیال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کارواں سے مراد مسلمانوں کی عظمت گزشتہ ہے وہ کہتے ہیں کہ رنگ، نسل، وطن، ذات اور برادری اسلامی اتحاد قائم کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ انہوں نے امت کو عالمگیریت کا درس دیا۔ اُمت اسلامیہ کا اتحاد وحدت مذہب و تمدن پر قائم ہے۔ علامہ اقبالؒ جس قومیت کے قائل ہیں، اس کا دائرہ اسلام کے اندر ہے اور اس کی بنیاد وہ دینی معتقدات پر رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں
تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

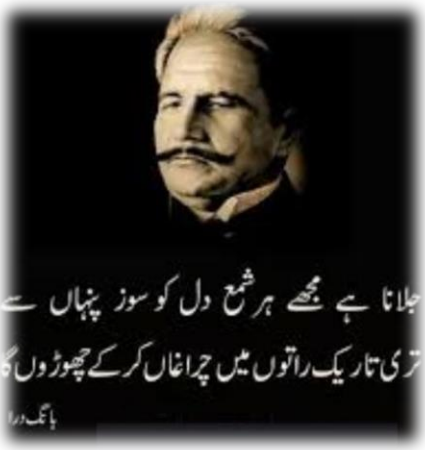

آج کے جدید مغربی سیاسی افکار میں وطنیت اور قومیت قریب قریب ہم معنی ہیں۔ اقبالؒ نے وطنیت کے سیاسی تصور کو جس بناء پر رد کیا تھا وہی وجہ مغربی نظریہ قومیت سے ان کی بدظنی کی بنیاد بنی۔ ان کا خیال تھا کہ قومیت کی ایک سیاسی نظام کی حیثیت قطعاً غیر انسانی اقدار پر مشتمل

ہے اور اس کی بنیاد پر ایک انسانی گروہ دوسرے انسانی گروہ سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اور بلاوجہ تنازعات کی بناء پڑتی ہے۔ جو بعض اوقات قیمتی انسانی جانوں کے اتلاف اور بلاخیز تباہی پر منتج ہوتی ہے۔ اسی نظام کو انہوں نے دنیائے اسلام کیلئے خاص طور پر ایک نہایت مہلک مغربی حربے کی حیثیت سے دیکھا اور جب ترکوں کے خلاف عرب ممالک نے انگریزوں کی مدد کی تو انہیں یقین ہو گیا کہ وطنیت اور قومیت کے مغربی تصورات مسلمانوں کیلئے زہر قاتل سے زیادہ نقصان ثابت ہو رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے قومیت کے مغربی تصور کے مقابلہ میں ملت اسلامیہ کا تصور پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ مسلمانانِ عالم کیلئے بنیادی نظریات اور اعتقادات کی رو سے ایک وسیع تر ملت کا تصور ہی درست ہے اور قومیت کے مغربی نظریہ میں بحیثیت ملت ان کی تباہی کے بے شمار امکانات پوشیدہ ہیں۔ ارادی طور پر ان پر عمل پیرا ہونا تاریکی کی جانب راغب ہونے کے مترادف ہے۔ دراصل کاروان سے مراد ملت اسلامیہ ہے جو ہر طرح کے جغرافیائی تصور سے بالاتر ہے۔ متاع کارواں دراصل تہذیب اسلامی ہے اور یہ تہذیب خدا مرکز تہذیب ہے اور اسی وجہ سے یہ انسان مرکز تہذب بھی ہے۔ دنیا کو اسلام بطور مذہب قبول ہے لیکن بطور نظام زندگی قبول نہیں ہے۔ **اقبالؒ کا فلسفہ خودی اور اسلام کا تزکیہ نفس کا تصور ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔**

سفر یورپ کے بعد علامہ کی شاعری نے قوم کو بیدار کر دیا۔ علامہ اقبالؒ مسلمانوں کو رنگ وخون کے بتوں کو توڑ کر ایک ملّت کی شکل میں متحد ہونے کا مشورہ دیتے ہیں کیونکہ یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعے مسلمان ایک زندہ قوم کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ملک، قوم، نسل اور وطن کی مصنوعی حد بندیوں نے نوعِ انسانی کا شیرازہ منتشر کر کے رکھ دیا ہے اور اس کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اسلامی معاشرے کے تصور کو رائج کیا جائے اور کم از کم مسلمان خود کو اسی معاشرے کا حصہ بنالیں، یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی اُخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی ہے اقبالؒ کا تصورِ ملت ایک انقلابی نعرہ یا جذباتی فیصلہ نہیں جسے اقبالؒ کے کلام میں دوامی حیثیت حاصل نہ ہو۔ اور نہ ہی اقبالؒ ملت کے اس تصور کا خالق ہے۔

جب اقبالؒ کے ذہن میں ملت کا تصور اُبھرا، اس وقت دنیائے اسلام کی حالت ایک بیمار جسم کی سی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد مسلم ریاستیں حقیقی معنوں میں آزاد اور خود مختار ریاستیں نہ تھیں۔ ترکی کی حالت ایک مُڑے تُڑے تاش کے پتے کی سی تھی۔ ایران کے شمالی حصوں پر روس اور جنوبی حصوں پر برطانیہ کی حکمرانی تھی۔ افریقا اور مصر پر یورپی اقوام قابض تھیں۔ افغانستان کے والی یوں تو امیر کہلاتے تھے، مگر ان کی حیثیت وظیفہ خوار اور نوابینِ اودھ سے زیادہ نہ تھی۔ انڈونیشیا ولندیزیوں کے زیر سایہ سیاسی بیداری سے بے خبر تجارتی کاموں سے زیادہ مصروف تھا۔ اور ہند میں مسلمان اقلیتوں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اقبالؒ کا تصورِ ملت محض انقلابی نعرہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی تاریخ کا حامل ہے۔

وطن دوستی کے شیدائی اقبالؒ نے دیکھا کہ اقوام عالم وطن پرستی کے بھیس میں دوسری اقوام پر ظلم کر رہی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے عمرانی اور سیاسی افکار کے مطالعہ سے ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ مغربی جمہوریت کو اس کے سیکولر اور مادر پدر آزاد ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے مگر جمہوری روح جس میں حریت فکر اور آزادی رائے عام ہے کو قبول کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں نہ تو سیکولر جمہوریہ آئے نہ لبرل ازم کے نام پر بے راہ روی پیدا ہو مگر عصرِ حاضر میں مسلمان جمہوری روح سے استفادہ کر کے خود اپنے نظام خلافت اجتہاد کے ذریعہ ایک ایسے منتخب نظام میں بدل دیں جس میں فرد سے زیادہ جماعت مقتدر ہو۔ ریاستِ اسلامی کی سیاسی، عمرانی اور معاشی معاملات چلانے کیلئے ایک منتخب ایوان تشکیل پائے جو ہماری عظیم فقہی روایات سے اصولی رہنمائی لے کر جدید عصری تقاضوں کے مطابق خود ایک جدید فقہی نظامِ مدنیت یا نظامِ حیات متشکل کرے۔ یہ ایک ایسا اصول ہو جس سے فرد کا روحانی استخلاص ہو سکے اور اس بنیادی اصول کی عالمگیریت سے انسانی معاشرے کا ارتقاء بھی روحانی اساس پر ہوتا رہے۔ فرد کے

روحانی استخلاص اور انسانی معاشرے کے ارتقا کے اس بنیادی اصول کا استخراج اقبالؒ کے ہاں کائنات کی روحانی تعبیر پر ہے جو مادے کے بارے میں جدید طبیعات کے اس انکشاف کے بعد کہ مادہ قابل تحویل بھی ہے اور قابلِ فنا بھی۔ اقبالؒ نے قرآن کے تصورِ توحید پر ایک نئی مابعد الطبیعات کو ایقان دیتے ہوئے اپنائی۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اخوت کے قائل ہیں لیکن اس کی بنیاد اسلام پر رکھتے ہیں کیونکہ اسلام ضابطہ حیات ہے جس کے پاس وسیع انسانی مسائل کا حل موجود ہے وہ قومیت کو اسلام کے دائرہ میں اس لیے رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک صحیح انسانی معاشرہ صرف اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے وجود میں آسکتا ہے چنانچہ ان کے تصور قومیت کی بنیاد اسلامی معتقدات پر ہے۔ اس لئے جب انہوں نے تمام عرب کو خلافتِ عثمانیہ کے خلاف انگریزوں کی مدد کی تو انہیں یقین ہو گیا کہ وطنیت اور قومیت کے مغربی تصورات مسلمانوں کیلئے زہر قاتل ہیں۔ چنانچہ انہوں نے قومیت کے مغربی تصور کے مقابلہ میں ملت اسلامیہ کا تصور پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ مسلمانانِ عالم کیلئے بنیادی نظریات اور اعتقادات کی رو سے ایک وسیع تر ملت کا تصور ہی درست ہے۔

آج ہم جن مشکلات کا شکار ہیں، ان سے نکلنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم بحیثیت مسلم امہ اقبال کے وسیع تر ملت کو اپنا ایمان اور ایقان بنالیں۔ پھر ہمیں امریکا جیسی سپر پاور سے خطرہ ہو گا نہ معاشی مسائل کا سامنا ہو گا بلکہ مسلم امہ خود ایک سپر پاور بن کر ابھرے گی۔

بروز سوموار 14 ربیع الاول 1446ھ 16 ستمبر 2024ء

توحید کا رقصِ بسمل، نظریات کی خوشبو

لفظ بھی بچوں کی طرح ہوتے ہیں، معصوم اور بھولے بھالے بچوں کی طرح، بہت محبت کرنے والے، لاڈ و پیار کرنے والے، ناز و ادا والے، تنگ کرنے والے، روٹھ جانے والے اور پھر بہت مشکل سے ماننے والے یا ہمیشہ کیلئے منہ موڑ لینے والے۔ کبھی تو معصوم بچوں کی طرح آپ کی گود میں بیٹھ جائیں گے آپ ان سے کسی کام پھر آپ ان کے بالوں سے کھیلیں، ان کے گال تھپتھپائیں تو وہ کلکاریاں مارتے ہیں، انہیں چومیں چاٹیں بہت خوش ہوتے ہیں وہ۔ کا کہیں تو وہ آمادہ ہو جاتے ہیں۔ محبت فاتح عالم جو ہے۔ کبھی تنگ کرنے پر آجائیں تو ان کا رنگ انوکھا ہو جاتا ہے۔ آپ ان کے پیچھے دوڑ دوڑ کر تھک جاتے ہیں لیکن وہ ہاتھ نہیں آتے کہیں دم سادھے چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپ انہیں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ آپ ہلکان ہوں تو ہو جائیں وہ آپ کو تنگ کرنے پر اترے ہوتے ہیں اور جب آپ کی ہمت جواب دے جاتی ہے تو وہ دیکھو میں آگیا کہہ کر آپ کے سامنے کھڑے مسکرانے لگتے ہیں۔

بچوں کی طرح لفظوں کے بھی بہت ناز نخرے اٹھانے پڑتے ہیں اور اگر اللہ نہ کرے وہ روٹھ جائیں اور آپ انہیں منانے کی کوشش بھی نہ کریں تب تو قیامت آجاتی ہے۔ ایک دم سناٹا، تنہائی اداسی، بے کلی آپ میں رچ بس جاتی ہے، آپ خود سے بھی روٹھ جاتے ہیں۔ ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ کا تو میں نہیں جانتا، میرے ساتھ تو ایسا ہی ہے۔ میں کئی ہفتوں سے اسی حالت میں ہوں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا، بے معنی لگتی ہے زندگی، دوبھر ہو گیا ہے جینا لیکن ..... لیکن پھر وہی جبر کہ بڑا مشکل ہے جینا، جئے جاتے ہیں پھر بھی! تھوڑی دیر کیلئے ای میل دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو ان گنت، ہزاروں دعا گو محبتوں کے پھول سجائے میرا اس طرح استقبال کرتے ہیں کہ اپنے کریم و رحیم رب کے کرم و رحم کی بارش میں مکمل طور پر بھیگ جاتا ہوں اور خود میں دوبارہ اتنی قوت محسوس کرتا ہوں کہ اپنے ارد گرد کی بھی خبر لے سکوں۔

مزاحمتی قوت گرتے ہوؤں کو پیروں پر کھڑا کرتی ہے، ڈوبتے ہوؤں کو تیرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور ساحل پر لا پٹختی ہے۔ اللہ کے حم سے بیمار کو بیماری سے جنگ میں فتح یاب کرتی ہے لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ دنیاوی کامیابی کے حصول کیلئے مزاحمت کمزور پڑ کر سرد ہو جاتی ہے لیکن اگر مزاحمت کے ساتھ "ایمان باللہ" شامل ہو جائے تو مزاحمت کبھی سرد نہیں پڑتی، راکھ میں کوئی نہ کوئی چنگاری سلگتی رہتی ہے جہاں مزاحمتی قوت بیدار ہو تو یہ چنگاری بھڑک اٹھتی ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ یہ مزاحمتی قوت اس وقت بیدار ہو جب خطرہ حقیقت بن کر سامنے آجائے، جب سر پر لٹکتی تلوار کی نوک شہ رگ کو چھونے لگے، جب سرحدوں پر کھڑے مہیب اور دیو ہیکل ٹینکوں اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ سڑکوں اور چھتوں پر سنائی دینے لگے۔ جب ڈیزی کٹر، کروز اور ٹام ہاک بم بارش کے قطروں کی طرح برسنے لگیں۔ جب بہت کچھ "گنوا کر" کچھ بچانے کیلئے ہم مزاحمت پر اتر آئیں گے؟

کیا پاکستانی ذمہ داروں نے دوچار خطرہ کو "لب بام" سمجھنے کی کوئی کوشش کی ہے جس سے دشمن بھی بخوبی سمجھ لے کہ ان کو چھیڑنا گویا موت کو دعوت دینا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی قوم لڑے بغیر ہی شکست تسلیم کر لیتی ہے تو یہ جسمانی نہیں ذہنی پسپائی ہوتی ہے۔ ایسی قوم کو جسمانی طور پر زیر کرنے کیلئے دشمن کو زیادہ مشکل نہیں اٹھانی پڑتی۔ ہلاکو خان کی فوجیں کھوپڑیوں کے میناریوں ہی نہیں تعمیر کر لیا کرتی تھیں۔ صلاح الدین ایوبی نے جب "ملت اسلامیہ" کا نام لیا تو ایک غدار طنزیہ مسکرا اٹھا، کون سی ملت اسلامیہ؟ یہ ذہنی پسپائی کی سب سے گری ہوئی شکل تھی کہ ایک دیو ہیکل انسان اپنے ہی وجود سے انکاری تھا۔ لیکن صلاح الدین ایوبی نے مزاحمت کی قوت کے ساتھ ایمان کو جمع کر کے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے بعد بیت المقدس ناپاک ہاتھوں سے چھین لیا۔

معاشی کمزوریوں اور سیاسی انارکی وابتری کے باوجود آج ہمیں ثابت قدمی سے میدان میں کھڑا دیکھ کر ہمارا دشمن (ٹرائیکا) پہلے سے بڑھ کر مصیبت مول لے چکا ہے۔ ایک یقینی شکست کے امکان کے باوجود محض دنیا پر ظاہری غلبے کی خواہش نے اسے ایک ایسی دلدل میں اتار دیا ہے جہاں اگلا قدم اس کی ظاہری شان وشوکت اور مصنوعی ہیبت کا جنازہ نکال کر رکھ دے گا۔ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ہمیں گھروں میں بیٹھے ہیبت زدہ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ سارے لاؤلشکر کے باوجود زیادہ خوفزدہ ہے۔ اس کی چڑھائی میں شیر جیسی بے جگری نہیں بلکہ لومڑی جیسی عیاری ہے۔ اب وہ ہمیں دیوار سے لگانے کیلئے پس پردہ دوسرے اقدامات کرنے سے باز نہیں آئے گا یعنی ہمیں سیاسی اور معاشی فتنوں میں مبتلا کرے گا، پس آج ہمیں اپنی مزاحمتی قوت کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد "ایمان" ہے اور اس قوت کو مضبوط کرنے والی قوت "اللہ کی نصرت" ہے اور اللہ کی نصرت کیلئے اس کی مکمل حاکمیت کا عملی اعلان کرنا ہوگا۔ جب مومن اپنا سب کچھ اپنے رب کی رضا کیلئے لگا دیتا ہے تو مزاحمت میں اللہ کی نصرت نازل ہو کر اس کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ تاریخ اسلام کے صفحات پر ایسی روشن مثالیں ان گنت تعداد میں جگمگا رہی ہیں جب نہتے مسلمانوں کی مزاحمت نے وقت کے فرعونوں کو زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ آج بھی دنیا بھر میں مزاحمتی تحریکیں پوری شان سے جاری ہیں۔ پتھر نے ٹینک سے شکست نہیں کھائی، دنیا کشمیر اور غزہ میں دیکھ رہی ہے کہ معمولی پتھروں سے جدید ٹیکنالوجی کا مقابلہ جاری ہے۔ جتنا ظلم بڑھتا جا رہا ہے، اتنی ہی شدت سے مزاحمت بڑھتی جا رہی ہے۔

لیکن کیا مزاحمت کی صرف ایک ہی صورت ہے؟ جب کوئی جابر وقت اپنے لشکروں کے زعم میں کسی قوم پر چڑھ دوڑتا ہے تو ہر مظلوم ہاتھ ہتھیار اٹھا لیتا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ ایسے وقت میں اس کے بغیر مزاحمت کی کوئی اور صورت نہیں ہوتی لیکن اس سے بھی پہلا مرحلہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے اور ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ مزاحمت "ایمان" کے بغیر کچھ نہیں۔ لہٰذا ایسا کڑا وقت آنے سے پہلے "ایمان" کو بچانا اور قائم رکھنا اشد ضروری ہے۔ ایمان کی کمزوری ہی ذہنی غلامی اور پسپائی کی طرف لیجاتی ہے، لہٰذا ہر اس وار کی مزاحمت ضروری ہے جس کا نشانہ آج ایمان بن رہا ہے۔ ہمارے نظریات وافکار، ہمارا طرزِ زندگی، ہماری تعلیم، ہماری معیشت، ہمارا میڈیا یہ سب وہ میدان ہائے کارزار ہیں جو ہماری مزاحمتی قوت کے شدت سے منتظر ہیں۔ یہ ڈوب رہے ہیں، ان کو ساحل پر کھینچ لانے کیلئے بھرپور توانائیوں کی ضرورت ہے۔ آج وہ خطرناک مرحلہ آچکا ہے جب نحیف ونزار مریض زندگی کی ڈور سلامت رکھنے کیلئے اس پوشیدہ قوت پر انحصار کرتا ہے جو اس کے جسم میں بجلی کی سی طاقت بھر دیتی ہے۔ گونگے، بہرے اور اندھے بھی اس نازک دور کی شدت سے کچھ کر گزرنے کو تیار ہو جائیں تو جن کو اللہ نے تمام تر توانائیوں سے نواز رکھا ہے، ان کو اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے سے کس نے روک رکھا ہے؟

وطنِ عزیز کی طرف نگاہ اٹھتی ہے تو دل میں ایک کسک سی پیدا ہو جاتی ہے کہ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟ پھر سوچتا ہوں کوئی بھی ہو.....جب طاقت ہو اس کے پاس، ہتھیار بند جتھہ ہو، حکم بجالانے والے خدام ہوں، راگ رنگ کی محفلیں ہوں، جام ہوں، عشوہ طرازی ہو، دل لبھانے کا سامان ہو، واہ جی واہ جی کرنے والے خوشامدی اور بغل بچے ہوں..... تو اس کے دیدے شرم وحیا سے عاری ہو جاتے ہیں۔ شرم وحیا کا اس سے کیا لینا دینا! چڑھتا سورج اور اس کے پوجنے والے بے شرم پجاری جن میں عزتِ نفس نام کو بھی نہیں ہوتی۔ بس چلتے پھرتے روبوٹ.....تب طاقت کا نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کل جو جلسہ میں دہمکیاں دیکر اصلاح کا مشورہ دے رہا تھا، جو بینڈ باجے کے ساتھ گھر میں گھسنے کی بات کر رہا تھا، چند گھنٹوں میں یہ حیوانِ نطق اپنا سافٹ وئیر اپ ڈیٹ ہونے پر بالکل خاموش ہے کہ وہاں کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ اب دھڑلے ایسے ہی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے آنے والے دنوں میں کھل کر چہرہ سامنے آجائے گا۔

لیکن مجھے آج ان کے برعکس کرداروں کا ذکر کرنا ہے کہ جن کا ذکر آنکھوں کی ٹھنڈک، دلوں کا سکون اور اطمینان و فرحت بخش ہے۔ ہاں کوئی بھی ہو، کہیں بھی ہو، انکار سننا تو اس کی لغت میں ہی نہیں ہوتا۔ انکار کیا ہوتا ہے، وہ جانتا ہی نہیں ہے لیکن ہوتا یہی آیا ہے، ہوتا یہی رہے گا۔ منکر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ نہیں ماننے کا نعرہ مُستانہ گونجتا رہتا ہے، تازیانے برستے رہتے ہیں، کھال کھنچتی رہتی ہے، خون بہتا رہتا ہے لیکن عجیب سی بات ہے، جتنی زیادہ شدت سے نہیں ماننے کی آواز کو دبانے کی ۔ نہیں ماننے کا رقص.....رقص ہی نہیں جتن ہر حربہ اپنایا جاتا ہے، وہ آواز اسی شدت سے گونجنے لگتی ہے چاروں طرف کوشش کی جاتی ہے، ہر رقصِ بسمل، نہیں ماننے نہیں ماننے کا نغمہ اور گھومتا ہوا رقاص۔

سینے پر پہاڑ جیسی سلیں رکھی جاتی ہیں، برفانی تودوں میں کود جاتے ہیں لیکن کیا بات ہے جی، کھولتے ہوئے تیل کے اندر ڈالا جاتا ہے، تپتے صحرا میں لٹا کر، نعرۂ مستانہ بلند ہوتا رہتا ہے۔ رقص تھمتا ہی نہیں اور یہ توحید کا رقص، جنوں تھمے گا بھی نہیں۔ زمین کی گردش کو کون روک سکا ہے! بجا فرمایا آپ نے، بندوں کو تو غلام بنایا جاسکتا ہے، ان پر رزق روزی کے دروازے بند کیے جاسکتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہم نادان صرف روپے پیسے کو ہی رزق سمجھ بیٹھے ہیں۔ بندوں کو پابہ زنجیر کیا جاسکتا ہے، قید خانوں میں ٹھونس سکتے ہیں آپ، عقوبت خانوں میں اذیت کا پہاڑ ان پر توڑ سکتے ہیں۔ پنجروں میں بند کر سکتے ہیں، معذور کر سکتے ہیں، بے دست و پا کر سکتے ہیں، ان کے سامنے ان کے پیاروں راج دلاروں کی توہین کر سکتے ہیں، انہیں گالیاں دے سکتے ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن سپاہی مقبول حسین 40 سال مکار دشمن بھارت کی جیل میں گزار کر اپنے وطن کی خاک کو چوم کر جس شان سے لوٹا، اور اپنے اس جانباز سپاہی مقبول حسین کو جس شان سے پاک سپاہ نے اسی وطن کی خاک کے سپرد کیا کہ فلک بھی یہ پاک نظارہ دیکھ کر عش عش کر اٹھا۔

صدیوں سے انسان یہ دیکھتا آیا ہے، انکار کرنے والوں کو بھوکے کتوں اور شیروں کے آگے ڈال دیا جاتا تھا۔ اس جگہ جہاں چاروں طرف خلق خدا کا ہجوم ہوتا اور ایک جابر تخت پر براجمان ہو کر یہ سب کچھ دیکھتا اور قہقہے لگاتا اور خلق خدا کو یہ پیغام دیتا کہ انکار مت کرنا، کیا تو پھر یہ دیکھو یہ ہو گا تمہارے ساتھ بھی۔ ہر فرعونِ وقت اپنی تفریح طبع کیلئے یہ اسٹیج سجاتا ہے، سجاتا رہے گا۔ ایسا اسٹیج جہاں سب کردار اصل ہوتے ہیں، فلم کی طرح اداکار نہیں۔ لال رنگ نہیں، اصل بہتا ہوا تازہ خون، زندہ سلامت انسان کا، رونا چیخنا بھنبھوڑنا کاٹنا سب کچھ اصل.....بالکل اصل۔ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، فرعونیت تو ایک رویے کا نام ہے، ایک بیماری کا نام ہے۔ ایک برادری ہے فرعونوں کی، فرعونوں کی ہی کیا.....ہامان کی، شداد کی، قارون کی، ابولہب کی، ابوجہل کی۔ یہ برادری کا نام ہے جس میں کسی بھی وقت کسی بھی مذہب و ملت کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ بس بچتا وہ ہے جس پر رب کی نظر کرم ہو۔

سب کچھ قید کیا جاسکتا ہے، سب کچھ لیکن ایک عجیب سی بات ہے، اسے قید نہیں کیا جاسکتا، بالکل بھی نہیں، مشکل کیا ممکن ہی نہیں ہے۔ عجلت نہ دکھائیں ، خوشبو کو قید نہیں کر سکتے آپ! اور پھر خوشبو بھی تو کوئی ایک رنگ ایک مقام نہیں رکھتی ناں، بدلتے رہتے ہیں اس کے رنگ، خوشبو کے رنگ ہزار..... بات کی خوشبو، جذبات کی خوشبو، ایثار و وفا کی خوشبو.....بس اب آپ چلتے رہئے اور ان تمام خوشبوؤں کی رانی ہے ہمارے شہداء کی خوشبو جنہوں نے اپنا آج ہمارے کل پر قربان کر دیا، یہ ہے ان کی عقائد کی خوشبو جنہوں نے اس معجزاتی ریاست جس کا نام پاکستان ہے، اس سے محبت کو دین کا لازمی جزو سمجھا کہ اس کا قیام 27 رمضان الکریم کی مبارک شب کو ہوا، دین کی خوشبو، نظریات کی خوشبو۔ یہ خوشبو قید نہیں کی جاسکتی۔ جب بھی دبائیں ابھرتی ہے

۔وہ کیا یاد آ گیا: "جتنے بھی تو کر لے ستم، ہنس ہنس کے سہیں گے ہم"۔ جتنا خون بہتا ہے اتنی ہی خوشبو پھیلتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب درد خود ہی مداوا بن جاتا ہے درد کا۔ دیکھئے پھر مجھے یاد آ گیا: "رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے، درد پھولوں کی طرح مہکے اگر تو آئے"۔

یہ سب کچھ میں آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے وہ دن یاد ہے جب میں نے یہ خبر پڑھی تھی، یقیناً آپ نے دیکھی، پڑھی یا سنی ہو گی۔ اگر نہیں، تو یاد دہانی کی سعادت شائد میرے حصے میں آ رہی ہے لیکن نہیں، یہ تو اس کا کمال ہے جس نے ہم جیسے بے خبروں کو بتایا ہے۔
(نیویارک۔ آن لائن) امریکی آرمی کے ایک اسپیشلسٹ میٹری ہولڈ بروکس گوانتاناموبے کے عقوبت خانے میں کلمۂ شہادت پڑھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ نوجوان فوجی افسر ہولڈ بروکس نے جن کی ڈیوٹی صرف چھ ماہ تک کیوبا کے عقوبت خانے میں مسلمان قیدیوں کی نگرانی اور بعض اوقات انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے وقت رہنمائی کرنا تھی، مسلمان قیدیوں کے اخلاق اور عبادات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ ہولڈ بروکس نے ایک مختصر سی ای میل میں تسلیم کیا کہ مراکشی اور دیگر مسلمان قیدیوں کے حسنِ اخلاق اور تلاوتِ قرآن پاک جو وہ عقوبت خانے کی سخت ترین جالیوں کے عقب میں کرتے تھے، کی مانیٹرنگ کرتے ہوئے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اور کیا بات باقی رہ گئی جناب۔

دیکھئے! چراغ کو تو پھونک مار کر بجھایا جا سکتا ہے، نور کو کون بجھا سکتا ہے! جی جناب نور کو تو پھونک مار کر نہیں بجھایا جا سکتا۔ اسلام نور ہے، قرآن حکیم نور ہے، روشنی ہی روشنی، صراط مستقیم کھرا سودا..... اسی قرآن کو نافذ کرنے کیلئے تو پاکستان جیسی معجزاتی ریاست عطا ہوئی تھی جس نے یہ سکھایا کہ اس ملک کیلئے جان قربان کر دینا سب سے بڑا اعزاز ہے اور ماں باپ، بیوی بچے اور پوری قوم کے علاوہ ملائکہ بھی استقبال کیلئے جمع ہو جاتے ہیں کہ بندے نے اپنے رب سے وفاداری کا جو حلف اٹھایا تھا اس میں یہ کامیاب ہو گیا۔ ہم بھلا اپنے 135 / نوجوان جو گیاری سیکٹر سیاچین میں برف کے پہاڑوں میں دفن ہو گئے تھے، آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ دنیا کے ماہرین نے اپنی تمام تر بہترین جدید ٹیکنالوجی، کوششوں اور تجربات کی روشنی میں برف میں دفن افراد کی بازیابی کو ناممکن قرار دیتے ہوئے ہاتھ اٹھا لئے لیکن صد آفرین ہے ان کے بہادر ساتھیوں پر کہ انہوں نے ان تمام پاک پوتر شہداء کو نہ صرف بازیاب کیا بلکہ دنیا کے ناممکن کو ممکن ثابت کر کے دکھا دیا اور یہ ناممکن کو ممکن کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوا کہ اب تک آٹھ ہزار سے زائد نوجوان ان سرد ترین وادیوں کا رزق بن گئے ہیں کہ انہوں نے یہ حلف اٹھایا تھا کہ اس ملک کی سرحدوں کی ہر حالت میں حفاظت کریں گے۔ بابا اقبال کیا خوب فرما گئے:

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں کعبے میں گاڑو برہمن کو

آپ سن لیجیے پاکستان بھی نور ہے اور اس کیلئے جان قربان کرنے والے اسی نور کے وہ چراغ ہیں جنہوں نے ملک کو دشمنوں کی پھیلائی ہوئی تمام ظلمتوں سے پاک کر دیا ہے، آپ نے سنا بھی ہے اور بار بار سنا ہے، میرے رب نے اعلان کر دیا ہے، اس کا فرمان ہے: شہدا زندۂ جاوید ہیں۔ اپنے رب سے رزق پاتے ہیں اور قادرِ مطلق نے خبردار کیا ہے کہ کبھی مردہ گمان بھی مت کرنا اور اب آپ ذرا دل تھام کر سنئے: جب بدترین تشدد کے بعد بھی وہ قیدی اور ایسے جاں گسل حالات میں وطن کی حفاظت کرنے والے نوجوان مسکرا رہے ہوں تو وہ کون سی طاقت ہوتی ہے جس سے ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر بھی جنبش نہیں ہوتی۔

کیا ایسا تو نہیں کہ کوئی شہید اسے تحسین کی نظر سے دیکھ رہا ہو، بدری شہداء یا میدان احد کے شہداء کی مثالیں جب ان کے دلوں کو منور کر دیتی ہوں تو پھر بھلا خوف کیسا۔ ہمارے ان جانبازوں اور شہداء نے آج اپنی اس طاقت کے اس راز کو پالیا جس کا نام خداداد مملکت پاکستان کی محبت سے جڑے ایمان کا پختہ جزو ہے اور یہ وہ مورچہ ہے جس میں پناہ لینے والوں کیلئے دائمی فتح کی خوشخبریاں ہیں۔ ایمان کی آبیاری وقت کی اوّلین ضرورت ہے، مزاحمت ایمانی قوت سے مشروط ہے، اس کو کھو دیا تو سب کچھ چھن جائے گا! ہمارے یہ تمام شہداء ہمارے سروں کے تاج اور اللہ کا انمول تحفہ ہیں۔ یاد رکھیں کہ اللہ کو پا کر کبھی کسی نے کچھ نہیں کھویا اور اللہ کو کھو کر کبھی کسی نے کچھ نہیں پایا۔

"ہمیں پیار ہے پاکستان سے، اور ہمیں پیار ہے اپنے شہداء سے"!

بروز بدھ 16 ربیع الاول 1446ھ 18 ستمبر 2024ء

خادم و مخدوم

میں نے عرض کیا "اللہ کو کیسے راضی رکھا جاسکتا ہے"۔ مسکرا کر نرم آواز میں بولے "دنیا میں اللہ کو راضی رکھنا سب سے آسان کام ہے۔ یہ کام اتنا آسان ہے جتنا ریموٹ کنٹرول سے اے سی آن کرنا یا ٹیلی ویژن کا چینل بدلنا یا پھر اٹھ کر لائٹ جلانا لیکن اللہ کو راضی رکھنے کی تکنیک سمجھنا بہت مشکل ہے"۔ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا اور چند لمحے رک کر عرض کیا "جناب آپ نے بھی عجیب بات کہی، کام تو آسان ہے لیکن اس کی تکنیک بہت مشکل ہے، مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی"۔ وہ مسکرائے اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے "میرے بچے یہ بات سمجھنے کیلئے تمہیں تخلیق کار کی نفسیات سمجھنا ہو گی"۔

"جناب تخلیق کار کی نفسیات کیا ہوتی ہے، وہ بولے: تم نے ایڈی سن کا نام سن رکھا ہے؟ میں نے فوراً عرض کیا "جی ہاں! یہ وہ شخص تھا جس نے بلب ایجاد کیا تھا، جس نے ریلوے کیلئے سگنل کا سسٹم بنایا تھا، وہ فوراً بولے "بالکل ٹھیک میرے بچے، میں اسی ایڈی سن کی ایک بات تمہیں سنانا چاہتا ہوں۔ وہ ایک دن بازار سے گزر رہا تھا، اس نے دیکھا لالٹین بنانے والا ایک کاریگر اس کی تخلیق کو گالیاں دے رہا ہے، لالٹین بنانے والے کا کہنا تھا ایڈی سن کی ایک احمقانہ تخلیق نے اسے اور اس کے بہن بھائیوں کو بے روزگار کر دیا ہے۔ ایڈی سن اپنی تخلیق کی بے توقیری برداشت نہ کر سکا اور وہ اس کاریگر سے الجھ پڑا، یہ تو تکار ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ پولیس آئی اور ایڈی سن کو پکڑ کر لے گئی، اس کے بعد جس بھی شخص نے یہ واقعہ سنا اسے یقین نہ آیا کیونکہ کسی نے کبھی ایڈی سن کو لڑتے یا جھگڑتے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ حقیقت تھا۔

وہ دم لینے کیلئے رکے اور چند لمحے بعد دوبارہ بولے "یہ بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اس میں تخلیق کار کی ساری نفسیات چھپی ہیں۔ دنیا کا ہر تخلیق کار اپنی تخلیق کے بارے میں حساس ہوتا ہے، وہ اپنی بے توقیری تو سہہ لیتا ہے لیکن اس سے اپنی تخلیق کی بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔ تم نے مصوروں، افسانہ نویسوں، شاعروں اور موسیقاروں کو دیکھا ہو گا، یہ لوگ گھنٹوں اپنی دھنوں، شعروں، افسانوں اور تصویروں کی تعریف کرتے رہتے ہیں اور انہیں ہر وہ شخص اچھا لگتا ہے جو ان کی تخلیقات کی مداح سرائی کرتا ہے۔ تم کسی شاعر کے سامنے بیٹھ کر اس کے شعروں کی تعریف شروع کر دو، وہ تمہیں وہاں سے اٹھنے نہیں دے گا، یہ بھی تخلیق کار کی نفسیات ہوتی ہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ بولے "دنیا کے ہر تخلیق کار میں دو چیزیں ہوتی ہیں، وہ اپنی تخلیق کی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے اور اسے اپنی تخلیق کی بے عزتی پر شدید غصہ آتا ہے"۔

میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور عرض کیا "جناب میرا سوال یہ تھا کہ اللہ کو کیسے راضی رکھا جاسکتا ہے لیکن آپ نے موضوع ہی بدل ڈالا"۔ وہ مسکرائے اور میری طرف اس طرح دیکھا جیسے فلسفی جاہلوں اور بے وقوفوں کی طرف دیکھتے ہیں پھر بولے "تم مجھے پہلے یہ بتاؤ جب اللہ کسی شخص پر راضی ہوتا ہے تو وہ اسے کیا دیتا ہے؟ میں نے عرض کیا "جناب میرا علم بہت محدود ہے، میں آپ ہی سے وضاحت کی درخواست کرتا ہوں"۔ وہ مسکرا کر بولے "اللہ کی ذات جب کسی شخص پر راضی ہوتی ہے تو وہ اس پر رزق کشادہ کر دیتی ہے، وہ اسے امن، خوشی، سکون دیتی ہے اور وہ اس کے اقتدار کو وسیع کر دیتی ہے اور جب وہ ناراض ہوتا ہے تو یہ ساری چیزیں ریورس ہو جاتی ہیں، اقتدار مختصر ہو جاتا ہے، زندگی سے سکون خارج اور خوشی ختم ہو جاتی ہے، امن غارت اور رزق دور ہو جاتا ہے اور وہ گھر، کمپنی، فیکٹری، دکان یا پھر ملک، تمام برباد ہو جاتے ہیں"۔

میں خاموشی سے سنتا رہا، وہ بولے "اللہ خالق کائنات ہے وہ اس کائنات کا سب سے بڑا تخلیق کار ہے اور انسان اس کی محبوب ترین تخلیق، چنانچہ جب تک کوئی شخص اس کی محبوب ترین تخلیق سے محبت نہیں کرتا اللہ اس وقت تک اس سے راضی نہیں ہوتا اور جس سے اللہ راضی نہ ہو اس دنیا میں اس شخص کا رزق ،خوشی، سکون، امن اور اقتدار وسیع نہیں ہوتا"۔ وہ رکے اور دوبارہ بولے: اللہ نے انسان، جانور، پودے، جھیلیں، پہاڑ اور کائنات کی ہر شے تخلیق کی لیکن انسان اللہ کی تخلیقی فہرست میں پہلے نمبر پر آتا ہے اور دنیا کا جو ملک، معاشرہ، نظام اور شخص اللہ کی وضع کردہ ترجیحات کے مطابق اس کی تخلیقات سے محبت اور عزت کرتا ہے، انہیں ان کا جائز مقام دیتا ہے اللہ بھی اس سے اتنا ہی راضی ہو جاتا ہے اور دنیا میں اسے اتنا ہی امن ،سکون، خوشی، رزق اور اقتدار مل جاتا ہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔

وہ چند لمحے رک کر بولے "تم اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دنیا کے مختلف ممالک کا جائزہ لو تو تمہیں معلوم ہو گا دنیا کے جتنے ملکوں میں لوگوں کا احترام، ان کے حقوق کا خیال، شہریوں کی عزت نفس محفوظ، بیماروں کو دوا، بے روزگاروں کو روزگار، جاہلوں کو علم اور مظلوموں کو انصاف ملتا ہے، وہ ملک خوشحال بھی ہیں، ان میں امن، رزق، خوشی اور اس ملک کے اقتدار کی سرحدیں بھی وسیع ہیں لیکن جن ممالک میں انسانوں کی قدر نہیں، جن میں غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جا رہا ہے اور جو ملک طبقاتی نظاموں میں جکڑے ہوئے ہیں، وہ ملک تیسری دنیا کہلا رہے ہیں، وہ ملک بھکاری بن کر خوشحال ملکوں کے دروازوں پر بیٹھے ہیں اور ان ملکوں کے حکمران اپنے اقتدار کے دوام کیلئے ان کی خوشامد میں مصروف رہتے ہیں۔ تم اللہ کی تخلیق سے محبت کے اس سلسلے کو ذرا سا مزید وسیع کر کے دیکھو اور سوچو دنیا میں اس وقت کون کون سے ملک ترقی کر رہے ہیں، وہ کون سے ملک ہیں جو سپر پاور بنتے جا رہے ہیں ؟؟ تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے، دنیا میں وہ ملک بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں وہاں انسانوں کے بعد جانوروں، درختوں، ندیوں، نالوں، جھیلوں، دریاؤں اور پہاڑوں تک کا خیال رکھا جاتا ہے، وہاں بے بس انسان پر ظلم اور درخت کاٹنا دونوں جرم ہیں چنانچہ اللہ ان ممالک سے پوری طرح راضی ہے اور یوں یہ ممالک آگے بڑھ رہے ہیں" وہ رکے اور دوبارہ بولے "انسان کی سلطنت اور اللہ کی کائنات کا آئین بہت مختلف ہے، دنیا میں انسان ان لوگوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہے جو صحت، رزق اور اختیار میں برتر ہوتے ہیں اور ان لوگوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے جو مرتبے میں چھوٹے ہوتے ہیں لیکن اللہ کا نظام اس سے بالکل الٹ ہے، وہ محروم لوگوں کے قریب اور خوشحال لوگوں سے دور ہوتا ہے، وہ بے زبانوں کی زبان اور بے کسوں کی بے بسی میں رہتا ہے چنانچہ جو لوگ اس کے محروم لوگوں کا خیال رکھتے ہیں، جو محروم لوگوں کو راضی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ ان سے راضی ہوتا جاتا ہے"۔ وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا "جناب یہ فلسفہ تو شاید ملکوں اور معاشروں کیلئے ہے، یہ نسخہ شاید حکمرانوں کیلئے وضع کیا گیا ہے، اگر عام شخص اللہ کو راضی کرنا چاہے تو اسے کیا کرنا چاہئے"؟ وہ مسکرائے اور زور دے کر بولے "اللہ کے قوانین اٹل ہوتے ہیں، وہ عام شخص سے لے کر حکمران تک سب سے ایک جیسی توقعات رکھتا ہے۔ تم اگر اللہ کو راضی کرنا چاہتے ہو تو اس کے غریب، بے بس، بے کس اور محروم لوگوں کے قریب ہو جاؤ، اللہ تمہارے قریب ہو جائے گا، تم محروم لوگوں کو اپنی خوشی، سکون، امن، رزق اور اقتدار میں شریک کر لو اللہ تمہیں رزق، امن، سکون اور خوشی میں شریک کر لے گا اور تم اللہ کی خوشی اور اقتدار کی وسعت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہو۔ حکمرانوں کیلئے بھی یہی فارمولا ہے، جس ملک کا حکمران اللہ کے بے بس لوگوں کیلئے کام کرتا ہے، اللہ اس حکمران کیلئے کام شروع کر دیتا ہے اور جس ملک کی حکومت بیمار کو دوا، رزق، روزگار، تعلیم، امن اور خوشی دیتی ہے، اللہ اس حکومت کے اقتدار کو

وسعت دے دیتا ہے اور یہ ایک بہت چھوٹا اور آسان فارمولا ہے۔ تم آج گھر سے باہر نکلو اور کسی بھوکے کو کھلانا کھلا دو، تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے، شام تک تمہارے گھر رزق وسیع ہو چکا ہو گا اور تم اور تمہارے اہل خانہ بے شمار دردوں سے رہائی پا چکے ہوں گے۔ تم یہ کر کے دیکھ لو۔ تم ایک بار اللہ کو راضی کر کے دیکھ لو، تمہیں عالمی استعمار کو راضی کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم اصلی مخدوم بن جاؤ گے۔

غور سے سنیں کہ خالق اپنی تخلیق سے کس قدر محبت فرماتا ہے اور ہمیں کیا حکم دیا جا رہا ہے:
لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَـٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَـٰئِكَةِ وَالْكِتَـٰبِ وَالنَّبِيِّـۧنَ وَءَاتَى ٱلْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ وَٱلسَّآئِلِينَ وَفِى ٱلرِّقَابِ۔
(البقرہ:177)
نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔

وَٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا۟ بِهِۦ شَيْـًٔا ۖ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَـٰنًا وَبِذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينِ وَٱلْجَارِ ذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْجَارِ ٱلْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا (النساء:36)
اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔

یہاں تخلیق کار نے اپنی تخلیق سے محبت کو کامیابی کا آسان راستہ قرار دے کر ایک خوبصورت پیغام دیا ہے۔
فَلَا ٱقْتَحَمَ ٱلْعَقَبَةَ،وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا ٱلْعَقَبَةُ،فَكُّ رَقَبَةٍ،أَوْ إِطْعَـٰمٌ فِى يَوْمٍ ذِى مَسْغَبَةٍ،يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ،أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ (البلد:11-16)
مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمّت نہ کی۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھُڑانا، یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔۔۔

تو آیئے اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے اس کی مخلوق کے خادم بن کر مخدوم بن جائیں۔

کامیابی کا راز: عاجزی یا تکبر؟

ایک ہاتھ سے ٹوپی سنبھالے بھاگتا ہوا آدمی سامنے شیڈ میں کھڑی چمکدار کار کے ڈرائیور کے کان میں سرگوشی کرتا ہے تو فوراً باہر کے ماحول میں ایک سراسیمگی اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ چمکدار گاڑی جو کچھ دیر پہلے ایک شیڈ کی چھاؤں میں دفتر کے سامنے کھڑی تھی، جس پر وقفے وقفے سے ڈرائیور اس کی دیکھ بھال کرتے ہوئے گرد صاف کر رہا تھا، مکھی تک کو بیٹھنے نہیں دیتا تھا، وہ فوراً گاڑی چوکس حالت میں ممکن حد تک دفتر کے دروازے کے قریب لا کر کھڑی کر دیتا ہے اور ڈرائیور باہر نکل نگاہیں نیچے کر کے مؤدب دفتر کی طرف منہ کر کے کھڑا صاحب کا انتظار کرتا ہے۔ اتنے میں بڑے دفتر کا دروازہ کھلتا ہے۔ چپراسی بریف کیس اور صبح کی اخباریں ہاتھ میں لئے باہر آتا ہے اور دوسرا آدمی ہاتھ میں کچھ فائلیں لئے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ کا دروازہ کھول کر نہائت سلیقے سے پہلے فائلیں اور اس کے ساتھ بریف کیس کے اوپر اخباریں رکھ دیں جاتی ہیں۔ پھر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کو زور لگا کر آخر ممکن حد تک آگے کر دیا جاتا ہے تا کہ پچھلی سیٹ کے سامنے کافی جگہ آرام سے ٹانگیں پھیلانے کیلئے میسر آجائے۔ گرمی کا موسم ہو تو ائر کنڈیشن صاحب کے دفتر سے نکلنے سے بیس منٹ پہلے چلا دیا جاتا ہے۔

صاحب بہادر ایک شانِ بے نیازی سے برآمد ہوتے ہیں، ارد گرد موجود لوگ ایک دم ساکت و جامد ہو جاتے ہیں، گفتگو کرنے والا بات کرنا بھول جاتا ہے، بے ترتیب یونیفارم والا ٹوپی سیدھی کر لیتا ہے اور سگریٹ پیتا ہوا شخص سگریٹ پھینک دیتا ہے یا کہیں چھپا دیتا ہے۔ پچھلا دروازہ جو ڈرائیور سے دوسری سمت والا ہے اسے کھول کر سر جھکائے کوئی شخص کھڑا ہوتا ہے۔ صاحب بہادر تشریف رکھتے ہیں، اشاروں کا منتظر گاڑی کو خراماں نکالتا ہوا منظر سے غائب کر دیتا ہے۔ پورا راستہ صاحب بہادر یا تو اخباروں کی ورق گردانی کرتے ہیں یا پھر اگر کوئی فائل ضروری محسوس ہو تو اسے دیکھا جاتا ہے۔ وہ حتیٰ الامکان کھانسنے سے بالکل پرہیز کرتا ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو کھانسنے کی تکلیف سے فارغ ہوتے ہوئے اپنی اس حرکت پر بڑا نادم اور شرمسار دکھائی دیتا ہے۔

اس پورے سفر میں ڈرائیور کی حیثیت ایک کل پرزے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے کہ کہ کمپنی نے سٹیئرنگ، گیئر یا سیٹ کی طرح اسے بھی فکس کر دیا ہے جسے صرف احکامات سننے اور اس پر عمل کرنا ہے۔ وہاں روک دو، ادھر لے چلو، میرا یہاں انتظار کرو، میں واپس آرہا ہوں، مجھے یہاں تین گھنٹے لگ جائیں گے اور ڈرائیور روبوٹ کی طرح سر ہلا کر یا پھر منہ سے سعادت مندی کے الفاظ نکالتا رہتا ہے۔ یہ منظر آپ کو ہر اس دفتر یا ادارے کے باہر ملے گا جہاں کوئی صاحبِ اختیار تشریف رکھتا ہے۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری کا کوئی امتیاز نہیں۔ وزیر کا دفتر یا سیکرٹری کا، جرنیل کا ہیڈ کوارٹر یا عدلیہ کی عمارات، کسی پرائیویٹ کمپنی کے دفاتر ہوں یا بینک کی شاندار عمارت، سب جگہ صاحبانِ طاقت اور والیانِ حیثیت کیلئے ایک ہی سیٹ مخصوص ہے۔ ان کی گاڑی کہیں پہنچے، لوگ وہی دروازہ کھولنے کیلئے لپکتے ہیں۔

پاکستان میں جب میں یہ سارے مناظر دیکھتا ہوں تو اکثر میرے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ سب لوگ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر کیوں نہیں بیٹھتے۔ کیا وہ آرام دہ نہیں، کیا وہاں ائر کنڈیشن کی ہوا صحیح طور پر نہیں پڑتی، کیا وہاں سے راستہ، ارد گرد کی عمارتیں یا لوگ ٹھیک طرح سے نظر نہیں آتے ؟؟؟ لیکن ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ یہ سامنے والی سیٹ زیادہ آرام دہ بھی ہے اور ائر کنڈیشن کی ہوا بھی اگلی سیٹ پر زیادہ لطف دیتی ہے، باہر کا منظر بھی صحیح طور پر نظر آتا ہے تو پھر اگلی سیٹ خالی کیوں رہتی ہے یا پھر اس میں سٹاف آفیسر یا پی اے کیوں بٹھایا جاتا ہے ؟

دراصل یہ کہانی اس نفرت اور تکبر کی ہے جس میں ڈرائیور کی حیثیت ایک انسان سے کم ہو کر بادشاہوں کے رتھ اور مہاراجوں کی بڑی بڑی سواریاں

چلانے والوں کی ہوا کرتی تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک اعلیٰ مرتبہ اور مقام رکھنے والی شخصیت ڈرائیور کے برابر آ کر بیٹھ جائے اور دیکھنے والے ان دونوں میں تمیز تک نہ کر سکیں کہ کون افسر ہے اور کون معمولی حیثیت کا ڈرائیور۔ ایک زمانہ ان متکبر افسران، وزرا، جج، جرنیل اور اعلیٰ عہدیداروں پر ایسا آیا کہ ان کو چھوٹی سوزوکی پر سفر کرنا پڑا جس کی پچھلی سیٹ انتہائی بے آرام اور کم جگہ والی تھی لیکن تکبر اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ اگلی سیٹوں کو مکمل طور پر فولڈ کیا جانے لگا اور آقا و مالک کی تمیز کو برقرار رکھنے کے نئے نئے طریقے دریافت کئے گئے۔

یہ رویہ ان ساری قوموں پر گزرا ہے جنہوں نے انسانوں کو غلام اور محکوم بنانے کے ڈھنگ ایجاد کئے تھے۔ امریکا میں جم کرو کے قوانین کے تحت بسوں میں کالوں کی سیٹیں گوروں کی سیٹوں سے علیحدہ یعنی پچھلی طرف ہوتیں اور اگر کوئی کالا اگلی سیٹ پر بیٹھ جاتا تو اسے گولی مار دی جاتی اور اگر کوئی گورا پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کی جسارت کرتا تو لوگ اسے طعنے مار مار کر مار دیتے۔ لندن شہر میں آج بھی کالے رنگ کی ٹیکسیوں کا رواج ہے جس میں ڈرائیور کی سیٹ اور سواریوں کے درمیان شیشے کی دیوار فکس ہے جس کی کھڑکی صرف مسافر کھول سکتا ہے تاکہ ڈرائیور کی حیثیت، مرتبہ اور اس سے بات کرنے کا تعین بھی وہی کرے جو پچھلی سیٹ پر براجمان ہے۔ صدیوں تک فرعونوں، شہنشاہوں، آمروں، ڈکٹیٹروں اور ان کے چھوٹے چھوٹے کارپردازوں کی سواریاں بھی ایسی تھیں کہ ان کا عام لوگوں سے کوئی تعلق نہ رہے۔ دھول اڑاتی یہ سواریاں جہاں عوام الناس کا مذاق اڑاتی تھیں وہاں ان سواریوں پر سفر کرنے والے بھی انسانوں کے درمیان تمیز، فرق اور آقا اور غلام کے قانون میں بٹے ہوئے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی ایک مناظر ایسے بھی یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں جس کو دیکھتی آنکھیں اپنے اندر صدیوں محفوظ کر لیتی ہیں۔ چند سال پہلے پاکستان کے فور اسٹار جنرل میرے ساتھ گاڑی میں جا رہے تھے کہ اچانک ٹریفک سگنل پر گاڑی کھڑی کی تو ساتھ والی لین میں برطانیہ کے وزیر اعظم بھی اشارہ کھلنے کے منتظر تھے۔ میں نے فوری طور پر اپنے مہمان کو ساتھ والی لین کی طرف دیکھنے کی دعوت دی اور کہا "کیا آپ جانتے ہیں کہ اس گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص اس ملک کا وزیرِ اعظم ہے۔ میں نے وزیر اعظم کی طرف دیکھ کر جونہی ہاتھ ہلایا تو اس کے جواب میں اس نے کئی مرتبہ ہاتھ ہلاتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور اسی اثناء میں ٹریفک سگنل کھل گیا اور ہم دونوں اپنی اپنی راہ پر چل دیئے۔ میرے مہمان نے باقی سارا سفر نہائت خاموشی میں گزارا، پتہ نہیں اس خاموشی میں کوئی ندامت تھی یا میرے سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ہمارے ہاں صدر اور وزیر اعظم اول تو عوام سے کوسوں دور ہیں لیکن اگر کبھی نکلنا پڑے تو سینکڑوں گاڑیوں کے سائرن بجاتے ہوئے قافلے کے جلو میں نکلتے ہیں۔ اعلیٰ عدلیہ کے چیف جسٹس بھی بیس گاڑیوں کے سکواڈ میں آتے جاتے ہیں، ملک کے وزیرِ داخلہ جن کے ذمے اس ملک کے شہریوں کی سلامتی کی ذمہ داری ہے، وہ اس وقت کہیں نہیں جاتے جب تک ایک بھاری سیکورٹی گارڈان کو چاروں طرف سیکورٹی فراہم نہیں کرتے۔ اب تو معمولی وزراء بھی سیکورٹی اور سائرن والی گاڑیوں کے بغیر سفر نہیں کرتے۔ تکبر، غرور اور گھنٹوں ساتھ چلنے، آرام پہنچانے والے شخص سے کراہت اور دوری کے اس ماحول میں پتہ نہیں کیوں مجھے اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے اور اسلاف کے وہ معیار آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ روم کے بادشاہوں کی طرح رہن سہن اور لباس پہننے والوں عیسائیوں کے بیت المقدس پر جب پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے مسلمانوں نے فتح حاصل کی تو شہر حوالے کرنے کیلئے خلیفہ وقت حضرت عمر فاروق کا انتظار تھا۔ ایک گھوڑا جس کے سم گھس کر بیکار ہو چکے تھے، رک رک کر قدم رکھتا تھا، اس کے ساتھ خلیفۂ وقت اور فاتح ایران و شام

عمر ابن خطاب اور غلام موجود۔ طے ہوا کہ آدھا راستہ غلام سواری کرے گا اور آدھا راستہ خلیفہ۔ بیت المقدس قریب آیا تو باری غلام کی آگئی اور پھر تاریخ نے انسانی احترام کا عجیب و غریب منظر دیکھا۔ غلام گھوڑے پر سوار اور خلیفۂ وقت باگ تھامے بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ شاہی کروفر اور لباس پہنے رومی عیسائی صرف ایک فقرہ بول سکے "ایسا ہی شخص عزت کا مستحق ہے اور ایسے ہی شخص کو فتح نصیب ہوا کرتی ہے"۔ اس تاریخی فقرے کے بعد بھی اگر کوئی مجھ سے سوال کرتا ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و رسوا کیوں ہیں، بے آبرو اور بے آسرا کیوں ہیں، تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوتی!

ہمارے وزیر اعظم امریکا 21 ستمبر کو برطانیہ اور امریکا کے دورے پر روانہ ہو رہے ہیں جہاں ان کی ملاقاتیں عالمی مالیاتی اداروں سے بھی ہونی ہیں جن کے بارے میں ان کو کہنا ہے کہ یہ ادارے ناک کی لکیریں نکلوانے کے بعد سودی قرض جیسی لعنت دینے کا وعدہ کریں گے۔ ان تمام حکمرانوں کو تو علم ہے کہ سود اللہ اور رسول کے خلاف کھلی جنگ ہے تو کیا ہم اللہ کے خزائن پر یقین نہیں رکھتے یا رب ذوالجلال کے مزید عذاب کے منتظر ہیں؟
رہے نام میرے رب کا جس کے ہاتھ میں عزت و ذلت ہے۔

یہ آرزو تھی کہ ہم اس کے ساتھ ساتھ چلیں
مگر وہ شخص تو رستہ بدلتا جاتا ہے
وہ بات کہہ، جسے دنیا بھی معتبر سمجھے
تجھے خبر ہے، زمانہ بدلتا جاتا ہے

بروز اتوار 20 ربیع الاول 1446ھ 22 ستمبر 2024ء